آئینۂ حیرت

اور دوسری تحریریں

سید رفیق حسین

آئینۂ حیرت

اور دوسری تحریریں

سید رفیق حسین

آئینۂ حیرت

اور دوسری تحریریں

آئینۂ حیرت

اور دوسری تحریریں

سید رفیق حسین

ISBN 969-8379-55-X

موجودہ صورت میں پہلی اشاعت: دسمبر ۲۰۰۲ء

زیرِ اہتمام

آج کی کتابیں

کمپوزنگ: عامر انصاری، حمزہ گبول

صفحہ سازی: عامر انصاری، امجد علی

طباعت: علمی گرافکس، کراچی

سٹی پریس بک شاپ

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400

فون: 5213916 - 5650623 (92-21)

ای میل: cp@citypress.cc

انٹرنیٹ: www.citypress.cc

ترتیب

ا

''آئینۂ حیرت''

۲

باقیات: افسانے

۳

باقیات: مضامین

۴

شخصیت اور فن

مآخذات

اس کتاب کا پہلا حصہ سید رفیق حسین کے آٹھ افسانوں کے مجموعے ''آئینۂ حیرت''
پر مشتمل ہے، جو (غالباً) ۱۹۴۴ء میں ساقی بک ڈپو، دہلی، سے شائع ہوا۔ دوسرے
اور تیسرے حصے میں شامل تحریریں، ایک کو چھوڑ کر، ادبی جریدے ''نیا دور''، کراچی،
کے شمارہ ۴۶-۴۵ (جون ۱۹۶۸ء) میں شامل خصوصی گوشے سے لی گئی ہیں۔ ایک
افسانہ ''حضت وہ تو نکل گئے'' بشیر ہندی کی مرتب کردہ کتاب ''میرا بہترین افسانہ''
سے ماخوذ ہے۔ لاہور سے شائع شدہ اس کتاب کا سن اشاعت نامعلوم ہے۔ سید
رفیق حسین کی مختصر ''خودنوشت'' بھی پہلی بار اسی کتاب میں شائع ہوئی تھی۔

سید رفیق حسین کی شخصیت کے بارے میں الطاف فاطمہ، فضل قدیر اور سید
مختار اکبر کے مضامین، جو زیرِ نظر کتاب کے چوتھے حصے میں شامل ہیں، وہ بھی
''نیا دور'' کے مذکورہ بالا شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ اسی حصے میں شامل نیر مسعود
کے دونوں مضامین ''سوغات''، بنگلور، کے شمارہ ۵ (ستمبر ۱۹۹۳ء) سے لیے گئے
ہیں۔ صلاح الدین محمود کی جو تحریر یہاں شامل کی گئی ہے وہ سید رفیق حسین کی تمام
تحریروں کے اس مجموعے کے لیے پیش لفظ کے طور پر ۱۹۹۸ء میں لکھی گئی تھی جسے
صلاح الدین محمود مرتب کر کے شائع کرانا چاہتے تھے، لیکن یہ منصوبہ نامکمل رہا۔

۱

''آئینۂ حیرت''

کہنے کی باتیں

کوئی چار سال کی بات ہے، ایک دن ''ساقی'' کی ڈاک میں ایک مسودہ آیا جسے دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگی۔ یہ مسودہ کھلا کھلا اور بڑے ہی بے ڈھنگے خط میں لکھا ہوا تھا۔ دل نے کہا کہ اسے بغیر پڑھے ہی واپس کر دو مگر دماغ نے ٹوکا کہ یہ تو ادارتی دیانت داری کے خلاف ہوگا۔ مضمون نگار کا نام دیکھا تو وہ بھی پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ خیر طبیعت پر جبر کر کے اسے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے مضمون پڑھتا جاتا تھا، جبر واکراہ رخصت ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب مضمون ختم ہوا تو میں حیران تھا کہ یہ کیسا جواہر پارہ اس بدنما پلندے کی صورت میں ہاتھ لگا، افوہ! ظاہر بھی کتنا فریبی ہوتا ہے! اگر میں دل کا کہنا مان لیتا تو ایک جوہر قابل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتا کیوں کہ یہ لکھنے والے کا پہلا افسانہ تھا جو بہت جھجکتے جھجکتے ''ساقی'' کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اور اس تاکید کے ساتھ کہ اگر پسند نہ آئے تو مسودہ ضائع کر دیا جائے۔ یہ افسانہ تھا ''کفارہ'' اور لکھنے والے کا نام تھا سید رفیق حسین۔ افسانہ چھپا، اشتیاق سے پڑھا گیا اور آئندہ کے لیے ناظرین کو مشتاق بنا گیا اور پھر ''کلوا'' اور ''بیرو'' کے شائع ہونے پر تو رفیق حسین نے گویا جھنڈے ہی گاڑ دیے۔ اور افسانوی ادب کے محترم نقاد مولانا صلاح الدین احمد صاحب نے ''ادبی دنیا'' کے ادبی جائزے میں کئی صفحات میں اس افسانے کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ اور پھر وہ معرکۃ الآرا افسانہ ''ساقی'' کے کسی خاص نمبر میں شائع ہوا جس سے اس کتاب کا نام موسوم ہے: ''آئینۂ حیرت''۔ ان افسانوں میں جانوروں کی نفسیات کے علاوہ، جو بجائے خود ہر افسانے کی ایک نادر خوبی ہے، ایک اور خوبی بھی ہے انسانی سرشت کی تحلیل کہانی کے پیرائے میں۔ اور یہ دونوں خوبیاں ہر افسانے میں آپ کو متوازی نظر آئیں گی لیکن اس ہنر مندی اور سلیقے کے ساتھ کہ کہیں بھی یہ دورنگی افسانے کی وحدت تاثر میں فرق نہیں آنے دیتی۔ بلکہ یہ تقابلی مطالعہ ہی رفیق حسین کی وہ خصوصیت ہے جو انھیں فن کاروں سے اٹھا کر حسن کاروں میں جگہ دیتی ہے۔

شاہد احمد دہلوی

دہلی

۵ رمارچ ۱۹۴۴ء

کفارہ

ریل سے اُتر کر اگر شاہ گڑھ اسٹیشن سے ٹھیک شمال کی طرف روانہ ہوں تو پانچ گاؤں چھوڑ کر اخیر گاؤں سکھ داس پور آتا ہے۔ اس کے بعد دو میل سے بھی زیادہ چوڑے میدان کو پار کر کے نگاہیں ایک سبزی مائل سیاہ دیوار پر رکتی ہیں، جو کہ دائیں ہاتھ پر سارداندی کی اونچی پٹری سے شروع ہو کر دائیں طرف ڈھندلی پڑتے پڑتے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ دیوار نہیں ہے بلکہ ترائی کے جنگل کا وہ حصہ ہے جسے مصطفےٰ آباد رینج کہتے ہیں۔ چوں کہ اس جنگل میں چوپاؤں کی کثرت ہے اس لیے اس میدان میں سوائے گیہوں کی ایک فصل کے اور کوئی کاشت نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس طرح پر کہ کنارے کے تمام گاؤں کے لوگ متفق ہو کر جنگل کے کنارے کنارے میلوں میل تک کانٹے دار درختوں کی شاخوں سے ایک باڑھ کھڑی کر دیتے ہیں جس سے کچھ بچاؤ ہو جاتا ہے۔ ورنہ دراصل یہ دس بارہ میل کا لمبا اور ڈھائی میل کا چوڑا گیہوں کا ایک تختہ خود بچاؤ ہے۔ اتنی بڑی کھیتی میں نقصان ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ رات کے آٹھ بجتے ہی جگہ جگہ پر سانبھر[1] اور چیتل[2] منھ اونچا کر کے اپنے پھیلے ہوئے شاخ دار سینگ لپیٹ پر ملا کر تھوتنے بھر راستہ ڈھونڈ لینے کے بعد بے تکلف اندر آ جاتے ہیں۔ ان کے پھیلے

---

[1] سانبھر سب سے بڑے قسم کا بارہ سنگھا ہوتا ہے مگر سینگ آٹھ ہی ہوتے ہیں۔ چار شاخیں ایک طرف اور چار دوسری طرف۔ جسم کا رنگ مٹیالا ہوتا ہے۔

[2] سانبھر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ نر کے بارہ شاخیں ہوتی ہیں۔ کھلی بدن پر سیاہ حاشیے سے گھرے ہوئے سفید گل ہوتے ہیں۔

ہوے سینگ کانٹے دار لکڑیوں کی دیوار کو چیر کر ان کے جسم سے زیادہ چوڑا راستہ بنا دیتے ہیں۔ رات بھر چرنے کے بعد دن پھوٹنے کی ہلکی روشنی پر یہ جانور پھر اسی طرح واپس نکل کر جنگل میں گھس جاتے ہیں۔

ہولی کو جلے پانچ دن ہو چکے ہیں۔ رات کے دو بجے ہیں، چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔ کانٹوں کی باڑھ سے کچھ دور، گھٹنوں تک اونچے کھیت میں چھ چیتلیں کھڑی ہوئی اطمینان سے آدھے سوکھے گیہوں کے پتے ایک ایک کر کے بین رہی ہیں۔ کھیت کے کنارے پر ایک جگہ فٹ دو فٹ کا گیہوں کا ایک گچھا، جیسے کہ اکثر رہ جاتے ہیں، اب بھی سبز ہے۔ اس میں تین اور چیتلیں چمٹی ہوئی ہیں۔ ان کے برابر ہی، کھیت سے باہر، شان دار جھانک [۳] موٹی گردن اینٹھائے، پھیلے ہوے بارہ سینگ تاج کی طرح لگائے، خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا ہے۔ ہاتھ پیر، سر یا آنکھیں، کسی کو بھی جنبش نہیں ہے، صرف کان وقتاً فوقتاً اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھر جاتے ہیں۔ آنکھیں اس قدر تیز نہیں ہیں کہ برابر گھنے جنگل کی تاریکیوں میں پتا چلا سکیں۔ ہوا بھی مخالف ہے، کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے، اس لیے بو بھی نہیں لے سکتا ہے۔ کانوں ہی سے کام لے رہا ہے۔ دُور گھنے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکی کھس کھس ہوتی ہے۔ دائیں ہاتھ پر کسی جگہ سے بہت خفیف کھٹ کھٹانے کی آواز آ رہی ہے۔ ان دونوں آوازوں کی اسے مطلق پروا نہیں ہے۔ یہ صاف پہچان گیا ہے کہ یہ آواز نیولی کے بچوں کے کھیلنے کی ہے اور دوسری جنگل کی نیلی کُھٹ کُھٹ بڑھئی کے درخت کی چھال میں سے کیڑے چننے کی ہے۔ جھانک اس فکر میں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی سال کے درختوں میں وہ جو زمین سے ملی لمبی سی چیز کے ہلنے کا شبہ سا ہوا تھا، دراصل وہ شیر ہی تھا یا کچھ اور؟ صرف ایک خفیف سی سوکھے پتے کی پیر کے نیچے چرچرانے کی آواز اس کو سارا ماجرا بتا دینے کے لیے کافی ہے۔

لیکن کیا مجال کہ شیر یا شیرنی کا پیر بے جا پڑ جائے۔ حالانکہ سال بنی کی تمام زمین پت جھڑ کے سوکھے پتوں سے بچھی پڑی ہے لیکن یہ دونوں، بغیر ایک پتے کو بھی چرچرائے یا کھس کھسائے، یہاں آ کر دیمک کی بنائی ہوئی چھوٹی سی دیوار کی آڑ میں اسی گلّے کی واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے ہیں۔

---

[۳] مادین چیتلیں کہلاتی ہیں اور ان کا نر جھانک۔

چیتلوں اوران کے درمیان بھٹ ہ کے چوڑے پتوں اور مڑوڑپھلی ۵ کی لمبی شاخوں سے اس قدر آڑ ہوگئی کہ نظران دونوں کو بھی کچھ نہیں آ رہا ہے، پھر بھی دونوں اطمینان سے دب کے بیٹھے ہیں۔ تیز ہوا میں، جو کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے، چیتلوں کی بو اوران کے ہلنے جلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

دفعتاً شیرنی کو ہوا میں ایک نئی بو معلوم ہوتی ہے۔ گھبرا کر شیر کی طرف سر گھماتی ہے۔ شیر نے کوئی نئی بو محسوس نہیں کی، وہ اسی طرح بیٹھا رہتا ہے، کہ اتنے میں پھر تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ اب شیر کو بھی یہ نئی بو معلوم ہوتی ہے۔ شیر جھنجھلا کر دونوں کان آگے جھکاتا ہے، لیکن شیرنی پریشان ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا پھر آتا ہے۔ اب شبے کی گنجائش نہیں رہتی۔ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر آہستہ سے گھوم کر شمال سے مشرق کی طرف چل دیتے ہیں۔

باہر کھیت میں جھانک اب بھی اسی طرح کھڑا ہے۔ سبز گچھے پر اب بجائے تین کے پانچ چیتلیں پھدک رہی ہیں۔ باقی چاران ہی سوکھے گیہوؤں میں سے پتے کھا رہی ہیں۔ چرتے چرتے ان چاروں کو بھی بو معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے چاروں سر اونچا کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک جھانک کی طرف دیکھتی ہے۔ جھانک جنگل کی طرف کان لگائے اسی طرح بے خبر کھڑا تھا۔ ایک چیتل کو دُور سکھ داس پور کی سمت دُھندلی سی ہلتی ہوئی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ چیتل فوراً ''کو'' کی لمبی آواز لگاتی ہے۔ سنسان رات میں جنگل کے کنارے سے آواز گونجتی ہے۔ باقی تمام چیتلیں چونک کر، سر اونچے کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جھانک بھی گھوم پڑتا ہے۔ یہ تمام جانور پانچ منٹ تک پتھر کی مورتیوں کی طرح بے حس کھڑے رہتے ہیں۔ بو برابر آ رہی ہے لیکن دور ہلنے والی چیز رُک گئی ہے۔ پانچ منٹ کے بعد وہ چیز پھر ہلتی ہے۔ سب چیتل ایک ساتھ جنگل کی طرف جھپٹتے ہیں۔ کانٹوں کی باڑھ جا بجا ٹوٹی ہوئی ہے۔ چیتل ان ہی میں سے ایک راستے سے ایک کے بعد ایک قلانچیں بھرتے نکلتے ہیں۔ سب سے آخر میں جھانک بھی اس قطار میں شامل ہو جاتا ہے جو کہ چیتلوں نے بنالی

ہ جنگلی پودا، پتے بڑے ہوتے ہیں۔ پودا فٹ ڈیڑھ فٹ اونچا ہوتا ہے۔

۵ جنگلی سن۔ یہ جھڑوں کی طرح اُگا ہوتا ہے۔ چار سے پانچ فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔

ہے۔ جنگل میں گھستے گھستے وہی چیتل پھر دو دفعہ ''کوکو'' کی آواز لگاتی ہے اور سب چیتل جنگل میں غائب ہو جاتے ہیں۔ سامنے کچھ دور سوکھے گیہوؤں میں ایک پریشان انسان کھڑا ہے۔

پھانسی کے تختے پر بے کسی اور بے بسی کی موت سے بچنے کے واسطے بہاری گاؤں سے بچتا ہوا شاہ گڑھ اسٹیشن سے دیوانہ وار اس جنگل کی طرف آیا تھا۔

اس کے خیال میں گھنے سرسبز جنگل، پھولوں پھلوں سے لدے، چھوٹے چھوٹے چشموں سے آراستہ، دامن پھیلائے، اس کو اپنی گہرائیوں میں چھپانے کے واسطے تیار کھڑے تھے۔ لیکن جنگل کے کنارے آتے ہی اُس پر اس سمت سے بھی خوف طاری ہو گیا۔ اس کی پشت پر گاؤں کی اِکا دُکا ٹمٹماتی روشنیاں ملک الموت کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے وہ جنگل جس کو کہ یہ زندگی کا گہوارہ سمجھ کر جویا ہوا تھا، قبر کی طرح تاریک اور بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے اس نے کچھ نہ دیکھا، نہ ناک سے کوئی بو محسوس کی تھی۔ صرف چیتل کی کوکیں سنی تھیں اور ان ہی تین آوازوں نے اس کی خیالی جنت کو ہیبت ناک گھنا بن بنا دیا تھا۔ بہاری دیہات کا رہنے والا ضرور تھا، بھوت پریت سے ڈرنا جانتا ہی نہ تھا، لیکن جنگل سے ناواقف تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا، اس کو پھر آگے پیچھے چاروں طرف موت نظر آنے لگی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ سر پکڑ کر وہیں کھیت میں بیٹھ گیا۔ اپنی بے کسی پر اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے لگے۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک ایسا ہیجان تھا کہ وہ کسی ایک بات کو لگاتار سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ کبھی وہ اپنی بدقسمتی کا خیال کرتا تھا، کبھی بے کس بڈھے باپ اور ماں کی حالت سوچتا تھا، کبھی اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا تھا اور کبھی آئندہ زندگی بسر کرنے کا نقشہ کھینچنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر پھر کے ہر خیال میں کسی نہ کسی طرح ایک تصویر آ جاتی تھی۔ ''چاندنی رات میں ایک کھیت کی مینڈ ہے، اس پر ایک آدمی خون میں نہایا اوندھا پڑا ہے۔ اس کے پیروں کی طرف وہ خود گنڈاسا لیے کھڑا ہے۔'' اس تصویر سے بہاری لرز جاتا تھا، کانپ اٹھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نہ سوچے، مگر بار بار یہی خیال آ جاتا تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا، ''بلدیو سنگھ کا قاتل میں ہوں تو سہی لیکن ہے رام! یہ کیسے ہوا؟... کیسے ہوا؟... ہاں میں نے مارا... دو گنڈاسے سر پر ہلکے سے مارے تھے۔ اور تیسرا ہی زور

سے مارا جو پیٹھ میں گھس گیا... اس ہی سے تو گر پڑا۔ پیٹھ کا زخم؟... نہیں پیٹھ والے سے کیا ہوا... وہ تو پہلا ہی گنڈاسا سر میں گھس گیا۔... میں نے مارا؟... یہ کیا ہو گیا تھا؟... ہے رام! یہ کیا ہو گیا؟... ہے رام! یہ کیا ہو گیا؟... ہے بھگوان! اب وہ زندہ ہو سکتا ہے؟... ناہیں! ناہیں!... ہے بھگوان! معافی مل سکتی ہے؟... ناہیں! ناہیں!...''

اسی طرح سوچتے سوچتے ٹھنڈی ہوا نے تھکے ہوئے دماغ میں نیند کے ہلکے ہلکے پردوں میں ملا کر ایک عجیب تصور پیش کر دیا۔ کیا دیکھتا ہے، بلدیو سنگھ کا باپ اس کے سامنے لڑکے کو لیے کھڑا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے، ''کنور بھیا، یو ہے بہاری تمرے سامنے! اب ماپھ کر دیو۔ اچھے ہوئی جائی ہو۔'' بلدیو سنگھ کے منھ سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے سامنے کھڑا ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھ لیتا ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ باپ دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑے کھڑا ہے اور برابر کہہ رہا ہے، ''بس کنور، اب جان دیو، ماپھ کر دیو۔ اچھے ہوئی جاؤ۔'' پھر بڈھا اس کی طرف غصے سے دیکھ کر کہتا ہے:

''بہاری، تم بھی ماپھی مانگ لیؤ، بیٹھے کا دیکھ رہے ہو؟ مانگو ماپھی!'' بہاری ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہے۔ بلدیو سنگھ سر ہلا کر باپ سے کہتا ہے، ''معاف نہیں کروں گا۔'' اب بہاری اس کے پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اس پر وہ کہتا ہے، ''میں نا معاف کروں گا، بلاؤ سپاہیوں کو۔ پکڑو، پکڑو! دوڑو! اسے پکڑو!'' بہاری کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں آدمی دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ وہ چونک کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ صبح کی سہانی روشنی اسے بھیانک معلوم ہوئی۔ سنہرا زرد گیہوں کا کھیت موت کے ہاتھوں مٹایا ہوا نظارہ معلوم ہوا، کالے جنگل کا کنارہ ایک قلعہ معلوم ہوا جس میں اس کو موت سے پناہ مل سکتی تھی۔ یہ فوراً اس کی طرف لپکا۔ لیکن چار قدم چلنے کے بعد اُس نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ درختوں میں سے جھانکتے ہوئے سکھ داس پور کے مکانوں پر اس کی نگاہ پڑی۔ ہر مکان اس کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بہاری جنگل کی طرف بھاگا۔ کانٹوں دار باڑھ کو پھاندتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔

جس وقت دوبارہ مرغے نے اذان دی تو بہاری نے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کا ہلکا نور پھیل رہا تھا۔ قریب ہی کسی درخت پر کوئی مور رات بھر کے سمیٹے ہوے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے سر کی طرف اوپر کی کسی ڈالی پر ایک چھوٹی چڑیا ''چیں چوں، چیں چوں'' چہک رہی تھی۔ لحہ بہ لحہ روشنی کے ساتھ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں۔ بہاری نے دن بھر کے سکڑے ہوے ہاتھ پیروں کو جنبش دی اور محسوس کیا کہ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ وہ ''اے بھگوان! کرپا کر بھگوان!'' کہہ کر بیٹھ گیا، اور اطمینان سے وہ رسی کھولی جس سے کہ اس نے اپنا سینہ اور کمر برگد کے دوشاخے سے باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سوتے میں درخت سے نہ گر پڑے۔ بہاری کو آج جنگل میں آئے آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ یہیں اس نے مڑوڑپھلی کی چھال سے یہ رسی بٹ لی ہے۔ رات کو کھیت میں سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر، ہولوں کی طرح بھون کر کھالیتا ہے۔ اور پھر جنگل کے کنارے ہی کسی موٹے درخت پر چڑھ کر اس کی ڈالیوں میں اپنے کو باندھ کر سو رہتا ہے۔

دن نکلتے ہی پھر اندر گھنے میں گھس کر جنگل سے گھری ہوئی چاندر میں چھپ جاتا ہے۔ جنگل کا جو تصور اس نے باندھا تھا یہاں آ کر اس میں سے کچھ نہ پایا۔ سال کا جنگل دراصل ایک میدان کی طرح تھا، جس میں فٹ سوا فٹ اونچے بھٹار اور کریاری کے چھوٹے پودوں میں لاکھوں سال کے درختوں کے سیدھے اور ننگے، بلا شاخوں کے تنے کھڑے ہوے، پچاس ساٹھ فٹ کے اوپر چھتری نما چند ڈالیوں سے ایک چھت تھامے ہوے تھے۔ رات کو ان درختوں پر چڑھ رہنا اور دن میں ان کے نیچے زمین پر پھرنا ناممکن تھا۔ آٹھ نو بجتے ہی جنگل میں گائے اور بھینسوں کے گلّے اور چرواہے آ جاتے تھے۔ مزروعہ زمین کی طرف جنگل کے کنارے البتہ نیچے اور پھیلی ہوئی ڈالیوں کے درخت بھی تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے مجموعے سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی بھجیاں بھی تھوڑی دور پر تھیں لیکن دن میں ان میں چھپنا ناممکن اور کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ سال بنی شمال کی طرف میلوں اسی طرح چلی گئی تھی۔ اس کے مشرق میں سارداںہر کی شاخ ہردوئی برانچ بہہ رہی تھی اور مغرب کی طرف ناقابل گذر کھیر کے جنگل سے ملا ایک چاندر تھا۔ اسی چاندر کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تالاب یا گڈھا تھا جس کے کنارے دلدل یا کیچڑ میں بیٹھ کے اور کھڑے رہ کر بہاری دن گذارتا تھا۔ نیچے کیچڑ میں جونکیں ہاتھ پیر اور پیٹھ پر ڈانس اور آنکھ کے

آگے صدہا بھنگے اسے ستاتے تھے۔ جنگل کا چاندر صدہا جنگلی سینوں، پتاوروں اور گھانسوں کا ایک اُیسا اونچا اور گھنا ٹکڑا ہوتا ہے جس میں کہ انسان کو پورا پیر رکھنا محال ہوتا ہے۔ اونچائی میں ہاتھی مع ہودہ اس میں چھپ جاتے ہیں۔ چاندر میں کبھی کوئی ایسا قد آور درخت نہیں ہوتا جس پر کہ انسان چھ سات فٹ بھی اوپر چڑھ سکے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ چاندر کی ٹھیرے نما گھانسوں کو کچل کر دو فٹ جگہ بنا لے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ بغیر کسی مضبوط ہتھیار کے نہیں کٹ سکتیں۔ پھر اب موسم بھی اور ہے۔ ہولی جل چکی ہے۔ سبز لہلہاتے چاندر کو چار مہینے کی سخت سردی نے مار کر سکھا دیا ہے۔ یہاں نہ اب چڑیاں چہچہاتی ہیں نہ کالا تیتر بولتا ہے۔ کھڑکھڑاتا ہوا بھورا چاندر ایک چنگاری کا منتظر ہے، جو کسی نہ کسی طرح ہر چاندر میں پہنچ کر ان مردہ گھانسوں کو فنا کی آخری منزل میں پہنچا دیتی ہے۔ اور جب چاندر جل کر بھوری اور سیاہ راکھ سے ڈھکا ہوا نکل آتا ہے تو اس ارتھی کی خاک سے آنے والی نسل کے بے خبر نونہال پودے ہنستے ہوئے سر نکالتے ہیں۔ ظالم... ظالم... قدرت کے قوانین ظالم ہیں۔

چاندر اُگتا ہے۔ وہ ہستیاں جو کبھی حیات کی طالب نہیں ہوئی تھیں، حالتِ بے خبری میں وجود میں لا کر اس دنیا میں گرم و سرد جھونکے برداشت کرنے کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ عرصۂ حیات کم ہے، مصائبِ عالم بھی ہیں، موسم کی سختیاں بھی ہیں، وجود کی جدوجہد بھی جاری ہے، کہ بیڑا پار لگ جاتا ہے، اور پھر وہی ہوتا ہے... ظلم... ظلم... قدرت کے قوانین کیسے ظالم ہیں۔ قد آور درخت، چھوٹے پودے، لاکھوں قسم کی گھانسیں، بڑے بڑے جانور اور درندے، چوپائے اور پرندے، چھوٹے چھوٹے جانور، کروڑہا قسم کے کیڑے اور انسان، سب اسی قانون کے تابع پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چکی چل رہی ہے، دانے ڈالے جا رہے ہیں، آٹا نکل رہا ہے۔ شاید یہ عالمِ ہستی خود کسی گناہِ عظیم کا کفارہ ہے۔

بہاری بڑی دیر تک ہاتھ میں رسّی لیے، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے برگد کی چھال کو کریدتا ہوا، اسی ڈگالے پر بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ جنگل کی اس زندگی سے اتنا عاجز آ چکا تھا کہ اب اس بات پر بالکل آمادہ تھا کہ پاس کے کسی گاؤں میں جا کر فقیر یا سادھو کے بھیس میں قسمت آزمائے۔ اگر پکڑا بھی گیا اور پھانسی پر بھی لٹکنا پڑا تب بھی گوارا تھا، لیکن وہ تکلیفیں جو اَب وہ اٹھا رہا تھا ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس سوائے ماچس کے ایک بکس کے اور چند بے کار روپوں کے اور کوئی چیز نہ تھی۔

کاش کہ ایک چاقو ہی ہوتا۔ دیا سلائیاں بھی ختم ہونے کے قریب آ چکی تھیں۔ دیا سلائی کا خیال آتے ہی اس نے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب سے ماچس کا بکس نکال کر اس کی تیلیاں گننے کے بعد نہایت احتیاط سے پھر اس کو جیب میں رکھ کر ''بھگوان! دَیا کر بھگوان!'' کہتے ہوئے درخت سے نیچے اترنا شروع کیا۔ جب آخری ٹہنے پر آ گیا تو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس پر لٹک گیا۔ اس کے پیر اب بھی زمین سے چار فٹ اونچے ہوں گے کہ اس نے دونوں ہاتھ چھوڑ دیے اور دھم سے زمین پر آ رہا۔ سنبھل نہ سکا، ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اس کے دائیں ہاتھ کی طرف ساٹھ فٹ کے فاصلے پر ایک عورت کی ''ارے دیا!'' چلّانے کی آواز آئی۔ سر گھما کر دیکھا تو ایک عورت رفع حاجت کرتے سے لٹیا ؤ ٹیا چھوڑ کر بھاگی چلی جا رہی ہے۔ بہاری بھی گھبرا کر اٹھا جنگل کے اندر کی طرف بھاگنے، مگر فوراً ہی لٹیا کا خیال آیا۔ بھاگتا ہوا اس تک گیا۔ اسے اُٹھا رہا تھا کہ کپڑے کی بڑی سی ایک پوٹلی اور نظر آئی۔ اس نے اسے بھی اٹھا لیا اور لٹیا کا پانی گراتا ہوا عورت سے دوسری سمت کو بھاگا۔ فاقوں اور مصیبتوں سے جسم لاغر ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دور میں سانس پھول گیا۔ بھاگنا بند کر دیا۔ تیز قدم اٹھاتا اسی چاندر میں گھس گیا۔

چاندر میں پہنچ کر بہاری نے اس پوٹلی کو کھولا تو اس میں سے ایک کھرپی، ایک ہنسیا، چھٹانک بھر کے قریب تمباکو، چلم، ایک دیا سلائی کی ڈبیا اور کوئی سوا سیر آٹے کی روٹی اور بینگن کی بھاجی نکلی۔ بہاری نے فوراً کھرپی اور ہنسیا کی مدد سے چاندر میں ایک خشک جگہ تھوڑی سی زمین صاف کی۔ اس کے بعد لٹیا میں پانی بھر کر لایا۔ آٹھ دن ہو چکے تھے۔ سیر ہو کر روٹی کھائی۔ پھر آگ جلا کر چلم بھری اور اطمینان سے پیتا رہا۔ عرصے کے بعد یہ نعمتیں ملی تھیں۔ روٹی اور تمباکو دونوں کا نشہ چڑھا، وہیں پڑ کر سو گیا۔ دن کے دس بجے سویا، شام کے چار بجے اٹھا۔ درخت پر نیند کہاں بھرتی تھی۔ اب جو سو کر اٹھا تو خواہ مخواہ طبیعت پر ایک طرح کی بشاشی تھی۔ صبح کو ہراساں ہو کر وہ گاؤں میں جانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تھا، لیکن اب اس کے خیالات بدل گئے۔ زندگی کا چسکا پھر زندہ ہو گیا۔ ہنسیا کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ گیہوں کی کٹائی شروع ہو گئی ہے۔ اس وقت اسے یہ فکر تھی کہ جلد سے جلد جس قدر گیہوں

کھیتوں سے کاٹ سکتا ہو کاٹ کر جنگل میں کہیں چھپا دے، ورنہ جب گیہوں نہ رہیں گے تو کیا کھائے گا۔ آبادی میں واپس جانے کو اب اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ وہ انسانوں میں گیا نہیں کہ پکڑا گیا۔ اس نے تصفیہ کرلیا کہ جہاں تک ہوسکے فی الحال تو جنگل ہی میں چھپا رہے۔ دنوں کے بعد پیٹ بھر روٹی نے اس میں ایک نئی روح ڈال دی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ آئندہ کے منصوبے گانٹھتا ہوا چاندر سے نکل کر جنگل کی سوفٹی سڑک[1] کے کنارے آہستہ آہستہ آرہا تھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کی طرف سڑک کے دوسرے کنارے پر اس کی نگاہ پڑی۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سے شیر چلا آرہا ہے۔ سر سے پیر تک پسینہ آ گیا، بت بن کر جہاں کا تہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بہاری کو یقین سا ہو چکا تھا کہ اس جنگل میں شیر یا بھیڑیا کوئی نہیں ہے۔ آج اس نے پہلی دفعہ شیر کو دیکھا تھا، لیکن شیر اس کو دو دفعہ پہلے دیکھ چکا تھا، اور آج تیسری دفعہ آمنا سامنا ہی ہو گیا۔ شیر نے اس کو دیکھ کر اپنا بھاری شاہانہ چہرہ تمکنت سے پیچھے پھیر کر ایک لمحے کے واسطے کچھ دیکھا، اور پھر نہایت شان اور اطمینان کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوا، بالکل آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ بہاری سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا کہ شیر کے پیچھے ایک اور شیر تیز قدم آرہا ہے۔ یہ شیرنی تھی۔ پورے دن پیٹ سے ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ جوں ہی شیر کے قریب آئی، اس کی بھی نگاہ بہاری پر پڑی۔ ہلکی سی غراہٹ اس کے منہ سے نکلی۔ شیر اور آہستہ ہو گیا۔ جوں ہی شیرنی اس کے بائیں ہاتھ کی طرف برابر میں آئی شیر پاس کے جنگل کی طرف گھوم پڑا، اور اس طرح ناراض شیرنی کو اپنے پہلو سے دھکیلتا ہوا ہٹا لے گیا۔ بہاری کے اس قدر اوسان خطا ہو گئے تھے کہ شیر اور شیرنی کے جنگل میں غائب ہو جانے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا تھا۔ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کدھر جائے، کیا کرے۔ آخر پھر روانہ ہوا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اس کی پشت پر مور چلّایا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں شیر اس سے کترا کر کچھ دور جنگل کے اندر اندر چل کر پھر سڑک پر نکل آئے تھے، اور اس طرح اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ بہاری کی متواتر جنگل میں موجودگی سے غصہ دونوں ہی کو آرہا تھا مگر شیر سمجھ دار، مطمئن طبیعت کا تھا۔ اس نے دیکھا کہ

---

[1] اودھ کے تمام جنگلوں میں محکمہ جنگلات کے انتظام سے سڑکیں کٹی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض ایسی ہیں جن پر موٹر چل سکتی ہے ورنہ زیادہ تر جھاڑیاں اگی ہوتی ہیں۔ ان سڑکوں سے آگ کا بچاؤ اور جنگل کے ٹکڑوں کی تقسیم وغیرہ کا فائدہ ہے۔

معاملات نازک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی ملکہ پیٹ سے ہے، تنہائی کی سخت ضرورت ہے۔ یہاں یہ انسان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ دوسرے اس کی موجودگی سے دس بیس کا نکر اور پاڑے، جو اس ٹکڑے میں مستقل طریقے سے رہتے تھے، کوچ کر گئے ہیں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ چیتل اور سانبھروں کی ٹولیوں نے بھی ادھر کا آنا بند کر دیا ہے۔ غذا کی کمی ہوتی جاتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس ٹکڑے کو چھوڑ کر چوکا ڈھایا کے نرکلوں میں رہا جائے۔ چناں چہ وہ شیرنی کو لیے نکلا چلا گیا۔ چار میل کی معمولی چہل قدمی کے بعد دونوں ساردا کی (اصلی نہر) کینال پر پہنچ گئے۔ سامنے چوکا ڈھایا کا پل تھا، مگر ان کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے دو سو قدم اِدھر ہی نہر میں انھوں نے پانی پیا اور پھر تیرتے ہوئے پار نکل گئے۔

رات گئے تک بہاری گیہوؤں میں لگا رہا تھا۔ صبح دھوپ نکل آئی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ دور کھیت میں تین چار لال صافے دیکھ کر اس کی روح خشک ہوگئی۔ جلدی سے رسی کھول کر درخت سے نیچے اترا۔ درخت کی جڑ میں چاروں طرف بن کروندوں کی گھنی جھاڑیوں نے اور اس پر پھیلی ہوئی بیلوں نے پوری آڑ کر رکھی تھی۔ یہ وہیں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ مارے ڈر کے سانس بھی پوری نہ لیتا تھا۔ دل کی دھڑکن سے مجبور تھا جس کی آواز اس کو نقارے کی چوٹوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ اور جب سپاہیوں اور آدمیوں کے پیروں کی آہٹ اسی کی طرف بڑھتی سنائی دینے لگی تو اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اس نے کہا، ''ہے رام! ایک میں اور سارا جگ میرا دشمن۔ میری کیا دُردَشا ہوگئی ہے۔ میں نے کس جنم میں کونوں پاپ کیے تھے؟'' اس کے تصور نے چاندنی رات کا وہ نقشہ پھر اس کے سامنے کر دیا جبکہ اس کا گنڈاسا پہلی دفعہ بلدیو سنگھ کے سر میں کھسکھساتا ہوا گھستا چلا گیا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کو تیز دھار کے زندہ ہڈی میں گھسنے کا احساس ہونے لگا۔ بہاری نے پھریری لے کر اس خیال کو مٹا دیا، اور نہ معلوم کیوں اور کس لیے وہ اپنے آپ سے یہی بحث کرنے لگا:

''میں مجرم ضرور ہوں لیکن سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ میں ہرگز ایسا نہ کرتا اگر میرے دوستوں نے مجھے شراب نہ پلا دی ہوتی، اور اگر بلدیو سنگھ کے باپ نے میرے اوپر اس قدر ظلم نہ کیے ہوتے۔

بے دخل کیا، زمین چھینی، باغ چھینا...لیکن اس کا بدلہ...لڑکے کو مار ڈالنا...قتل!قتل؟...قتل؟ ہاں قتل!...
میں نشے میں تھا۔ پھر اسی حالت میں رمضانی نے آ کر جوش دلایا...جمنا میری منگیتر ہے...میری منگیتر
ہے...اس کے گھر میں بھی تو بلدیو تھا...جمنا!...جمنا؟...اب کس کی ہے؟...ہے رام، کرپا کر..."

بالکل قریب آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ اسی طرف آ رہے تھے۔
بڑے داروغہ...خاں کی آواز آئی۔ "پاگل ہوئے ہو۔ کہیں ڈاکو کھیت کاٹتے ہیں؟ گیہوں چراتے
ہیں؟ ڈاکو ہوتا تو کہیں نہ کہیں واردات ضرور کرتا۔"

ایک آواز: سرکار اِکل لا ہے۔ ساتھ ماں کوؤنا ہے۔

بڑے داروغہ: ہاں بے ہاں، اِکلے ہی واردات بھی کیا کرتے ہیں۔ اِکا دُکا راہ گیروں
کو لوٹتے ہیں۔ سوتوں کے گھروں میں گھستے ہیں۔ کہیں گیہوں چراتے ہیں؟ اور ایسا ڈاکو کہ سالے کے
پاس چاقو تک نہیں۔ کیوں جی، پہلے تو ہاتھ ہی کی توڑی بالیاں تھیں نا؟ ٹھیک سے دیکھا تھا؟ پہچان
لیتے ہو ہاتھ کی ٹوٹی؟

ایک آواز: ارے حجور، ہم دیکھ کر بتائی دیں، کوؤ جناور نے کھائی، کوؤن ہنسیا کاٹی۔ مل سرکار
یہ ہئی کوؤن بڑا۔

بڑے داروغہ: کوئی بالکل نیا مجرم ہے۔ ضرور خون کر کے بھاگا ہے۔ ہو نہ ہو وہی مفرور
قاتل ہے۔ کیا نام تھا جی؟ گشتی چھٹی پڑھی تھی۔ یاد ہے؟

ایک کانسٹیبل کی بھاری آواز: بھاری ولد مہابیر ساکن مکروان۔ مقتول بلدیو سنگھ۔

ایک آواز: داروغہ جی، اتے نا ملے ہئے چاندر ماں۔ نہیں تو کھیرے ماں ہوئی ہے، اتے چلو۔

بڑے داروغہ: ابے اُلو کی دُم، یہ ہم بھی جانتے ہیں۔ یہاں تو پیروں کے نشان دیکھنا چاہتے
ہیں۔ اور چاندر میں جا کر کیا چھ آدمی ڈھونڈ لیں گے؟ پانچ سو آدمی بھی ہوں تو نہیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہ
تو گاؤں میں ہی پکڑا جائے گا۔ تھوڑے دن میں گھبرا کر ضرور کسی نہ کسی گاؤں میں جائے گا۔ تم لوگ
خیال رکھنا۔ جو پکڑ لائے گا یا اطلاع دے گا اسے بہت انعام ملے گا۔

جان، جان، دُنیا بھر سے زیادہ پیاری جان، تیری حفاظت ہر طرح کی جاتی ہے۔ سڑک کے

کنارے اندھی لنگڑی بڑھیا سسک سسک کر بھیک مانگتی ہے۔ جوانی کے وہ دن، عشاق کے ہجوم، عیش وعشرت، روپیہ پیسہ، بال بچے، گھربار، سب رخصت ہو گئے۔ کچھ نہ رہا۔ اب کیوں جی رہی ہے؟ کس کا انتظار ہے؟ گئے دن واپس آنے کی امید ہی نہیں۔ پھر کیوں جی رہی ہے؟ جان! سب سے پیاری جان باقی ہے۔ اس ہی کو گھرے داموں پالتی ہے۔

الوداع! اے انسانوں کی بستیو، الوداع! بہاری اب کبھی تمھاری طرف رخ نہ کرے گا!

انسانی رہ گذر سے کوسوں دور، گھنی سبز اور شاداب جھاڑیوں اور طرح طرح کے فرنوں سے ڈھکا چوکا ڈھایا ڈھلواں اُترتا ہوا اپنے میں ٹھنڈی سبز بیت کی جھاڑیاں شامل کر لیتا ہے تو پھر وہاں انتہائی گھنا پندرہ فٹ اونچا نرکل کا تختہ اس سے آملتا ہے۔ جب تمام جنگل سوکھ جاتا ہے اور ہر طرف آگیں لگی ہوتی ہیں تو یہاں مہکتے ہوئے پھولوں میں صدہا چڑیاں جھولا جھولتی ہیں اور قدرت کے راگ گاتی ہیں۔ اسی نرکل میں ایک جگہ سے چھچھاندی بو آتی ہے۔ تر زمین پر نازک نرکل بچھا کر شیر اور شیرنی نے تھوڑی سی جگہ بنالی ہے، اور اس ٹھنڈے اور روشنی سے محفوظ گھر میں شیرنی نے بچے دیے ہیں جن کو وہ لیٹی ہوئی بڑے غرور سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی پشت پر شیر غافل پڑا سو رہا ہے۔ بچوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ وہ آپس میں کھیل رہے ہیں۔ سنہرے بدن پر ہلکی دھاریاں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ شام ہوگئی ہے۔ شیرنی کو انتظار ہے کہ کب اس کا سرتاج شیر اٹھے اور کب وہ ڈھائے سے اوپر سانپ لائن [ے] سے کچھ دور رونی [۸] کی جھاڑیوں میں جائے جہاں کل کا بچا ہوا آدھا سانبھر اب بھی پڑا ہے۔ شیر انگڑائی لے کر، لیٹے سے سر اٹھا کر، اس کو اور بچوں کو دیکھتا ہے۔ شیرنی فوراً بدن کو جھکولا دے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ گول مٹول بھورے بھورے دونوں بچے، جو اس کے اوپر سوار ایک دوسرے پر داؤں لگا رہے

ے سانپ لائن وہ سڑک ہے جو ڈھائے کی آدھی اونچائی پر کاٹی گئی ہے۔ چوں کہ ڈھایا ٹیڑھا میڑھا ہے اس لیے یہ سڑک بھی سانپ کی طرح لہرائی ہوئی ہے۔ سڑک سے کہیں بھی اصلی سڑک کی مراد نہیں ہے بلکہ صرف ایک راستہ ہے جس پر سے درخت کاٹ دیے گئے ہیں۔

۸ ایک جھاڑی جس کے پھولوں میں سے سرخ رنگ کی ایک دوا نکلتی ہے۔ نہ معلوم یہ دوا کس کام آتی ہے۔ پہاڑی اسے جمع کرتے ہیں۔

ہیں، لدلدزمین پر گر کر لڑھک جاتے ہیں۔ جیسے ہی شیر اٹھ کر بیٹھتا ہے شیرنی نرکلوں میں آمدورفت سے بنی ہوئی گلی کا رخ کرتی ہے۔ شیرنی چوں کہ دودھ پلا رہی ہے، اس کی اشتہا بڑھی ہوئی ہے۔ وہ بھوکی ہو رہی ہے۔ آخر شیر بھی روانہ ہوگیا۔ جب نرکلوں سے باہر آ گیا تو اس نے ایک لمبی چوڑی انگڑائی پھر لی اور شیرنی کے پیچھے پیچھے اطمینان سے چل دیا۔ بید کی جھاڑیوں سے نکل کر جوں ہی یہ دونوں سانپ لائن پر آئے، ایک ساکھو کی ساٹھ فٹ کی بلندی سے مور نے ''می اوں، می اوں'' کے نعرے لگائے۔ ہلدو کے درخت پر بیسیوں بندروں کی ٹکٹکی بندھ گئی۔ ان دونوں کو آج شکار تو مارنا نہ تھا، چھپ کر پھرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے نکلنے کی اگر جنگل کو اطلاع ہوگئی تو ہو جائے، اطمینان سے کھلم کھلا سانپ لائن پر چلتے رہے۔ اور جب روہنی کے جنگل کے نیچے پہنچ گئے تو باری باری ایک ایک جست لگا کر ڈھائے پر چڑھ گئے، اور روہنی میں تھوڑی دور چل کر سانبھر کی بچی کھچی ٹھٹھری پر پہنچے۔ لیکن یہاں آتے ہی دونوں کے شاہانہ سکوت اور اطمینان میں قہر اور غصے کا تغیر پیدا ہوگیا۔ شیر غضب ناک ہونے لگا۔ اس کی نرم و نازک لچکتی ہوئی ملکہ خوں خوار جھنجھلائی ہوئی شیرنی ہوگئی۔ گوشت چرایا گیا ہے... انسان کی بو آرہی ہے... شیر کی سیدھی دُم کی نوک دائیں اور بائیں لہرا لہرا کر طبیعت کے انتشار کو ظاہر کرنے لگی۔ شیرنی کو غصہ زیادہ تھا۔ ناگن کی سی دو پھنکاریوں کی سی آوازیں اس کے منھ سے نکلیں۔ وہ سانبھر کی بچی ہوئی کھال اور ہڈیوں کو سونگھتی ہوئی اس کے چاروں طرف گھومی، پھر ایک طرف روانہ ہوگئی۔ آج وہ ضرور اس موذی چور سے بدلہ لے گی۔ یہ تیسری بار ہے کہ اس کا شکار چوری ہوا ہے۔ شیر بھی اس کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا لیکن اب اس پر پھر وہی فطرتی متانت آ گئی تھی۔ وہ بڑھ کر شیرنی کے آگے ہولیا۔ جاتے جاتے تین فرلانگ کے بعد جیسے ہی کنارے کی گھنی پتاور سے کھلی ہوئی فائر لائن پر شیر نے باہر سر نکالا، دو سو قدم پر سامنے بھاگتا ہوا انسان نظر آیا۔ شیر آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف گھوم پڑا اور اسی طرف کتراتا ہوا شیرنی کو نہر کی پٹڑی پر نکال لے گیا۔[9]

---

9 جنگل کے تمام جانور انسان سے اس قدر ڈرتے ہیں گویا انسان کا مارنا ان کو حرام ہے۔

اگر کوئی چیز انسانی دماغ پر ایک ہی وقت میں دو متضاد اثرات پیدا کر سکتی ہے تو ترائی کے جنگلوں ہی میں۔ جنھوں نے خود ان جنگلوں کی سیر نہیں کی ہے وہ مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ شام کے وقت چوکا ندی کے ڈھائے کے کنارے کسی فائر لائن پر کھڑے ہوں تو دونوں طرف کے اونچے سال کے جنگلوں میں لاکھوں قد آور درختوں کے تنے ہی تنے اوپر کے سبز پتوں سے بنی ہوئی چھت کے اندھیرے میں نگاہ سے اوجھل پڑتے پڑتے غائب ہو جاتے ہیں۔ ڈھائے کی طرف صدہا جھاڑیاں، ان پر بیلیں، اور دھانی رنگ کے نازک پودوں کے بعد ہری کچی بید کی بیلوں سے بنی ہوئی جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی نگاہ نرکل کے لہلہاتے تختے پر میلوں جا کر دھندلی پڑتے پڑتے کسی دور دراز جنگل میں مل جاتی ہے، جو کہ فاصلے کی وجہ سے دھندلے غبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جنگل میں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہوتی ہے۔ دفعتاً ایک مرغی کڑکڑاتی ہے اور اس کے بعد ہی مور چلاتا ہے، ''می اوں، می اوں،'' اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ سین ایک ہی وقت میں انتہائی دل فریب بھی معلوم ہوتا ہے اور انتہائی بھیانک بھی۔ انسان خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگنا بھی چاہتا ہے اور ہٹنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک ہے جب تک دن کی روشنی پوری طرح موجود ہے۔ جوں جوں اندھیرا بڑھتا ہے اس کی دل فریبی بھیانک پن میں بدلتی جاتی ہے۔ جوں جوں شام ہوتی ہے، دل کی حرکت تیز ہوتی ہے اور جھٹ پٹے کے وقت دیکھنے والے کو یہ جنگل موت کا بھیانک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ درخت اور جھاڑیاں سیاہ کمل اوڑھ کر منحوس شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اس وقت سیر کرنے والے کا دل روشنی اور انسانی صحبت کے واسطے تڑپتا ہے۔ وہ جلد جنگل سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ اور جب ایک دفعہ پھر وہ لیمپ کی روشنی میں اپنے ہم جنسوں میں جا بیٹھتا ہے تو اس کا دل خود بہ خود خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

لیکن صرف چار مہینے کے قلیل عرصے میں پیاری جان کی حفاظت کا جذبہ بہاری کے دماغ کو ان احساسات سے معطل کر چکا ہے۔ انسانی خیالات اور محسوسات ساکت ہو چلے ہیں۔ ان کے بجائے خالص حیوانیت ترقی کر رہی ہے۔ سر اور داڑھی کے خودرو پریشان بالوں سے گھرا ہوا چہرہ انسان کے چہرے سے بہت کچھ جدا معلوم ہوتا ہے۔ کمر سے گھٹنوں تک اب بھی کپڑے کی چند لبیریں لٹکی ہوئی

ہیں۔ حرکات میں وحشت، چال میں چیتے کی سی جھپک، اور آنکھوں میں ہرن کا سا چوکنا پن ہے۔ اب وہ بیٹھ کر، بجائے اپنی بدقسمتی کے واقعات سوچنے کے، جنگل کی آوازوں پر کان لگا کر ان کے مطلب اخذ کرتا ہے۔ جنگل کی جڑوں اور پتوں سے بڑھ کر پرندوں کے انڈے، بسیرا لیتے پرندے، مرے گرے جانور، اور دوسروں کا مارا شکار کھاتا ہے۔

ایک دن حسبِ دستور جب مور نے کوک کر، میناؤں نے شور مچا کر اور بید کی رہنے والی مرغیوں نے کڑکڑا کر اطلاع کر دی تھی کہ جنگل کا بادشاہ اور اس کی ملکہ رات کے کاروبار سے فراغت کر کے دن بھر سونے کے واسطے نرکلوں میں گھس گئے ہیں، اور جب بندروں نے بھی درختوں سے اترنا شروع کیا تو بہاری بھی درخت سے اترا۔ رات کو سانبھروں کے بے تحاشا بھاگنے، چیتلوں کے "پوق پوق" چلانے کے بعد چوکا کی طرف شیر کے فتح مندانہ گرجنے کی آوازیں سن چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج پھر تازہ شکار مارا گیا ہے۔

اب اس کے واسطے یہی تھا کہ شام ہونے سے پہلے اس شکار کو ڈھونڈ لے جس کو کہ شیر اور شیرنی نے انتہائی کمال سے کہیں چھپا دیا ہوگا۔ بہاری اس کی تلاش میں روانہ ہوا لیکن ڈھونڈتے ڈھونڈتے دن ڈھل گیا۔ یہ ناامید ہو کر اس جستجو کو دوسرے دن کے واسطے ملتوی کرنے ہی کو تھا کہ شکار کی گھسیٹن پر اس کی نگاہ پڑ گئی۔ فوراً بہاری نشان پر روانہ ہوا۔ نرکلوں سے آدھ میل جنوب کی طرف سانپ لائن پر سے ہو کر، جہاں نرکل ختم ہو کر پانی اور کیچڑ میں گھنا پیڑ اکھڑا تھا یہ جا پہنچا۔ اب گوشت کچھ دور نہ تھا۔ ضرور اسی پٹیرے میں ہوگا۔ ایک کوا ابھی وہاں بیٹھا تھا۔ لیکن شام ہو چلی تھی، وہاں جانا مخدوش تھا۔ شیر کے نکلنے کا وقت آ گیا تھا۔ مگر بہاری کو تین دن کا فاقہ ہو چکا تھا۔ اس نے ہمت کی کہ جلدی سے تھوڑا گوشت کاٹ لائے۔ پانی میں چھپ چھپاتا، پٹیرے کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا تیزی سے بڑھا۔ پتوں سے ڈھکے سانبھر تک پہنچا تھا کہ دور مور چلایا۔ مرغیاں کڑکڑائیں۔ بہاری سانبھر پر جھکا ہوا تھا، تین سکنڈ کے واسطے ٹھٹک گیا۔ لیکن فوراً ہی اس نے ارادہ کیا کہ ایک ہی ٹکڑا کاٹ لے۔ کھائی اور چری ہوئی سانبھر کی لاش پر ایک ہی وقت میں ایک جگہ دونوں ہاتھ ہنسیا سے گوشت کاٹنے میں لگ

گئے، اور دوسری جگہ اس کے دانت کچے گوشت میں مصروف ہو گئے۔ دو لقمے پیٹ میں اور سیر بھر کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر بہاری بھاگا۔ پٹیرے سے نکل، جھاڑیوں میں سے ہو کر جس وقت وہ سانپ لائن پر آیا تو وہیں شیرنی کھڑی تھی۔ خاموش بجلی سی کوندی۔ چار من کا شیرنی کا جسم ایک ہی چھلانگ میں بھاگتے ہوئے بہاری پر گرا۔ کمر اور پسلیاں سینٹوں کی طرح چر چراتی چلی گئیں۔ بہاری شیرنی کے اگلے پیروں کے نیچے ایسا پڑا تھا جیسے کھونٹی سے گری ہوئی اچکن پڑی ہو۔

شیر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ان واقعات سے بے خبر، ٹہلتا ہوا جیسے ہی قریب آیا، ٹھٹک کر رک گیا۔ شیرنی نے لاش کو اس طرح منھ میں اٹھا لیا جیسے بلی نیم مردہ چوہے کو، اور جھٹکے دینے لگی۔ شیر کے منھ سے گھٹی ہوئی غراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ بہاری کے زمین پر گھسٹتے ہوئے پیر اور لٹکتے ہوئے ہاتھ ہلتے دیکھ کر خوف سے شیر کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ شیر انسان سے نہ ڈرتا تھا لیکن جنگل کے قوانین(۱۰) اس طرح شکن ہوتے دیکھ کر تھرا گیا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور ''خوں خوں، خوں خوں'' غراتا ہوا شیرنی کو ہمیشہ کے واسطے چھوڑ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ڈھائے سے اتر کر پٹیرے اور اس کے بعد کلک کے جنگل میں سے نکلتا ہوا چوکا کو تیر کر نیپال کی طرف نکل گیا۔

انسان کے گوشت اور خون میں ایک عجیب صفت ہوتی ہے۔ جس طرح کتے کے کاٹے سے انسان بورایا ہو جاتا ہے، اسی طرح درندے انسان کے گوشت سے بورا جاتے ہیں۔ پھر ان کو ہر وقت انسان ہی کی جستجو رہتی ہے۔ شیرنی کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک بن رکھے اور دو گاڑی والوں کو مارنے کے بعد جب اس کو اور آدمی چوکا ڈھایا کی طرف نہ ملے تو اپنے بچوں سمیت وہ شہر پار کر کے گھومتی گھومتی مزروعہ زمین اور گاؤں سے ملے مینا کوٹ کی زمینداری جنگل میں آ گئی۔ یہاں آ کر اس نے متواتر کئی خون کیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن دوپہر کے وقت ہاکا کر کے، طرح طرح کی آوازوں

---

(۱۰) جو لوگ جنگل سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس کس طرح شیر اور ہاتھی تک انسان کو چھوڑ چھوڑ کر کتراجاتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے ایک چاندر میں تازہ مرا ہوا سانبھر ملا۔ سینگ بہت اچھے تھے۔ میں اور میرا ملازم سر کاٹنے کے واسطے اس پر جھکے۔ آٹھ نو فٹ کے فاصلے سے شیر نے غرا کر ڈانٹا اور حملہ تب بھی نہ کیا۔ اصلیت یہ ہے کہ دہلی اور بمبئی کی سڑکوں سے کہیں زیادہ محفوظ جنگل میں پھرنا ہوتا ہے۔

ڈرا کر، اسے ننے اُگے چاندر سے نکالا۔ دونوں چھوٹے بچے ساتھ تھے جن کی وجہ سے یہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ جوں ہی یہ بچوں کو لیے چاندر سے نکلی سامنے درختوں پر بندھے ہوئے مچانوں سے تڑاتڑ بندوقوں کے فائر ہوئے۔ دو گولیاں اس کے لگیں اور ایک اس کے بچے کے۔ دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ محمود کی گولی گردن پر اور احمد میاں کی پاکھے پر کبھی خطا ہی نہیں ہوئی۔ دوسرا بچہ پھر چاندر میں گھس گیا جو کہ کمبل اور کپڑے ڈال کر زندہ ہی پکڑ لیا گیا۔

آج اس واقعے کو برسوں گذر گئے ہیں۔ اب بھی کہیں ایک سفید بڈھا لکڑی ٹیکے ٹیکے پھر کر زندگی کے کاروبار بھی کرتا ہے اور دن میں کئی دفعہ لکڑی کے سہارے بیٹھ کر اپنے اکلوتے بیٹے بلدیو سنگھ کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے اور کہتا ہے، ”اے بھگوان، میں نے کونوں پاپ کیے تھے جو مجھے یہ سزا ملی؟“ اور اب بھی کہیں ایک گیارہ فٹ لمبا شاندار شیر اپنے لاغر جسم کو لچکاتا ہوا گھنٹوں کٹہرے کی سلاخوں کے آگے گھومتا ہے، اور جب سلاخوں میں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو بیٹھ کر کسی دور دراز خیال میں غرق ہو جاتا ہے۔ تماشائی تالیاں بھی بجاتے ہیں، کنکریاں بھی پھینکتے ہیں مگر اس کو خبر نہیں ہوتی۔ وہ کسی گہرے خیال میں ہوتا ہے۔

شیر کیا سوچتا ہوگا؟

یارب! یہ دنیا کن گناہوں کا کفارہ ہے؟

کلوا

منھ پر پسینہ، گالوں پر سرخی، کوٹ کے بٹن کھلے ہوے، قمیص کے دامن اور ہاتھ پر روشنائی کے دھبے، ازار بند پیروں تک لٹکا ہوا، ایک بغل میں کالا بستہ اور دوسری بغل میں کالا کتے کا پلا، منن گھر میں داخل ہوا۔ اماں نے چیخ ماری، ''اے ہے میں مرگئی۔'' سنگر مشین نے گنگنانا بند کر دیا۔ ماں کا ایک ہاتھ مشین کے ہینڈل پر تھا، دوسرا ماتھے پر۔ وہ ساکت بچے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ اور گہری محبت نمایاں تھی۔ لڑکے نے چھوٹے سے گھر میں ایک طرف سے دوسری طرف گردن گھما کر دیکھا، اور بھاری آواز بنا کر بولا، ''اماں، ہم اسے پالیں گے۔''

ماں نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر پلے کی طرف اشارہ کرتے ہوے کہا، ''اسے خدا کے لیے گود سے تو پھینکو۔'' کچھ خفگی کی آواز میں، ''سارے کپڑے نجس کر لیے! پھینکو اسے، تمھارے ابا آتے ہوں گے۔''

لڑکے نے جلدی سے پلے کو زمین پر رکھ دیا۔ پلا تین انچ کی دم ہلا ہلا کر منن کے جوتوں پر لوٹنے لگا۔ ماما نے باورچی خانے سے گردن باہر نکال کر ناک پر انگلی رکھ کر ہنستے ہوے کہا، ''بیوی دیکھیے تو، موا کیسا پیروں میں لوٹ رہا ہے۔'' دو برس کی لڑکی تخت کے پاس سے صحن کی طرف بڑھی۔ ماں چلائی، ''لو یہ بھی چلیں، اب گھر بھر گندا ہوگا۔ منن، تم یہ کیا مصیبت لے آئے!''

منن نے کہا، ''بجو، کاٹ کھائے گا، ادھر نہ آنا۔''

ڈیڑھ گھنٹے بعد منن منھ دھوئے، صاف کپڑے پہنے، اجلے بنے، چارپائی پر بیٹھے تھے۔ صرف

سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر ہلکے نیلی روشنائی کے نشان ابھی تھے۔ سامنے مرادآبادی تھالی میں دو بسکٹ، تین جلیبیاں اور ایک پیالی دودھ تھا، جس پر تین مکھیاں مشغول تھیں۔ خود کتے کی طرف مشغول تھے۔ کتے کا پلا صحن کے دروازے کے سامنے کھٹولے کے پائے میں دھجی سے بندھا ہوا، ایک ہڈی میں پوری طرح مشغول تھا۔ ماں نے توریاں چھیلتے ہوئے کہا، ''اب ناشتہ کرلو۔ یہی تو بات بُری ہے۔ مکھیاں بھنکا رہے ہو۔ دیکھو دودھ میں مکھی گر جائے گی۔''

''اماں اس سے ہڈی چبتی تو ہے نہیں، بسکٹ دے دوں،'' یہ کہا اور لڑکا بسکٹ لے کر اٹھنے لگا۔

ماں نے کہا، ''چلے پھر چھونے کو! ارے تم کھا تو لو، میں اور......''

گھر میں آہستہ سے مالکِ خانہ داخل ہوئے۔ سیاہ ٹوپی، سیاہ فریم کی عینک، سیاہ تکونی داڑھی، سیاہ شیروانی، سیاہ چھڑی ہاتھ میں اور سیاہ جوتا پیر میں۔ کھٹولے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ بیوی بجی ہوئی چائے کی ٹرے میں سے چائے دان لے کر باورچی خانے کی طرف چلیں۔ لڑکا وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر دودھ میں بسکٹ توڑ توڑ کر ڈالنے لگا۔ میاں نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا، ''یہ کیا ہے جی؟ کون لایا اسے؟''

بیوی چائے دان ہاتھ میں لیے باورچی خانے کے سامنے رک گئیں۔ مسکرا کر بولیں، ''اے موا ڈیوڑھی میں آ گیا تھا، کوں کوں کر رہا تھا۔ دیکھ کر ترس آ گیا۔ کیسا پیارا ہے۔ میں نے باندھ لیا۔''

میاں نے لاحول کو قرأت سے ادا کر کے کہا، ''ہگے گا تو؟''

''بھنگن اٹھائے گی۔''

''موتے گا جو؟''

''تو لوٹے سے دھویا جائے گا۔ آؤ، چائے پی لو۔''

''بچے جو چھوئیں گے؟''

بیوی اب باورچی خانے میں تھیں اس لیے کوئی جواب نہ ملا۔ منّن کا سر البتہ پیالے کی طرف اور جھک گیا۔ میاں نے کمرے میں جا کر اپنے سوا باقی تمام چیزیں ایک ہی کھونٹی پر لٹکا دیں۔ دوسرا قمیص اور پاجامہ پہن کر منھ دھویا، تولیے سے رگڑ رگڑ کر داڑھی کو پونچھا، اور چائے پینے کو بیٹھ گئے۔

بیوی پاس بیٹھ کر مکھیاں جھلنے لگیں۔ اب پھر میاں بولے، ''کیا نجاست پھیلائی ہے، پھکوا دو باہر!''

بیوی نے بگڑ کر کہا، ''بس تم کو تو ایک بات کی دُھن ہو جاتی ہے۔ ہمارا کیا لیتا ہے؟ پڑا ہے، بچے کھیلیں گے!''

''ہاں یہ انھیں حضرت کا شوق ہوگا؟''

حضرت تینوں جلیبیاں، آدھا بسکٹ اور تھوڑا سا دودھ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے زینے میں گھس، چھت پر پہنچ گئے۔

کالا پلا آٹھ دن اس گھر میں مہمان رہا۔ دو دن صحن میں، جہاں دو دفعہ میاں نے گود والی لڑکی کو اسے چھوتے دیکھا۔ پھر پانچ دن ڈیوڑھی میں، جہاں ایک دفعہ اس کی رسی پیروں میں پھنسی اور دوسری دفعہ یہ خود ان کے پیروں میں آ گیا۔ آخری یعنی آٹھویں رات اس کو کوٹھے پر بسر کرنی پڑی۔ یہاں اس کو ماں کی یاد نے ستایا۔ یہ یادِ ماضی پر چیخیں مارتا رہا اور میاں بیوی کو جھنجھوڑتے رہے۔ اوپر اور نیچے دونوں جگہ رت جگا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے کالا پلا صدائے احتجاج بلند کرتا رحیمن بوا (ماما) کے پیچھے گھسٹتا ہوا نخاس کی چوڑی سڑک پر پہنچ گیا، اور سڑک کے سپرد کر دیا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک موٹر نے غیں غیں کرنا شروع کی۔ ایک بڑے لڑکے نے ہنستے ہوئے لپک کر اسے ایسی ٹھوکر ماری کہ یہ گیند کی طرح لڑھکتا ہوا پکی نالی میں جا گرا۔ موٹر ایک دفعہ اور غیں کر کے چل دیا، لیکن کالا پلا عرصے تک ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا رہا۔

نالی میں کیچڑ اور پانی صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے پنجے ڈوبے ہوئے تھے، لیکن نالی اس کے واسطے کافی گہری تھی جس میں سے وہ نکل نہ سکتا تھا۔ اس نے چار چھ زبان کے سڑاپوں سے کچھ پانی پیا، اور پھر نالی پر چڑھنے کو اگلے پیر اُٹھا کر نالی کی دیوار پر رکھے۔ تین دفعہ کوں کوں کی اور پھر پیر نیچے کر کے چل دیا۔ آٹھ قدم چل کر پھر اس نے وہی کوشش کی اور کوں کوں کر کے پھر چل دیا۔ گلے کی رسی پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ یہ ایسی ہی کوششیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک قصائی کے لڑکے کی اس پر نگاہ پڑی۔ ایک ہاتھ میں بستہ اور بغل میں تختی تھی، دوسرے ہاتھ میں مٹی کی دوات اور سینٹے کا قلم۔ صرف پیر آزاد تھے۔

چنانچہ اس نے ننگا پیر لٹکا کر اس کی مدد کرنا شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں پلاّ کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ اتنے میں قصائیوں کے دو لڑکے اور آ گئے۔ کچھ دیر وہ اس کا تماشا دیکھتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے جھک کر اس کی رسی کا سرا پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اور اس کی رسی کو نالی سے باہر نکال دیا۔ رسی پر لپٹی ہوئی کیچڑ کے چھینٹے اڑے۔ ایک کی آنکھ میں اور دوسرے کے کھلے ہوئے ہنستے منھ میں کیچڑ نے اپنا مزہ چکھایا۔ چنانچہ تینوں لڑکوں میں آپس میں ماں اور بہنوں کے متعلق شستہ گفتگو شروع ہو گئی۔ کالے پلے نے محبت بھری نگاہوں سے اس لڑکے کو دیکھا جو جھکا ہوا اپنے ہاتھ کی کیچڑ سڑک پر پھینک رہا تھا اور اپنے ساتھی کی گالی کے جواب میں گالی برابر لوٹا رہا تھا۔ پلاّ دم ہلاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ اب اس نے پلے کو غور سے دیکھ کر کہا، ''شیرا ہے شیرا۔'' پھر اس نے رسی کے سرے کو پیر سے زمین پر رگڑا اور اٹھا لیا۔ ''آ ؤ شیرا، آ ؤ!'' کر کے رسی تانی۔ شیرا نے تین چار پھدکیاں اس کی طرف بھریں۔ اب لڑکا بھاگنے لگا۔ دو چار قدم شیرا نے ساتھ دیا، پھر گھسٹنے لگا۔ جب پیر چھلنے لگے تو پیں پیں کر کے چت ہو کر گھسٹنا بہتر سمجھا۔ باقی دونوں لڑکے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ گلی کے نکڑ پر مونڈھا بچھائے پہلوان بیٹھے تھے۔ انھوں نے لونڈوں کو ڈانٹ بتائی۔ ''ارے تمھارا ایسا ویسا! لونڈو، کیا کرتے ہو۔ چھوڑو پلے کو!''

لونڈے پلے کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پلا تین انچ کی دم ٹانگوں میں دبائے، سر زمین سے لگائے، پہلوان کی طرف بڑھا۔ پہلوان نے پیر سے دو تین دفعہ اسے لڑھکا کے گلی کے اندر کر دیا اور خود بے فکر ہو کر پھر مونڈھے پر جا بیٹھے۔ وہیں پر چار دکانوں میں کہار رہتے تھے۔ ایک کہاری بیٹھی لوہے کی کڑھائی مانجھ رہی تھی۔ پلا اس کے پاس اسی حالت سے سر زمین سے ملائے دُم پیروں کے اندر کوں کوں کرتا گیا۔

کہاری نے کہا، ''دھو، دھو!''

ایک تیرہ برس کی دُبلی پتلی کہار کی لونڈیا نے برابر کی دکان سے چھلانگ ماری اور پلے کو اٹھا لیا، لیکن فوراً ہی ''رام رام!'' کہہ کر زمین پر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پر رگڑ کر دکان میں گئی۔ ایک لٹیا پانی لائی اور اسے غسل دیا۔ پلے کا یہ پہلا غسل تھا۔ بہت ناپسند آیا۔ ہر طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ ناک میں بھی پانی چلا گیا۔ بری طرح چھینکیں آئیں۔ جب غسل ہو چکا تو وہ کانپ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کا بدن ایک میلے چیتھڑے سے پونچھا۔ مٹھی میں بجور کر بجھرے کی روٹی کھانے کو دی۔ اسی لڑکی نے اس

کا نام کلوا رکھا۔ لڑکی کا خود نام چندو تھا۔

کلوا نے ڈھائی مہینے چندو کے ہاتھ اور پیر چاٹے۔ اس کا یہ زمانہ بڑے عیش میں کٹا۔ لیکن اسی قلیل عرصے میں بھوریا نامی قصائی کے لڑکے نے پہلے تو چندو سے تعشق بڑھایا۔ لیکن جب چندو نے ایک دو مرتبہ بری طرح جھڑک دیا تو پھر اس نے بیر بڑھایا۔ اور اب بھی جب بس نہ چلا تو ایک رات جب یہ لوگ گلی میں سو رہے تھے تو کلوا کو کھٹیا کے پاس سے اٹھا، بھاگ گیا۔ پہلے کلوا نے کوں کوں کی، پھر ناراضگی کے دانت دکھائے اور آخر میں جب کاٹنے کی کوشش کی تو بے چارے کی تھوتنی پکڑ لی گئی۔ بھوریا نے اسے بہت دور بلوچ پورے کے ایک پرانے قبرستان میں لے جا کر قبروں کے بیچ میں ایک بیری سے باندھ دیا۔

کلوا تمام رات سینکڑوں قبروں پر اکیلا نوحہ خوانی کرتا رہا۔ صبح کو ایک لونڈا، زمین سے صرف چار انچ اونچا کرتا پہنے، قبروں میں کچھ ڈھونڈتا ہوا آیا۔ کلوا کو دیکھ کر بڑے زور سے چلاّیا، ''باباؔ رے! یہ دھرا سالا!'' بابا، قبرستان کے تکیہ دار فقیر، مہندی کی قمچی ہاتھ میں لیے آئے اور کلوا کی بہن کو یاد کر کے بولے، ''رات بھر چلاّیا کیا!'' اور مہندی کی قمچی سے کلوا کو دھنکنا شروع کر دیا۔ لمبے کرتے والا لڑکا کلوا کے واویلا سے بہت محظوظ ہوا۔ ہنسی کے مارے لوٹا جائے۔ یہاں کلوا کی یہ حالت کہ جب پیٹھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی تو چت ہو گیا اور پیروں پر قمچیوں کو روکنے لگا۔ خدا خدا کر کے قمچی ٹوٹی تو اس کی جان بچی۔

کلوا دن بھر اسی بیری کے نیچے بھوکا پیاسا بندھا ہوا، چندو کی یاد میں پڑا رہا۔ دن بھر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ دور کچھ عورتوں اور بچوں کے بولنے کی آوازیں آیا کیں، لیکن اس طرف ایک قبر کے لمبے چوڑے تکیے نے آڑ کر رکھی تھی۔ شام کو جب اندھیرا ہونے لگا تو اسی طرف سے کلوا کی تیز ناک نے بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ صبر پر جبر نہ ہو سکا۔ ایک مہین اور لمبی چیخ نکل گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد ایک عورت اس کے پاس آئی تو کلوا ڈر کے مارے چت لیٹ گیا۔ دُم پیروں میں سکیڑ لی۔ زبان گو پیاس سے لٹکی پڑتی تھی لیکن جلدی جلدی اندر سمیٹ کر ہلکے ہلکے کوں کوں کرنے لگا۔ عورت

نے اسے کھولا اور لے چلی۔ کلوا خاموشی سے ساتھ ہولیا۔ قبرستان کے دوسرے سرے پر دو مختلف قسم کے مکان تھے۔ ایک کوٹھڑی اور ایک مقبرہ۔ ان ہی دونوں میں ان لوگوں کی رہائش تھی۔

وہاں ایک بکری بندھی تھی۔ چار کھٹیاں ایک لائن میں پڑی تھیں۔ ایک عورت اور چھ بچے چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گیسو دراز فقیر صاحب مقبرے کے چبوترے پر اکڑوں بیٹھے گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ کلوا نے ہانپتی ہوئی زبان اندر کر کے گانجے کی خوشبو پر غور کیا۔ غالباً بری معلوم ہوئی۔ ناک کی نوک کو ایک دفعہ دائیں اور پھر بائیں طرف جنبش دے کر زبان پھر لٹکا دی اور ہانپنے لگا۔ عورت نے اس کو بھی اس کھونٹی سے باندھ دیا جس سے کہ بکری بندھی تھی۔ اس نے جاتے ہی بکری کے کونڈے میں سے پانی چاٹا۔ بکری کو اس دوہری ہتک پر غصہ آ گیا۔ اس نے تین چار دفعہ کھریاں جوڑ کر اور سینگ کی نوکیں کلوا کی طرف کر کے حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن کلوا نے ظاہرا اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اطمینان سے دونوں اگلے پیر آگے پھیلا کر اور پچھلے سمیٹ کر اس چٹائی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ جب اس چٹائی پر کھانا ہونے لگا تو اس کی ہم کھونٹا بکری نے بھی جگالی شروع کر دی۔ پہلی بوٹی جب کلوا کے پاس آ کر گری تو اس نے اپنی دم کو شکریے کے واسطے دو دفعہ زمین پر مارا۔ تہذیب سے وہیں پر بیٹھے بیٹھے گردن لمبی کر کے سر بڑھا کر بوٹی کو اٹھا لیا۔ چوں کہ مزے دار تھی، دو ہی دانت مار کر نگل لی۔ زبان سے ناک اور ہونٹوں کو چاٹ کر صاف کر لیا، اور پھر انتظار کرنے لگا۔ دوسری بوٹی ہوا میں اُڑی۔ ان کے پھیلے ہوے پیروں کے بیچ میں گردن کے نیچے آ کر رک گئی۔ دُم کو تین جھٹکے شکریے کے دے کر کلوا کھڑا ہو گیا۔ بوٹی نرم تھی، ویسے ہی نگل گیا۔ پھر جو ایک ہڈی اچھلی تو بکری کے پاس گری۔ یہ جو اس طرف بڑھا تو بکری چونک پڑی۔ جابن نگل کر جگالی کے نئے غلّے کے گردن میں سے چل کر منھ میں آنے کے انتظار میں تھی، کوئی بھلا جانور ایسے موقعے پر دخل اندازی پسند نہیں کر سکتا۔ فوراً سر نیچا کر کے سینگوں کی نوکیں پیش کر، کھریاں جوڑ، حملہ آور ہوئی۔ معاملہ ہڈی کا تھا، معمولی بات نہ تھی۔ کلوا نے بھی جواب دیا، ''ہڈی''، اور پھر ''ہم ہم'' کر کے دو جھوٹے حملے کیے۔ بکری صاحبہ ڈر گئیں۔ اب جو بھاگیں تو رسی کو بھی بھول گئیں۔ بس بھاگ پڑیں۔ رسی تنی، جھٹکا کھایا، دھم سے زمین پر دراز ہو گئیں۔ کلوا کی جانے بلا۔ ہڈی اٹھا دوسری طرف چل دیے۔ جب رسی تن گئی، بیٹھ کر مزے لینے لگے۔ گیسو دراز

صاحب نے اٹھ کر ایک رسی کے ٹکڑے سے کلوا کو بڑی مار ماری۔

سات دن کلوا کو قبرستان میں پیٹ بھر مار اور آدھے پیٹ کھانے پر گذر کرنی پڑی۔ ایک رات خیال آیا کہ اگر دانتوں کو رسی پر ورزش دی جائے تو کیا حرج ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹے کی متواتر محنت کے بعد ایک عجیب نتیجہ یہ ہوا کہ کلوا آزاد تھے۔

غلامی کا نشان صرف فٹ بھر کا ٹکڑا گلے میں باقی تھا۔ اس کی فکر کلوا کو مطلق نہ ہوئی۔ فوراً ایک طرف روانہ ہو گیا۔ چندو کی یاد اور پیٹ کی خواہش، ان دو اثرات کے تابع اس کے قدم اٹھنے لگے۔ نیم کا سایہ، نیم کی جڑ، تین کچی قبریں، دو پکی قبریں، ایک بہت اونچی پکی قبر، وہی پت جھڑی بیری، دو دھنسی قبریں، ایک چھوٹی قبر، اس کے برابر ایک بڑی قبر، ایک قبر کا خالی گڑھا، قبرستان کی دیوار کا ایک گرا ہوا حصہ، سب کو دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف کیے ہوئے پار کیا۔ دوسری طرف دیوار سے ملا ایک نیولا کھڑا تھا۔ اس نے اس کو دیکھا اور لپکا۔ اس نے اُسے دیکھا اور بھاگا۔ چار چھلانگوں میں یہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ نیولا پلٹ پڑا۔ دُم پھول کر جھاڑو ہو گئی۔ پچھلے پیروں پر بیٹھ کر مقابلے کو تیار ہو گیا۔ کلوا بھی اگلے دونوں پیر چھوڑ کر بدن کو پیچھے تان کر رُک گئے۔ اب غالباً اشاروں میں ایک نے دوسرے نے معافی مانگی۔ وہ اُدھر چل دیا اور یہ ادھر روانہ ہو گئے۔ پھر وہی دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف۔ چندو یا غذا، دونوں میں سے ایک، جس کی بوہل جائے۔

جاتے جاتے پکی سڑک پر ہولیا۔ عیش باغ کے سامنے پولیس کی چوکی پر پہنچا۔ ایک موٹے کتے نے لیٹے لیٹے غرا کر کہا، ''ہوں۔'' کلوا نے دُم دبائی اور ایک سپاٹا بھرا۔ ایسے ہی چلا جا رہا تھا کہ ایک ہڈی کی بو پائی۔ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ناک زمین پر سوں سوں کر کے فوراً ڈھونڈ لی۔ دیکھا تو کچھ حصہ اس میں کام کا تھا۔ کھایا اور پھر چل دیا۔ آ کے ریلوے کی چوکی آ گئی۔ ایک بوچے کتے نے لپک کر اس کا راستہ روکا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے کھڑے ہو کر کھیسیں دکھا، بردباری سے کھینچ کر کہا، ''کھیسیں۔'' کلوا نے بھی کچلیاں دکھا کر کہا، ''کھیسیں۔'' بوچے نے اور گہری آواز گلے سے نکال کر کہا، ''ویکھیں۔'' کلوا نے دانت نکال کر تین دفعہ جھکول سے منھ بنا کہا، ''ہیں، ہیں، ہیں۔'' ایک کتیا اور آ گئی۔ اس نے

آتے ہی کلوا کو باری باری دونوں سروں سے سونگھا، اور پھر بے پروائی سے انھیں چھوڑ کر چل دی، جس کے صاف معنی اس کی زبان میں یہ تھے، ''جانے بھی دو، لونڈا ہے۔'' مگر بگڑے دل بوچے کو کب گوارا تھا۔ ''ہم ہم ہم'' کر کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ ناچار کلوا نے اطاعت قبول کی، چت لیٹ گیا۔

دو مہینے کلوا نے بوچے کی اطاعت میں عیش باغ اسٹیشن سے آغا میر کی ڈیوڑھی تک آر کے آر لائن کے اوپر چکر لگائے۔ یہی بوچے کے دانتوں اور پنجوں کے زور سے حاصل کردہ جائداد تھی۔ کلوا نے بار بار چندو کی یاد میں اس جائداد کو چھوڑ کر دور کے سفر کے قصد کیے، لیکن ہر دفعہ اس کو ناکامیاب واپس آنا پڑا کیوں کہ زمین کا چپہ چپہ کتوں کی جائدادوں میں تقسیم ہوا پڑا تھا جس پر کہ غیر کا قدم رکھنا کتوں کے قانون میں سخت جرم ہے۔ اگر کسی بڑی جائداد کے تنہا خوں خوار مالک سے بچ کر نکل بھی گیا تو دوسری سرحد پر وہاں کے حاکم اور ایک، دو یا تین، جتنے بھی شاگرد ہوے، ان سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان ناکامیاب کوششوں سے اسے ایک فائدہ ضرور ہوا، زخم کھا کھا کر اس کا جسم پکا پڑ گیا اور آداب جنگ کی تمام باریکیوں سے واقف ہو گیا۔

ایک روز کلوا تنہا آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ریلوے کراسنگ سے کچھ دور بوچا استاد کی لاش لائن پر کٹی پڑی ہے۔ استانی پریشان کھڑی اس کو سونگھ رہی ہے۔ کیا کر سکتے تھے سوائے ہمدردی کے۔ خود بھی سونگھا۔ پاس کھڑے ہو کر استانی کا غم غلط کیا۔ وراثتاً جائداد کے مالک تھے، اس کا انتظام ہاتھ میں لیا۔ متعینہ غذا جو اس جائداد میں ریل سے گرتی تھی اور چیلوں کے پنجے سے ٹپکتی تھی، اب اس کے کھانے والے تین کی جگہ دو ہی منھ رہ گئے۔ ایک ہی مہینے میں استانی چربیا گئیں اور ان کے بھی ہاتھ پیروں پر رونق آ گئی۔ لیکن اب استانی کو ان کا تعشق لونڈھیاپا معلوم ہونے لگا، یہاں تک کہ ایک دن کلوا کو اکیلا چھوڑ کر ایک کبرے کتے کے پیچھے نکل گئیں۔ اب یہ تنہا رہ گئے۔ اکیلے کھانے والے اور اکیلے جائداد کی حفاظت کرنے والے۔ پیٹ بھر ورزش تھی اور پیٹ بھر خوراک۔ ایک مہینہ جو اور گذرا تو اب کلوا کی شان ہی نرالی تھی۔ سیاہ چمک دار مخملی کوٹ، لہراتی ہوئی لمبی دُم، گھٹا ہوا بھاری تھوتھنا، ہاتھ اور پیروں پر ابھرے ہوے پٹھے بل کھائے ہوے۔ قد میں بھی

بڑے سے بڑا کتا ان کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چور اور آوارہ گرد کتوں کا ان کو دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنی جائداد کو بھی اور وسعت دے لی تھی۔ آغا میر کی ڈیوڑھی کے پلیٹ فارم کی اپنی طرف کی آدھی لمبائی تک قبضہ بڑھا لیا تھا۔ ایک دن اس پلیٹ فارم پر ایک جگہ ایک بو تھی۔ کلوا کا محبت کا بھوکا دل تڑپ گیا۔ یہیں چندو بیٹھی تھی۔

کلوا اس جگہ کو سونگھے اور منہ اونچا کر کے خاموش کھڑا ہو جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دیے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا، پھر ایک دفعہ دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین پر، یہ روانہ ہو گیا۔ سیکڑوں ہزاروں ہر طرح کی بوؤں میں چندو کی بو اس کے واسطے الگ تھی۔ بو لیتا، بو ہی بو چل دیا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان تک آنے میں اتنی مہموں کا سامنا نہ کیا ہوگا جتنی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو اس نے بلوچ پورے تک پہنچنے میں عبور کیا۔ بیسیوں کتوں کو زخمی کر کے، خود زخموں سے چور، جس وقت وہاں پہنچا رات کا ایک بج چکا تھا۔ گلی وہی تھی، مکان وہی تھا، دکان وہی تھی مگر بند تھی۔ اب لوگ اس کے اندر سو رہے تھے۔ دروازے سونگھے۔ چندو کے ماں اور باپ دونوں کی بوئیں تازہ تھیں مگر چندو کی بو بہت خفیف تھی۔ کتے آتے، اس پر بھونکتے اور چلے جاتے، مگر یہ وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چندو کی بو سونگھتا رہا جو برابر زائل ہوتی چلی جاتی تھی، یہاں تک کہ صبح چار بجے چندو کی بو گم ہو گئی۔ اس نے دکان کے سامنے منہ اٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ کاش کوئی انسان اس کو یہ بتا دیتا کہ چندو اپنے دولھا کے ساتھ دلھن بن کر بانس بریلی گئی، مگر کون بتاتا۔ چندو کا باپ ہاتھ میں لٹیا لیے یہ کہتا ہوا نکلا، ''روئے جات رے کو کرا!''

قصائیوں کے کتے نہ اس کے ایسے تندرست تھے نہ قد آور، لیکن کچے گوشت کے کھانے والے، بے انتہا خوں خوار۔ کلوا کے بھی دانت کھٹے ہو گئے جب کہیں جا کر ان کو گلی اور گلی کے پیچھے تھوڑے میدان پر قبضہ ملا۔ دن رات کا زیادہ تر حصہ یہ چندو کی دکان کے آگے ہی گذارتا جہاں اب اس کا پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ کلوا چندو کے باپ اور ماں دونوں کی مار برابر کھاتا رہا لیکن اس نے دکان کا دامن نہ چھوڑا۔ یہاں کھانے کو کافی اور پھر عمدہ چیزیں مل جایا کرتی تھیں لیکن افسوس دل کی آگ، محبت کے چھینٹوں کی طالب، سلگے گئی۔ کچھ عرصے بعد اس نے ان دونوں کے علاوہ غیروں سے بھی اشارے کیے اور محبت

کے لین دین کا خواست گار رہا مگر دل کا سودا کہیں نہ پٹا۔ ایک برس اسی طرح گذر گیا، مگر آخر چندو آ ہی گئی۔

بالکل وہی، چندو کچھ دُبلی اور ہوگئی تھی، بچہ گود میں تھا، لیکن کلوا کو بھول چکی تھی۔ وہ کلوا سے ڈر گئی۔ انسان کا کلیجہ پھٹ جاتا لیکن کلوا کتا تھا، زمین پر بچھ گیا۔ پیٹ کے بل زبان نکال کر پیر چاٹنے کو آگے بڑھا۔ پیر نہ ملے تو زمین چاٹی۔ کہاری کی جوتیاں جب پڑیں لیٹ گیا، آنکھیں بند کر لیں۔ کہار نے ڈنڈے جب مارے تو سمٹ سمٹ کر چلآیا، لیکن سب لاحاصل۔ اس بڑی چکی کے دونوں پاٹوں میں پتھر کم پستے ہیں اور دل زیادہ۔ آٹھویں دن چندو پھر سسرال چلی گئی۔

آج کالا کتا غیظ وغضب کی تصویر بنا ہوا آوارہ گرد ہے۔ کتے اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں، سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ سیاہ منھ پر آنکھیں لال انگارہ ہیں۔ موٹی گردن پر بال کھڑے ہیں اور دُم بالکل سیدھی پھیلی ہوئی ہے۔

اور آج ہی وہی پیارا بچہ منن، باپ کی بے جا سختی اور ماں کی اندھی محبت کے باعث آوارہ ہے۔ اسکول میں جھڑکیاں اُٹھانے اور مار کھانے کے بجائے آج کے دن اس نے سونی عیدگاہ میں آزادی کی عید منائی ہے۔ اب چار بج چکے تھے۔ منن عیدگاہ کی چار فٹ اونچی دیوار پر بیٹھا سوچ میں تھا۔ دن تو گذر گیا، اب کیا کرے؟ گھر جائے نہ جائے؟ وہاں خبر ضرور ہوگئی ہوگی۔ ننھے سے دل میں وحشت کے پنکھے چل رہے تھے۔ وارفتہ دل، صحرا نورد کلوا کا گذر ادھر سے ہوا۔ اس کی نگاہ بچے پر پڑی۔

جس طرح انسانوں کے واسطے راتیں تاریک ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لیے ان میں سہانی روشنی ہوتی ہے، اسی طرح انسانوں کے واسطے صورتیں، آنکھ، ناک، کان اور منھ کا صرف مجموعہ ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لیے ان پر خوشی کی چمک، غم کی سیاہی اور محبت کی ارغوانی شعاعیں بھی عیاں ہوتی ہیں۔ کلوا نے دیکھا بچہ اداس بیٹھا ہے، لیکن وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے نیچے نیچے جہاں وہ جارہا تھا بچے کی بُو رواں دواں تھی۔ اس نے اس بو میں کچھ خصوصیت محسوس کی۔

خیال، اور خیالوں کے تحت واقعات کی یادداشت اس کو قدرت نے عطا کی ہی نہ تھی۔ نہ رہا

گیا، گھوم کر بچے کو دیکھنے لگا۔

چاروں طرف آگ کا اک سمندر موج زن تھا جس میں سے لپلپاتے شعلے تا بہ فلک اٹھ رہے تھے۔ ٹوکری بھر کے ایک بچے کو اس میں پھینکا گیا تو کیا ہوا؟ پلک جھپکی بھی نہ تھی اور وہاں سبزے میں پھولوں کا ایک تختہ تھا جو خوشبوؤں سے مہکتا تھا۔ اس میں بچہ بیٹھا کھیل رہا تھا۔ یہ قصہ حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ اب جن دماغوں میں عقل کی زیادتی ہوگئی ہے اور اس قصے کو صحیح ماننے سے قاصر ہیں، آئیں ادھر آئیں، میں ان کو دکھائے دیتا ہوں کہ یہی ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ جفاکاری میں بھینسا کتے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ استقلال میں پتھر کی سل کتے کے آگے گھس جائے گی۔ خوں خواری اور دلیری میں جس وقت کتے سے مقابلہ پڑتا ہے تو شیر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن محبت کی ایک چھوٹی سی چمکاری میں کتا پیروں پر گر پڑتا ہے اور اس وقت وہ حلم، عاجزی، انکساری اور خاکساری ایسی رقیق چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

منن اور کلوا میں ایک دفعہ پھر نئے سرے سے دوستی شروع ہوئی۔ اس کی جیب میں بچی ہوئی ایک روغنی ٹکیا اور تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوالوں میں کلوا کو پیش کی گئی۔ انڈا تھا نہ انڈے کی بو، اس پر بھی ٹکیہ کلوا کو بڑی میٹھی معلوم ہوئی۔ منن نے ڈرتے ڈرتے کلوا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کلوا نے منھ کھول کر محبت کے نشے میں ''عاؤں'' کہہ کر انگڑائی لی۔ منن کھیلتا کھیلتا کتے کو ڈھیلوں کے پیچھے بھگاتا قدرتاً گھر کی طرف آ گیا۔ یہ بھی تو امید تھی کہ گھر میں اسکول سے بھاگنے کی خبر نہ پہنچی ہو۔ ڈرتے ڈرتے گھر میں گھسا۔ کلوا باہر ہی رہ گیا۔

محبت کی دیوانی ماں نے منھ دُھلایا، ناشتہ کھلایا۔ اگنی کنکیا کے واسطے دی۔ دو پیسے کی برف کی قلفی لے دی۔ دو دفعہ باپ کے بے جا غصے اور منن کے بیچ میں سدِ سکندری بن کے حائل ہوگئی، یہاں تک کہ رات ہوگئی اور منن سو گیا۔ افسوس، اے جاہل ماں، تو نے سب کچھ کیا لیکن بچے کے دل کی تھاہ نہ لی۔ بچے کے دل میں بچہ بن کر گھسنا ہوتا ہے۔ وہاں اس کے چھوٹے چھوٹے رنج، ننھی منی خوشیاں، معصوم گلے اور شکوے ہوتے ہیں، اور بے وقوف مائیں اس دنیا کو کس مپرسی میں چھوڑ دیتی ہیں۔

چھ دن کلوا نے استقلال سے بیٹھے بیٹھے اسکول کے سب تماشے دیکھے۔ ساتویں دن ضبط برداشت سے باہر ہوگیا۔ سیاہ پینتیس سیر کا جسم ایک جست سے دروازے سے باہر نکلا اور ماسٹر سے تصادم ہوا۔ ماسٹر زمین پر گر پڑا۔ کلوا اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ روتے ہوئے منن نے جلدی جلدی کتابیں اور بستہ سمیٹا اور سیدھا اسکول سے باہر بھاگا۔ سڑک پر جاکر ''آؤ، آؤ'' کی آوازیں لگائیں اور دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر میں خون آلودہ کان کو جھٹکتا ہوا، کلوا بھی منن سے آن ملا۔ سر اٹھا کر منن کا منہ چاٹنا چاہا تو اس نے سر پر سلیٹ ماری۔ کلوا خوش ہوگئے۔ اچھل کے آگے آگے ہو لیے۔

دوسرے دن بستہ بغل میں لے کر منن نے پھر عیدگاہ کا رخ کیا۔ کلوا کو اس سے کیا مطلب تھا۔ جدھر وہ چلا اس کے پیچھے ہولیا۔ واٹر ورکس کی دیوار کے نیچے پہنچ کر باہر لٹکی ہوئی املی کی شاخوں کے سائے میں دونوں بیٹھے۔ منن نے کوٹ کی جیبوں میں سے چرائے ہوئے روٹی کے ٹکڑے، ہڈیاں اور بوٹیاں کلوا کو کھلائیں۔ اس کے بعد املی پر الجھی ہوئی پتنگ پر اینٹ کے ڈھیلے کا لنگر اچھالنا شروع کیا۔ کلوا بھی ڈھیلے کی ہر اچھال پر اچھلتے تھے لیکن فٹ سوا فٹ ان کی حد تھی۔ اس کے بعد عیدگاہ میں بسیار ڈھیلے بازی کے بعد ایک کچا کیتھا اٹھا کر تال کٹورے کا رخ کیا۔ راستے میں منن نے کیتھے کے وہ چٹخارے لیے کہ کلوا کی بھی رال ٹپک پڑی، لیکن جب حصہ ملا تو سونگھ کر ہی چھوڑ دیا:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

جانوروں کو انسٹنکٹ (instinct) کا مادّہ دیا گیا ہے جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں اور ہم کو عقل، جو ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے۔

تیسرے دن شام کو جب آوارہ گردی کے مکتب سے منن گھر واپس ہوا تو اس نے دیکھا کہ مکان کے آگے اسکول کے تین لڑکے اور ایک ماسٹر کھڑے ہیں۔ باپ دروازے پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ سر سے پیر تک کانپ گیا اور فوراً واپس لوٹ پڑا۔ پھر عیدگاہ پہنچا۔ وہاں پھرتے پھرتے جب شام ہونے لگی تو قدم گھر کی طرف خود بخود اٹھنے لگے۔ واٹر ورکس کے پاس آکر پھر دل

میں پنکھے چلنے لگے۔ عقل نے قدم روک دیے۔ واٹر ورکس کی دیوار پر چڑھا۔ اندر بالکل سنسان تھا۔ تھوڑی دور پکے تالاب تھے۔ دیوار سے کود کر ان کے کنارے پہنچا۔ کلوا بھی کود پھاند کے ساتھ تھا۔ تالاب کے چاروں طرف پکی دیوار تھی جس سے ڈیڑھ فٹ نیچے شفاف پانی میں چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ منن اپنی فکریں بھول گئے۔ کنارے اکڑوں بیٹھ کر مچھلیوں کی سیر میں محو ہو گئے۔ ایک مچھلی دیوار کی جڑ تک آ گئی۔ منن نے جھک کر اسے پکڑنا چاہا، پوری جان سے اندر لڑھک گیا۔ کلوا کچھ دور تھا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہیں سے اس نے پانی میں جست ماری، لیکن قبل اس کے کہ یہ پاس پہنچے بچہ پانی کی تلی کی طرف روانہ تھا۔ پانی بہت گہرا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بچے نے اُچھالا کھایا۔ کلوا کے دھوکا نہ کھانے والے احساس نے اسے بتا دیا کہ بچہ کس جگہ ابھرے گا، وہیں پر موجود تھا۔ کلوا نے ڈھال کی طرح اپنا جسم بچے کے سینے کے نیچے کر دیا۔ بچے کے پیٹ میں کافی پانی جا چکا تھا۔ وہ قریب قریب بے ہوش تھا لیکن قدرتاً اس کا ایک ہاتھ بچے کی گردن میں اور دوسرا پچھلے پیروں میں لپٹ گیا۔

افق کی سرخی گہری پڑتے پڑتے سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔ سیاہ آسمان پر جھانک جھانک کر تارے نکل آئے۔ ایک چمگادڑ نے پانی کی سطح پر سرّ اٹا مارا۔ دو بوند پانی منہ میں اٹھاتا ہوا نکلا چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد ایک نیولے نے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر تالاب کو دیکھا اور سمٹ کر سرسراتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔ رات بڑھتی چلی گئی۔ راہِ عدم سے ایک تارا ٹوٹا اور راہ عدم میں غائب ہو گیا۔ اب کلوا کا بھی پیٹ پھول چکا تھا۔ جسم میں طاقت نہ تھی۔ یا اپنی ناک سے پانی باہر رکھ سکتا تھا یا بچے کی۔ دل میں طاقت وہی باقی تھی۔ مالک کی ناک اوپر رہی اور تھکی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔ صبح کو کچھ لوگ جمع ہوے، سسکتے ہوے بچے کو نکال کر میڈیکل کالج کی طرف دوڑے۔ کلوا کی پھولی ہوئی لاش وہیں چھوڑی جس کو تھوڑی دیر بعد دو بھنگیوں نے نکال کر احاطے سے باہر میدان میں پھینک دیا۔

تین گدھ فضائے آسمانی سے سنسناتے اترے۔ چھ فٹ کے پھیلے بازو سمیٹ کر آہستہ آہستہ اس لاش کی طرف بڑھنے لگے۔

بیرو

جوگی کی گرفتاری کے بعد سے بیرو کا مزاج اور بھی زیادہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ قصبے کے لڑکوں نے اسے لاوارث سمجھ کر چھیڑنا شروع کیا تو وہ آتے جاتے ہر ایک انسان پر حملہ کرنے لگا۔ جانبین سے رنجشیں اس قدر بڑھیں کہ قصبے کے لوگوں نے اینٹیں پتھر مار مار کر اسے جوگی کی منڈیا چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پژمردہ دل بیرو منڈیا کو حسرت سے دیکھتا ہوا، ریلوے لائن کے پار اتر کر جنگل کے کنارے نہر کے پرانے بھٹے پر چلا گیا جہاں سے اس نے گاؤں کی بھینسوں کو مار مار کر نکال دیا۔ لوگوں نے اُدھر سے راستہ چلنا بند کر دیا۔ کھٹیمہ کی بستی بھر میں اطلاع ہو گئی کہ جوگی کا مرکھنا نیل گائے بھٹے پر ہے، اُدھر کوئی نہ جائے۔ بیرو نے بھی بھٹے کی تنہائی کو غنیمت سمجھا۔ اس کو انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گاؤں کے جانوروں کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کے خیال میں وہ اور اس کا جوگی (جس نے کہ اسے پالا تھا) دونوں یکہ و تنہا ایک دوسرے سے محبت کرنے کو پیدا ہوئے تھے۔ ان دونوں کا ثانی کوئی نہ تھا۔ نہ جوگی ایسا نیم برہنہ بڑے بڑے بالوں والا کوئی دوسرا انسان تھا، نہ ایسا بھاری قد آور، سیاہ کوٹ، سفید مفلر، خوب صورت چونچ دار داڑھی اور نوکیلے چمکتے سینگ والا دوسرا جانور ہی پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنی تنہائی کا خیال آیا کرتا تھا لیکن جوگی کی صحبت میں دل بہل جاتا تھا۔ جوگی اسے اپنے اکتارے پر گانے اور بھجن سنایا کرتا تھا، نمک ملواں بھیگے ہوئے چنے کھلاتا تھا، اس کی گردن کھجاتا تھا۔ اب جوگی بھی دفعتاً جدا ہو گیا۔ نہ معلوم کہاں گیا۔ جوگی کی جدائی اور اپنی تنہائی سے بیرو افسردہ تھا۔ شروع جاڑے کا موسم۔ شام ہو رہی

تھی۔ بھٹے پر ایک گڑھے کے کنارے جہاں اس نے اپنی بیٹھک بنالی تھی، بیرو کھڑا ہوا کبھی پانی میں اپنے عکس کو دیکھتا تھا اور کبھی سر اٹھا کر ریلوے لائن کے پار شام کے دھویں سے دھندلی کھٹیمہ کی بستی اور اسٹیشن کو دیکھتا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں طرف سریلے گھنٹے بجاتے ہوئے گایوں اور بھینسوں کے ریوڑ گاؤں کی طرف جارہے تھے۔ آسمان پر ایک دوسرے کو آواز دیتے ہوئے طوطوں اور کووں کے جھنڈ بسیرا لینے جنگل کی جانب اڑ رہے تھے، اور یہ پانی میں اپنے شان دار عکس کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ اس کو افسوس تھا کہ یہ دنیا میں اکیلا ہی پیدا ہوا ہے۔ اسی رنج میں بیرو اکیلا وہاں کھڑا تھا۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر جنگل تھا جہاں بالکل خاموشی تھی۔ بہت دور سامنے کھٹیمہ کی بستی سے ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کو اپنی پشت پر ہلکی سی آہٹ معلوم ہوئی۔ اب جو گھوم کر دیکھتا ہے تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بالکل اسی کا ہم شکل ایک نیل گائے، جنگل سے دو گز باہر کھڑا ہوا، اسے دیکھ رہا تھا۔ ویسا ہی سفید سینہ، سیاہ پیٹھ، ویسی ہی داڑھی، قد بھی قریب قریب اسی کے برابر تھا لیکن گلے میں کوڑیوں کا کنٹھا اور بانسے پر پتلی رسی کی ناتھ نہیں تھی اور جسم بھی اس کی طرح بھاری نہیں تھا بلکہ سیاہ چھریرے گول چمکتے ہوئے ہاتھ پیر بڑے ہی خوب صورت معلوم ہو رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر بیرو کے دل میں ایک عجیب گدگدی سی پیدا ہوئی۔ یہ آہستہ آہستہ ایک ایک قدم اس نووارد کی طرف بڑھا۔ نیا نیل گائے بھی پھرتی سے دم کی تھاپی کو دائیں بائیں ہلاتا ہوا ایک ایک قدم اس کی طرف آیا۔ جب بیرو اس کے قریب پہنچا تو اس کے دل میں اس ہم جنس سے سینگ لڑانے کی خواہش از خود پیدا ہونے لگی۔ اس کا مدمقابل بھی اپنے سینگوں کی نوکیں سامنے کیے اور سر کو جھٹکے دیتا ہوا برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن جب ان دونوں میں چار چھ قدم کا فاصلہ رہ گیا تو جنگل کے نیل گائے کی نظر اس کے کنٹھے پر پڑی۔ وہ فوراً ہی گھوم پڑا اور نوک دُم بھاگا۔ جنگل میں گھسا اور غائب ہو گیا۔ بیرو پریشان تھا کہ یہ کیا ہوا۔ یہ آہستہ آہستہ گھنے جنگل تک گیا اور دیر تک تاریک جنگل کو دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جنگل میں گھس کر اپنے ہم جنس کو ڈھونڈے لیکن وہاں بالکل اندھیرا تھا اور اندھیرے میں چلنے پھرنے کا یہ عادی نہ تھا۔ مجبوراً پھر بھٹے پر واپس آگیا۔ ایک اونچی سی جگہ اطمینان سے بیٹھا اور سوچ سوچ کر جگالی کرنے لگا۔ وہ بار بار جنگل کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید اس کا ہم جنس پھر آجائے۔

دوسرے دن صبح بہت سویرے بیرو جنگل میں گھس کر اپنے ہم جنس کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ یہ بہت دور تک سال بنی میں چلا گیا جہاں کہ اونچے قد آور درختوں کے نیچے زیادہ گھاس اور جھاڑیاں نہ تھیں لیکن اب یہ جو جو آگے بڑھتا تھا، سال کے درخت چھوٹے اور جنگل گھنا ہوتا جاتا تھا۔ اسے اس گھنے میں چلنے میں بہت دِقت ہوئی۔ یہ کھلی صاف زمین کا عادی تھا، بیلوں اور جھاڑیوں میں اس کے پیر اُلجھتے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے اس طرح پھرنے میں لطف آنے لگا۔ اس کو چلتے چلتے دوپہر ہو گئی لیکن سوائے چند موروں کے اور کوئی جانور یہاں نظر نہ آیا۔ یہ جو جو آگے بڑھتا تھا جنگل گھنا اور دشوار ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ پریشان ہو کر لوٹ پڑا۔ جب یہ جنگل سے باہر نکلا، دن چھپ رہا تھا۔ جنگل کے کنارے کانٹوں کی باڑھ سے گھرے ہوئے گیہوؤں میں یہ گھس گیا۔ ہرے ہرے گیہوں میں یہ چرتا ہوا ایک دفعہ پھر کھتیمہ کی طرف چلا کہ شاید جوگی آ گیا ہو۔ راستے میں کئی آدمیوں نے اس پر ڈھیلے برسائے اور اس نے اُن پر حملے کیے۔ جب یہ منڈیا کے پاس پہنچا تو لوگوں نے باقاعدہ لاٹھیوں اور پتھروں سے اس کی تواضع کی۔ جوگی کے ملنے کے بجائے کئی پتھروں کی چوٹیں اسے ملیں۔ ناچار پھر بھٹے پر آ گیا۔ اب نہ بھٹے پر اس کا دل لگتا تھا نہ بستی میں گذر! جنگل ہی کی طرف دھیان تھا، مگر وہاں بھی کیا تھا۔ بیرو بے حد بدمزاجی اور مردہ دلی سے رہنے لگا۔ روزانہ شام کو اس جگہ کی طرف دیکھتا رہتا تھا جہاں کہ ایک دفعہ اس نے اپنے ہم شکل کو دیکھا تھا۔

ایک دن سویرے بیرو بھٹے سے کچھ دور جنگل کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ لاکھوں زبردست درختوں کے تنے اوپر کی سبز چھت کے اندھیرے میں خاموش کھڑے تھے۔ ان ہی میں کچھ کھس کھس ہوئی اور رُک گئی۔ بیرو نے رُک کر بڑے غور سے ان بے شمار ستونوں میں دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ یہ پھر چلنے کو تھا، ایک دفعہ کئی ایک جانوروں نے ایک ہی ساتھ جنبش جو کی تو اب صاف نظر آ گئے۔ ان میں سے ایک اس کا ہم شکل سیاہ نر نیل گائے تھا اور چار چھریرے بدن کی خوب صورت نازک اندام گائیں تھیں جن کو دیکھتے ہی بیرو کے دل پر بجلی سی کوندی۔ اس کی ہم جنس ماداؤں کا چھوٹا سا گلّہ۔ کاش اس دوسرے نر کے بجائے بیرو خود ان کے ساتھ ہوتا۔ آج اس کو معلوم ہو گیا کہ دنیا میں وہ تنہا جوگی کی صحبت کے واسطے

پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کے دل میں ایک جولانی پیدا ہوئی۔ پست خیال امیدوں میں، رنج مسرت میں تبدیل ہوگیا۔ یہ فوراً ان کی طرف دُلکی کی چال میں روانہ ہوا۔ کھیت اور جنگل کے درمیان کانٹوں کی باڑھ کو بغیر دیکھے بھالے، چیرتا کچلتا ہوا نکلا چلا گیا۔ اُدھر ماداؤں نے ایک ایک دو دو قلانچیں بھر کر کچھ پیش قدمی کی لیکن پھر سب کی سب ادھر ہی منھ کر کے ساکت کھڑی ہوگئیں۔ گلے کا مالک جنگلی نیل گائے اپنے حرم کی حفاظت کے واسطے سینگ جوڑ کر ماداؤں کے آگے کھڑا ہوگیا۔ بیرو کو بھی قدرت نے، یا رگوں میں دوڑنے والے خون نے، آگاہ کر دیا کہ دونروں کے درمیان فاتح گلے کا مالک ہوتا ہے اور شکست خوردہ اُس وقت تک تنہا پھرتا ہے جب تک کہ وہ طاقت ور بن کر پھر نہ فتح حاصل کرلے یا کسی دوسرے کم زور نر کو شکست دے کر اس کی خوب صورت ملکاؤں پر قبضہ حاصل نہ کرلے۔ بیرو کو اپنی طاقت ہی پر ناز نہ تھا، وہ گلّے کو حاصل کرنے کے واسطے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اگر اس وقت اس کے سامنے ہاتھی بھی ہوتا تو وہ اس سے جا بھڑتا اور اپنے خون کی آخری بوند بہائے بغیر پسپائی قبول نہ کرتا۔

لیکن افسوس، جیسے ہی وہ اپنے مدمقابل کے قریب پہنچا، ماداؤں کی نظر اس کے گلے کے کنٹھے پر پڑی۔ وہ ڈر گئیں۔ "پی قوں، پی قوں" چلا کر وہ بھاگ پڑیں۔ ان کے نر کو بھی ٹھہرنے کی اب کوئی ضرورت نہ رہی۔ جب مستورات ہی اجنبی کو ناپسند کرتی ہیں تو پھر کیسی لڑائی۔ وہ بھی گلے کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ پہلے تو بیرو حیران و ششدر کھڑا کا کھڑا رہ گیا، پھر وہ بھی ان کے تعاقب میں دوڑا۔ بھاری جسم، دوڑنے کا عادی نہیں۔ جنگل گھنا رہ گیا، اُن کی خاک بھی نہ پاسکا۔ البتہ ان کی بو پکڑ لی، اسی کے سہارے چلتا رہا۔ اس کے واسطے آج یہ بالکل ہی نئی بات تھی۔ بوئیں طرح طرح کی اس کو ہزاروں روزمرہ معلوم ہوا کرتی تھیں لیکن ان پر کبھی اس نے غور ہی نہ کیا تھا۔ آج اس کو معلوم ہوگیا کہ ان کی بھی کتنی اہمیت ہے۔ ماداؤں کی بوؤں میں عجیب مستی تھی۔ ان کے تعاقب میں مسرت تھی۔ یہ اسی طرح بہت دور چلا گیا یہاں تک کہ ایک جلے ہوئے چاندر کے میدان میں نکل آیا۔ یہاں ہوا تیز چل رہی تھی۔ بو بھی منتشر ہوگئی۔ لاچار کھڑا ہوگیا۔ میدان میں کوئی جانور نہ تھا۔ جنگل کے کنارے کنارے شمال کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں چھ مادین چیتلیں نظر آئیں، بہت کچھ نیل گایوں سے مشابہ تھیں، مگر کہاں نیل گائیں کہاں یہ چیتلیں۔ جوں ہی بیرو قریب پہنچا، یہ بھی اس سے ڈر کر بھاگیں۔

آج تک بیرو اپنی دنیا، اپنے ہم پائے، اپنے ہم جنس، حتیٰ کہ اپنی ہستی سے بے خبر، انسانوں کی مصنوعی دنیا میں زندگی بسر کرتا رہا تھا جہاں کہ اس کی ہستی ایک ناگوار مہمان سے زیادہ نہ تھی۔ نہ یہ دنیا ہی اسے اپنی سرگرمیوں میں شامل کر سکتی تھی نہ بیرو خود اس دنیا کی زندگی میں کوئی حصہ لے سکتا تھا۔ زندگی کی جدوجہد، یعنی جنگِ بقائے حیات، جس میں کہ رات دن ہر نفس مبتلا ہے، یہی زندگی کی دلچسپیاں ہیں، یہی چشمہ ہائے آبِ حیات۔ بیرو ان سے بے سروکار، از خود آ جانے والی غذا سے شکم پُر، غموں اور مسرتوں سے بے بہرہ، حسرتوں اور امیدوں سے نا آشنا، جستجو اور تعاقب، نفرت اور محبت، غرض یہ کہ تمام جذبات سے ناواقف، نیم خوابیدہ حالات میں زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ عقل و حواس گم کردہ، ایک بے کیف نشہ اسے گھیرے ہوئے تھا۔ زندگی اس کے لیے مشغلہ نہ تھی، مشغلے اس کے واسطے بے کار تھے، لیکن اب دفعتاً اس کے آگے زندگی، اصلی، پر لطف زندگی کا ایک میدان وا ہو گیا تھا۔ اس کو اپنی اصلی دنیا صاف اور کشادہ سامنے نظر آ رہی تھی۔ وہ دنیا جس کے واسطے یہ پیدا ہوا تھا اور جہاں کا پتا پتا اس کے واسطے لامحدود مسرتیں لیے پیدا ہوا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی اس کے سلب شدہ حواس[۱] تیزی سے بیدار ہونے لگے۔ کان خفیف آوازوں پر گھومنے لگے، ناک میلوں کی بو پر تھرتھرانے لگی، پنڈلیاں سامنے کی رکاوٹیں از خود دیکھ کر راستہ ڈھونڈنے لگیں، آنکھیں رات کی تاریکی چیرنے لگیں۔ ایک ہی ماہ میں بیرو پکا جنگلی نیل گائے ہو گیا ہے، مگر افسوس، غلامی کا کنٹھا، کوڑیوں کی مالا اب بھی اس کے گلے میں ہے۔ البتہ سڑی ہوئی ناتھ ایک ڈالی میں پھنس کر ٹوٹ گئی ہے لیکن اس کنٹھے نے اس کو پریشان کر رکھا ہے۔ جس طرح کہ کھتیمہ کی بستی سینگوں کی وجہ سے اس سے بھاگتی تھی، اب اسی طرح جنگل کی بستی کنٹھے کی وجہ سے اس سے بھاگتی ہے۔ نئے اُگتے ہوئے چاندر میں چیتل، سانبھر، پاڑے اور نیل گائے راتوں کو خاموش پہلو بہ پہلو یہ چرتے ہوئے دیکھتا۔ لیکن جب یہ ان کے پاس جاتا ہے تو سب ایک ایک کر کے اِدھر اُدھر ٹہل جاتے ہیں۔ دن کی تیز دھوپ میں پتاوروں، بے جلے چاندروں، گھنے کھیریوں اور کلکوں کے تختوں میں یہ مارا مارا پھرتا ہے۔ ان میں جا بجا اطمینان سے بیٹھے جگالی کرتے جانور اسے ملتے ہیں،

---

[۱] خواہ پانچ ہی مان لیے جائیں مگر میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جنگلی جانوروں میں دس سے زیادہ حواس ہوتے ہیں۔

لیکن اس کی صورت دیکھتے ہی دُمیں ہلاتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سر جھکا جھکا کر گھنی گھاس کی تپلی گلیوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بیرو اس سرگردانی اور پریشانی میں جنگل کے کئی رینج (range) پار کر چکا ہے۔ کھکرا، لوہیا، سونی، گرکھا، جکبورا، بگھاندیاں پار کر کے، منڈی کے شمال مغرب میں، نیپال کی سرحد پر چاندنی کی پہاڑیوں میں پہنچ گیا ہے۔

چاندنی کی پہاڑیاں فلک بوس ہمالیہ کی پہلی سیڑھیوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ ہے۔ نہ یہاں پہاڑوں کی سردی ہے نہ چیڑ کے درخت ہیں۔ وہی سال کا جنگل جنوب کی ترائی سے پھیلتا ہوا ڈیڑھ دو ہزار فٹ کی بلند چوٹیوں تک چڑھتا چلا آیا ہے، البتہ یہاں آ کر یہ ختم ہو جاتا ہے۔ شمال کے اُتار پر جو بے انتہا ڈھلوان ہے، بڑے بڑے پتھروں اور پھیلی ہوئی چٹانوں میں پہاڑی سدا بہار گھنی جھاڑیاں پہلے تو خال خال نظر آتی ہیں لیکن جو جو وادی میں اُترو یہ بتدریج بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ نیچے پہنچتے پہنچتے اس قدر گھنی ہو جاتی ہیں کہ چاندنی اور نیپال کے گورا پہاڑ کی تنگ گھاٹی میں کالی ندی کو دونوں طرف سے گھیر کر چھپا لیتی ہیں۔

یہاں سبزے کی آرائش میں قدرت نے اپنی تمام فیاضیاں ختم کر دی ہیں۔ پتھروں پر کائی کی طرح سبزہ اُگتا ہے۔ اس سبزے کی ہر پتی کرشمۂ قدرت کا ایک نمونہ نظر آتی ہے۔ کوئی مخملی ہے چاندی کی طرح چمکتی ہے، کوئی چکنی ہے ریشم کی طرح نرم اور نازک ہے، کسی پر سرخ ٹپا ہے، کسی میں سفید دھاریاں ہیں، کوئی انتہائی تراش اور کٹاؤ کی پتی ہے، لیکن ہیں سب ہری۔ ہر جگہ، ہر طرف ہرا ہی ہرا ہے۔ نیچے سبزے کا فرش، اوپر جھاڑیاں، جھاڑیوں پر بیلیں، ہر جگہ طرح طرح کے پھول، ہر جگہ طرح طرح کی خوشبوئیں، جگہ جگہ مقطر پانی کے شفاف بہت چھوٹے چھوٹے چشمے، گنگناتے، دھیمے دھیمے راگ گاتے، پتھروں کو کتراتے، چٹانوں پر جھلملاتے، دونوں طرف کی ڈھالوں پر سے بڑی جھاڑیوں کے سائے میں گھومتے گھامتے، نیچے اترتے چلے آتے ہیں اور کالی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کالی متواتر چھوٹے چھوٹے آبشاروں پر جھر جھراتی، بڑے بڑے پتھروں کو کتراتی نکلتی ہوئی، چٹانوں کی گھوم پر سنسناتی، اس باغ کے بیچوں بیچ میں لہراتی ہے۔

دراصل یہ چھوٹی سی وادی باغِ ارم کا ایک نمونہ ہے جسے سر بہ فلک گورا ایک طرف سے اور ناقابل

گذر سیدھا گگارا لیے ہوئے چاندنی کا سلسلہ دوسری طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔اسی قلعے کے جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں، یا بیت کی ٹھنڈی بیلوں کے اندھیرے سائے میں، جنگل کا بادشاہ، گیارہ فٹ کا سیاہ دھاریوں والا سنہرا شیر، دن بھر غفلت کی نیند سوتا ہے، یہاں تک کہ جب چڑیاں چہچہانا بند کر کے ڈالیوں میں دبک دبک کر بسیرا لینے لگتی ہیں اور لاکھوں جگنو چمک چمک کر کالی کو بقعہ نور بنا دیتے ہیں تو پھر انگڑائیاں لیتا ہوا اور ''عاؤں، عاؤں'' کرتا ہوا بادشاہ ٹہلتا ہوا ندی کے کنارے آتا ہے۔دو چار کانکر ؎ جو یہاں رہتے ہیں، بھونک بھونک کر گورا کی چڑھائیوں پر چڑھ جاتے ہیں۔یہاں چوپائے بالکل ہی کم ہیں، کیوں کہ باوجود درختوں، پودوں اور گھانسوں کی کثرت کے، کھانے کے قابل کوئی سبزہ یہاں نہیں ہے۔غذا ترائی کے ہی جنگل میں کثرت سے ہے، اس لیے سانبھر، نیل گائے، چیتل اور پاڑے چاندنی کے دامن میں رہتے ہیں۔

البتہ جب کبھی دو ٹانگوں والے جانور آگ اُگلنے اور گرجنے والی لکڑیاں لے کر آ جاتے ہیں تو پھر یہ جانور ان ظالموں کے خوف سے چاندنی کی چوٹیوں پر چڑھ کر خطرناک اور دشوار راستوں سے دوسری طرف نیچے اتر کر کالی کے گوشۂ عافیت میں پہنچ جاتے ہیں۔حالانکہ یہاں ان کو شیر کے پہلو بہ پہلو رہنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی ان کو یہ گوارا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ اُس جنگل میں ٹھہریں جہاں کہ ظالم اور بے رحم انسان آ گیا ہو۔شیر باوجود درندہ ہونے کے جنگل کا رہنے والا، ان کا ہم سایہ ہے جس کی موجودگی ان کو چار و ناچار گوارا کرنی پڑتی ہے۔وہ جنگل کا بادشاہ ہے جس کو کہ ہر ہفتے ان کے گلّے میں سے کسی ایک کو جان کا خراج دینا ہوتا ہے لیکن وہ انسانوں کی طرح ظالم نہیں ہے۔وہ بلا ضرورت محض جان لینے اور خون بہانے کے واسطے کبھی شکار نہیں کرتا۔جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے تو وہ ان کے سامنے تک نہیں آتا اور اگر سامنا بھی ہو جائے تو فوراً ہٹ جاتا ہے۔اس کو چوپایوں کو بلا وجہ ڈرانے کی عادت نہیں۔جب بھوکا ہوتا ہے تو مجبوراً کسی ایک گلّے کو تاک کر اس کے سب سے کم زور ایک نفر کو اس خوبصورتی اور چالاکی سے دبا بیٹھتا ہے کہ اکثر گلّے کو پتا بھی نہیں چلتا کہ ان میں سے ایک کم ہو گیا ہے۔

؎ کانکر ایک چھوٹا ہرن ہوتا ہے لیکن کتے سے بہت ملتا ہے۔بادامی کھال کتے کی سی ہوتی ہے۔دانت بھی کتے کے سے ہوتے ہیں۔یہ بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتا بھونک رہا ہے۔

شکار مار لینے کے بعد اگر جانور بڑا ہے تو باسی اور تباسی تک کھاتا ہے، یہاں تک کہ شکم سیر ہو کر کسی اندھیرے اور ٹھنڈے مقام پر جالیٹتا ہے جہاں سے وہ چار دن تک سوائے پیاس بجھانے کی ضرورت کے نہیں نکلتا۔ حتیٰ کہ ساتویں آٹھویں دن ایک دفعہ پھر بھوک اس کو پریشان کرتی ہے تو وہ رات کے اندھیرے میں گھنی جھاڑیوں میں چھپتا، درختوں کی آڑ لیتا، دبے پاؤں نکلتا ہے۔ جنگل کو کھلبلا دینا اور جانوروں پر ہیبت طاری کر دینا اس کا کام نہیں۔ یہ گلوں کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور ان میں سے بالکل اسی طرح خوراک حاصل کرتا ہے جیسے کہ ایک دور اندیش مالی اپنے کھیتوں میں سے ترکاری بتدریج نکالتا ہے۔ گوشت کو برباد اور ضائع کرنے سے اسے نفرت ہے۔ ہر جانور اس کی کھیتی ہے جس کے بچوں سے اس کے گلے قائم ہیں۔ جب کوئی جانور بڑھاپا یا کمزور ہو کر نسل کا سلسلہ آگے بڑھانے کے ناقابل ہو جاتا ہے تو پھر جنگل کا بادشاہ اس پکے اور ٹپک جانے والے پھل کو چپکے سے توڑ کر کھا لیتا ہے۔ گلے اس سے ڈرتے ضرور ہیں لیکن ان کی ہیبت ان کے دلوں پر نہیں ہے۔ اس کا تعاقب ان کے لیے ایک کبڈی ہے جس میں کہ وہ پوری دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں، اور اگر ان میں سے کسی ایک کو شیر کی چستی اور چالاکی سے شکست ماننا بھی پڑتی ہے تو ان کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس بدنصیب ساتھی پر کیا گذری۔ اور دراصل گذرتی بھی کیا ہے، شیر کا بھاری جسم ایک ہی جست میں اس کی کمر پر گرتا ہے جس سے کہ فوراً کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ دوسرے سکنڈ میں دو سخت جھٹکے گردن کی گرّی گرّی الگ کر دیتے ہیں۔ دو منٹ نہیں لگتے کہ جانور کی تمام تکلیفیں دور ہو جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے، جس وقت انسان قتل اور غارت کے جذبے سے بھرا ہوا جنگل میں گھس آتا ہے تو یہاں کی دنیا ہی خوف و ہراس سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ وہ بلا ضرورت اور بلا امتیاز جانیں لیتا ہے، اور صرف غارت گری کے لیے۔ ظلم پر ظلم یہ ہے کہ جتنے جانور وہ ہلاک کرتا ہے ان سے زیادہ زخمی، خون میں نہائے، جنگل میں مارے مارے پھرنے، دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

کبھی کبھی چاندنی کے ان جانوروں کو بھی وحشی انسان کی اس غارت گری کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کیوں کہ ٹنک پور منڈی اور ان پہاڑیوں کے درمیان کئی خطرناک دلدلیں اور

نہایت گھنے جنگل ہیں جنھوں نے چاندنی کی پہاڑیوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ عرصے سے یہاں جانور بے خوف وخطر پُرامن زندگی بسر کر رہے تھے کہ یکا یک ایک ہلکی سی بے چینی ان کی دنیا میں پیدا ہوئی، یعنی بیرو دفعتاً نمودار ہوے اور مجنوں کی طرح یہاں کی نیل گایوں کی ڈار کے پیچھے پھرنے لگے۔ نہ اس ڈار کو ہی ایک جگہ قرار تھا اور نہ دوسرے ہی جانوروں کو اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے دیتا تھا۔ ان کے نر نے پہلے تو دلیرانہ مقابلہ کر کے بیرو کو بھگا دینے کی بہت کوشش کی لیکن جب یہ دیو ہیکل حریف کے مقابلے میں متواتر شکستیں اٹھا کر کئی زخم کھا چکا تو پھر مقابلہ کرنا چھوڑ دیا۔ بس اتنا ہی کرتا تھا کہ بیرو کو دور سے دیکھتے ہی، مقابلے کی تمام تیاریاں کر کے، سینگ نیچے کھریاں جما کر کھڑا ہو گیا، لیکن دشمن قریب آیا تو پھر بھاگ پڑا۔ اس عرصے میں مادائیں کافی دور نکل جاتی تھیں۔ چھریرے بدن کا جنگلی نیلا چار چھلانگوں میں پھر ان سے جاملتا تھا اور بھاری بھرکم بیرو اپنی سست رفتار میں پھر ان کا تعاقب شروع کر دیتے تھے۔

چاندنی کی پہاڑی ابھی اسی پریشانی میں تھی کہ ایک مصیبت اور نازل ہوئی۔ ایک قد آور چڑ چڑا اور بدمزاج سفید ریچھ اپنی زخمی مادین کے ساتھ گوراپار کی آٹھ ہزار فٹ کی اونچی برف کی چوٹیوں سے اُترا۔ گورا کو پار کر کے کالی کے کنارے آ گیا جہاں سے آگے بڑھنے کی سکت اس کی مادین میں نہ رہی۔ کسی شکاری کی گولی سے اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ نہ کھا سکتی تھی۔ کالی کے کنارے پانی پی پی کر، بھوک اور زخم کی تکلیف میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، زندگی کے آخری دن پورے کرنے لگی۔ اس عرصے میں سفید ریچھ نے، جو کہ قدرتاً بدمزاج ہوتا ہے اور اب اور بھی زیادہ خطرناک ہو گیا تھا، بلاامتیاز چھوٹا یا بڑا جنگل کے تمام جانوروں کی زندگی دُوبھر کر دی۔ ریچھ کے جو بھی سامنے پڑ گیا ''بھاؤں، بھاؤں'' کر کے اسے بھنبھوڑ ڈالا۔ پنجے مار مار کر حیثیت بگاڑ دی۔ ندی پر جا بیٹھا تو پانی پینے کے گھاٹ بند کر دیے۔ چاندر میں گھس گیا تو چوپایوں کی دن کی نیند اور جگالی حرام کر دی، ایک ہلچل سی مچا دی۔ اور جب آٹھویں دن اس کی زخمی ریچھنی مر گئی تو اس کا جنون اور بھی بڑھ گیا۔ جانوروں نے چراگاہیں چھوڑ دیں، بندھے ہوے گھاٹ بدل گئے، ان کی بیٹھکیں اُجڑ گئیں۔ اس ہلچل سے شیر بھی سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ شکار بھڑکا ہوا تھا، بہت سخت دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی۔ بندھے ہوے راستوں

اور گھاٹوں پر پڑے پتھروں یا سال کے موٹے دوشاخوں کی آڑ میں یہ گھنٹوں بیٹھ کر انتظار کرتا لیکن کوئی ڈار ادھر سے نہ گذرتی۔

آج بھی وہ سخت غصے اور پریشانی میں تھا۔ بھوک کی آگ پیٹ میں لگے دو راتیں ہو چکی تھیں۔ تیسری رات نمودار ہو رہی تھی کہ بھوک سے بے تاب شیر، پوستین جھٹکتا، شانے اور پیر زبان سے صاف کرتا، گھنے گلاب کی اندھیری جھاڑی میں سے نکل کر کالی کی طرف جھاڑیوں جھاڑیوں روانہ ہوا۔ ایک گستاخ خرگوش نے کچھ دور اس کے پیچھے خریش کی اور پھر غائب ہو گیا۔ ندی کے کنارے جوں ہی اس نے پانی پینا شروع کیا، ایک مور نے اسے دیکھ لیا۔ وہ چلایا اور اس کے چلانے سے گردونواح کے دس بارہ مور اور چلائے۔ جنگل میں پھر سکوت چھا گیا۔ شیر نے پانی پی کر پانی کو کچھ دیر بہ غور دیکھا، پھر مڑ کر چار قدم چلا اور رُک گیا۔ بڑی دیر تک دُم کو آہستہ آہستہ جنبش دیتا اور کانوں کے کٹورے گھماتا خاموش کھڑا رہا۔

آٹھویں تاریخ کی ہلکی چاندنی پتوں میں سے چھن چھن کر کہیں کہیں اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ سوائے آبشاروں کی مدھم میٹھی رِم جھم رِم جھم کے، باقی تمام سکوت ہی سکوت تھا۔ خوبصورت، لوچیلے، نازک، معصوم شیر نے دفعتاً ایک جھرجھری لی۔ وہ کچھ معلوم کر رہا تھا۔ اب اس کا مطلب حل ہو گیا تھا۔ وہ پھرتی سے پھر مڑا۔ لمبی دلکی کے دو قدم میں کالی تک آیا۔ اس کے جسم نے بغیر جھکولا لیے یا ہاتھ پیروں کے پٹھے تانے، ایک پینگ سا لیا اور وہ کالی کے پار تھا۔ اس کے لیے بارہ فٹ کا فاصلہ ہی کیا تھا، ویسے ہی نکل گیا۔ یہاں سے پھر اسی لمبی دبی ہوئی دلکی میں چند سکنڈ نہ لگے تھے کہ تین سو فٹ اوپر گورا کی چڑھائی کی ایک نکلی ہوئی نوک پر پہنچ گیا اور یہاں چند پتھروں کی آڑ میں دبک کر، چاندنی کی طرف منھ کر کے بیٹھ گیا۔ جس جگہ کہ اب شیر بیٹھا ہوا تھا یہاں سے کالی کے دونوں طرف جنگل، سامنے کی چڑھائیاں اور چاندنی کا کگارا بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ شیر دُم کو اپنے پہلو میں سمیٹے منھ کھولے، ہلکے ہلکے ہانپتا ہوا، تیزی سے آنکھیں اِدھر اُدھر گھماتا ہوا، سامنے کی کھڑی چڑھائی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ریچھ، جس کی کہ بو اس کو ندی کے کنارے ہی آ گئی تھی، سامنے پتھروں پر آہستہ آہستہ بھدے پن سے چڑھتا نظر آ رہا تھا۔ شیر کا کھلا ہوا منھ بند ہو گیا۔ دُم لٹھیا کی طرح پیچھے جا پڑی اور دُم کی

پتلی نوک ناگن کی طرح دائیں بائیں لہرانے لگی۔ شیر بار بار، دبکا ہوا، پنجوں کے بل سدھر سدھر کر بیٹھنے لگا۔ وہ یہ انتظار کر رہا تھا کہ ریچھ کگارے پر پہنچ جائے اور وہ دیکھ لے کہ کس راستے سے ریچھ اوپر گیا ہے۔ ریچھ آہستہ آہستہ ایک ایک پتھر، جڑ اور ڈالی پکڑتا ہوا آخر اوپر پہنچ گیا اور زبردست آنولے کے درخت کے نیچے، جہاں کہ زمین کافی ہموار تھی، نظروں سے غائب ہو گیا تو پھر جنگل کے بادشاہ نے جنبش کی۔ اب جو چلا تو دراصل معلوم ہوا کہ شیر ہے۔ جس طرح بجلی کوندتی ہے، چار جستوں میں یہاں سے نیچے تھا۔ ندی کے آٹھ فٹ اِدھر ہی سے ایک چھلانگ ماری اور تیس فٹ ہوا میں اُڑتا ہوا پار کی گھنی جھاڑیوں کے اندھیرے میں غائب ہو کر دو منٹ بعد پانچ سو فٹ اوپر کھڑی چٹانوں اور پتھروں میں ناگن کی طرح لہراتا نظر آیا۔ یہ اس طرف نہیں جا رہا تھا جہاں کہ ریچھ گیا تھا بلکہ آنولے کے درخت سے کافی مغرب کی طرف ہٹا ہوا ایک ایسے کھڑے کگارے کی طرف جا رہا تھا کہ جہاں پہاڑ بالکل دیوار کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔ شیر اس چڑھائی کو اس طرح چڑھ رہا تھا کہ آنکھ کام نہ کرتی تھی۔ ابھی ایک پتھر پر ہے اور پھر جو دیکھا تو اس سے بہت اوپر کسی دوسری چٹان کے سہارے جا رہا ہے۔ چڑھتے چڑھتے یہ ایک ایسی جگہ پر پہنچا جہاں نہ صرف پہاڑ بالکل دیوار کی طرح سیدھا تھا بلکہ بیس فٹ اوپر ایک چٹان چھجے کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ رُک گیا اور اس کے چاروں ہاتھ پیر سمٹے، پیٹ اور سینہ زمین سے چھو گیا اور پھر نگاہ کو مات کر دینے والی تیز چھلانگ میں وہ اوپر کی چٹان پر تھا۔ لیکن اس چٹان سے اوپر اب کوئی باہر نکلی ہوئی چٹان یا پتھر نہ تھا بلکہ خالص ایک ہزار فٹ کی سیدھی کھڑی دیوار کے اوپر دو بہت زبردست پتھروں کے درمیان سے نکلی ہوئی ایک چٹان اس چڑھائی کا آخری زینہ تھا۔ چنانچہ شیر نے اب ایک پتلی اور نہایت خطرناک پگڈنڈی پکڑ لی جو کہ بہت گھماؤ کے بعد سانپ کی طرح بل کھاتی آخر پھر اسی ایک ہزار فٹ اوپر کی نکلی ہوئی چٹان پر آ ملی تھی۔

جنونِ عشق جب سر پر سوار ہوتا ہے تو انسان ہو یا حیوان، تکلیفوں اور تھکاوٹوں سے بے حس ہو کر دنیا بھر کی صعوبتوں اور سختیوں کا سامنا دیوانہ وار کرتا ہے یہاں تک کہ صحرائے نجد کی وسعتیں شرما جاتی ہیں، دامانِ کوہ پھٹ کر جوئے شیر رواں ہو جاتے ہیں، تاج و تخت کے ہیرے جھونپڑوں کے

چراغوں کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ صدائے عشق کے آگے لن ترانیاں بھی خاموش ہو جاتی ہیں۔اور چونکہ عشق محض ایک حیوانی جذبہ ہے (جیسا کہ ہر پینتالیس سے اوپر کی عمر کا انسان جان چکا ہے،خواہ وہ اس کا قائل ہو یا نہ ہو) اس لیے بیرو پر اس کا اثر اسی حد تک اور زیادہ تھا۔چلبلی ماداؤں کی وہ ادائیں، ان کی میٹھی میٹھی وہ صدائیں، مشک وعنبر سے بہتر ان کی وہ مست بوئیں سرِ شوریدہ میں طوفان بہ سر طوفان برپا کر رہی تھیں۔جنگلی نیل گائے، دن رات کے تعاقب، دن رات کی دوڑ دھوپ سے پریشان، بھوک اور پیاس سے ہلکان، زخموں سے چور، دن بدن کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا۔آخر ایک دن سرِ شام، جب کہ دن کی تیز روشنی ختم ہو کر ہر طرف رات کا سہانا اندھیرا چھا چکا تھا، جب کہ بارہ ماسی اوس اونچے درختوں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھی اور جب کہ دو بن رکھی چڑیاں ایک دوسرے سے دو میل کے فاصلے پر سے ''ترا تو تو تو'' کے جواب سوال میں متواتر بحث کر رہی تھیں، جنگلی نیل گائے بیرو کے مقابلے سے آخری دفعہ بھاگا۔اس نے مکمل شکست قبول کر لی۔اس دائمی تعاقب سے اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ ماداؤں سے دست بردار ہو کر ڈار سے دوسری طرف بھاگا۔بے نر کی ڈار، لاوارث بنی ہوئی، چاندنی کی ڈھال پر بیرو سے ڈیڑھ سو فٹ اوپر کھڑی تھی۔بیرو اس طرف روانہ ہوا۔ مگر مادینیں حسب دستور اس سے ڈر کر بھاگ پڑیں۔بیرو کی سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آیا کہ وہ پھر اس نر کا تعاقب کرے، اس کو شکست فاش دے بلکہ ہلاک کر ڈالے۔ادھر جنگلی نیل گائے نے ان سب جھگڑوں کو چھوڑ کر چاندنی کے کگارے کا رخ کیا جہاں سے وہ اوپر ہی اوپر جا کر مشرق کی طرف سے کھیر کے گھنے میں اتر جانا چاہتا تھا۔لیکن جیسے ہی وہ ان دو بڑے پتھروں کے پاس پہنچا جن کی آڑ میں ایک بڑی چٹان چھجے کی طرح ایک ہزار فٹ کی بلندی پر نکلی ہوئی تھی، ٹھیک اسی وقت شیر بھی وہاں آ چکا تھا۔شیر آیا تو تھا ریچھ کو سزا دینے لیکن اسے خوراک کی بھی سخت ضرورت تھی۔بھوک سے بے تاب تھا۔چھ گز کے فاصلے پر بڈھا زخمی نیل گائے جا رہا تھا۔دونوں بارہ چودہ فٹ کے موٹے پتھروں کے بیچ میں تین فٹ کی گلی سی تھی۔اس میں سے وہ جھپٹا اور نیلے کو گرا لیا۔دو چار جھٹکوں میں شکار بے حرکت ہو گیا۔عادت کے موافق شیر کو فکر ہوئی کہ کسی پوشیدہ تنہائی کی جگہ پر گھسیٹ لے جائے اور پھر کھانا شروع کرے، لیکن پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی۔پشت پر کی چٹان بھی کافی تنہائی کی جگہ تھی یا کم از کم ناشتہ کر

لینے کے واسطے کچھ دیر کے لیے شکار وہاں بھی کھایا جا سکتا تھا۔ گردن پر سے جہاں اس کے کیلے گھس گئے تھے، خون کی دھاریں چل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر اس خون کو چاٹا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر نیل گائے کے پٹھے پر دانت جمائے۔ اگلے دونوں ہاتھوں سے ران اور کمر کو دبا کر منھ کو اوپر ایک جھٹکا دیا۔ تڑاخے کی ایک آواز ہوئی۔ ڈیڑھ سیر کا ایک ٹکڑا ران سے جدا ہو کر شیر کے منھ میں آ گیا۔ اس تڑاخے کی آواز سے ریچھ، جو کہ ان پتھروں کے پاس سے گذر رہا تھا، ٹھٹک گیا۔ بھاری جھبرا سر ہلا ہلا کر اِدھر اُدھر سونگھا۔ ''دو بوئیں مشترکہ۔'' جھلا کر پنجے سے ناک کے بانسے کو دو دفعہ پونچھا اور دونوں پتھروں کے بیچ میں گھس گیا۔ بجلی کی طرح شیر، شکار کو چھوڑ، گھوم کے کھڑا ہو گیا۔ آندھی کی طرح ریچھ نے جھٹکا لیا اور راستہ روک کر سات فٹ اونچا، تین فٹ چوڑا جھبرا دیو پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ دھوکے میں ریچھ آ گیا تھا۔ موقع ایسا خراب تھا کہ اب ہٹنا ناممکن تھا۔ اگر وہ ایک انچ بھی گھومتا ہے تو شیر اس کو دبا لیتا ہے، اس لیے سیدھا کھڑا، دونوں ہاتھ آگے کو پھیلائے، مقابلے کے لیے تیار تھا۔ شیر بھی اس طرح آمنے سامنے ہو کر حملہ کرنے سے ہمیشہ بچتا ہی رہتا تھا۔ اور اب یہ دیو ہر طرح سے تیار کھڑا ہے۔ کس طرح، کس پہلو سے حملہ کرے۔ دونوں مدمقابل ایک منٹ اسی حالت میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ شیر چاہتا تھا کہ اس کا دشمن ذرا بھی جھکے اور وہ اس کی پیٹھ پر جا پڑے۔ ریچھ اس داؤں میں تھا کہ شیر ذرا بھی اٹھے کہ وہ اس کے پیٹ کے نیچے گھس جائے۔ اسی خیال سے ریچھ کچھ آگے جھکا ہی تھا کہ شیر نے تڑپ کھائی۔ دونوں ہاتھوں کے ناخن پسلیوں میں اور دانتوں کے کیلے ریچھ کی کمر پر ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف گھسا دیے۔ ریچھ کا بھاری سر اور کھڑ کھڑاتے ہوے بڑے بڑے ناخنوں سے آراستہ دونوں ہاتھ شیر کے پیٹ کے نیچے تھے۔ ایک سکنڈ بھی نہ لگا کہ شیر کی آنتیں نکل کر ان میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

اِدھر تو یہ ہو رہا تھا اور اُدھر عشق کا بھوت حسبِ دستور سر پر سوار، بیرو کو اندھا بنائے لیے پھر رہا تھا۔ جنگلی نیلے کی بو پر وہ چلا آ رہا تھا۔ سب بوؤں سے بے خوف اور بے خبر، آخر وہ اس جگہ آ ہی گیا۔ جوں ہی وہ دونوں پتھروں کے اندر داخل ہوا اس کو یہ سین دکھائی دیا۔ چھوٹی سی نکلی ہوئی چٹان پر ایک طرف نیلا بے حس وحرکت پڑا تھا، دوسری طرف دو زبردست ایک دوسرے میں گتھم گتھا زور کر رہے

تھے۔ بیرو کو بھی اپنی طاقت پر ناز تھا، پھر خطرے کے موقعے پر حملہ کرنا قدرت نے اسے سکھایا تھا۔ اس کا سر نیچا ہو گیا۔ بھاری گردن اینٹھ کر درخت کا لٹھا ہو گئی۔ نومن کا سیاہ جسم اپنا پورا وزن لگانے کو تیار ہو گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر جو لپک کر ایک ٹکر لگاتا ہے تو شیر اور ریچھ دونوں تین پلٹے کھا کر چٹان کے نیچے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر سے قلابازیاں کھاتے نیچے گر رہے تھے۔

ان کے لہو سے رنگی ہوئی چٹان پر بیرو کا کنٹھا پڑا تھا جسے بیرو نے بڑے افسوس سے دیکھا۔ شیر نے ایک پنجہ اس پر بھی چلایا تھا لیکن اوچھا پڑا تھا جس سے صرف کنٹھا ہی ٹوٹا، گردن پر زخم نہیں آیا۔ شیر اور ریچھ ایک ہزار فٹ کی مسافت طے کر کے جس وقت نیچے کی دوسری چٹان سے ٹکرائے تو بڑے زور کا دھماکا ہوا جس کی آواز دیر تک وادی میں گونجتی رہی، اور ابھی یہ گونج ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک دھماکا پھر ہوا اور پھر وادی اور اطراف کے پہاڑ گونج اٹھے۔ اب کی بیرو نے اس نیلے کی لاش کو بھی نیچے دھکیل دیا تھا۔ اب خون آلودہ چٹان خالی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ بیرو وہاں ساکت کھڑا تھا۔ یکایک ''پی قو، پی قو'' کی پیاری پیاری آوازیں اس کے کان میں آئیں۔ مغرب کی طرف بیرو سے سو سوا سو فٹ اونچی ایک چوٹی پر مادینیں کھڑی ہوئی اسے بلا رہی تھیں۔

اور ان میں وہ جا ملا۔

گوری ہو گوری

چوماسے کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے، ٹر، ٹر، ٹر۔ پیپل کے سوکھے ڈگالے پر اُلو کہتا تھا، ہک ہو، ہک ہو۔

بسنتی نے کروٹ لی، پھر منھ پر تھپڑ مارا۔ بولی، "ہائے رے! ارے رام، کیسے ڈانس لاگیں۔"

پیپل پر الو بولا، ہک ہو، ہک ہو۔

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی، "مری جائے! پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا۔"

ہک ہو، ہک ہو۔

"اجی او جی! اجی او جی! اٹھو نا۔ گھگو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔"

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ بولا، "سون دے ری۔ اری نا کھائے لے تو ہے۔"

"اٹھو جی اٹھو۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اڑائے دے۔ اُونہو۔"

مادھو "اُدھ سے تو را ڈر!" کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا۔ جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر پھر نیچے دیکھا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ چھوٹی چمنی کی دھویں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھلملا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا، "جوکا ہوا رے!"

بسنتی گھبرا کر اٹھی۔ بولی، ''اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام! بھیکا کو جگائیو۔ ارے رمکلیا کو جگا لئو۔ ارے ان ہن کی پیڑھی لو۔ پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا، رمکلیا! ہو، اری او رمکلیا۔ سوئے جات رے۔ ارے اُٹھ اُٹھ، او بھیکا۔''

آٹھ برس کی دبلی پتلی رمکلیا جاگی، چھ برس کا بھیکا جاگا۔ دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلائے۔ ''اری میاری۔ موہے لیے لے باپو رے۔ اری میاری۔''

''چپ کرو چپ!'' مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان دیا۔ دور کہیں سے آواز آ رہی تھی: گڑپ، شل شل شل، گڑپ، شل شل شل۔

گھگو بولا، ہک ہو۔

بسنتی روتی ہوئی چلائی، ''ارے پریتم بھیا آئی گئی۔ ارے مورے بچے کی جورے۔''

کھٹولے سے کود، پانی میں چھپھاتے بچے ماں سے چمٹے۔ مادھو اُٹھا، دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی، ''اجی جاوت کہاں ہو جی؟''

باہر سے آواز آئی، ''مادھو بھیا ہو۔ او مادھو! ارے باڑھ آئی۔ اُٹھ رے اُٹھ۔''

شڑپ، گڑپ، شل شل شل۔ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

مم مم، میں، بکری بولی۔ ماں، ہاں آں، ماں ہاں آں، کہیں گیاں چلا رہی تھیں۔ بارہ گھر کے گوجر پُروے میں ہل چل مچ گئی۔ سب جاگ اٹھے، سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا، کوئی چلاتا تھا، کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رمکلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اُٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے چون کی مٹکی اُٹھائی۔ تیرتی ہنڈیا پکڑی۔ مٹکا کترایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا، اسے پیر سے روکا۔ کھٹیا نے سر ہلایا، پھر وہ بھی گھومی۔ دری، بچھورا، کھتری سب کچھ اس پر تھا۔ لو، وہ بھی چلی۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلا رہے تھے۔ گھر کے اندر رمکلیا اور بھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا، ''بھاگو بھاگو! او بسنتی

نکل! ارے مادھو بھاگ!''

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اُچکا، رانوں تک آیا۔

''بھاگو بھاگو! مادھو بھیا بھاگو رے! ارے کا ہوے گیا؟ نکلت کا ہے ناہیں؟'' باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا، پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی، ''ارے مورے گڑوے۔ ارے موری ہنسلی تو نکال لے رے!''

''چل چل، تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون چون تو لیے لوں۔ اُڑھنا پچھورا تو دبائے لوں۔''

پانی کا شور تھا، چار آدمیوں کا چلانا تھا۔ دروازے پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا۔ آدمی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ ''چالو چالو، سب چھوڑو۔ جان ہی بچائے لو۔ چالو۔ چالو۔''

اس گڑبڑ میں، جلدی میں، گھبراہٹ میں، اندھیرے میں دری، پچھورے، کپڑوں کے لیے پکارتی، ناج اور ناج کی کٹھیوں کے لیے پکارتی، برتنوں اور زیوروں کے لیے پھڑکتی بسنتی نے یہ بھی کہا، ''بھیا رے! رمکلیا کو کونو لے لے رے۔'' لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا، ''موں اٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہرے۔''

پانی کی شل شل، رات اندھیری، بادل کی گرج، بجلی کی چمک، کمر کمر سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی، پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا، ہر جانور چلاّ رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا، دوسرا سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا، دوسرا اُبھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پروے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے ہو کر پون میل کے فاصلے پر دور ریل کی اونچی پٹری کا رخ کیا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور بسنتی ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ دودھ پیتی لڑکی اور بھیکا ان کے ساتھ تھے۔ رمکلیا کو بھی کسی نے کوٹھے کے زینے پر سے اٹھا لیا تھا۔ ان کو اس کا اطمینان تھا، مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی جو کہ گاؤں سے باہر کنویں کے پاس بنگلیا پر اس کے سالے کے ساتھ

رہتے تھے۔ بسنتی کو ڈھوروں کی اتنی فکر نہ تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کے لے بے تاب تھی۔ ''ادھر تو وہ اِکلاَ ہی رہتا ہے۔ نہ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے آیا کہ ناہیں۔'' مادھو نے گرتی ہوئی جورو کو سنبھالتے ہوے دہرایا، ''کوؤ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے بروے کھولے کہ ناہیں۔''

اندھیری رات تھی، ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور کمر سے اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر دور اور نزدیک آوازیں ان کی آرہی تھیں۔

''جانکی ہو جانکی!''

''آئے رہوں دادا۔''

''مرلی رے مرلی!''

''بھلا رے بھلا۔ چالے چالو۔''

مادھو بھی بار بار سالے کو پکارتا تھا، ''ناگا او ناگا!'' اور جواب نہ آتا تھا۔ اب پانی میں شور کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے میں پکار کر کہا، ''لین کے لگے نریا ہے نریا۔'' کوئی بولا، ''سنبھلے سنبھلے نکلے چالو۔'' کسی نے کہا، ''ڈٹے رہو بھیا۔ ڈٹے رہنا بھیا۔ آ گئی لین۔''

ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی، ''مادھو بھیا ہو۔ کوؤ مادھو بھیا دیکھو؟''

کسی نے جواب دیا۔ ''بڑا دکھوئی یا۔ ہاتھ لوتو لوکت ناہیں۔''

مادھو نے جلدی سے پکار کر جواب دیا، ''بھلی ہے بھلی۔ آت ہوں۔ بروے لے آیا رے؟ ناگا چلایا، ''بسنتی کتے بولت ناہیں۔''

''ارے ہے رے مورے ساتھ۔ بروے کتے چھوڑے؟ لے آیا رے؟''

''آئے جاؤ۔ آئے جاؤ۔'' آر کے آر کی لائن پاس آ گئی تھی۔ ناگا دو گز پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ڈکراتی بھینسیں، چلاتی گائیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد، سب بھیگے، سب پانی ٹپ ٹپاتے، ریل کی پٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سونی پٹری آباد ہو گئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آ گیا ہے اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی

فکر تھی۔ چھوٹے سے پروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی ہوئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور دو سگے بھائی کُرمی کم تھے۔ بچوں میں رمکلیا کم تھی۔

بسنتی نے رمکلیا کے واسطے اور چمار چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں کرمی بھائیوں کے رشتے داروں کو اطمینان تھا، کیوں کہ ایک تو دونوں تیراک تھے، دوسرے کافی اونچے مکا کے کھیت میں بہت مضبوط اور اونچے مچان پر وہ سوئے ہوئے تھے۔

رمکلیا کی ماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ سب دلاسا دیتے تھے۔ ہر کوئی سمجھاتا تھا۔ رو دھونا، صبر کر۔ شاید دونوں کرمیوں میں سے ہی کوئی آ گیا ہوگا۔ کسی درخت پر ہی لے کر بیٹھ گیا ہو۔ چمار کا لڑکا بھی تو وہیں تھا۔ اس نے ہی تو کہا تھا گودی لے لے گا۔ وہی اس کو لے کر کسی درخت پر چڑھ گیا ہوگا۔ پر ماما کی ماری کیسے چپ ہوتی۔ اس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ ناگا ہچکیاں لیتا تھا اور وہیں پر ان کی گوری گائے کھڑی اڑاتی تھی، تو کاں آں ھ، تو کاں آں ھ۔ یہ بھی دُکھ پیٹی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے نہ جانے، بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دُکھیا روتی ہے، تو کاں آں ھ۔

روتی ہچکیاں لیتی ہوئی بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور روئی۔

''گوری رے، موری رمکلیا... اہھ اہھ اہھ اہھ...

گوری رے، اب تو ہے کون چرائے... اہھ اہھ اہھ اہھ...

گوری رے، اب تو ہے کون کھلائے... اوھ اوھ اوھ اوھ...

گوری رمکلیا تو گئی رے... اوھ اوھ اوھ اوھ...

گوری توری رمکلیا... اہھ اہھ اہھ اہھ...

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی، تو کاں آں ھ۔

کوئی جانے نہ جانے، دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے لے کر آخر صبح ہی کر دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پروے کی طرف اٹھ گئیں۔

سامنے چھوٹا آموں کا باغ تھا۔ اس ہی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پروا آباد تھا، لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ آموں کے درخت تو تھے، مکان بہہ چکے تھے اور اگر کوئی بچا کھچا مکان ہوگا بھی تو درختوں کی آڑ میں ہوگا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے ہل رہے تھے اور پھر ان کے پار، میلوں میلوں جہاں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔ ریل کی لائن کے قریب ہی جہاں پر چھوٹا نالا تھا، پانی کا دھارا تیزی سے چل رہا تھا لیکن پھر بھی چار نوجوانوں نے ہمت کی، لنگوٹی کس پانی میں کود پڑے۔ تیرتے ہوئے آموں کے باغ تک گئے۔ وہاں چمار اور دونوں کرمی بھائی تو موجود تھے، رمکلیا نہ تھی۔ چمار کو تیرنا نہ آتا تھا اور پھر ڈرتا بہت تھا۔ ان لوگوں نے ایک پٹیلا ڈھونڈھ لیا تھا جو کہ درختوں میں الجھ کر تیرتا ہوا رہ گیا تھا۔ سب نے چمار سے بہت کہا کہ اس پٹیلے پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے اور یہ لوگ کھیتے ہوئے اسے لے جائیں، مگر اس کی عقل میں ہی نہ آئے۔ ڈر کے مارے مرا جائے، پانی میں اُترے ہی نہیں۔ بہت سمجھایا، خوشامد کی لیکن راضی ہی نہ ہو۔ اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑ کر چلنے کو تیار ہوں تو پھر بری طرح سے دہاڑیں مار مار کر روئے۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک کی سمجھ میں آ گیا۔ چمار کے درخت پر چڑھ کر اور اس کی گردن پکڑ، مارے کس کس کے جو ہاتھ تو راضی ہوگیا۔ پٹیلے کے تختے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیرتا ہوا سب کے بیچوں بیچ ساتھ ہو لیا اور سب باری باری پٹیلے کو دھکیلتے ہوئے لے چلے۔ رستے میں کسی نے کہا، ''لے اب بہائے رے سانچی سانچی، ناہیں ڈبوئیں دین تو ہے اتے ہی۔'' بچارے نے سب اگل دیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارے ان چار آدمیوں کے ساتھ ساتھ تھا جو کہ مادھو اور اس کی بیوی بچوں کو نکالنے گئے تھے اور بستی کے چلانے پر اسی نے کہا تھا کہ وہ رمکلیا کو گودی لے لے گا، لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے اور وہ اکیلا جو رہ گیا تو ڈر کے مارے سیڑھیوں کے پاس سے ہی لوٹ آیا۔ باہر آیا تو وہ لوگ نہ ملے، پانی اور بڑھ گیا تھا۔ آخر جب باغ میں پہنچا تو اکیلے چلنے کی ہمت نہ پڑی، درخت پر چڑھ گیا۔ یہ سن کر سب نے کہا، ''ڈبوئے دوایسے پاپی کو۔ کیا کرنا لے جا کر ایسے دُشٹ کو۔''

لیکن ڈبویا نہیں بلکہ ریل کی پٹری پر اُتار ہی دیا۔

وہاں سیوا کمیتی کے سچے خدمت گار، کانگریس کے ذرا بڑے اور ذرا مغرور، تھوڑا کام اور بہت

باتیں کرنے والے لیڈر، لال صافے والے پولیس کے اینٹھتے اکڑتے سپاہی موجود تھے۔ مدد ان کی سب ہی اپنی اپنی طرح کر رہے تھے۔ تیل، گھی، آٹا، لکڑی، دال سیوا کمیٹی والے لائے تھے۔ امن انتظامات پولیس والوں کی طرف سے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریاں اور مرہم پٹی کا سامان کانگریس والوں کی طرف سے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہنسی خوشی کھانے پکنے لگے، کڑھائیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ دو چار جن کے اندھیرے میں پانی میں گرتے پڑتے چلنے سے چوٹیں آئی تھیں، ان کی مرہم پٹی ہوئی، لیکن بسنتی کے زخمی دل کی مرہم پٹی کون کرتا۔ مادھو اور ناگا خود ہی پریشان تھے۔ ایک ہمدرد گوری تھی جو رات بھر اس کے ساتھ روئی تھی۔ اب وہ بھی نہ تھی۔ ''کا جانے بھور بھئے کتے چال گئی۔''

جب تک اندھیرا رہا، ہڑپ گڑپ گڑاپ کرتے پانی نے رمکلیا کو خوب ہی ڈرایا اور روتے روتے بے دم گز بھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے اپنی بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے، دوسرے کونے پر ایک کالا سانپ کنڈلی مارے، بل کھایا بیٹھا، دہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے جس میں سے اکا دکا پیڑ کہیں کہیں جھانک رہے ہیں۔ پیچھے آم کا باغ، آدھا ڈوبا آدھا نکلا، طرح طرح کی لہریں اپنے درختوں میں سے نکال رہا ہے۔

ہراس اور خوف سے رمکلیا چلائی اور پھر چلائی۔ ڈری، سہمی، اور چاروں طرف اس نے گھبرا کر دیکھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک وہ تھی اور دوسرا کالا ناگ تھا، اور پانی ہی پانی تھا جس میں پھرکی ایسے گھومتے کٹورے بنتے تھے اور ہڑپ ہڑپ کر کے غائب ہو جاتے تھے۔

رمکلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موند لی تھیں اور ''اری میاری، او میری میا!'' کہہ کر بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی، ''تو کاں آں ھ۔''

رمکلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

''تو کاں آں ھ۔'' آواز پھر آئی۔

رمکلیا نے ''ہرے رام، گوری بولے!'' کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی

نہیں لیکن رمکلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا، ''گوری ہو گوری!''

جواب آیا، ''تو کاں آں ھ۔''

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رمکلیا نے پھر پکارا۔ وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی لیکن دور سے ایک اور آواز آئی، ''او ماں آں ھ۔'' باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکلیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی، پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی، ''گوری ہو گوری!''

''گوری ہو گوری!''

''ارے گوری رے آئے جا۔''

''ہائے رے میا نا ہیں آوت۔''

''گوری ہو گوری۔''

''گوری میا آئے جاری۔''

لیکن گوری نے رُخ نہ بدلا، البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رمکلیا کی طرف دیکھا۔ اڑا کر بولی اور پھر اُدھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آ رہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آ گیا جہاں سر شام وہ، اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ماں بچے کی آواز کا جواب دیتی، تیرتی تیرتی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی، اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی، مگر بچہ نہ چلا، وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آ کر اپنی کمر اور پیٹ سے اسے دھکیلا۔ ایک طرف چلی۔ بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی۔ بچہ چھ فٹ نیچے زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے میں رسی سے بندھا ہوا تھا اور رسی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلاتے بچے کو وہیں چھوڑا اور پھر رمکلیا کی طرف رخ کیا۔

رمکلیا رونے چلانے کی تھکن، ڈر، خوف اور آخر میں انتہائی ناامیدی کا اب تک برابر مقابلہ کرتی رہی تھی لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آ کر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رمکلیا کو ہوش نہ آیا تو پھر لمبی، کھردری گرم گرم زبان سے اس کا منھ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا۔ ''گوری میا، گوری میا!'' کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے، آگے بڑھی۔ رمکلیا چھت سے گھسٹ، پانی میں آ گئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور چمٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آ گئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چمٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس گئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکر کھائے اور چلی، اور جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو پھر لوٹ آئی۔ اب رمکلیا کی بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی، رمکلیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رمکلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹری کی طرف سے دھار چل رہی تھی اس لیے یہ دونوں بہاؤ کی ہی طرف تیرتے چل دیے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے۔ لیکن جہاں گاؤں والے تھے تین میل دور یہ نکلے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دیے تھے اور جب گاؤں کے بہادر تیراک تیرتے ہوئے باغ میں آئے تو وہاں نہ بچھڑا تھا رمکلیا تھی، بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کھچا حصہ بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رمکلیا پیچھے بچھڑا ''او ماں آں ھ'' کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہنچے تو ہل چل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رمکلیا کو گلے لگاتی تھی کبھی بچھڑے کو، اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی اور گائے کہتی تھی، ''تم۔ ماں آں ھ۔ ہم۔ ماں آں ھ۔''

آواز آئی، ''بول گوری میا کی جے۔''

پچاس آوازوں نے جے پکاری۔

پھر آواز آئی: ''بول گئو ماتا کی جے۔''

آئینۂ حیرت

جب دن انگڑائیاں لے لے کر رات پر دست درازیاں کر کے اپنی ساعتیں بڑھانے لگتا ہے تو افسردہ راتوں کو دن بھر کی برسی ہوئی تمازت فضا میں منتشر کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ روزِ گذشتہ کی تپتی ہوئی زمین پوری طرح ٹھنڈی بھی نہیں ہونے پاتی کہ رات کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے۔ اُفقِ مغرب سے روزِ روشن جھانکتا ہے۔ تاریکی شرما کر پہاڑوں، دریاؤں، میدانوں اور شہروں پر سے سمٹتی ہوئی مغرب میں جا چھپتی ہے۔ روزانہ یہی ہوتا ہے۔ رات میں راتیں دنیا کو ٹھنڈا کرنے نہیں پاتیں کہ دن آ کر اور زیادہ آگ برساتا ہے، نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ بتدریج حدّت بڑھتے بڑھتے دنیا تپتی ہوئی بھٹی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

تو پھر میدان تپتے ہیں، شہر جھلستے ہیں، زمین سے لو کے جھونکے اٹھتے ہیں، در و دیوار سے لپٹیں اٹھتی ہیں، مکانوں میں دم گھٹتا ہے، سڑکوں پر ہو کا عالم ہوتا ہے، خاک اُڑتی ہے، لو چلتی ہے، جدھر جاؤ، بھوبل سی جھلستی ہے۔

اس وقت جب کہ میدان خشک ہو جاتے ہیں، پودے جل جاتے ہیں، درخت مرجھا جاتے ہیں، تب بھی مادرِ ہند کے پہلو میں ایک پر سکون ٹھنڈا گوشۂ عافیت ہوتا ہے۔

مردہ، خشک، گرد آلود، تپتے جھلستے، دہکتے چمکتے میدانوں کو چھوڑ کر تلملاتے پرندے جانب شمال اُڑتے ہیں اور کوسوں، منزلوں، شمال پسِ شمال اُڑتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ گھنے سبز جنگلوں کا کنڈل کھینچے، سیاہ دیو ہمالہ سنہرا، روپہلا، ہیرے سے زیادہ چمکتا، برف کا تاج لگائے نظر آتا ہے۔ تھکے

پیاسے، پژمردہ چڑیوں کے جھنڈ چہچہا اٹھتے ہیں۔ آخری منزل کا دم توڑ سپاٹا بھرتے ہیں اور پہاڑوں کے پھیلے ہوئے سبز دامنوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔

یہاں دنیا اور ہے۔ ہوا ٹھنڈی ہے، زمین ٹھنڈی ہے، پتھر ٹھنڈے ہیں۔ پتھروں میں چھوٹے چھوٹے چشمے بہتے ہیں، وہ بھی ٹھنڈے ہیں۔ برف میں جھلا ہوا شفاف پانی، کہیں بوندوں بوندوں ٹپکتا ہے، کہیں منّی منّی نالیوں میں شلشلاتا اور جھلملاتا ہے، کہیں پتھروں کو کتراتا ہوا چٹانوں سے سلوں پر اور سلوں پر سے چٹانوں پر کودتا ہوا پانی چشموں کی صورت میں گنگناتا مسکراتا، ہنستا ہنساتا ہوا بہتا ہے۔ اس کے دونوں طرف چھوٹے بڑے درخت، درختوں کے نیچے جھاڑیاں، جھاڑیوں میں پودے اور پودوں کے نیچے مخملی گھاس اور کائی سب مسکراتے ہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں، بلبلیں اور شامائیں میٹھے میٹھے راگ گاتی ہیں۔ ہر طرف زیست کے سامان ہیں، ہر طرف پھول خنداں ہیں، ہر چیز شاداب ہے، ہر چیز تروتازہ ہے۔ مٹی پر فرش سا سبزہ ہے، پتھر پر کائی کا سبزہ ہے، درخت میں ڈالیوں، پتوں کا سبزہ ہے۔ بڑے بڑے گدالوں پر فرنیں اُگ آئی ہیں۔ گویا اپنی ڈالیوں اور پتوں سے جدا اپنا سبزہ الگ آراستہ کیا ہے۔

اس جانفزا روح پرور آب و ہوا کا طالب کون نہیں؟ پر جس کو اللہ مقدرت دے۔ کیا چوپائے، کیا پرندے، کیا انسان۔ مگر تھوڑے ہی ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کو یہاں تک آنا نصیب ہوتا ہے۔

تپتا ہوا جون کا مہینہ ہے۔ پتھر کی سل، کھولتی زمین، تانبا ایسا صاف دمکتا آسمان، تھپیڑا ایسے جھلتے لو کے جھونکے، جھلکتی چمکتی، چندھیاتی جھلجھلاتی دھوپ ہے، اور تین نفر دھندلے، سیاہ، ہنوز دور اُفتادہ پہاڑوں کی طرف راہی ہیں۔ ایک انسان ہے دوسرا جانور اور تیسرا... تیسرا انسانوں کی گنتی میں ہے نہیں، جانور ہے نہیں... تیسرا ایک ڈھٹیال ہے، مزدوری کے بکھیڑے میں، پیسوں کے لالچ میں، دھوکے میں آکر اس کھولتی ہوئی میدانی دوزخ میں تین دن ہوئے اُتر آیا تھا، اب افتاں و خیزاں واپس جا رہا ہے۔ گرمی کی شدت سے پسینے میں نہایا ہوا ہے، سانس پھولا ہوا ہے، دماغ چکرایا ہوا ہے۔ سرد

پہاڑوں کا رہنے والا، اس کی تو جان پر ہی بن آئی ہے۔ زندہ پہنچ جائے تو بھر پایا۔ کاٹھ گودام کی چمکتی سنسان سڑک پر، جہاں بگولے اٹھتے ہیں، یہ سست قدم چلتا ہے۔ اسی پہاڑی تھمی ہوئی چال میں اُلّو بنا چلا جا رہا ہے۔ اونی کن ٹوپ نما ٹوپی ڈورے سے بندھی سینے پر لٹک رہی ہے۔ سر پر کمّل تہہ کر کے رکھ لیا ہے۔ گھنے جھبرے بالوں پر ایک تہہ اور لگائی ہے۔ پیٹھ پر چونگلے کی ساخت کی ٹوکری بندھی ہے۔ طرح طرح کے اونی چیتھڑے اور گودڑوں کا مجموعہ لبادہ در لبادہ، کہیں پوستین کے ٹکڑے کہیں لبیریں، سب میلے، گندے، پسینے سے تر، پہنے ہوئے ہے۔ ٹانگوں میں موٹے کپڑے کا، میانی کی بے جا مدد سے آزاد سلا ہوا، چوڑے پائنچے اور تنگ مہری کا پاجامہ، اس کے نیچے ٹاٹ، نواڑ، گودڑ وغیرہ کے سے سامان سے بنے ہوئے گول مٹول جوتے نما پھولے پھولے دو خولوں میں پیر گھسائے، آگے کو جھکا، بھد بھد کرتا ہموار سڑک کی چڑھائی کو چڑھتا چلا رہا ہے۔ چینی ساخت کے چہرے میں چپاں ایسی آنکھیں حدت سے سرخ، چیپڑ میں چپچپاتی، دائیں طرف دور افتادہ پہاڑوں کو حسرت سے تکتی ہیں اور پھر نگاہیں سامنے کی سیدھی، نہ ختم ہونے والی سڑک پر پیش قدمی میں دوڑتی ہیں اور وسعت کے گرد و غبار میں جذب ہو جاتی ہیں۔

تپش، پیاس، لو، دھوپ۔ کبھی درخت اُچک اُچک کر ناچتے ہیں۔ سیدھی سڑک بل کھا کھا کر لہراتی ہے۔ کبھی دھوپ کی تیزی بڑھتے بڑھتے سیاہی میں تبدیل ہو کر دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ پہاڑی ڈگمگاتے قدم ڈالتا ہوا رک جاتا ہے۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیک کر جھکا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ بتدریج تاریکی زائل ہوتی ہے، پھر اسی چندھیاتی، چلچلاتی دھوپ میں دونوں طرف کے ننگے پت جھڑے درخت کبڈی کھیلتے اور سڑک سانپ ایسے بل کھاتی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی کچھ آواز سنائی دیتی ہے: غیں غیں۔ درختوں کی آواز ہے کہ سڑک کی؟ درخت بھاگ رہے ہیں۔ دُھند، او جھل، او جھل۔ پھر اندھیرا۔

غیں غیں۔ شاں۔ کھچ۔ زرد رنگ کا بیوک کار تین فٹ پر رُک گیا۔ ''مرا سالا، لو لگ گئی،'' موٹر ڈرائیور نے ذرا چپکے سے کہا۔

شیں شیں، چھن چھن، چھن چھن، شیں شیں، چھن چھن، ریڈی ایٹر کا پانی بولا۔

''ہٹاؤ، ہٹاؤ۔ جلدی کرو،'' اشتیاق علی صاحب قریشی رئیس بدایوں نے حکم دیا۔

کھڑکی کھول، جلدی سے ڈرائیور کودا۔ ڈھٹیال کے پاس جا کر اسے سڑک کے کنارے ڈھکیلنے کے بعد آ گیا۔

ڈگمگاتا، سنبھلتا ہوا ڈھٹیال اپنی زبان میں کچھ کہتا ہوا قریشی صاحب کے پاس سے گذرا۔ انھوں نے نفرت مائل مذاق میں کہا، ''کیوں بے!''

ڈرائیور نے رینگتی موٹر کو روک لیا۔ وہ سمجھا کہتے ہیں ٹھیرو۔ ڈھٹیال سمجھا اس کو بلاتے ہیں۔ پاس آ گیا۔

قریشی صاحب: کیوں بے کیا ہے؟

ڈھٹیال: (سانس پھولی ہوئی) پانی۔ پانی شاب۔

قریشی صاحب: (پیروں میں رکھے ہوئے تھرماس اور خس پوش صراحی کو دیکھتے ہوئے) احمد، ٹین میں پانی ہے۔ دے دو اس کو۔

احمد (شوفر): پانی ہوتا تو ریڈی ایٹر میں ڈالتا۔ کھول رہا ہے۔ (ٹین کو پیر سے ہلا کر) کچھ تو ہے۔ اس کے پینے بھر کو ہو جائے گا۔

احمد نے پٹرول کا ٹین جس میں پانی تھا، اٹھا کر ڈاٹ نکالی اور اندر ہی بیٹھے بیٹھے باہر جھک کر ٹین کو ٹیڑھا کیا اور آواز دی، ''او ساتھی، لے پانی۔ (قدرے آہستہ سے) کھول رہا ہے۔ سالے کو چائے کا مزہ آ جائے گا۔''

ساتھی پر گرم پانی نے آبِ حیات کا کام کیا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ پانی ختم ہو گیا، چلّو اور پانی کے انتظار میں منھ سے ہی لگا رہا اور جب معلوم ہوا کہ اور نہیں ہے تو بھیگے ہوئے ہاتھ منھ پر مل کر بولا، ''ساتھی ولیش جاتا۔ مشکو جانا۔ (قریشی صاحب کی طرف دیکھ کر) مے شلو شاب؟''

قریشی صاحب نے پوچھا، ''ابے تو چلے گا؟ بڑا شوقین! (سیٹ کی طرف اشارہ کر کے) اس میں بیٹھے گا؟''

پہاڑی نے فوراً بند ہی دروازے کو پھلانگ کر اندر گھسنے کو پچھلے ہی حصے کے دروازے پر، جہاں

قریشی صاحب بیٹھے تھے، ہاتھ رکھ اندر کودنے کے لیے ٹانگ اٹھائی۔ قریشی صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹے اور بگڑ کر بولے، ''ارے ارے۔ خبردار! او بے بندر۔ منھ لگایا تو سر چڑھنے لگا۔ کیا میری گود میں بیٹھے گا؟ چل اُدھر جا۔ احمد، دروازہ کھول دو آگے بٹھالو۔'' موٹر پھر چل دیا۔

دور سامنے سڑک کے کنارے پکّے کنویں کی جگت پر تیسرا مسافر حیوان ہی سہی (لیکن نسل انسان کے ارتقا کی پہلی کڑی) ایک بندریا بیٹھی ہے۔ چھپکلی کا سا بچہ، کچے گوشت کا لوتھڑا، تین چار دن کا بچہ سینے سے بے جس چپکا ہوا ہے۔ بندریا جگت پر بیٹھی کنویں کے اندر جھانک رہی ہے۔ اس کے چہرے پر نہایت اہم پریشان کن خیالات کا سا گہرا اثر نمایاں ہے۔ کنویں کے اندر ٹھنڈا شفاف پانی جھلملاتا ہوا مسکرا کر اپنے عقب میں تصویر حیرت بتلاتا ہے۔ ایک دوسرے کنویں کا دائرہ ہے اور اس میں ایک دوسری بندریا بچہ لیے جھانک رہی ہے۔ ادھڑے ہوئے پلستر میں سے چونے کی ایک بہت چھوٹی کنکری بندریا کے ہاتھ سے اندر گرتی ہے۔ ٹپ سے ہوتا ہے۔ سطح آب لہریں لے کر کھلا اٹھتی ہے۔ نقش حیرت ہیجان میں پڑ جاتا ہے۔ پانی... پانی... بندریا پر پانی کا احساس غالب آتا ہے۔ پانی دسترس سے باہر ہے۔ وہ عجلت کے دو کھرونچوں سے سر کھجا کر کنویں کے مونگھڑ پر بیٹھ جاتی ہے۔ چاروں طرف دیکھتی ہے۔

کنویں کی جگت کے نیچے ایک جگہ پر فٹ بھر مٹی نم ہے۔ بندریا کود کر اس پر جا بیٹھتی ہے۔ تر مٹی کو ہتھیلی سے چھوتی ہے، ناخنوں سے کرید کر تولہ بھر مٹی اٹھاتی ہے لیکن فوراً ہی اسے پھینک کر ایک پرانی ماچس کی ڈبیا جو وہاں پڑی ہوئی ہے، اسے اٹھا کر نوچنے کے بعد پھر کنویں کے کنارے جا کر اندر جھانکتی ہے۔ پانی ہے، پانی میں عکس ہے۔ بندریا کی بھنویں پہلے انتہائی حیرت کا اثر، اوپر کھنچتی ہیں پھر غور و فکر کا اظہار، نیچے سکڑتی ہیں۔ لیکن یہ سب ظاہرا نقشے ہیں۔ حیرت اور استعجاب، دُکھ اور تکلیف، محبت اور حسد، محبت اور رشک، ضرورت اور جستجو کے جذبات میں ثمر گناہ پیدا کرنے والی چیز، سوچ یعنی تسلسل خیال سے دماغ مبرا ہے۔ جذبات سطحی ہیں۔ افعال حس حیوانی کے تابع ہیں۔

''شاں'' کر کے موٹر آیا۔ کھچ سے رک گیا۔ ریڈی ایٹر کا پانی کھول رہا ہے۔ شیں شیں، شیں شیں، چھن چھن، چھن چھن، شیں شیں، چھن چھن چھن۔ بندریا دو پھلانگوں میں پاس کے پاکھر

(درخت) تک پہنچ ایک ہی جست میں اوپر کے ٹہنے پر اچک، کچھ دیر موٹر کو کھیسیں دکھاتی ہے اور جب اس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا تو کنویں کی طرف آدھی پیٹھ موڑ کر ان سے بے واسطہ ہو کر مطمئن، سنجیدہ اور متفکر چہرہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔

''اُٹھ بے اُٹھ!'' احمد نے موٹر سے باہر کود کر ڈھٹیال سے کہا اور دو تین دھکوں کے بعد اسے اونچا کر کے سیٹ کے نیچے سے پتلی ستلی نکال کر ٹین میں باندھ کے کنویں پر گیا۔ پانی بھر کر نکالا۔ ریڈی ایٹر میں ڈالنے لگا۔ ڈھٹیال نے جو یہ دیکھا بے تابانہ اپنے کو سمیٹتا، اپنے کو بھینچتا اسٹیرنگ گیئر اور لیوروں میں سے اپنے الجھنے والے چیتھڑوں کو سلجھاتا موٹر سے باہر نکل احمد کے پاس چلّو منہ سے لگا کر بیٹھ گیا۔ ''شاتھی پانی، شاتھی پانی۔''

ساتھی احمد نہایت اطمینان سے ریڈی ایٹر میں پانی بھرتے رہے، یہاں تک کہ ٹین خالی ہو گیا تو وہ پھر کنویں پر گیا۔ ڈھٹیال بھی ساتھ ساتھ گیا۔ جگت کے نیچے چلّو لگا کر بیٹھ گیا۔ ''شاب پانی، شاب پانی۔'' احمد ٹین بھر کر، ڈھٹیال کو وہیں چھوڑ کر، موٹر کی طرف چلے تو قریشی صاحب موٹر میں سے بولے، ''ارے پلا دو، پہلے اسی کو پلا دو۔'' لیکن منہ چڑھے ڈرائیور نے فکر نہ کی۔ پانی ریڈی ایٹر میں ڈالنے لگا۔ ڈھٹیال پھر ان کے پاس آ گیا۔ آدھے سے کچھ کم ٹین بچا ہو گا۔ ریڈی ایٹر منہ تک بھر گیا تو احمد نے پہاڑی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے چلّو لگا کر بیٹھ گیا اور اس قدر پانی پیا کہ ٹین خالی ہو گیا۔ احمد نے کہا، ''سالا پیتا ہی چلا جائے گا۔'' سالے نے اور پانی مانگا۔ احمد نے تیسرا ٹین بھرا اور پھر پلایا۔ جب ڈھٹیال سیر ہو گیا تو ٹین کا پانی وہیں گرا کر احمد اور وہ دونوں موٹر میں آ گئے اور موٹر بھنبھنا کر اور گنگنا کر ایک دفعہ پھر گرد آلود سڑک پر اور زیادہ گرد اڑاتا ہوا سپاٹے بھرنے لگا۔

موٹر کے ہٹتے ہی درخت سے کود کا دبندریا اس جگہ آ گئی جہاں بچا ہوا پانی پھینکا گیا تھا جو کہ قریب قریب سب ہی پیاسی زمین جذب کر چکی تھی۔ صرف پیالی سوا پیالی پانی ہتھیلی بھر کے گڑھے میں باقی تھا۔ اسی پر اگلے دونوں ہاتھ ٹیک کر جھک گئی۔ تھوڑا سا پانی پی کر زمین پر ہاتھ ٹیکے ہی ٹیکے سیدھی ہوئی، سر جھکا کر اپنے بچے کو دیکھا اور پھر پانی پر جھک گئی۔ پانی ختم ہو گیا تو پھر ویسے ہی اٹھی۔ ایک ہاتھ

اٹھا کر ٹھوڑی کے تر بالوں کو کھسوٹا اور پھر جھکی اور پھر سیدھی ہوگئی۔ پانی اب نہ تھا۔ کیچڑ پر آہستہ سے ہتھیلی رکھی اور تر ہتھیلی چاٹ لی۔ دو چار مرتبہ یہی کرنے کے بعد سینے پر چمٹے ہوئے بچے کو جلدی سے ایک ہاتھ سے تھپکی دے، دُم اونچی اٹھا، درختوں کے نیچے نیچے سڑک کے کنارے کنارے چل دی۔

اتنے عرصے میں گرمایا، بھنایا ہوا موٹر لو کے تھپیڑوں سے لڑتا بھڑتا، گرد میں خود لپٹا، گرد اڑاتا، راہ چلتوں پر غیں غیں غراتا، میلوں کو چاٹتا، کوسوں نکل گیا تھا۔ دُور سڑک کے دونوں طرف پتھر کی متعدد چار دیواریاں اور چند مکان کاٹھ گودام کی قربت ظاہر کر رہے تھے۔ پہاڑوں کے پھیلے ہوئے دامن جو پہلے دُھندلے سیاہ تھے، اب سبز درختوں کا لبادہ پہنے نظر آنے لگے۔ دو چار بیل گاڑیاں اور گاہ بگاہ چند اجڑے ہوئے راہ گیر بھی سڑک پر ملنے لگے، یہاں تک کہ نیچی نیچی احاطے کی دیواریں ان کے اندر کیلے اور پپیتے کے درخت اور درختوں کی آڑ میں مکان یکے بعد دیگرے آنے لگے حتیٰ کہ موٹر کاٹھ گودام شہر میں اور پھر بازار میں سے ہوکر گذرا۔ یہاں موٹر نے بہت سے اپنے ہم جنسوں کو دیکھا جن میں کہ لاری قوم کے افراد زیادہ تھے مگر ہمارا موٹر بازار میں سے ہوتا ہوا کئی پیٹرول کی دکانیں چھوڑتا ہوا بغیر رکے آخری پیٹرول پمپ کے پاس جا کر رک گیا۔ یہ دکان شہر کی آخری شمالی دکان تھی جہاں سے آگے اب باقاعدہ چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ موٹر روک کر احمد اُترا۔ رومال سے منھ کی خاک پونچھی، پھر ڈھٹیال کو دھکیل دھکیل کر نیچے اتارا۔ اس کو لو لگ چکی تھی۔ بدن پھک رہا تھا، سینے میں آگ لگی تھی۔ وہ بے چارہ کچھ اور سمجھا۔ چلّو لگا کر پانی کے واسطے بیٹھ گیا۔

احمد "واہ بیٹا مزے میں آگئے!" آہستہ آواز میں کہتے ہوئے موٹر کا پیٹرول ناپنے لگا۔ پیٹرول دینے والا آ گیا تھا۔ چار گیلن پیٹرول موٹر میں ڈلوا کر نہایت احتیاط سے پمپ کی موٹی ربڑ کی نلکی کو سونتنے لگے۔ پمپ والے آدمی نے ڈھٹیال کو غور سے دیکھ کر دبی زبان میں احمد سے پوچھا، "اسے کہاں سے پکڑ لائے؟"

احمد نے کہا، "زبردستی سالا سر پڑ گیا۔ صاحب نے بٹھالیا ہے۔ پانی ہو تو لا کر پلا دو۔ سالا مر رہا ہے۔" اس کے بعد قریشی صاحب کے پاس آیا۔ پوچھا، "کچھ چاہیے؟" صاحب نے اشارہ کیا۔ احمد نے نہایت احتیاط سے صراحی میں سے پانی اور تھرماس میں سے برف ملا کر صاحب کو پانی دیا، پھر خود

موٹر کی آڑ میں پانی پی کر صراحی اور تھرماس کو اپنی جگہ پر رکھ، بچی ہوئی برف کی ڈلیاں اس گال سے اس گال میں گھماتا ہوا اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ڈھٹیال کے واسطے بھی پانی آ گیا تھا۔ جب وہ پی کر آ گیا تو پوچھا، ''کہاں جائے گا؟'' معلوم ہوا بیر بھٹی۔ صاحب نے کہا، ''بٹھالو، کیا ہرج ہے۔''

احمد نے سلف اسٹارٹر پر پیر رکھا۔ موٹر گنگنا کے بھڑ بھڑایا اور آگے کو رینگا، لیکن فوراً ہی لاغر صورت، پریشان بال، جھبری ڈاڑھی کا ایک نوعمر آدمی، سیدھے ہاتھ میں پنسل، الٹے ہاتھ میں بہت بڑا رجسٹر لیے موٹر کے آگے آیا۔ گاڑی روک لی گئی تھی۔ ریڈی ایٹر کی طرف جھکا، غور سے اسے دیکھا۔ ہی ہی، ہی ہی کر کے ہنستا ہوا سیدھا ہوا۔ پنسل اور رجسٹر آگے بڑھا کر نہایت صاف انگریزی میں گویا ہوا: Now then my Lord، لیکن کسی جواب کا انتظار کرنے یا اس سے آگے کچھ کہنے کی کوشش کرنے کے بغیر وہ پھر ریڈی ایٹر کی طرف جھکا۔ اس کے وسط میں غور سے دیکھنے کے بعد پھر ہنسا اور پھر وہی کہا۔

احمد اور قریشی صاحب دونوں نے پریشان ہو کر کہا، ''آپ کیا چاہتے ہیں؟ تم کون ہو؟''

اب اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا There is my card اور پھر بغیر کارڈ نکالے گویا ہوا، ''آپ انگلش میں سوچتے ہیں یا اردو میں؟''

قریشی صاحب تو چپ ہی رہے۔ احمد نے جلدی سے جواب دیا، ''اردو میں بات کیجیے اردو میں۔ آخر مطلب کیا ہے؟''

اس نے جواب دیا، ''بہتر ہے، اردو ہی میں سہی۔ میں آج آپ کو تفکراتِ انسانی کے ارتقائی مراحل کا زندہ اور جاوید نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ گو میں نے تمام دنیا کے انفرادی اور اجتماعی وسوسات اور احساسات کا تنقیہ، تزکیہ اور تبصرہ اس رجسٹر میں نقش کالحجر کر لیا ہے، لیکن پھر بھی اپنے محترم و معظم سامعین کی خاطر یہ خاکسار یعنی پروفیسر دیا شنکر دوبے متخلص وجد جو، تمام عجز و انکساری اس وقت معزز مجمعے کے آگے حاضر ہے فلسفۂ ریڈی ایٹر کو انہماکِ خیال میں تنسیخ دے کر بتائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے پھر وہ ریڈی ایٹر کی طرف جھکا۔

احمد نے کہا، ''الٰہی توبہ! یہ کون صاحب ہیں؟'' قریشی صاحب حیرت زدہ، خاموش تھے کہ اتنے

میں پیٹرول پمپ والا دوڑا اور آتے ہی پروفیسر صاحب کو دھکے دے کر موٹر کے سامنے سے ہٹا کر بولا، ''جلدی نکال لو۔ پاگل ہے پاگل۔'' احمد نے موٹر بڑھایا اور جب پروفیسر صاحب کے برابر سے گذرا تو قریشی صاحب نے دیکھا کہ وہ جسم کے صرف بالائی حصے پر کپڑوں کا استعمال روا رکھتے تھے۔ ٹانگیں دھوتی، پاجامے یا پتلون کے احسان سے شرمندہ نہ تھیں۔

موٹر پھر روانہ ہوا۔ ایک فرلانگ سیدھی چڑھائی پر دوڑنے کے بعد بائیں طرف گھوما۔ سو قدم سیدھا چلا اور پھر دائیں کو چلا۔ اب باقاعدہ چڑھائی کی بل کھاتی، لہراتی، ہر ہر قدم اوپر کی طرف جاتی سڑک شروع ہوگئی۔ موٹر نے دو چار چکر اور کاٹے ہوں گے کہ ایک دفعہ گنگناتا ہوا پھر جو گھومتا ہے تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جاں بخش جھونکا آ کر موٹر کی بلائیں لیتا ہوا نکل جاتا ہے اور پھر دوسرے ہی موڑ پر پل سے گذرتے ہی متعدد اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔ ان کے بعد اور... اور ان کے بعد اور۔ لو ایک ہی منٹ میں رُت بدل گئی، منظر بدل گیا، جان میں جان آ گئی۔ چڑھائی پر ابھی ابھی جب روانہ ہوئے تھے تو سیدھے ہاتھ پر چوڑے نالے کی خشک تلی میں ریتے اور بجری میں بوئے ہوئے جھلتے ہوئے بڑے بڑے پتھر دھوپ میں چمکتے ہوئے آنکھوں کو پتھراتے تھے دوسری طرف آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ کی دیوار سے لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اس پر لگی ہوئی زندہ اور مردہ سبز اور بھوری گرد میں تپتی ہوئی جھاڑیاں گرم آہیں بھر بھر کر گرد اڑانے والی موٹروں کو کوستی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ سب منٹوں میں بدل گیا۔ تر و تازہ، مست، جھومتے ہوئے درختوں، شاداب مسکراتی ہوئی جھاڑیوں، نم ڈھالوں اور ٹپکتی ہوئی چٹانوں کے درمیان موٹر بھاگنے لگا۔ سڑک بل پر بل اور گنڈلیوں پر گنڈلیاں کھاتی، نکلے ہوئے دامنوں پر سے صدقے ہوتی، دھنسی ہوئی کھوؤں کی بلائیں لیتی، ہر ہر قدم پر رخ بدلتی، سیاہ دیوار کوہ پر ہلکی بھوری لکیر سی نظر آنے لگی اور موٹر بھنبھناتا ہوا چھوٹا سا زرد بھنورا معلوم ہونے لگا۔

موٹر کی ان ہر دم چکر گھمیریوں سے جس میں کہ انسان کا جسم خود بھی آزو بازو جھکتا رہتا ہے، اکثر آدمیوں کا جو عادی نہیں ہوتے سر گھومنے لگتا ہے اور استفراغ ہو جاتا ہے۔ بے چارہ ڈھٹیال سب سے پہلے سب سے پہلی سواری پر اسی موٹر میں بیٹھا تھا اور گو ٹھنڈی ہوا سے ہوش و حواس آ گئے تھے

لیکن پیٹ میں بھرا ہوا ڈھائی کنستر پانی اس ہلچل سے بھونچال میں آیا ہوا، سر کے چکروں کا پھسلایا ہوا، منھ کے ذریعے واپس نکلنے کے واسطے طوفان مچائے ہوئے تھا۔ ڈھٹیال کو اس لذت سے بھی پہلی ہی دفعہ شرف حاصل ہوا تھا۔ جوں ہی منھ بھر پانی پہلی ابکائی کے ساتھ نکلا اس نے مزید احتیاط کے واسطے دونوں ہاتھوں سے دبا کر اپنا گلا پکڑ لیا لیکن اس حرکت نے صرف اتنا ہی کیا جو کھلی ہوئی سوڈے کی بوتل پر ہتھیلی رکھ دینے سے ہوتا ہے۔ گھٹ گھٹا کر پھر جو پورے زور سے نکلا تو منھ سے پانی کی دھار سامنے کی گھڑیوں، میٹروں اور لیوروں پر پڑتی چلی گئی۔

احمد نے فوراً موٹر روک کر مگا درست کیا، پھر اسے ناکافی سمجھتے ہوئے جھک کر موٹر کا پمپ اٹھایا۔ وہ ضرورت سے زیادہ شدید معلوم ہوا تو اسے بھی پھینک، اب ایک ہاتھ ماتھے پر اور دوسرا اسٹیرنگ گیئر پر رکھ بے بسی کی تصویر بن کر بیٹھ گیا۔ قریشی صاحب کسی سوچ میں تھے چونک کر ڈپٹے، ''کیا بات ہے جی؟''

احمد نے روتی ہوئی آواز میں جواب دیا، ''قے کر رہا ہے۔''

قریشی صاحب: ارے۔ ارے یہ کیا!

احمد: آپ نے بھی کیا بے کار کی بلا پالی۔ سالے نے سب نجس کر دیا، توبہ توبہ! میرے پیر بھی سن گئے۔

قریشی صاحب: اُتارو۔ اُتارو۔ اُتارو۔

احمد: اُتر سالے، اُتر۔

جس جگہ ڈھٹیال کے بار سے سبک دوش ہونے کے لیے موٹر روکا گیا تھا وہیں پر ایک جگہ بہت چھوٹا سا چشمہ چٹانوں میں سے نکل کر جنگلی اسٹرابریوں میں بل کھاتا، کسی مردِ خدا کے کھوسے ہوئے گھگوار کے پتے پر سے دھار کی صورت میں سڑک کے کنارے کی نالی میں گر رہا تھا۔ احمد نے اسی میں سے پانی بھر بھر کر کچی اور پکی اسٹابریاں کھاتے اور تھوکتے ہوئے موٹر کو دھو کر صاف کیا۔ ادھر سڑک کے دوسری جانب انتہائی مخدوش کھڈ کے کنارے ڈھٹیال بھی پاجامہ کھسکا کے صفائی میں مشغول ہوئے۔ قدرت بہ سرامداد تھی۔ ہر رستے سے لوکی گرمی نکلنے لگی۔ بول و براز اور استفراغ سب

ہی جاری ہوگئے اور اسی حالت میں ان کو چھوڑ کر موٹر روانہ ہوگیا اور موٹر کے روانہ ہوتے ہی جناب اشتیاق علی قریشی رئیس بدایوں کے دماغ سے ہمیشہ کے واسطے ڈھٹیال کا خیال بھی اپنے آپ جدا ہو گیا۔ البتہ مانگ پٹی والے چکنے چپڑے، اُترن کی ریشمی قمیص پہننے والے میاں احمد ڈرائیور کچھ دیر تک ڈھٹیال اور اس کی ماں بہنوں کو زیرلب یاد کرتے رہے، پھر وہ بھی بھول گئے۔ موٹر نینی تال کے میل ۱۹ پر پہنچ گیا تھا۔ سامنے سیمنٹ کے پل کے پار جہاں سڑک قدرے چوڑی ہے وہیں سے ایک راستہ اور نکل کر دو چار بل کھاتا چیڑھ کے درختوں میں ہوتا ہوا سوفٹ کے قریب اور اوپر چڑھ کر قریشی صاحب کے بنگلے میں پہنچ جاتا ہے۔

۲

موٹر کے بیٹھنے والے سنسناتے ہوئے منٹوں میں پہاڑ پر پہنچ گئے لیکن ہماری بندریا ابھی سڑک کے کنارے درختوں کے نیچے نیچے جارہی ہے۔ رفتار سست سہی، پر دُم تنی ہوئی ہے اور چوں کہ ہر ہر قدم پر ایسی عجائباتِ قدرت سامنے پڑ جاتی ہیں جیسے کہ پی ہوئی بیڑیوں کے سرے، کاغذ کے ٹکڑے، کپڑوں کی دھجیاں اور درختوں کی جڑوں میں مکڑی کے جالے وغیرہ، لہٰذا ان کے معائنے اور مشاہدے میں اور بھی زیادہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ پھر ان ہی چیزوں پر موقوف نہیں، سڑک کے درختوں میں جامن، آم اور نیم کے بھی متعدد درخت موجود ہیں جن میں کہ مرتا ہوا بور اور بڑھتے ہوئے پھل بھی موجود ہیں۔ بندریا کے لیے ان کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے۔ غرض یہ کہ اطمینان کے سفر اور ان مشغلوں میں بہت جلد شام ہونے لگی۔ ایک جگہ بکھٹی جامنوں اور کھٹی کیریوں کے بعد نیم کی کڑوی نمکولیوں سے بندریا منھ کا مزہ بدل رہی تھی کہ ایک تلک دھاری مہاتما کا گذر ادھر سے ہوا۔ اپنا پیٹ کاٹ، دو مٹھی چنے بندریا کے واسطے سڑک کے کنارے سرے کی جڑ کے پاس رکھ، خاک اُڑاتے، چنے پھانکتے، چل دیے۔ بندریا نے لو کی گرمی، نمکولیاں اور سوکھا بور بینا چھوڑ سرے کی طرف دوش کی۔ دو مٹھی بھنے ہوئے چنوں کی ڈھیری ان ہی کے لیے حاضر تھی۔ بھوجن سوادِشٹ تھا۔ دونوں ہاتھ چلنے لگے۔ جلدی جلدی ادھر اُدھر گھما کے دیکھنا اور دونوں ہاتھوں سے چنے اٹھا اٹھا کر منھ میں رکھنا شروع کر دیا۔ چنوں کی ڈھیری غائب ہونا

اور بندریا کے دونوں گالوں میں دو غدود اُبھرنا شروع ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں یہ غدود بڑھتے بڑھتے تھیلیوں کی طرح لٹک پڑے۔ چنے اب ختم ہو چکے تھے۔ اِکا دُکا جھانکتے ہوئے یا چھپے ہوئے دُھول میں باقی تھے اور بندریا کبھی سیدھے اور کبھی الٹے ہاتھ سے مٹی کو منتشر کر کے ان ہی کو چن رہی تھی کہ ایک راہگیر اور آتا ہوا نظر آیا۔

گو یہ مسافر قد میں بندریا سے کچھ زیادہ بڑا نہ تھا لیکن تھا انسان اور بڑے ٹھاٹ کے ساتھ تھا۔ سر پر چار بل کھائے موٹے گاڑھے کا صافہ، پیروں میں چونچیں اٹھائے، ایڑیاں لچکائے، کچے چمڑے کا جوتا، کسی اور کھسی ہوئی دھوتی باندھے۔ آنکھوں کی قربت میں آدھے منہ پر کاجل لگائے ٹپکنے پر آمادہ ضدی ریٹنا، پیہم سڑپتا، ایک ہاتھ میں سینٹا لیے دوسرے ہاتھ سے سر پر کی چھوٹی پٹلیا تھامے، بندریا پر نگاہیں جمائے ٹھٹکتا چلا آ رہا تھا۔ جب بندریا اس کی طرف دیکھے تو رُک جائے اور جوں ہی وہ چنے چننا شروع کرے تو وہ رک جائے۔ اسی طرح کرتے کرتے بندریا کے برابر آ گیا۔ اب بندریا نے سر اٹھا کر لڑکے کو غور سے دیکھا۔ لڑکا رُک گیا، سینٹا اٹھایا۔ بندریا نے آزمانے کے خیال سے ایک قدم اس کی طرف بڑھی۔ لڑکا گلا پھاڑ کر چلاّیا، ''ہو دادا! دادا، ہو دادا!'' اب کیا تھا، معلوم ہو گیا۔ لپک کر بندریا اس کے پاس پہنچی۔ لڑکے کی گھگی بندھ گئی، ''ہے ہے ہے ہے!'' بندریا نے ہر ہر قدم پر بھبکی دینے کے تین تین چار چار ڈنڑ پیلتے ہوئے، ایک ایک قدم آگے بڑھنا شروع کیا اور لڑکا ''ہے ہے ہے ہے ہے۔'' کرتا اور سینٹا اپنے آگے ہلاتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی گڑبڑ میں سر پر کی پوٹلی ایسا معلوم ہوا کہ اپنی نشست پر سے ڈر کر بھاگی، سڑک پر لڑھکنے لگی۔ بندریا پوٹلی کی طرف دوڑی اور اسے پکڑا۔ بھنگی بدوش دادا، جن کی اس شد و مد سے امداد طلب کی گئی تھی، بھنگی بیچ سڑک پر چھوڑ، ٹیکن کی چڑیا دار لکڑی ہاتھ میں لیے ''اے تور بہنیاں! اے تور بہنیاں!'' کرتے ہوئے بھاگے۔ بندریا نے ایک ہاتھ میں پوٹلی پکڑ لی۔ تین ہی ٹانگوں پر اُچکتی درخت تک بھاگی۔ لحہ بھر نیچے جست کے واسطے رُکی اور پھر ایک، دو اور تین ہی چھلانگوں میں درخت کی سب سے اونچی ڈال پر بیٹھ گئی، اور حالانکہ دادا درخت کے نیچے کھڑے ''اے تور بہنیاں'' کا وظیفہ اور لکڑی کے چڑیا دار سرے کی گردش بڑے ہی زور شور سے فرماتے رہے، لیکن چوٹی کے اوپر بیٹھی ہوئی بندریا پوٹلی کو نوچ نوچ کر اس میں اشیائے خوردنی اس

طرح کھاتی رہی جیسے اس سے کوئی مخاطب ہی نہیں ہے۔ اور ادھر کچھ دور سڑک کے بیچوں بیچ رکھی ہوئی بہنگی پر، نہ معلوم کہاں سے نکل ایک لال پچھاوے والے جغادری بندر صاحب نہایت اطمینان اور انہماک سے مصروف ہوگئے، گویا بہنگی ان ہی کی ہے اور آپ ٹوکرے میں آدھے دھڑ سے اندر جھکے ہوئے کسی ضروری چیز کی تلاش کر رہے ہیں۔

فلک آشیانی بندریا کو چھوڑ، دادا صاحب اب بہنگی کی طرف متوجہ ہوئے، اور جب جغادری سے اپنی بہن کی شان میں ہتک آمیز جملے برداشت نہ ہو سکے تو انھوں نے بھی جلدی میں جو بھی ہاتھ پڑا لے، تین ٹانگ پر اُچکتے ہوئے ایک دوسرے درخت پر آسن جمایا، اور چوں کہ ان کے حصے میں تمباکو کی پوٹلی آئی تھی، اس لیے بڑی دیر تک سونگھ سونگھ کر تمباکو نیچے ٹپکاتے رہے۔ یہاں تک کہ بہنگی، دادا، اور تین فٹے پوتے نظروں سے غائب ہوگئے۔ اور جب بندر اور بندریا دونوں اپنی اپنی پوٹلیوں سے فارغ ہوگئے تو بندر تیزی کے ساتھ اور بندریا ڈرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے درخت سے نیچے اُترے۔ اور بھبکیا کر بندر بندریا پر جھپٹا۔

دراصل یہ بندر کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اسی بندریا کا بندر ہے اور انھیں کے لخت جگر بندریا کی گود میں ہیں۔ لیکن چوں کہ یہ صاحب وسیع خرچ، شوقین طبع، خاندانی بندر ہیں، آپ کی دس بارہ بیویاں اور ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے اور بندر کی ٹولی کے سب کے سب مل کر، بغرض سیر و تفریح اور تبدیل آب و ہوا، گرمیوں میں پہاڑ پر جا رہے ہیں اور دوران سفر میں بندریا کے بے موقع زچہ خانے کی وجہ سے اسے تنہا چھوڑ کر ہی آگے بڑھ جانا پڑا تھا اور چوں کہ بندروں کی اس ٹولی کی رفتار بہت کم تھی (جیسا کہ ہونا چاہیے) اس لیے بندریا زچہ خانہ، چھٹی چلہ سب سے ایک ہی ساتھ جلد فارغ ہو، پھر روانہ ہوگئی تھی اور اب ٹولی کے پاس آ گئی تھی جس سے کہ کچھ دور پر ٹہلتے ہوئے بندر سے اب ملاقات ہوگئی تھی۔

جغادری صاحب ان سے بے حد خفا تھے۔ ان کی شکایتیں بھی بجا تھیں: بے وقت کا زچہ خانہ، پیچھے رہنا، دیر میں آنا وغیرہ وغیرہ۔ خوخیاتے، بھبکیاتے پہنچے اور بری طرح بندریا کی خبر لی۔ انتہا یہ کہ دُم پکڑ پکڑ کر کھینچی (جو کہ انسانوں میں عورت کی چوٹی پکڑ کر کھینچنے کے برابر ہے)۔ بندریا نے سب ہی طرح معافی مانگی، ہاتھ جوڑے، اپنی مجبوریاں پیش کیں، اپنے عذر بیان کیے۔ لیکن کس طرح سے

بولی، اور لفظوں میں نہیں، جھرجھریاں لیں، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ''قی قی قی قی'' کی اور جب بھی ظالم بندر کو رحم نہ آیا تو چاروں ہاتھ پیروں کو سمیٹ پیٹ کے بل زمین پر لیٹ، منھ اونچا کر، دونوں باچھیں کانوں تک پھاڑ کچ کچ، کچ کچ، قی قی، کچ کچ، کچ کچ، قی قی کرنے لگی۔ اور جب (اللہ کی پناہ) دُم کھینچی گئی، پیشاب خطا ہو گیا (ماربری چیز ہے)۔ خیر، بہ ہزار خرابی بندر صاحب کا غصہ، جو رہ رہ کے واپس پلٹتا تھا، دفع ہوا اور جب دونوں میں کچھ میل ہو گیا تو بندر کے پیچھے پیچھے بندریا اس طرف روانہ ہوئی جہاں بندروں کی ٹولی نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

سڑک سے سوگز کے فاصلے پر، نالے کے پار، چھوٹی بڑی جھاڑیاں اور معمولی قد کے درختوں سے گھرا ہوا برگد کا شاندار پیڑ، جٹیں اور ڈاڑھیاں لٹکائے، بڑے تنے کے علاوہ دس بیس اور ستونوں کا سہارا لیے، گہرے سبز پتوں کا سایہ کیے، کچی پکی برگدیوں سے لدا ہوا، دو منزلہ، سہ منزلہ، عالی شان محل سا کھڑا ہے اور اس میں بندر لوگوں کا قیام ہے۔

کیا چہل پہل ہے، کیسی رونق ہے، کیا زندہ دلی ہے۔ برگدیاں کھائی جا رہی ہیں، کھیل کود ہو رہے ہیں، کہیں ورزش ہو رہی ہے، کشتی لڑی جا رہی ہے، جھولا جھولا جا رہا ہے۔ دوسرا برابر کی ڈالی سے اُچک، اس کے پیر پکڑ، اس سے نیچے پیروں میں لٹک جاتا ہے۔ لو ایک کے اوپر دوسرا، دونوں جھول رہے ہیں۔ اوپر والا ڈالی چھوڑ دیتا ہے۔ دونوں گدابد نیچے گرتے ہیں، اور گرتے ہوئے اٹھ کر بھاگتے ہیں۔ کوئی کسی کو نوچ کر بھاگا ہے، وہ اس کے پیچھے دوڑا ہے۔ یہ ڈال ڈال ہے تو وہ پات پات ہے۔ ایک صاحب موٹے ڈگالے پر چت لیٹے دونوں ہاتھ سر کی طرف پھیلائے ہوا کھا رہے ہیں۔ (کروٹ لیں تو نیچے)۔ ایک بندریا بندر کی جوئیں پا رہی ہے۔ بندر صاحب ہاتھ سر کی طرف پھیلائے بغل کھولے بیٹھے ہیں۔ بندریا کا منہ پلچ پلچ چل رہا ہے۔ دو ایک جوئیں اصلیت میں اور سینکڑوں تصور میں کھا رہی ہے۔ ایک اَور بندریا ان کو رشک سے دیکھ کر آہستہ آہستہ قریب آتی ہے۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر بندر کی پیٹھ چھوتی ہے۔ دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کو بھی یہ شرف حاصل ہو سکتا ہے، لیکن نہیں، بندر لیٹے ہی لیٹے خو خیاتا ہے۔ معتوب جورو اُچک کر دور ہو بیٹھتی ہے۔ مد نظر لاڈلی انچ بھر اور قریب

کھسک، دُگنی تیزی سے پلچ پلچ منہ چلانے لگتی ہے۔

دو بچوں نے بازی بدی ہے، کشتی لڑ رہے ہیں۔ ماں پاس بیٹھی موزہ بن رہی ہے... ارے توبہ! بے کا گھونسلا نوچ رہی ہے اور غرور سے ہونہار سپوتوں کو دیکھ رہی ہے۔ سپوت ذرا کم عمر ہیں۔ دونوں ہاتھ اونچے کرکے پچھلے پیروں پر کھڑے ہوکر لڑنے کو تیار ہوتے ہیں۔ ایک تناسب سے بھاری سر کا جھونک بگڑنے سے اپنے آپ چت گرتا ہے، دوسرا اپنی ہی نامعقول دُم کو جو بلاوجہ سامنے آجاتی ہے پکڑ کر کھینچتا ہے اور لامحالہ وہ بھی لڑھک جاتا ہے۔ ایک صاحب ان دونوں کے سر کے اوپر پیروں سے ڈالی پکڑے اُلٹے لٹکے ہر لمحہ ان پر گرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اور چوں کہ بندر لوگ بھی ہم لوگوں کی طرح زندگی کے صرف چار اہم مقاصد پورے کرتے ہیں — یعنی پیدا ہوتے ہیں، پیٹ پالتے ہیں، پیدا کرتے ہیں اور پھر مرجاتے ہیں — اس لیے ان میں بھی چند بدنصیب، غم زدہ اور مردہ دل ضرور ہونا چاہییں، اور ہیں بھی۔ ایک بندریا سات دن سے مرا ہوا بچہ دبائے دبائے پھر رہی ہے۔ ابھی بچے کا سر ٹیک پڑا ہے، اسے غور سے دیکھ رہی ہے۔ (دل کی کیا حالت ہوگی۔) ایک بوڑھی بندریا، جس کے بہت سے نواسے پرنواسے اس ٹولی میں کھیل کود رہے ہیں، بڑ کے درخت کے پاس اکڑوں بیٹھی ہے۔ لمبے ہاتھ گھٹنوں پر ٹکے ہوئے آگے پھیلے ہیں۔ بدن پر چمکتی ہوئی پوستین کے بجائے لمبے اور چھدرے بال بے ترتیبی سے منتشر ہیں۔ لٹکی ہوئی بھنوؤں کے نیچے آنکھیں معمول سے کہیں زیادہ اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ یہ گھنٹوں ایک جگہ نگاہیں جمائے اسی حالت میں بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی سوکھا پتا ہوا میں تلملاتا اس کے کان کے پاس سے گذرتا ہے تو سر ایک طرف جھکا، پتے کو گر جانے دیتی ہے اور پھر ویسے ہی بیٹھ جاتی ہے:

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں یاں بیزار بیٹھے ہیں

زندگی! پرعیش و پرکیف زندگی، بچپن کی پرسحر بے فکر زندگی، جوانی کی مست زندگی! کیا تو اسی واسطے عطا ہوئی تھی کہ وقت آخر تیری یاد کے تازیانے پشت خمیدہ کی دھجیاں اڑائیں؟ مگر نہیں، یہ تو میں اپنی حالت لکھ گیا۔ کھری کھٹیا پر بیٹھا، حقے کی نَلی منہ سے لگائے، ناک پر رکھی عینک کا ڈورا اس کے گرد

لپیٹے، ہاتھ میں پنسل، سامنے بادامی کاغذ کا رجسٹر رکھے، ڈاڑھی کھجا کھجا کر من گھڑت قصے لکھتے لکھتے گھنٹوں کے لیے غائب ہو جاتا ہوں۔ یاد، یاد، بچپن اور جوانی کی یاد۔ گذشتہ زندگی کے نقشے پھر سے کھنچتے ہیں اور اسی سینما کو دیکھتے دیکھتے چونک پڑتا ہوں۔ کھٹیا پر بیٹھا ہوں، حیرت کا قصہ لکھ رہا ہوں۔ بڈھی بندریا کا بیان ہے۔ تو اے بندریا، بڈھی بندریا، تو خوش قسمت ہے۔ بڑھاپے کے تھکے ہوے ہاتھ پیر، دُھندلی آنکھیں، کمھلایا ہوا دل تجھ کو گھنٹوں اس حالت میں بٹھاتا ہے تو بٹھائے۔ تیرا دماغ یادِ ماضی سے پاک اور فکر فردا سے مستغنی ہے۔

بے شک تو خوش قسمت ہے، اور میں بدنصیب کانپتے ہوے ہاتھوں سے چند پیسوں کی اجرت کے واسطے لکھ رہا ہوں کہ بندر بندریا کو ساتھ لیے ہوے بندروں کے اس قافلے میں داخل ہوا۔ فوراً ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جو درخت پر تھے نیچے آ گئے، جو نیچے تھے اوپر چڑھ گئے۔ خوخیانے اور قوقوانے میں دو متضاد جذبے، نفرت اور محبت کے اظہار ہر طرف سے ہوے، اختلاف رائے کی وجہ سے کئی جگہ جنگ چھڑ گئی۔ بچے گودوں میں چھپا لیے گئے۔ لیکن جس قدر جلد یہ بدامنی پھیلی تھی اتنے ہی جلد پھر امن اور سکون ہو گیا اور بندریا اپنی ٹولی میں باقاعدہ داخل ہو کر اس ٹولی کا ایک جزو بن گئی۔

اس ٹولی نے اس دن شام تک اسی درخت کی برگدیاں کھائیں، نالے کا پانی پیا اور رات کو یہیں قیام کیا اور دوسرے دن صبح کوچ بول دیا۔ سڑک کو چھوڑ، شمال مغرب میں سب سے قریب نظر آتے ہوے پہاڑ کے دامن کی طرف بندر لوگ چل دیے۔ پھل پھول کھاتے، گھونسلے اُجاڑتے، ڈالیاں توڑتے، اُچکتے، لڑتے بھڑتے، خوخیاتے، چلاتے، روز بروز پہاڑ کے اوپر ہی چڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ دس دن کے بعد پانچ ہزار فٹ اوپر پہنچ کر نینی تال کی سڑک پر میل ۱۸ اور میل ۱۹ کے درمیان اخروٹ کے درختوں میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اتنی اونچائی کی آب و ہوا بندروں کو ہرگز خوش گوار نہ تھی۔ اتفاقاً یہاں تک آ گئے تھے اور غالباً آتے ہی واپس لوٹ جاتے، لیکن کچے اخروٹوں اور نیلی مکوئیوں کی لذت ان کو چند روز یہاں روکے رہی۔

بارش پہاڑوں کی چوٹی پر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ گاہ بگاہ ہلکے چھینٹے پڑتے رہتے تھے۔ اس

واسطے ابھی سردی بھی خوش گوار تھی۔ دن تو بہت ہی پر لطف تھے البتہ راتوں کو بندروں کے واسطے ٹھنڈی ہوا کی جھونکے کبھی کبھی تکلیف دہ ہو جاتے تھے، لیکن یہ لوگ سکڑ سکڑا، کوں کوں کرتے ہوے، ایک دوسرے سے اس قدر چمٹ کر بیٹھ جاتے تھے کہ کافی بچاؤ سا ہو جاتا تھا اور اسی طرح صبح ہو جاتی تھی۔ پھر صبح ہوتے ہی، سورج کی گرم کرنوں میں رات کی تکلیفیں بھول کر، پر فضا پہاڑوں کی سیر و تفریح میں لگ جاتے تھے۔ اس مست کن آب و ہوا نے بندروں کو، جو بہت ہی زندہ دل ہوتے ہیں، اور بھی زیادہ زندہ دل کر دیا تھا۔ ہر ایک خوش و خرم تھا۔ ہر ایک کے دل میں شرارتوں کی گدگدیاں رہ رہ کے پیدا ہوتی تھیں، یہاں تک کہ بڑھیا میں بھی زندگی کی ہلکی سی لہر پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی کسی ڈھال پر بیٹھے بیٹھے ایک آدھ پتھر لڑھکا کر اس کا دور تک لڑھکتا چلا جانا اور لڑھکنے میں متعدد اور چھوٹے بڑے پتھروں کا اپنے ساتھ شریک کر لینا دیکھا کرتی تھی۔ ادھر ہماری بندریا کا نوزائیدہ بچہ، جس کو میں نے کنویں اور سڑک پر گھنٹوں ایک ہی تھن منہ میں دبائے، بے حس، سینے سے چمٹا دیکھا تھا، پہلے پہلے تو کچھ ہشیار سا ہو گیا اور اب تو ماں کی گود سے اتر کر کچھ کچھ اُچکنے اور پھدکنے بھی لگا ہے، لیکن ہے ابھی بہت چھوٹا۔ ہر عضو تناسب سے الگ ہے۔ بہت بڑا سر، ذرا سا پنڈخی ایسا پیٹ، اس میں چار ہاتھ پیر، ایک دُم — یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانچ سینٹے لگے ہوے ہیں۔ جھریوں دار لال لال منہ میں سرمہ دار آنکھیں، سر پر مانگ نکلی ہوئی۔ ایک دفعہ دودھ پیتے پیتے ماں کی گود سے کود کر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے۔ ماں، جو کہ سڑک کی نالی سے تین فٹ دور بڑے سے پتھر کے نیچے بیٹھی اس کی جڑ میں سے تپتیا چڑ پٹے کے پتے نوچ نوچ کر کھا رہی ہے، بغیر رُخ بدلے دوسرا ہاتھ بڑھا کر بچے کی دُم پکڑ کر پھر اسے اپنے قریب کھینچ لیتی ہے۔ بڑی دیر سے یہی ہو رہا ہے۔ بندریا کی پشت کی طرف ڈھال اور ڈھال پر کے پیڑ اور جھاڑیوں پر بڑی دور تک بندر پھیلے ہوے پُر امن مشغلوں اور کھیلوں میں مصروف ہیں۔ ان میں سے ایک سیانا بچہ کئی دفعہ بندریا کے پاس آ کر اس کے بچے کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے بہکا کر لے جانے کی کوشش کر چکا ہے اور آخری مرتبہ اس حرکت پر بندریا نے کئی بھبکیاں دے کر اسے ذرا دھمکا بھی دیا ہے، مگر یہ کب مانتا ہے، پھر چپکے چپکے بندریا کی پیٹھ کے پیچھے بڑھ رہا ہے۔ منا بچہ دو پیروں پر کھڑا، اماں کے کندھے پر سے اس آوارہ چھوکرے کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ دوستی کرنے کو

دل چاہ رہا ہے۔ ماں کے کندھے پر چڑھنے کو اُچکتا ہے اور ناکامیابی کی وجہ سے بغل کے نیچے سے نکل کر چھوٹی چھوٹی پھدکیاں لیتا ہوا بندر کے لونڈے کی طرف بڑھتا ہے۔ ماں چڑپٹا نوچتے نوچتے، گود خالی پا کر ایک دفعہ گھوم پڑتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ وہی بدمعاش کھڑا بچے کو پھسلا رہا ہے۔ غصہ آ گیا۔ اس کے پیچھے لپک ہی تو پڑی۔ لیکن ایک اور صرف ایک ہی گز بچے سے آگے ہوئی تھی کہ وہ وہیں رُک گئی۔ بچے کی طرف سر گھما ہی رہی تھی کہ ''دناں نانا دن دن... '' اوہ، یہ کیا ہوا؟ کان کے پردے پھٹ گئے۔ دل دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اُچک پتھر پر، وہاں سے اُچک درخت پر، اور پھر اچک اور اوپر۔ بندریا بچے کو چھوڑ درخت کی پھونگ پر تھی۔ باقی بندر جہاں کے تہاں تتر بتر بھاگ رہے تھے۔ زن سے ایک آدمی بڑے پتھر کی آڑ میں سے نکل بچے کے پاس آیا۔ بچہ زمین پر اوندھا پڑا کھیسیں نکالے کچ کچ، کچ کچ کر رہا تھا۔ بندریا درخت سے پتھر پر کودی۔ احمد نے دو فیر بارہ بور کے اور کیے: دَن، دَن۔ بندریا پتھر سے درخت پر اور درخت سے پتھر پر کودنے لگی۔ دو جغادریوں نے کبھی ادھر لپکتے ہوئے اور کبھی ڈر کر بھاگتے ہوئے خوخو، قوق، خوخو کی پُر وحشت صدائیں نکالیں۔

بندروں کا پورا قبیلہ خوخو، قوق، خوخو چلانے لگا۔ ادھر احمد نے جھک کر بچے کو اٹھایا، ادھر ساں سے پھسلتا ہوا زرد موٹر پتھر کے پاس آ کر رک گیا۔ ان سب واقعات میں ابھی دس سکنڈ بھی نہ لگے ہوں گے کہ احمد بچہ دبائے موٹر میں کودا اور قریشی صاحب، جو اَب خود ڈرائیور کر رہے تھے، اسے لے کر سنسناتے ہوئے چل دیے۔ اب بندر ہزار دوڑ دھوپ کریں، کیا ہوتا ہے۔ بیسیوں موٹر کے تعاقب میں خوخیاتے دوڑے لیکن وہاں کیا تھا، سڑک خالی پڑی تھی۔ موٹر کا دھواں تک نہ تھا۔ بندریا بوکھلائے ہوئے بندروں میں ہر ایک کے آگے خوخو کرتی ہوئی، ناچی ناچی پھرنے لگی۔ ہر ایک بندر خود بھی کان پیچھے تانے بھنویں چڑھائے گردن اور پیٹھ پر کے بال کھڑے کیے خوخو کر کے بندریا کو جواب دینے لگے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک اس سے کہہ رہا ہے، ''اے بوا، تم ہی نے کچھ کر لیا ہوتا!''

بوا نے بار بار ہر ایک کو خوخیا اور تی قیا کے، بدن کو جھٹکے دے کر، پیٹھ کے بال کھڑے کر کے، بہادری پر آمادہ کرنا چاہا، مگر سب بے سود رہا اور جب کچھ اور ہوتا نظر نہ آیا تو خوخو، تی تی، خوخو کرتی ہوئی تیزی سے اُدھر دوڑی چلی گئی جدھر موٹر گیا تھا۔ کچھ نوجوانوں نے تھوڑی دور اس کا ساتھ دیا لیکن پھر وہ

بھی لوٹ آئے۔

تپتے میدانوں اور گرد اُڑتی سڑکوں سے بھاگتی موٹر اور اُچکتے خوخیاتے بندروں سے پڑھنے والوں کا دماغ پریشان ہوگیا ہوگا۔ اس لیے ہم ایک پرامن، پرسکون، پرعیش، پرفضا، پروضع، پرتکلف مکان، کرسیوں، میزوں، کوچوں، صوفوں، دریوں، قالینوں، اوٹوں، پردوں، تصویروں، آئینوں، گلدانوں، گملوں، پھلوں اور خوشبوؤں سے پُر پیش کرتے ہیں۔

قریشی صاحب کا مکان، فردوس کاٹج، ان عمارتوں میں سے نہیں ہے جو کہ شاہراہِ عام پر کھڑی اپنی شان وشوکت کی نمائش سر بازار کرتی ہیں، بلکہ چند ہستیوں کی طرح جن کو کہ دولت کی زیادتی خود آرائی اور خودستائش سے بھی بالاتر کر دیتی ہے، یہ زبردست کوٹھی بھی کاٹج (چھپریا) کا تخلص اختیار کیے، شہر سے میلوں دور، سڑک سے ایک طرف چیڑھ کے درختوں میں چھپی کھڑی ہے۔ گویا کہ شہر اور سڑک سے اس کی ہستی کسی طرح زیر بارِ احسان نہیں، یہ خود اپنی تمام ضرورتیں آپ پوری کرسکتی ہے، اور واقعہ بھی یہ ہے۔ اس کے گیرج میں قریشی صاحب کی سیدھی سادی بیوک اور بیگم صاحبہ کی رولز کے علاوہ دو بازاری فورڈیں آبے لونڈے جابے لونڈے کے احکام کی منتظر معمولی ضرورتوں کے واسطے نینی تال، کاٹھ گودام اور بریلی دوڑ بھاگنے کو تیار رہتی ہیں۔ کوٹھی کے احاطے میں سیب، ناشپاتی، آلوچے اور خوبانیوں کے درخت پھلوں سے لدے، چکنے سیمنٹ کے ٹینس کورٹ کے گرد کھڑے، آرائش کی نازک خیالیوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہر طرف گملوں، پودوں، جھاڑیوں، درختوں اور بیلوں میں پھول رنگ و بو میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ پس پشت نہادہ ترکاریوں کا تختہ، دُور افتادہ، مودب، شاگرد پیشے سے اپنی مٹر پھلیاں اور ٹماٹر وغیرہ لٹکا لٹکا کر دل لگیاں کرتا معلوم ہوتا ہے، یا اپنی ہماں گردو پیش کوٹھی نے اب یہی سادگی کا ایک جامہ پہن رکھا ہے۔ باہر سے دیکھنے میں کوٹھی بھی خوش نمائی کی کوشش کرتی نظر نہیں آتی۔ قیمتی لال ٹائل کی ہر طرف سے ڈھلواں چھت سے ڈھکا ہوا ایک ڈھیر سا ہے جس کو قریب قریب ہر طرف سے شیشوں دار کھڑکیوں اور شیشے دار کٹہروں نے گھیر رکھا ہے اور اس میں سے ہفت پہل اور ہشت پہل شیشوں دار کھڑکیاں آگے کو نکلی ہوئی، پھول دار بیلوں کے آنچل سر

پر ڈالے جھانک رہی ہیں۔

چھوٹے سے پورچ نما برآمدے میں، جس کو بیلوں اور لٹکے ہوئے گملوں نے فرن ہاؤس سا بنا رکھا ہے، دھوئے ہوئے سفید رنگ کی نازک خیال، نازک طبع، نحیف الجثہ فردوس بانو بیٹھی نزاکت سے موٹی موٹی ڈکشنری اٹھا کر ''السٹریٹڈ ویکلی'' کا معمہ حل کر رہی ہیں۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر ٹیلی فون سے کچھ دور نیچی تپائی پر، ہلکا آسمانی جمپر سیتی ہوئی، قریشی صاحب کی بیوہ بہن، ٹیلی فون اور بھاوج دونوں سے خوف زدہ، بیٹھی ہیں۔ برآمدے کے وسط میں خاموش سفید پوش ملازم بغیر پیروں کی آہٹ کے سامان لا لا کر شام کی چائے کے واسطے میز سجا رہا ہے۔ برآمدے کے دوسرے سرے پر دو مائیں یا دو ساسیں گو ایک ہی کوچ پر بیٹھی ہیں لیکن ہر طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

سفید رنگ، سادہ پوش، سفید بال، دُبلی پتلی، بے وجہ ہنسنے والی، عقل سے خارج، ہر چیز پر قانع، ہر چیز سے خوش، یہ فردوس بانو کی ماں یا قریشی صاحب کی ساس ہیں۔ چاہیں تو خود مختار گھر کی مالک ہیں، لیکن یہ اپنے اختیارات سے واقف ہیں نہ اختیار برتنے کی خواہش ہی ہے۔

دوسری موٹی، بھدی، زیورات سے آراستہ، رنگین کپڑوں کا پلندہ، کھچڑی سر، سرگیں آنکھیں، بھنویں تنی، منہ ٹیڑھا، قریشی صاحب کی ماں اور اس لیے فردوس بانو کی ساس ہیں۔ خود مہمان طریق آئی ہیں۔ مالکانہ اختیارات ہر ہر لمحہ برتنے کے موقعے دیکھتی رہتی ہیں۔ احکامات جاری کرتی ہیں اور جب اکثر ان پر عمل درآمد نہیں ہوتے تو گھٹتی اور کڑھتی رہتی ہے۔ ان کو ہر ایک سرکشی پر آمادہ اور اُن سے خلاف نظر آتا ہے۔ میاں کی زندگی میں سب راج راج چکی ہیں اور گو وہ، اور ان کے ساتھ دولت، دونوں ان سے جدا ہو گئی ہیں لیکن طبیعت کی رعونت وہی باقی ہے۔ اس وقت بھی مدراسن آئی کو، جو کہ ان کے پاس برآمدے کے کنارے بچے کی جھلواں مسہری ہلا رہی ہے، بری نظروں سے گھور رہی ہیں کیوں کہ اس کو حکم دیا تھا کہ سردی ہو رہی ہے، بچے کو باہر نہ لائے، اور وہ اپنے علم آگہی کو زور دیتی ہوئی، بچے کو ہوا خوری کے واسطے باہر لے آئی ہے اور برابر دہرا رہی ہے، ''بابا لوگ کا کام ہم سے جادہ بی بی تم نئی جانتا۔ ہم کوئی نیا نئی ہے۔ ہم بڑا بڑا میم لوگ پاس کام کیا ہے۔ بی بی تم نئی جانتا۔''

بی بی بھی یکساں بڑبڑا رہی ہیں، ''اے چل! تیری صورت کو جھلسے۔ موئی چمریہ، چلی مجھ سے

زبان درازی کرنے۔ بنی ہے بڑی میم کی بچی۔"

بیوہ لڑکی سے آخر نہ رہا گیا اور جز بز ہو کر کہا، "اماں چپ بھی ہو جایئے!" اور پھر بھاوج کی طرف مخاطب ہوئیں، "اے دلہن، دیکھو تو ٹھیک ہے نا!"

فردوس بانو: (ذرا بگڑ کر) باجی، دلہن دلہن اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کو کئی مرتبہ منع کیا۔ آخر آپ میرا نام کیوں نہیں لیتیں؟

کلثوم: (یعنی نند، کھسیانی ہنسی ہنس کر) ہو گا۔ منھ سے نکل گیا۔ دیکھو تنگ تو نہیں ہو گیا۔

فردوس بانو نے جمپر لے کر دیکھا۔ نہ تعریف کی نہ منھ بنایا۔ "ہاں ٹھیک ہے" کہتے ہوئے واپس کر دیا۔ اتنے میں موٹر آ گیا۔ قریشی صاحب نے اُترتے ہی احمد کے ہاتھ سے بندریا کا بچہ لے لیا اور اسے لیے ہوئے بڑے زور سے آگے بڑھے۔ "لیجیے بیگم،" کہتے ہوئے بچے کو، جو دونوں ہاتھوں سے کوٹ پکڑے بغل میں گھسا جاتا تھا، کھینچ کر آگے بڑھا دیا۔ بچہ دانت نکالے قیں قیں کرتا دہائی دینے لگا۔ بیگم صاحب اخبار پھینک، ساری سنبھالتی ہوئی ہال کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ "بھئی اُدھر ہی رہنے دو، اُدھر ہی رکھو!" کہتی ہوئی بڑھیں۔ اندر چھپ جانے اور باہر آ جانے کے نہ طے ہونے والے فیصلے میں پڑ کر وہیں رُک گئیں۔

بڑی بیگم یا قریشی صاحب کی والدہ بولیں، "اچھا کیا میاں، جو لے آئے۔ میں تو کئی دفعہ کہہ چکی تھی کہ بچے کے پاس بندر کی ہوا ہونے سے الا بلا بیماریاں پاس نہیں آتیں۔"

قریشی صاحب: بی اماں، آپ نے بھی کئی دفعہ کہا تھا اور احمد نے بھی مجھ سے کہا کہ بندر پاس رکھنے سے ہوا صاف رہتی ہے۔ دیکھیے آج میں لے ہی آیا۔

یہ کہتے ہوئے بندر کو پھر بیوی کی طرف بڑھایا۔ بیوی نے پھر کمرے میں گھس جانے کے آثار ظاہر کیے۔

امی: (یعنی قریشی صاحب کی ساس) بچے کے پاس لے جاؤ میاں، دیکھو کیا کرتا ہے۔

آیا: (جلدی سے بچے کے سامنے آ کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر) اوہ نئی نئی! بابا لوگ ڈر جائے گا۔ بابا لوگ کے کاٹ لے گا۔

بی اماں: چل چڑیل، بڑی آئی۔ اماں بنتی ہے!

فردوس بانو: اے واہ بی اماں، اور کیا! ڈر تو جائے گا۔ (میاں سے) بھئی ایسے نہیں، بس دور ہی رکھو، دور سے ہوا کیا نہیں لگے گی؟

فردوس بانو اور شاید قریشی صاحب ایک منٹ کے واسطے بھی بندر کی موجودگی بچے کے پاس تو درکنار، اپنے گھر میں بھی گوارا نہ کرتے، لیکن شادی سے آٹھ برس بعد اللہ نے لڑکا دیا ہے۔ ہزاروں منتوں مرادوں کا بچہ اور پھر وہ بھی نہایت کمزور، دبلا پتلا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سوکھے کی بیماری ساتھ ہی لیے پیدا ہوا ہے۔ ماں اور باپ دونوں اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں۔ گو ابھی ڈیڑھ مہینے کا ہے لیکن درجنوں، کوڑیوں طرح طرح کے کھلونے اس کے واسطے آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر ہر تیسرے روز اسے آ کر دیکھتا ہے۔ کوئی کچھ بھی لڑکے کے فائدے کی بات بتا دے، ماں اور باپ دونوں، روشن خیالی کو بالائے طاق رکھ کر، جہالت اور توہم پرستی کے کام کرنے لگتے ہیں۔ اسی لیے بندر کا بچہ انسانوں کے گھر میں آیا ہے۔ دیکھیے کس کروٹ اونٹ بیٹھتا ہے۔

۳

بچے نے آتے ہی ہوا صاف کرنے کی بجائے گندگی پھیلانا شروع کر دی۔ دودھ جب دیا جائے، پیالے میں ہاتھ ڈال دے اور انگلیوں میں سے ٹپکتی ہوئی بوندیں چاٹنے کی کوشش کرے۔ سخت چیزیں کھا نہیں سکتا تھا۔ نرم چیزیں مثلاً گھلے ہوئے کیلے اور کھچڑی اور کھیر، کھائے تو کم اور چاروں طرف لیسے زیادہ۔ ہر ایک اس کے لیے غذائیں، بیٹھنے کی جگہ اور مہذب بنانے کے طریقے دور ہی سے تجویز کرنے لگا اور بے چاری نند کو ان کی آیا گری اس طرح سپرد ہو گئی کہ گویا یہ ان کا ہمیشہ کا ہی کام تھا۔ بیوہ نند نے، جس طرح مغلانی وغیرہ کے اور کام بھی بغیر عذر کیے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اپنے ذمے لے رکھے تھے، یہ کام بھی لے لیا، اور کئی دن کی الٹ پلٹ کے بعد صاحبزادے کے لیے ایک بڑی سی دودھ کی بوتل میں نپل لگا کر ان کے دودھ پینے کا مسئلہ حل کیا۔ ایک چھوٹا سا کھٹولا بھی ان کے واسطے منگا دیا گیا تھا جس پر کہ یہ دودھ پیتے وقت تو ضرور بوتل کے ساتھ لیٹ جاتے تھے لیکن اس وقت کے علاوہ

سوائے رفع حاجت کرنے کے بستر کو کسی اور مصرف کا نہ سمجھتے تھے۔ ہر وقت یہی کوشش رہتی تھی کہ کسی کرسی پر چڑھ کر اس کے ڈنڈوں پر آرام کیا جائے۔ آخر کار سب نے ہار کر، ان کو کمروں کے اندر سے نکال، لڑکے کے کمرے سے ملے برآمدے میں رکھنے کی جگہ منتخب کی۔ وہاں کٹہرے پر چڑھ کر اس کے ڈنڈے پر ان کو بھی آرام ملا۔ گو یہاں کالی کلوٹی مدراسی آیا آتے اور جاتے ان کے ٹیپیں لگاتی رہتی تھی، تاہم کھلی ہوا تو تھی، سامنے کے درخت اور درختوں کے پیچھے پہاڑ تو نظر آتے تھے۔ یہ گھنٹوں بیٹھا پیٹھ اور کمر کھجا کھجا کر اس نظارے کو دیکھا کرتا تھا۔

پہاڑ پر کے ان ہی درختوں میں سے ایک روز اس کی ماں نکلی۔ درختوں سے کود ٹماٹروں میں سے دبکی دبکی چل کر، تین چھلانگوں میں کٹہرے پر آ، اسے سینے سے چمٹا لیا۔ بچھڑے مل گئے۔ ماں کے کلیجے سے بچہ چمٹ گیا۔ زبانیں خاموش رہیں، دل سے دل مل گئے۔ نہ اس نے دنوں اور راتوں اُو اُو کرتے پہاڑوں پہاڑوں مارے مارے پھرنے کی داستان سنائی، نہ اس نے رو رو کر دودھ نہ پینے پر مار کھانے، کھٹولے پر نہ لیٹنے پر مار کھانے، کھیر لینے پر مار کھانے، کرتا نہ پہننے پر مار کھانے، ہگنے موتنے پر مار کھانے کے بیان کیے۔ بس ہوا تو اتنا ہی دھڑکتے ہوئے دو دل مل گئے۔ دودھ پیتے ہوئے بچے کی اوپر اور دودھ پلاتی ہوئی ماں کی آنکھیں نیچے، ایک دوسرے کی روحوں میں جذب ہونے لگیں۔ شام کی روشنی میں چھائے ہوئے ہلکے بادلوں کے سائے میں سوئے سبزے پر بجلی کا کوندا ہوا۔ بچہ چھاتی سے اور چمٹ گیا۔ ماں نے ہاتھ سے اور چمٹا لیا۔ شام ہو رہی تھی، موقع مخدوش تھا، بسیرے کا وقت آ گیا تھا۔ بندریا نے درختوں کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ جنگلے سے نیچے بھی نہ اُتر سکی تھی کہ ''کی کی، کی کی'' کرتا ہوا بچہ سینے سے الگ کھنچ گیا۔ وہ پھر کٹہرے پر چڑھی، بچے کو سینے میں دبایا اور پھر اُترنے لگی لیکن بچہ پھر ''کی کی'' چلایا اور اس نے کمر پر بندھی رسی ہاتھ سے پکڑ لی۔ (آہ، بچہ بندھا ہوا ہے!) ماں پھر نیچے اتری، رسی نے بچے کو پھر کھینچ لیا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بجلی چمکی، بادل گرجا اور گرج پہاڑوں میں گونجنے لگی۔ شام، شام، بسیرا، گھنے درخت سامنے تھے۔ سر پر بادل چھایا تھا۔ بندریا اور بچے دونوں نے رسی کو کھینچا اور پھر کھینچا، برآمدے کے اندر اترے، رسی تانے تانے ایک چکر کھایا اور کٹہرے پر چڑھ کر بچے کو چمٹا، روانہ ہوئی۔ رسی اب بھی موجود تھی، وہ تن گئی۔ یہ کلکلایا اور کھنچ گیا۔ بڑھتے اندھیرے میں، گڑگڑاتے

بادلوں میں ممتا کی ماری دیوانی بندریا کھمبے کے گرد گھومی، کٹہرے کے جال میں سے نکلی، اوپر چڑھی، اوپر سے کودی، کھمبے کے گرد گھومی، پھر کٹہرے کے جال میں سے نکلی، مگر آہ، رسی سے نجات نہ ملی، بلکہ رسی اور چاروں طرف سے الجھ کر تن گئی۔ اب ہلنا جلنا مشکل ہوگیا۔ بچے کی کمر کٹنے لگی اور وہ بری طرح چلاّنے لگا۔ بندریا کے دل پر وحشت تھی، دہشت تھی، خوف تھا، ہراس تھا، پریشانی تھی، حیرانی تھی، اضطراب تھا، یاس تھی، بے کسی تھی اور محبت کی آگ لگی تھی۔ اندھیرا چھا چکا تھا، بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ اسی حالت میں جھک سے ہوگیا۔ وحشت زدہ بندریا ''خی'' سے چلا کر اُچھل پڑی۔ کسی نے سوئچ لگا دیا۔ بجلی کے تین لیمپوں سے برآمدہ دن کی طرح جگمگا گیا۔ ماں کے ڈر کر زور سے اُچھلنے سے بچے کی کمر میں رسی نے بلا کا جھٹکا دیا۔ وہ ''کی کی، خی خی'' چلا رہا تھا اور کمرے کے دروازے میں مدراسی آیا ''آئی، آئی، آئی مونگ کی، آئی آئی مونگ کی'' چلا رہی تھی۔

بے وفا اقبال وثروت کی پھر نہ ملنے والی تصوری مورتیوں کی پجارن، قریشی صاحب کی ماں، آیا پر بگڑتی، لڑکی کو جھڑکتی، بہو پر کلستی دوڑیں۔

دسترس سے باہر اقبال وثروت کی خوشہ چیں، قریشی صاحب کی بہن، آیا سے جھینپتی، ماں سے دبتی، بھاوج سے ڈرتی دوڑیں۔

اور اقبال وثروت کی روشن خیالیوں سے ناآشنا، سیدھی سادی، قریشی صاحب کی ساس بھی ہنستی ہوئی، ہر ایک سے راضی، سب سے پیچھے آ کر کھڑی ہوگئیں۔

بندریا بھبکیاں دیتی ہوئی برابر پیچھے ہٹتی چلی گئی یہاں تک کہ ملازم دوڑے آئے اور وہ آخری بھبکی دے کر، اخروٹ کے درخت پر چھلانگ مار کر، درختوں درختوں جنگل کو چل دی۔ اور رات کے اندھیرے میں، جب کہ وہ ٹھنڈی ہوا اور بوندوں میں درخت پر دبکی بیٹھی تھی، یہاں فردوس کاٹج میں ریڈی ایٹر کی گرم شعاعوں میں اور شیڈ دار لیمپوں کی چھنی ہوئی روشنی میں کھانا ہونے لگا۔ میز کے گرد قریشی صاحب، ان کی بیوی، ساس، ماں اور بہن بیٹھ گئیں۔ ایک اسٹول پر آیا بچے کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ دروازے کے پاس بند الماری کی کنڈی میں رسی باندھ کر بندریا کے بچے کو جگہ دی گئی اور ہنسی اور باتوں کے ساتھ ساتھ کھانا ہونے لگا۔ آیا بولتی تھی، صاحب ہنستے تھے۔ غرض کہ باتیں، مذاق، ہنسیاں،

ہلکے ہلکے طعنے، جھڑکیاں، اعتراض اور پھر مذاق، پھر ہنسیاں بھی جاری تھیں، اور جب یہ جاری تھا تو بندر کے بچے کا رسی کی حد میں چائیں مائیں، چائیں مائیں، یکساں چکر لگانا بھی جاری تھا۔

بہت دیر کے بعد، جب کہ کھانا ختم بھی ہو چکا تھا، ریڈیو بھی بول چکا تھا، جب کہ بندر کا بچہ خالی غسل خانے میں بند کر دیا گیا تھا، جب کہ گھر والے اپنے اپنے کمروں میں اور ملازم اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں نیند سے بے ہوش ہو چکے تھے، قریشی صاحب نے اپنے نرم گرم ریشم اور اون کے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے دور دو آوازیں سنیں۔ پہلے بندریا کی آواز تھی جس کو کہ بیچ بسیرا ممتا نے بے قرار کر دیا تھا۔ وہ اُو اُو پکارتی درختوں درختوں پھر رہی تھی اور دوسری، بہت دور، دو ہزار فیٹ نیچے بیر بھٹی کے قریب کسی نامعلوم شخص کی زوردار آواز تھی جو کہ چلاّیا: Now then my Lord

اور پہاڑوں نے بتدریج گھٹی ہوئی آوازوں میں جواب دیے۔

Now then my Lord... then my Lord...

اندھیری رات، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور بارش کے خیال سے قریشی صاحب کے بدن میں پھریری آ گئی۔ وہ گرم ریشمی لحاف میں دبکے اور سو گئے۔

دوسرے دن پھر بندریا کوٹھی میں دیکھی گئی، اور تیسرے اور چوتھے اور پانچویں دن پھر۔ کبھی بچے کے پاس، کبھی بچے کو دودھ پلاتے۔ لوگوں نے دیکھا، پتھر مارے، غل مچایا اور بھگا بھگا دیا، لیکن آخر میں یہی رائے قائم ہوئی کہ آتی ہے آنے دو، بچے کو دودھ پلاتی ہے، اپنا کیا لیتی ہے۔ اس طرح بندریا دن میں کئی مرتبہ آ کر بچے کو دودھ پلا جاتی تھی۔ اب اس کے واسطے یہی مشغلہ رہ گیا تھا، کیوں کہ اس کی ٹولی پہلی ہی بارش پر، ہر ہر طرح اس کو ساتھ لے چلنے کی کوشش کرنے کے بعد، اسے اکیلا چھوڑ کر پہاڑوں سے نیچے کوچ کر گئی تھی۔ اب اکیلی بندریا درختوں پر تنہا اُچھل کود کر پھل پات سے پیٹ بھرتی اور دن میں دو ایک مرتبہ بچے کو دودھ پلا جاتی تھی۔ اسی دوران میں ایک دفعہ بچے کے پاس روٹی کے ٹکڑے اور پھل پڑے ہوئے بندریا کو ملے، جو کہ اس نے کھا لیے۔ پھر ایک دفعہ جب یہ دودھ پلا رہی تھی کہ ایک عورت نے برابر کے دروازے میں سے آدھے دھڑ سے باہر نکل، اس کی طرف روٹی کے

ٹکڑے پھینکے۔ پہلے تو یہ ڈر گئی، بچے کو چھوڑ، جنگلے سے کود، دو گز پرے کھڑے ہو کر، کان پیچھے کو تان، ہونٹ سکیڑ، دہانے کو گول دائرہ بنا، خوخو کی بھبکی دی، مگر دو پیروں پر کھڑے ہو کر دیکھا تو روٹی تھی۔ پھر کٹہرے پر آ بیٹھی اور مزید احتیاط کے واسطے کان سکیڑ، سر کو جھٹکا دے، بھبکیوں پر بھبکیاں دیں۔ جب دشمن کا احتمال نہ رہا، دوستی کے ارادوں کا یقین ہو گیا تو نیچے کود، روٹی کھانے لگی۔ اس دن سے اکثر اس کو کھانے کی چیزیں ملنے لگیں۔ دو چار دن بعد بارش نے پورا زور پکڑ لیا۔ سخت سردی پڑنے لگی، پہاڑوں پر کہرا چھا گیا۔ بندریا کو کچھ تو غذا مل ہی جاتی تھی، اب اس نے بھی کوٹھی کا دامن پکڑ لیا۔ یہاں سردی اور پانی سے بچاؤ تھا۔ باغ میں پھل، کیاریوں میں ترکاریاں تھیں۔ بچہ پاس تھا، ایک طرح پر یہیں رہنے لگی، اور فطرت کا تقاضا، پھل پھول، ترکاریاں، کھانے، نوچنے اور برباد کرنے لگی، اور جب اس طرف سے سیری ہو جائے تو گھر کا بھی جائزہ لے۔ کبھی گلدان گرائے، گملے لڑھکائے، کبھی پردے نوچے اور ہال میں سے کشن اُٹھا لائے۔ ان سب پر اضافہ یہ ہوا کہ بچہ تو بندھا ہوا غلاظت کا چھڑکاؤ رسی کے محدود دائرے ہی میں کیا کرتا تھا اور یہ آزادی کی وجہ سے نجاست کی تخم ریزی بنگلے بھر میں کرتی پھرتی تھی۔ تواضع شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد لوگوں کا دل ان سے بھر گیا اور اب طرح طرح سے ان کو بھگا دینے کی کوششیں ہونے لگیں۔ بی اماں آیا پر اور آیا بی اماں پر بندریا کی دوستی کا الزام لگانے لگیں۔ فردوس بانو نند کو قصوروار ٹھہرا کر ان پر کلسنے لگیں۔ نند بے چاری کھسیانی ہنسی ہنس کر چھوٹے چھوٹے نئے نئے طریقوں سے خوشامد کرنے لگیں۔ فردوس بانو کی ماں ہر ایک کو حق بجانب ٹھہرانے اور ہر ایک کی طرف داری کرنے میں اور بھی زیادہ دیوانے پن کا ثبوت دینے لگیں۔ آخر کار جس دن ڈائننگ ٹیبل پر بندریا نے رفع حاجت کر کے واشاٹ کے اوپر قطار میں رکھے ہوئے پورٹ وائن گلاسوں کی جگہ صاف کی تو چھن چھن چھنا چھن کی آوازیں بالکل پسند نہ آئیں۔ احمد کو نادر شاہی حکم دے دیا اور احمد صاحب ریشمی قمیص شلوار اور تلے دار جوتا پہنے، دونالی بندوق اٹھائے اٹھائے، کوٹھی کے گرد پھر پھر کر چھت پر آنکھ مچولی کھیلتے، بندریا کی گھات لگانے لگے۔ فردوس بانو کی سڑن ماں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ٹھونسے اوّل ہر ایک سے باری باری بندریا کے حق میں سفارشیں کیں اور جب سب طرف سے مایوسی ہو گئی تو روتی ہوئی داماد کے حضور میں حاضر ہو کر رحم اور جاں بخشی کی التجا کی۔ ''بیٹا، بندریا کا مارنا برا

ہے۔ ہمارے یہاں تو راس ہی نہیں آتا۔ مجھے تو وہم آتا ہے۔ جیسے فردوس، ابھی اس کا بچہ چھوٹا ہے۔ بیٹا، بندر نہ مارو، اس کا مارنا بہت برا ہے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بلائے گئے، ان کا بہادرانہ جوش ٹھنڈا کیا گیا اور حکم دے دیا گیا کہ جان سے نہ مارا جائے، صرف ہوائی فیر کر کے ڈرا دیا جائے۔ اور بندوق شاگرد پیشے ہی میں رکھی رہے، جب یہ آئے اسے ڈرا کر بھگا دیا جائے۔ بندریا کی بساط ہی کیا۔ بارہ بور کے دھڑاکوں سے اوسان خطا ہو گئے۔ دو ہی دن میں وحشت محبت پر حاوی ہو گئی۔ بندریا نے بنگلے کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔

سخت سردی، سخت بارش، ٹھنڈی ہوا، کہرا، ٹپکتے ہوئے درخت، بھیگی ہوئی گھانسیں، پہاڑوں کی کھوئیں اور کھڈ تھے، اور تنہا بندریا تھی۔ اس کی ٹولی اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ بچہ اس کا جیتے جی چھٹ گیا تھا۔ موسم ہر طرح اس کے خلاف تھا۔ غذائیں نئی تھیں اور کم تھیں۔ بندریا گھنٹوں کسی گیلے، اُگی ہوئی فرنوں کے سبز گدالے پر بھوکی بیٹھی، اپنے سے اوپر اور اپنے سے نیچے خاموش گھومتے ہوئے بادلوں کو دیکھا کرتی تھی، یہاں تک کہ کہرا آ کر پھر سب قرب و جوار کو دھند میں غرق کر لیتا تھا اور اس وقت بے بس بندریا، جو نہ جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، دل پر چھائے غبار کو دھیمی، دبی اُواُو میں کھینچ کھینچ کے نکالتی تھی:

یہ کیا ہوا کہ جدا ہو گئے گلے مل کے
ابھی تو زخم بھی بھرنے نہ پائے تھے دل کے

ادھر بندریا کے بچے کی یہ حالت کہ ماں سے مل کر چھٹنے کا صدمہ تھا۔ ہر وقت اس کے پھر آ جانے کا بے کلی سے انتظار تھا اور جب امید ناامیدی سے تبدیل ہونے لگتی تھی تو وہ بھی اُواُو کرتا تھا اور یہ اُواُو، پُر یاس، دل خراش اُواُو، دوپہر کے سناٹے میں، شام کی خاموشی میں، راتوں کی تاریکی میں، ہر وقت بچے کے سینے سے نکلتی تھی۔ گندگی گو کم ہو گئی تھی اور مالی نقصانات بھی اب نہ ہوتے تھے لیکن صبح اُواُو، شام اُواُو، پہر رات اُواُو، ادھر پہر رات، اُدھر جب آنکھ کھلی تو اُواُو، گھر کا گھر عاجز آ چکا تھا۔

ایک دن چند احباب اور لیڈیز کی ٹی پارٹی کے وقت اس آواز نے بندریا اور بچے کے متعلق باتیں چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ "بندر کے سینے میں قید کی حالت میں بہت جلد

دق کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ بندر کو گھر میں کبھی نہیں رکھنا چاہیے۔''

یہ سنتے ہی قریشی صاحب اور ان کی بیوی دونوں گھبرا گئے۔ اسی وقت انھوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ کل ہی اس بچے کو کہیں دور چھڑوا دیں گے لیکن مہمانوں میں شیلا نام کی ایک نازک اندام، نوعمر، کم پڑھی اور زیادہ روشن خیال، آریہ ورت تمدن اور نئی روشنی کے دو بعد المشرقین سروں کو یکجا کر کے ایک ناممکن مرکب تیار کرنے کی کوشاں، بالکل ایسی لڑکی بھی موجود تھی جیسے کہ اکثر نوجوان آج کل نظر آتے ہیں۔ اس نے بندر کے بچے کو لینے کی التجا کی، جو کہ فوراً قبول کر لی گئی اور اس طرح حیوان کا بچہ فردوس کاٹج کی ذلیل زندگی سے نکل کر اوک لاج میں خدائی کا درجہ حاصل کر کے رہنے لگا، کیوں کہ گوبردھن لال دوبے، آئی سی ایس، کی پری جمال، نازک خیال، نازک بدن شیلا ہنومان مندر واقع تلی تال کے مست پجاریوں کی بے باک نگاہوں سے متنفر ہو کر جیتے جاگتے ہنومان کو پوجا کرنے کے واسطے ہی لے گئی تھی۔

خوب صورت، زبردست، عالی شان اوک لاج میں اعلیٰ انگلش مذاق کے مطابق نہایت قیمتی اشیا سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، سائڈ روم اور پارلروں کے علاوہ ایسے بھی کمرے تھے جن میں آنکھ سے گھری ہوئی رشیوں اور دیوتاؤں کی تصویریں لال رنگ سے دیواروں پر بنائی گئی تھیں، جہاں کی دیواریں اور فرش لپے پتے اور صاف تھے، جہاں منجھی ہوئی پیتل کی جھلملاتی بالٹیوں اور لٹیوں میں پانی دھلی ہوئی چوکیوں پر رکھا رہتا تھا، جہاں اشنان کیے، تلک لگائے، ننگے بدن، دھوتی اور جنیئو پہنے گھر کے بزرگ، تپ اور جپ کرتے دھیان اور گیان میں لگے رہتے تھے، جہاں ستھری تھالیوں میں سیندور، صندل، تلسی، ناریل وغیرہ پوجا کے لیے مہیا رہتے تھے۔ کمرے، جن کے برامدے کے اندر اور باہر مہین سفید دھوتیاں لمبائی میں پھیلی ہوئی سرسراتی نظر آتی تھیں، جہاں دودھ پی لینے سے گندے ہو جانے والے گلاس اور کھانا کھا لینے سے انتہائی ناپاک ہو جانے والے برتن استعمال کے بعد لڑھکا دیے جاتے تھے، جہاں کتا ان کو اس وقت تک چاٹتا تھا جب تک کہ بہت سے جمع ہو جانے کے بعد ایک دفعہ پھر کہار آ کر ان کو مٹی گوبر سے صاف نہ کرے۔ اسی برآمدے سے ملی ایک کوٹھڑی میں دیوار سے ملی ایک کیل گاڑی گئی۔ زمین گوبر سے لیپی گئی۔ تعلیم یافتہ، روشن خیال، فیشن کی دلدادہ، دھرم کی پکی، جدت پسند، ترقی کی حامی، لیڈر منش، ہنومان بھگت، سندر دیوی شیلا اشنان کیے، تر بال بکھیرے، اٹھتی جوانی کو

اکیلی ریشمی ساڑی میں لپیٹے، ایک ہاتھ میں لٹیا لٹکائے، دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر پوجا کے سامان سے بھری تھالی رکھے، ہنومان جی کی پوجا کو آئی۔ بندر کا بچہ پیتل کی ایک طشتری، جس میں اس کو کھانے کو کچھ دیا گیا تھا، دونوں ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھے زور کر رہا تھا۔ فوراً شیلا دیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ چھن چھنانانانا، سر سے تھالی گری، لڑھکی اور چھنچھنائی۔ بندر ہمہ تن گوش شیلا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہاتھ کے بجائے پیر سے تھالی کو پکڑ ہلانے جلانے لگا۔ شیلا عقیدت سے پر، مطمئن، مودب، سامنے بیٹھی پوجا میں مصروف ہو گئی لیکن بندر کو قبل از وقت ہی چڑھاوے کی چیزوں کی فکر ہوئی۔ اس نے رسی کی حد تک بڑھ کر ہاتھ بڑھایا۔ تھالی گو دور تھی، شیلا نے انچ بھر اور دور کھسکا لی۔ بندر نے کھونٹی کے مرکز پر دو نصف دائروں میں چکر کی چہل قدمیاں کیں اور تیسرے ٹہل میں جھٹ کھونٹی کی طرف سر کر، دھڑ بڑھا، پچھلا پیر لمبا کر، تھالی پیر سے پکڑ لی۔ لیکن فوراً ہی اُدھر شیلا نے اپنی طرف تھالی پکڑی۔ زور ہونے لگا۔ شیلا کے بھولے چہرے پر حیرت، غصے اور پریشانی کے آثار آ گئے۔ گالوں پر سرخی، منھ پر گھبراہٹ، ساری سینے سے ہٹ گئی۔ ''اچھا لے!'' کہہ کر تھالی بندر کی طرف دھکیل، سیدھی کھڑی ہو گئی۔ غصے بھری نگاہوں سے بندر کو، جو کہ ناریل، سیندور اور پھولوں میں مصروف تھا، تھوڑی دیر گھورتی رہی اور پھر ناگن کی طرح بل کھائی، بجلی سی کوندتی، تیزی سے کئی کمرے پار کر کے اپنے پرتکلف آراستہ کمرے میں پہنچ کر اس کے دروازے بند کر کے ایک کونے میں لٹکے ہوئے لنکا کے جزیرے کو ہتھیلی پر اڑاتے ہوئے ہنومان کی تصویر کے آگے ہاتھ جوڑ اور آنکھیں بند کر کے بصد عجز و انکسار اپنے ملنے والے پتی پروفیسر دیا شنکر دوبے (جن کے ساتھ پھیرے بچپن ہی میں پھر چکے تھے لیکن ان سے وہ ابھی تک نہیں ملی تھی) کے حق میں دعائیں مانگنے لگی۔

چوں کہ طرح طرح کے لوگ امیدوں میں پھنسے، منصوبے گانٹھتے، طرح طرح سے دنیا کے بکھیڑوں میں اُلجھے، اصل خدا اور اصل خدا کے اٹل منصوبوں سے بے خبر، طرح طرح کے خداؤں کی پوجا میں مصروف رہتے ہیں، اس لیے فردوس کاٹج کے باشندے بھی پرستش میں مصروف تھے اور یہ اتفاق تھا کہ ٹھیک اس وقت جب کہ شیلا ہنومان جی کے گیان میں تھی، یہ لوگ بھی ٹھیک اسی وقت فردوس کاٹج

سے ہزار ڈیڑھ ہزار فٹ نیچے پیر بھٹی کی آبادی میں عجب شاہ کے مزار پر سر عقیدت خم کیے، مرادیں مانگنے اور منتیں ماننے میں مصروف تھے۔ قریشی صاحب مزار کی چھوٹی سی چار دیواری کے باہر اپنی موٹر کی پچھلی سیٹ پر، سگار منہ میں دبائے، آدھے لیٹے اور آدھے بیٹھے، تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھولے، ہلکے ہلکے سگار کا دھواں اڑانے میں مشغول تھے لیکن ان کی چہیتی پری جمال بیوی، جگر پارے، دل کے ٹکڑے، کمزور لڑکے کی تندرستی اور صحت کی دعا ہاتھ اٹھا، آنسو ڈبڈبائے دوزانوں قبر کے پائینتانے بیٹھی مانگ رہی تھیں۔ ان کے ایک طرف مٹھائی سے بھری دوسینیاں ریشمی رومال سے ڈھکی، مٹی کی رکابی میں سلگتے ہوئے لوبان سے روحانیت حاصل کر رہی تھیں۔ ان کے دوسری طرف قبر کے برابر زمین پر پڑا بچہ ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ان سے پیچھے بچے کی طرف احمد بیٹھے بے کار کی چٹکیاں بجا رہے تھے اور لوبان کی طرف فردوس بانو کی ماں بیٹھی لوبان کا متبرک دھواں دونوں ہاتھوں سے سمیٹ سمیٹ کر منہ پر ملنے کی ناممکن کوشش کر رہی تھیں۔ قبر کے سرہانے کی طرف جہاں چھوٹے سے محراب دار دھویں سے کالے طاق میں مٹی کا دِیا شام کے انتظار میں منہ فق بیٹھا تھا، بی اماں کا ڈھیر ہاتھ اٹھائے، آنکھیں مچکائے، من ہی من میں کہہ رہا تھا، ''شاہ صاحب، لڑکے کے دل سے اس جورو کی محبت کم کیجیے اور میری محبت اور عزت اس کے دل میں بڑھایئے۔''

دروازے کے برابر لیکن چار دیواری کے اندر نند کھڑی تھیں اور ان کی گود میں بھاوج کا فر کا کوٹ، بچے کی رضائی، اماں کا دوشالا تھا۔ یہ اُنھیں کو کلیجے سے چمٹائے آنکھیں بند کیے کھڑی تھیں، گویا برسوں کے بعد یہ پیارے ملے ہیں، سینے سے چمٹائے محبت کی سینک لے رہی ہیں، مگر نہیں صاحب، یہ بھی دل میں کہہ رہی ہیں، ''شاہ صاحب، بھابی کے دل میں کچھ ایسا ڈالیے کہ میرا مہینہ کر دیں اور میں سب بکھیڑوں سے الگ اپنے ہی گھر میں بدایوں میں رہوں۔'' دروازے کے برابر لیکن چار دیواری سے باہر مدراسی آیا، کافر سیاہ، جس کو اندر آنا منع تھا، کھڑی ہوئی ہر ایک کو باری باری سیاہ چہرے میں سفید دانت دکھا رہی تھی اور چوں کہ ہر ایک اپنی طرف مصروف تھا لہٰذا موقعے کے منتظر متولی، مجاور یا سجادہ نشین، جو بھی سمجھو، ولی کامل شاہ ولی اللہ صاحب بھی حجرے کے دروازے کے باہر دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے تسبیح میں مصروف تھے۔ آپ کا نورانی گندمی چہرہ تیل میں چمکتا، اوپر کی طرف گنبد نما جال دار ٹوپی،

نیچے کی طرف سیاہ چوکھنٹی ڈاڑھی سے اور دائیں بائیں دونوں طرف بل پر بل کھائے گیسوؤں، پھکنیوں میں وابستہ روحانیت کے تمام مدارج طے کر کے حضور خداوندی میں مصروف معلوم ہوتے تھے لیکن جیسے ہی فردوس بانو نے دعا ختم کر کے آزو بازو دیکھا، آپ ہوشیار ہو گئے۔ فوراً تسبیح ہاتھ میں لپیٹتے ہوئے اٹھے، کونے میں رکھے ہوئے کائی زدہ گھڑے میں زنجیر سے بندھا ٹین کا تاملوٹ ڈال کر پانی نکالا۔ جلدی سے تین کلیاں کر، مٹھائی کی سینیوں کے پاس دوزانو آ بیٹھے۔ مزید لوبان سے مزید دھواں اُڑایا گیا۔ چراغی کے پانچ آنے اور لوبان کے پانچ آنے، نذرانے کا سوا روپیہ لے کر نذرانہ، فاتحہ ہوا۔ چادر چڑھائی گئی، منت کا ناڑا باندھا گیا، اور چلتے چلاتے ایک مرتبہ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے کنپٹی پر سے رخسارِ مبارک پر آ کر ٹہلنے والی گستاخ جوں کو چٹکی سے مسل کر حجرے کی طرف پھر رخ کیا۔ وہاں سے قلم دوات اور کاغذ لا کر پھر بیٹھ گئے۔ کاغذ گھٹنے پر رکھ دعاؤں پر دعائیں پڑھتے ہوئے تعویذ لکھنا شروع کر دیا۔ کئی روز سے مینھ برابر پڑ رہا تھا۔ دوپہر سے رُکا تھا لیکن اب بوندیں پھر پڑنا شروع ہو گئیں۔ باہر کھڑی مدراسن نے شور مچایا، ”آئی، آئی، میم شاب، پانی گرتی۔“ جلدی جلدی سب لوگ موٹروں میں سوار ہوئے۔ شاہ صاحب نے آخری مرتبہ دعا پڑھ کر موٹر میں جھک کر لڑکے پر پھونک ڈالی۔ قریشی صاحب نے اپنا موٹر بڑھایا، پھر احمد نے۔ بیر بھٹی کے چھوٹے سے بازار میں سے جب موٹر نکل رہے تھے تو ایک بیل گاڑی کے سدِراہ ہو جانے سے دونوں موٹر کچھ دیر رُکے۔ وہاں کے ایک مکان کے اوپر سب نے پروفیسر دیاشنکر کو کرسی سے بندھے ہوئے بیٹھے دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے، ”Now then my Lord تو یہی وجہ ہے کہ آپ دیش کے انشکاروں، منشی شتوں کے اونچے وکاش کے جیوسنسار ہوتے ہیں اور ہم چنا شیتا نئی تکتا کلاوڈیا آدمی کے پاپوں سے سمالوچک ہو کر شدھ سوباش ہوتے ہیں۔ آج بھارت کے دی ادھ سمالوچک کے گن گانے کو مان سیک و شون میں پراکٹ کرنے کو موٹر جا رہے ہیں۔“ اتنا کہہ کر پروفیسر صاحب نے جھک کر موٹروں کو غور سے دیکھا اور پھر "Now then my Lord" کہہ کر کچھ اور کہنے لگے۔ لیکن بیل گاڑی ہٹ جانے سے گاڑی پھر چل دی۔ ان لوگوں کو اس پاگل کی باتوں پر سخت حیرت تھی لیکن ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ان کی غیر موجودگی میں فردوس کالج میں ایک اور پاگل اس سے کہیں زیادہ پاگل پنے کی باتیں کر رہا تھا۔ یہ

نوجوان قریشی صاحب کا حقیقی بھتیجا عبدالحکیم تھا جو کہ احمد کی کوٹھری میں اپنا پھیلا ہوا شیو کا سامان، مسکی ہوئی ٹائیاں، ملگجے سوٹ، گھسے ہوئے موزے وغیرہ سمیٹ کر سامان باندھنے میں مشغول یہ شعر بھی پڑھتا جاتا تھا اور مقدر کو کوسنے اور قادرِ مطلق کو گالیاں بھی دیتا جاتا تھا:

''فلک سے ہم کو عیش رفتہ کے کیا کیا تقاضے ہیں

متاعِ بردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہ زن پر

ارے واہ چچا غالب! خوب کہا ہے مگر یار مقدر کی جوتے کاری تمھاری کھوپڑی پر بھی پوری طرح ہوئی ہے ورنہ ہرگز یہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے کیا کہا ہے:

متاعِ بردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہ زن پر

بھئی واہ کیا کہا ہے۔ بڑھؤ کو رہ زن بنا دیا۔ ارے رہ زن نہ سہی تو نہ سہی، لیکن یار ایسے قسام ازل کو الرحمٰن الرحیم کا لقب اختیار کرنا کہاں تک صحیح ہے۔ ارے بھئی قسام ازل، آنکھیں بند کر کے جس کو چاہا جتنا دے دیا، سب تمھارے آگے بے بس ہیں۔ مگر بڑے میاں الرحمٰن الرحیم بنتے تو تم کو شرم آنا چاہیے۔ کیا اسی کا نام رحم اور انصاف ہے؟ آج میں اسی کوٹھی میں راج کرتا ہوتا۔ یہ کوٹھی میری ہونی چاہیے تھی۔ بریلی اور بدایوں کے گاؤں، بمبئی کی بلڈنگیں، بینکوں میں کا روپیہ، سب میرا ہونا چاہیے تھا۔ بڑے بیٹے کا لڑکا میں ہوں مگر واہ، آج پچھتر روپے چھ آنے کی ملازمت پر ہوں اور اس سسری نوکری کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا حرج تھا اگر والد صاحب کچھ دن اور زندہ رہ جاتے۔ کچھ ہی دن اور، صرف ڈیڑھ برس اور زندہ رہ جاتے۔ اچھا اللہ میاں، اگر آپ کو ان کے بلا لینے کی اتنی ہی سخت ضرورت تھی تو بڈھے دادا کو ہی پہلے بلا لیا ہوتا۔ ارے زیادہ نہیں دس پانچ ہی دن پہلے دادا صاحب لڑھک گئے ہوتے تو میں تو مجبور نہ ہوتا۔ کیا بے انصافی ہے، کیا بے انصافی کے قانون ہیں۔ آج میں مجبور ہو کر چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں اور چچا صاحب نواب بنے مزے اڑاتے ہیں۔ ذرا سی سفارش کے لیے آٹھ دن سے شاگرد پیشے میں پڑا ہوں۔ جس دن یہاں آیا تھا تو خیر واقعی برج کے کھلاڑی مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ چلو احمد کی ہی کوٹھری میں ٹھہر گیا۔ لو وہ بھی چلے گئے اور کسی نے منھ سے یہ نہ پھوٹا کہ اب کوٹھی کے کمروں میں سے کسی میں آ جاؤ۔ ذرا سی سفارش کو کہا تو ڈرتے ہیں کہ میری بات جائے گی۔ ہاں بھئی تمھاری بات نہ

جائے، چاہے میں فاقے کروں۔لعنت ہے ایسے چچا پر اور لعنت ہے مجھ پر بھی جو میں ان کے پاس آیا۔ لو دیکھو، آج کا وعدہ تھا کہ کرافورڈ صاحب سے میرے لیے ملیں گے تو چل دیے۔کہاں؟ مزار کی پوجا کرنے۔ارے جب ان بھوؤں کی ہی پوجا سے کچھ نہیں ہوتا تو مٹی کے ڈھیروں کی پوجا سے کیا ہوگا؟"

اسی طرح بکتے ہوے سامان باندھ، مالی کے کندھے پر رکھ، سڑک پر جا، تیز بارش میں بھیگتے ہوے بیچے جاتی ایک لاری میں بیٹھ حکیم روانہ ہوگیا۔راستے میں یہ شعر بھی وردِ زباں تھا:

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کے کیا کیا تقاضے ہیں
متاعِ بردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہ زن پر

۴

انشاءاللہ خاں انشا تو مخولیے ہیں۔ان کا کہنا:

ناچے ہے پڑی عالم لاہوت میں انگلی

محض بے ہودہ گوئی، خالص ہزل ہے۔لیکن دراصل عالم لاہوت کا نقشہ یہ ہے: ستر ہزار برس پورب، ستر ہزار برس پچھم، ستر ہزار برس اتر اور ستر ہزار برس دکھن، ستر ہزار برس اوپر اور ستر ہزار برس نیچے اگر خیال دوڑے تو اس عالم میں کچھ بھی نہیں ہے، خلا ہی خلا ہے، کہیں کچھ نہیں ہے۔اور اس انتہائی تنہائی اور نابودیت کے وسط میں اگر ہے تو صرف ایک چھوٹی سی ٹائم پیس ہے جو عالم لاہوت میں ٹک، ٹک، ٹک کر رہی ہے۔

صدیاں اور قرنیں گذر گئی ہیں، عالم لاہوت کی گھڑی ٹک، ٹک، ٹک کر رہی ہے۔

صدیاں اور قرنیں گذر جائیں گی اور عالم لاہوت کی گھڑی ٹک، ٹک، ٹک کرتی رہے گی۔

جب سیارے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں، جب دنیائیں پاش پاش ہو جاتی ہیں تو عالم لاہوت کی گھڑی تنہا اس وقت بھی ٹک، ٹک، ٹک کرتی ہوتی ہے۔

جب چڑیا کا انڈا گھونسلے میں سے گر کر پچ سے ہو جاتا ہے اور چڑیا چیں چیں، چیں چیں کرتی پھرپھراتی ہے تو عالم لاہوت کی ذات واحد گھڑی اس وقت بھی ٹک، ٹک، ٹک کرتی ہوتی ہے۔

مست شرابی کی بے سری تانوں سے، بھوکے یتیم کی ٹھنڈی سانسوں سے، بیوہ کی سسکیوں سے، حسن پرست نوجوانوں کے قہقہوں سے بے خبر عالم لاہوت میں گھڑی ٹک، ٹک، ٹک کرتی ہے۔

ذات باری کے مذاق اُڑائے جاتے ہیں، اس پر گالیاں پڑتی ہیں حتیٰ کہ جانوروں، پتھروں، مٹی کے ڈھیروں میں خدائی اوصاف لگا کر ذاتِ مطلق کو چڑایا جاتا ہے۔ عالم لاہوت کی گھڑی پھر بھی ٹک، ٹک، ٹک ہی کرتی رہتی ہے۔

کیا شان بے نیازی ہے: ٹک، ٹک، ٹک۔

شیلا سن، فردوس بانو سن، سن اے عبدالحکیم سن:

ٹک، ٹک، ٹک۔

پہاڑوں پر کی بارش میں، بلا کی ٹھنڈی تیز ہواؤں میں، بھیگی ہوئی بندریا، اندھیری رات میں، اندھیرے جنگل کے ایک بھیگے ہوئے ٹپکتے درخت پر بیٹھی ہے۔ برساتی پہاڑی نالہ پاس ہی کہیں اندھیرے میں گڑگڑاتا، دھڑ دھڑاتا، جھر جھراتا بہہ رہا ہے۔ آزو بازو پہاڑ کی سیاہ ڈھالیں اس کی آواز سے گونج رہی ہیں اور نالے کی ان پیہم آوازوں میں سے بھیچ کر نکلتی ہوئی کبھی کبھی بندریا کی دبی ہوئی لمبی آواز سنائی دیتی ہے۔ اندھیرا ہے، بارش ہے، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں، نالہ دھڑ دھڑا رہا ہے، نالیاں جھر جھرا رہی ہیں، اس میں بے کسی کی اُواُو ہے، اور پھر اُواُو ہے۔ لیکن اب کی لمبی دردآمیز اواو کے بعد خی خی۔ یہ کیسی؟ کیا کوئی اسے چھیڑ رہا ہے؟ کیا کوئی اندھیرے میں اس کے برچھیاں چبھو رہا ہے؟ ''اواو! خی خی خی خی!'' کیا بات ہے؟ ضرور کسی تکلیف میں ہے۔ رہ رہ کر اس کے درد سا ہوتا ہے یا کوئی سخت بے چینی ہوتی ہے۔

کچھ جانور اور اس اندھیرے میں حرکت کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ دو چار گلہریاں درختوں سے اُتر کر گھانسوں اور پودوں میں کھسکھساتی مغربی چڑھائی کی طرف جا رہی ہیں۔ اس طرف چند سیئیاں اور خرگوش بھی جا رہے ہیں۔ بسیرا چھوڑ چھوڑ کر چند پرندے بھی گرتے پڑتے پھڑ پھڑاتے ادھر ہی کو اُڑ رہے ہیں۔ بندریا ابھی تک وہیں بیٹھی دردآمیز اُواُو اور پھر گھبرائی ہوئی خی خی کر رہی تھی لیکن اب

وہ ڈالی ڈالی کر کے درخت سے نیچے آ گئی۔ مگر یہ بالکل دوسری طرف اسی طرح آوازیں نکالتی چل دی۔ کدھر جا رہی ہے؟ فردوس کاٹج؟ ہاں ہاں وہیں۔ اندھیرے میں چھپچپاتی برابر اسی طرف چلتی رہی۔ ایک جنگلی بلی بھی اس کو سامنے سے آتی اور دوسری طرف جاتی نظر آئی مگر یہ نہ رُکی اور آخر سوتے ہوئے فردوس کاٹج کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ لیمپ بھی قریب قریب سب گل کر دیے گئے تھے۔ کمروں کے اندر دو تین مدھم روشنیاں معلوم ہوتی تھیں۔ بندریا نے اسی برآمدے میں آ کر اُو اُو کرنی شروع کر دی مگر جب جواب نہ ملا تو خی خی خی کر کے اِدھر اُدھر دوڑی۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے پاس اُو اُو کی، بند دروازوں کے پاس اُو اُو کی، مگر کہیں جواب نہ ملا۔ آہ، بچہ کہاں ہے؟ جلدی اور گھبراہٹ میں خی خی خی کرتی دوڑی پھری۔ چھت پر چڑھی، نیچے کودی، کوٹھی کے دوسری طرف بھاگ کے گئی۔ اِدھر اُو اُو، اُدھر اُو اُو کی اور جب کمروں میں جانے کا راستہ نہ ملا تو پھر کوٹھی کا چکر لگایا۔ گھبرائی پریشان بندریا اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر دوڑی پھر رہی تھی کہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی نظر آ گئی۔ کود اس میں، وہاں سے کمرے میں کرسی پر کودی، میز پر چھلانگی، آتش دان پر اچھلی۔ گلدان گرا دھڑ سے۔ اوئی اوئی کرتی بندریا نے ایک دروازہ اور دیکھا۔ یہ اس میں سے ہو کر کمرے میں دوڑی۔ وہاں بھی گھبرائی بوکھلائی پھری اور اس میں سے تیسرے کمرے میں ٹھیک اس وقت پہنچی جب کہ گھر کے اندر فردوس بانو کی گھگی کی آواز بھی گھر کے باہر کے تمام پہاڑوں پر پھیلی ہوئی بھاری مدھم، خوف ناک گڑگڑاہٹ میں مخلوط ہونے لگی تھی۔

یہ خوف ناک آواز ہزاروں فٹ نیچے سے پیدا ہو کر بتدریج بڑھتی اور میلوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اب کمرے اس آواز سے گونج رہے تھے، دیواریں تھرا رہی تھیں۔ بندریا کی آواز سے جاگی ہوئی فردوس بانو اور فردوس بانو کی آواز سے جاگے ہوئے اَور لوگ، سب اس آواز سے خوف زدہ، اوسان خطا، اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے۔ محبت اور خالص محبت کی ماری بندریا بچے کی تلاش میں سرگرداں پہنچی اور قریشی صاحب کے اکلوتے لڑکے کی مسہری پر پہنچی۔ محبت، محبت اور خالص محبت، جس میں انتقام، حسد، رشک اور نفرت کبھی شامل نہ ہو سکتے تھے۔ دل کے لیے پھائے کی طالب تھی، سینے سے چمٹانے کے لیے بچے کی ضرورت تھی۔ بچہ مل گیا۔ کیسا؟ اور کون؟ اور کس کا؟ اس سے کیا مطلب۔ کپڑوں کو نوچا، رضائی کو

کھینچا اور جلدی سے آدم کے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔ مدراسن بری طرح چلائی۔ بندریا نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا اور وہیں سے جست کی۔ اِدھر دوڑی، اُدھر اُچکی۔ کچھ لوگ اٹھ بیٹھے تھے، کچھ چلا رہے تھے، کچھ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے، کچھ دروازے اور بھی کھل گئے تھے۔ ہڑاہڑ، ہڑاہڑ، ہاؤں ہاؤں سے دل کانپ رہے تھے، دیواریں کانپ رہی تھیں، مکان اور درخت ہی نہیں بلکہ پہاڑ بھی کانپ رہے تھے۔

اس وقت بندریا گھر سے باہر بچے کو لیے ہوے نکلی۔ اب کیا ہو سکتا تھا! پہاڑ گر رہا تھا، لینڈ سلپ ہو رہی تھی۔ پوری زمین، مکان، باغ، درخت، اوپر نیچے کے جنگلوں سمیت، تیزی سے نیچے پھسل رہی تھی۔ سکنڈوں نہیں بلکہ پلکوں حالت بدل رہی تھی۔ زمین جگہ جگہ پھٹی۔ سیدھے درخت اپنی اپنی جگہ ٹیڑھے بکھرے ہوے تھے۔ قریشی صاحب کی کوٹھی کانپی، لرزی، پھوٹ پھوٹ ہو کر بزدل کی طرح اڑاڑا کر بیٹھ گئی۔ دھڑ دھڑ، ہاؤں ہاؤں کی بڑھتی ہوئی تا بہ فلک آوازوں میں گری ہوئی کوٹھی کا ملبہ نیچے دوڑا۔ پیچھے سے گرتے پڑتے سرنگوں درخت دوڑے، ہزاروں من کے پتھر، لاکھوں من کی سلیں دوڑیں۔ یہ سب آپس میں مخلوط ہوے اور نیچے کو دوڑے۔ ہزاروں قد آور درخت، کروڑوں من ملبہ، لاکھوں من پتھر ایک دوسرے پر گرتے، پلٹے کھاتے، ٹوٹتے، توڑتے، مسمار ہوتے، خود تباہ ہوتے اور سامنے کی ہر چیز کو تباہ کرتے گر رہے ہیں اور گرتے چلے جا رہے ہیں، اور ان ہی میں، ان آوازوں میں، اس اندھیرے میں، لاکھوں لڑھکتے ہوے پتھروں میں، تیز پھسلتی ہوئی سلوں میں، مشت خاک تین ٹانگ کی بندریا ہے (کیوں کہ ایک ہاتھ سے بچے کو تھامے ہے)۔ چھوٹے پتھروں سے کتراتی ہے، بڑے پتھروں پر چڑھ جاتی ہے، سلیں اور چٹانیں اس کو پیس دینے کے لیے پھسلتی ہوئی لپکتی ہیں، یہ کود ان ہی پر سوار ہو جاتی ہے۔ دیو ہیکل درخت سیکڑوں ہاتھ پھیلائے اس پر لڑھکتا ہے، جھاڑو سا دیتا سامنے کی ہر چیز سمیٹتا آتا ہے۔ بندریا اس کی ڈالی ڈالی اُچکتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں من سلیں، پتھر، درخت، مٹی برابر اوپر سے گر رہی ہیں۔ پہاڑ کا اس طرف کا پورا ڈھال چوٹی سے لے کر نیچے بیر بھٹی تک پھسل پڑا ہے۔ بیر بھٹی کی آبادی کئی سو فیٹ ملبے کے نیچے دفن ہو گئی ہے۔ کیا جھونپڑا، کیا مکان، کیا امیر، کیا غریب، کیا پیر، کیا فقیر سب دفن ہو چکے ہیں۔ فردوس کاٹج کے منتشر ٹکڑوں پر بھی گزوں بلکہ بلیوں ملبہ گر چکا ہے اور گر رہا ہے اور اب بھی، اس شورِ قیامت میں، اس اندھیرے میں، بندریا پتھر سے چٹان پر اور

چٹان سے درخت پر، درخت سے نگل جانے والے ملبے پر اُچکتی ہے۔ تین ہی ہاتھ پیر ہیں۔ ایک ہاتھ سے بچہ سینے سے چمٹا رکھا ہے۔ بندریا ہر وقت اُچھل رہی ہے۔ ہر کچل کر پیس لے جانے والی چیز پر اُچک کر سوار ہو جاتی ہے اور پھر جب اس چیز کے خود دفن ہونے کی نوبت آتی ہے تو اس سے اوپر آنے والی چیز پر اچک کر سوار ہو جاتی ہے۔ اندھیرے میں گرد اس قدر ہے کہ سانس لینا مشکل ہے۔ آوازیں ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ قیامت برپا ہے...

رات کی تباہ کاریوں کے بعد فلک پیر انتہائی معصومیت سے مسکرایا۔ خاموش پہاڑوں میں صبح ہوئی، بادل بھی چھٹ چکے ہیں، کہرا بھی نہیں ہے، ہوا بھی بند ہے۔ دو چار چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ بیر بھٹی کی آبادی تین سو فٹ ملبہ اوڑھے ٹھنڈی پڑی سو رہی ہے۔ سامنے مخمور کالا پہاڑ ڈیڑھ میل چوڑا، دو ہزار فٹ لمبا، کھتئی بھورا دہانہ پھاڑے جمائی سی لے رہا ہے۔ لمبی چوڑی جمائی ہے کچھ عرصہ لگے گا۔ پانچ چھ سو برس میں پھر اس دہانے کو گھنے جنگل اُگ کر ڈھانک لیں گے۔ ابھی تو یہی خالی جگہ ہے جہاں زمین اوڑھے بیر بھٹی دبی پڑی ہے۔ اور یہ بے ترتیب ڈھیر بھی یا تو جب تک بہہ بہا کر خلیج بنگال کی تلی میں ہوگا یا اس پر بھی گھنے جنگل اُگ کر اسے سرسبز سیرگاہ بنا دیں گے۔ لوگ جنھوں نے بیر بھٹی کا نام بھی نہ سنا ہوگا ،یہاں آئیں گے، چلیں گے، پھریں گے، قہقہے لگائیں گے۔ لیکن فی الحال یہ مٹی، پتھر اور چٹانوں کا ڈھیر ہے جس میں بڑے بڑے درختوں کی ٹوٹی ڈالیاں اور پتوں دار شاخیں، آدھی دبی اور آدھی نکلی، جا بجا نظر آتی ہیں اور خال خال انسانی ہاتھوں کی بھی کارگزاریوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ اوپر کی سڑک کا ایک فرلانگ کا پتھر پڑا ہوا سات کا منحوس نمبر آسمان کو دکھا رہا ہے۔ ایک اور جگہ ایک نالی دار ٹین کی چادر کا ایک سرا زمین میں سے خوف زدہ جھانک رہا ہے۔ ملبے کے بیچوں بیچ نہ معلوم کس طرح اور کیوں کر کسی مکان کے برآمدے کا ایک لکڑی کا کھمبا زمین میں آدھا دبا آدھا باہر نکلا ہوا کھڑا ہے۔ اس کے اوپر نچی کھچی کپڑے کی ایک دھجی چمٹی ہوئی چھوٹی سی جھنڈی کی طرح لہرا رہی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لینڈ سلپ نے مہم سر کرنے کے بعد اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ اس جھنڈے سے کافی فاصلے پر سسکتے ہوئے انسان کے بچے کو اب بھی سینے سے چمٹائے، زخموں سے چور بندریا تشنج کی حالت میں دم توڑ رہی ہے۔ ہر طرف خاموشی ہے، چڑیاں چہچہا رہی ہیں، صبح کی روشنی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

دور سے آواز آتی ہے: Now then my Lord پھر بڑبڑاتی ہوئی آواز بڑھتی ہوئی قریب آتی ہے۔ پروفیسر دیاشنکر دوبے صرف کوٹ اور قمیص پہنے لکچر دیتے چلے آرہے ہیں۔ آپ آتے آتے اس کھمبے اور جھنڈی کے قریب آتے ہیں، رُکتے ہیں، اسے غور سے دیکھ کر یوں خطاب کرتے ہیں، "Now then my Lord مجھے آج آپ سے تعارف حاصل کر کے جو شرف لاحاصل سے ارطباع ہوا ہے وہ نشاط کامل الہام غیبی میں بھی میسر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے آج میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ نطق اور خیال کے باہم تصادم کو معدوم البقا ٹھہرا دینا غلطی اور سخت غلطی ہے، اس لیے اس خاکسار کی عرض ہے کہ آپ یہیں ٹھہریں اور بندہ آگے جاتا ہے۔"

اس عالمانہ مزاج پرسی کے بعد پروفیسر صاحب جھنڈے کو چھوڑ آگے بڑھ گئے اور جیسے ہی وہ دور چلے گئے ایک ڈھٹیال نکلی ہوئی چٹان کی آڑ میں سے، جہاں وہ دیر سے چھپا بندریا اور بچے کو دیکھ رہا تھا، نکلا۔ مردہ بندریا کی گود سے بچے کو اپنی گود میں لے دوسری طرف روانہ ہوگیا۔ اب پھر خاموشی اور تنہائی ہوگئی۔ بندریا کی لاش پڑی ہے۔ جانور کی لاش پر کوئی نہیں روتا۔ آہ! قریشی کے اکلوتے لڑکے! لاکھوں کی جائداد کے وارث، تیری لاش پر میں رووٗں۔ بے شک تو مر گیا۔ مکانوں، زمینوں، گاؤں کا ایک مالک قریشی کا لڑکا تو مر گیا۔ بندریا نے اپنی جان دے کر جسے بچالیا ہے وہ اب ایک جانور کا بچہ ہے، کیوں کہ ڈھٹیال اسے پالے گا۔ وہ جیے گا، جوان ہوگا مگر ایک دوسرے جنم میں، جہاں طرز خیال اور ہوگا، جہاں طرز تکلم اور ہوگا، طرز زندگی اور ہوگا، طرز معاشرت اور ہوگا۔ تو اپنی جاگیروں سے بے خبر، اپنے مذہب سے ناآشنا، اپنے تمدن سے ناواقف، ڈھٹیال بنا اپنے طبقے کو خوف زدہ دور سے دیکھا کرے گا اور تیرے اصلی ساتھی تجھ سے اس طرح بچ کر چلا کریں گے گویا تو انسان نہیں ہے۔ بے شک، تو نیم وحشی ڈھٹیال ہے اور وہ روشن خیال اور روشن دماغ انسان ہیں۔

انسان کو حیوانیت کے درجے سے نکال کر خدا کی نائبیت کا تاج پہنانے والا اگر انسان کا عقل سے پُر دماغ ہی ہے تو تعجب ہے۔

کیا دراصل انسان صحیح الدماغ ہے؟

ہندو بن کر نہیں، مسلمان بن کر نہیں، قریشی یا ڈھٹیال بن کر نہیں، انسان اور صرف انسان بن

کر، اے انسان، اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ، تو آئینۂ حیرت ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک۔

ہر فرعونے راموسیٰ

دن ڈھلتے ہی جنگل کے جانور بیدار ہو کر اپنی اپنی پوشیدہ نشست گاہوں سے نکلنے لگے، اور مالا کا وہ جنگل جو دن بھر چوپایوں سے خالی نظر آتا تھا، آباد ہو گیا۔ گو چڑیوں کے بسیرا لینے سے خاموشی ضرور چھا گئی، لیکن سنسان سال بنی میں اب جا بجا حرکت کرتے ہوئے چوپائے نظر آنے لگے۔ چوں کہ دن کی ہلکی ہلکی روشنی اب بھی موجود تھی اور جنگل کے واسطے ابھی بہت سویرا ہی تھا اس لیے سوٗر، چیتل اور نیل گائے ایسے ہی نیچ ذات جانوروں کی صورتیں فی الحال نظر آ رہی تھیں جو کہ پوری طرح رات نہ ہونے کی وجہ سے قدرے بے خوف اِدھر اُدھر خوراک کی جستجو میں جا رہے تھے۔ اس امن اور خاموشی کے عالم میں ایک بھاری مست اِکرو سوٗر کبھی کبھی اپنی بدطینتی کی وجہ سے تھوتھو، خوک خوک، تھوتھو، خوک خوک کر، کسی پاس آنے والے جانور پر دوڑ پڑتا تھا اور اس کا دور تک پیچھا کرنے کے بعد پھر واپس آ کر بھاری تھوتھنی سے موسل کی جڑیں کھودنے میں لگ جاتا تھا۔ سال بنی کے مشرق کی طرف گھنے سال اور نیچے گھنی جھاڑیوں نے بالکل ہی اندھیرا کر رکھا تھا۔ مغرب کی طرف ڈوبتے ہوئے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی اس لیے اب بھی موجود تھی کہ اُدھر ہی پاس لگا ہوا سال بنی کا کنارہ تھا، جس کے اختتام پر، بیلوں کے جالوں سے ملے ہوئے کٹھ روکھ کے اونچے اور کانٹے دار جھاڑیوں کے نیچے درختوں کی تھوڑی سی چوڑائی کے بعد مالا ندی کا چوڑا پاٹ، اپنی کیچڑ، دلدل اور چھچھلے پانی کو ہاتھی چھُپواں گھانس میں چھپائے ہوئے، ساکت اور بھورا پھیلا ہوا تھا۔ ندی کے اس پاٹ میں، بلکہ اس اونچی گھانس کے سمندر میں، جا بجا انتہائی گھنے،

چھوٹے جنگل کے ٹاپو بھوری گھانس میں سے نکلے ہوئے دھندلے پڑ رہے تھے۔

بنڈیلے کو مالا کی گھانس کی طرف سے کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ زمین میں گھسی ہوئی بھاری تھوتھنی وہیں مٹی میں دھنسی کی دھنسی رہ گئی۔ کانوں نے آہستہ آہستہ جنبش جاری رکھی۔ آواز پھر بند ہوگئی تھی۔ کچھ دیر اسی حالت میں انتظار کرنے کے بعد ناک کو دوبارہ مٹی میں جھٹکے سے دھنسایا ہی تھا کہ کھس کھس کھساک آواز آئی۔ بنڈیلا جڑ کھودتے میں رُکا اور پھر بغیر سر گھمائے، بدن کے ایک ہی جھٹکے میں پوری جان سے گھوم، مالا کی طرف رُخ کر، پتلی دم کی جلیبی بنا، ساکت کھڑا ہوگیا۔ چند جانوروں کی اونچی اور سوکھی گھاس میں سے نکلنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ نگاہ کے کمزور سوٗر نے سرسراہٹ کی آواز سے ہی آنے والے جانوروں کو تھوڑی سی غلطی کے ساتھ پہچان لیا۔ وہ سمجھا کہ پھر کوئی بدتمیز نیلا مع اپنی گایوں کے واپس آ رہا ہے۔ اس روز کئی نیل گائے اسے ستا چکے تھے۔ دو دو قدم اور دو دو قدم رُکتا ہوا، چمکتی ہوئی سفید بل کھائی ہوئی کھاپوں سے مرصع تھوتھنی کو جھٹکے دیتا ہوا چلا۔ سامنے بل پر بل کھائے ہوئے جنگلی بیلوں کے موٹے ننگے تنے رسّوں کی طرح جھولوں کی صورت سے لٹکے ہوئے، اونچے درختوں سے جھاڑیوں پر اور جھاڑیوں سے درختوں پر پھیلے ہوئے، جال سا بنائے ہوئے تھے۔ اور وہیں ایک جھاڑی کے برابر لٹکی ہوئی بیل کے نیچے مالا کی ترائیوں، دلدلوں اور مالا کی ہاتھی چھپواں گھانسوں کا اصلی باشندہ، زبردست گوند، موٹے شاخ دار سینگوں کی پرچھائیاں بلند کیے، پیچھے رکتی، ٹھٹکتی آنے والی مادینوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

کم عمر نر، بچھے اور مادینیں ایک ایک کر کے اونچی گھانس میں بنی ہوئی پتلی پگڈنڈی میں سے نکل کر، چونکتی، چاروں طرف دیکھتی، رکتی، اپنے بچوں کو ساتھ لیتی، بڑھ رہی تھیں، اور ایک ایک دو دو کر کے نر کے پیچھے جمع ہو رہی تھیں۔ نر گوند، جنگل کا سب سے بڑا چوپایہ، اپنے جثے اور اپنی طاقت پر مغرور گوند، نتھنے پھلائے، کانوں کی کٹوریاں آگے گھمائے، دم کی تھاپی تیزی سے ہلاتا، جھنجھلایا ہوا کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون گستاخ اور بدتمیز راستے میں ہے۔ سامنے سال بنی میں نیچے نیچے پودے اور جھاڑیاں اور گھانس تھی، لیکن کوتاہ قد سوٗر ان میں پنہاں نہ تو خود نظر آتا تھا اور نہ اپنی کمزور بینائی کی وجہ سے خود ہی گوند کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی نیل گائے سمجھے ہوئے آگے بڑھتا رہا، اور

مادینوں کی چاپ کے جب قریب آ گیا تو تھوتھوخوک، تھوتھوخوک کی جھڑکیاں آمیز آواز نکالتا ہوا لپکا، چھوٹی جھاڑیاں اور گھانسوں کو سڑ سڑاتا پھڑ پھڑاتا نکلا۔ گوند سے پندرہ گز کے فاصلے پر ہوگا کہ دفعتاً اس نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا۔ سامنے زبردست گوند، سینگوں کی چمکتی ہوئی سفید نوکیں برچھیوں کی طرح تانے، بے خوف کھڑا اسے حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ نیلے اور جھانک ڈرا دھمکا کر بھگائے جا سکتے تھے، لیکن گوند؟ گوند؟ توبہ، توبہ! بڑھتا ہوا سوٗر کھٹ سے رکا، سٹ سے پورا جسم گھما، اور نوک دم، تھوتھو، تھوتھو کرتا ہوا بھاگا اور بھاگتا ہی چلا گیا۔

مغرور گوند اکڑتا ہوا خاموش آگے آگے راستے سے آگاہی کرتا ہوا بڑھا اور اس کے پیچھے نو عمر بچھڑے اور نازک، تندرست، چکنی مادینیں پٹھے اور شانیں پھڑکاتی، پیر جھٹکتی، گردنیں لچکاتی، بھڑکتی، ٹھٹکتی، کودتی، اُچکتی آپس میں چہلیں کرتی بڑھیں۔ اور اس طرح مالا کے گوندوں کی ڈاروں میں سے ایک ڈار سال بنی میں چلی، جس کے سامنے پڑ جانے والے چیتل، پاڑے، سوٗر اور نیل گائے از خود راستہ چھوڑنے لگے۔ گوندوں کی ڈار نے زبردست نر کی حفاظت میں آہستہ آہستہ اطمینان کے ساتھ سال بنی کے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ڈیڑھ میل کی چوڑائی کو پار کر کے موٹر روڈ کے قریب جنگل میں چھپی ہوئی ایک نمیاری پر پہنچ کر بچے، پٹھے، بچھڑیاں اور مائیں گڈھے کو چاروں طرف سے گھیر، گردنیں نیچی کر، وہاں کی نمکین مٹی چاٹ چاٹ کر سب مزے لینے لگے۔ بڑے نر نے کچھ دیر علیحدہ کھڑے رہ کر جنگل میں چاروں طرف پھر نظر دوڑائی۔ اور جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ سے بڑھ کر جھکی ہوئی مادینوں کے پیچھے ہی سے مٹی چاٹنے کو گردن بڑھائی تھی کہ سال بنی کے مالا کی طرف کے حصے سے دبی ہوئی آواز آئی، ”پُررررر، ٹھر، پُررر۔“ گوند نے، اور اس کے ساتھ ساری ڈار نے، گھبرا کر اُس طرف دیکھا۔ اندھیری رات اور پھر اندھیرا گھنا جنگل، جانوروں کے واسطے سہانی روشنی سے پُر تھا۔ گوندوں نے دیکھا کہ ایک سیاہ پہاڑ ایسا ہاتھی، دو سفید دانت ان کی طرف دراز کیے، سونڈ لمبی پھیلائے، اپنی آمد کی اطلاع ان کو دے رہا تھا۔

آدھے منٹ تک ہر گوند، پتھر کی مورتی کی طرح ساکت کھڑا، بغیر پلک جھپکائے، اس سیاہ پہاڑ کو دیکھتا رہا۔ پھر اک بارگی سب کے سب چونکے اور بے ترتیبی سے بھاگ پڑے۔ بھاگتی ہوئی

مادینوں نے ایک قطار بنا، اس کے بیچ میں نر کو لے لیا۔

امن اور سکون کی حالت میں نر آگے آگے اُن کے واسطے راستے کے خطرات سے آگاہی کرتا چلتا تھا، لیکن بغیر راستہ دیکھے اور بغیر راستے کے حالات معلوم کیے بے تحاشا بھاگنے کی حالت میں نسل کا سلسلہ قائم رکھنے والے نر کی بجائے مادینیں خود اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر، نر کو بیچ میں لے کر بچالے جانے کے واسطے بھاگ پڑیں۔ یہی جنگل کے تمام چوپایوں کا اصول ہے۔ البتہ انھوں نے اتنا ضرور کیا کہ پاس لگی موٹر روڈ پر پہنچ کر چلتی ہوئی ہوا کے مخالف جنوب مشرق کی طرف اپنا رُخ کر لیا، تا کہ اگر سامنے گھنے بلّی کے جنگل میں کوئی دشمن ہو تو اس کی بوان کو آجائے۔

اور جب گوند بھاگ گئے تو نر ہاتھی نے ہلکی سی "پینپ پر رورورو، پا، پو" کی آواز نکال کر پیچھے پیچھے آنے والے غولوں کو راستے کے محفوظ ہونے کی اطلاع دی، جس کے تھوڑی ہی دیر بعد سیاہ تودے، پنکھے ایسے کان اور اژدہے ایسی سونڈیں ہلاتے، جا بجا درختوں کے تنوں سے کتراتے ہوئے نکلنا شروع ہوئے۔ ان میں نر، مادینیں اور بچے، سب ہی تھے۔ ہلتے جلتے پہاڑ، چڑپڑ، کھڑبڑ، ڈالیاں توڑتے، جھاڑیاں نوچتے، سونڈوں میں ڈالیاں گھماتے، ستون ایسے پیروں کو ہلاتے بڑھتے چلے آئے، اور موٹر روڈ کو پار کر کے دوسری طرف کے بلّی کے جنگل میں گھس کر اس کے بیچ میں چھپی ہوئی پٹیلا جھیل کی طرف، بلّیاں توڑتے، درخت چرچراتے، خوش ذائقہ پٹیلا کھانے کے لیے بڑھنے لگے، یہاں تک کہ تر پٹیلے کی بوان کو آنے لگی۔ ان میں سے ایک اسکاؤٹ نے آگے بڑھ کر، گھنے ساکھو میں سے سر نکال کر، سبز لہلہاتے پٹیلے کے تختے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، پھر سونڈ کی اٹھی ہوئی نوک چاروں طرف گھما کر بُو لی، کانوں کے پنکھوں کو ہر طرف گردش دے کر آوازوں کا پتا چلایا، اور جب سب طرح اطمینان ہو گیا تو اپنے غول کو بڑھنے کے واسطے ہلکے سے بگل میں اطلاع دی: "پینپ پر رورورو، پا، پو۔" ساتھ ہی "عاؤں وآ آواوا عاں خوں" — شیر کے ڈانٹنے کی کرخت آواز آئی۔ زمین ہل گئی، جھاڑیاں لرزیں، درخت تھرائے، ہاتھی بری طرح گھنے پتلے بلّی کے جنگل کو توڑتے کچلتے واپس بھاگے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ پچھلی رات کا چاند نمودار ہو کر اوس ٹپکاتے گھنے ساکھو کے ستواں،

سیدھے درختوں پر سے جھانکتا ہوا، اپنی زائل ہوتی ہوئی ہلکی روشنی چھچلی خشک جھیل میں اُگے ہوئے نیچے گھنے پٹیلے پر ڈال رہا تھا، اور اونچے، گھنے، ساکت، خاموش، سیاہ جنگل سے چاروں طرف گھرے قدرے روشن پٹیلے کے ایک کنارے جنگل کی ٹیٹری بانس ڈیڑھ بانس اونچی پھرپھراتی ہوئی بول رہی تھی: ''ٹٹ ٹیٹ، ٹیٹیئی ٹیٹیئی، ٹٹ ٹیٹ، ٹیٹیئی ٹیٹیئی ٹیٹیئی''۔ لیکن جوں ہی شیرنی نامعقول ہاتھیوں کو ڈانٹ بتا کر اونچے درختوں میں سے نکلی ٹیٹری ''ٹٹ ٹیٹ، ٹیٹیئی، ٹیٹیئی، ٹیٹیئی'' کی آخری چیخ بھرتی ہوئی، پھیلے پٹیرے کے شمال کی طرف نیچی نیچی اڑتی چلی گئی اور وہیں غائب ہو گئی۔ دس فٹ لمبی دھاریوں دار شیرنی، خود لچکتی، دم لچکاتی، پٹیرے میں کچھ دور گئی اور پھر رک گئی۔

وہاں سامنے جنگل سے سوا سو گز کے قریب، دور پھیلے ہوئے پٹیرے میں، شیرنی کے واسطے عجیب مسرت انگیز نظارہ تھا۔ شیرنی کے دو نو عمر بچے گوند کی ایک اَدھ مری کی ہوئی مادہ پر چمٹے ہوئے تھے۔ ایک گری ہوئی مادہ کی پیٹھ کے پاس کھڑا ہوا، اپنے دونوں اگلے پنجے اس کی کمر پر جمائے، برابر اٹھنے کی کوشاں گوند کو پھر گرا گرا دیتا تھا، اور دوسرا، موٹی گردن چھوٹے جبڑوں میں دبائے، اپنی پوری طاقت سے اسی طرح جھٹکے دے رہا تھا جس طرح پورا شیر دو ہی جھٹکے دے کر گردن کی گرّی گرّی الگ کر دیتا ہے۔ شیرنی نے پہلے ہی سے اپنے بچوں کو شکار کی تعلیم دینے کے واسطے گوند کی گردن توڑ اَدھ مرا سا کر دیا تھا۔ اس کا سر گردن پر جھول رہا تھا، لیکن پھر ذبح کیے ہوئے مرغے کی طرح ڈگمگاتا سر اُٹھا، وہ اٹھ بھاگنے کی کوشاں تھی۔ جیسے ہی پیٹھ پکڑے پکڑے گرانے والا بچہ اُدھر سے کچھ ہٹ، پٹھے پر منھ مارنے میں مشغول ہوا، نیم بسمل گوند نے پھر زور کیا۔ چاروں ہاتھ پیروں پر بیٹھ گئی۔ جو بچہ گردن میں چپکا تھا گردن میں لٹکنے لگا۔ گرفت چھوٹ گئی۔ جھٹ چار گز پیچھے ہٹ، داؤں لگا، جست کے لیے دبک، گوند کے بھاگنے کا منتظر ہو بیٹھا۔ پٹھے پر کے بچے نے اگلے پنجے کے ناخنوں اور دانتوں کے کیلے وہیں گھسا دیے تھے۔ جیسے ہی گوند ڈگمگاتی ہوئی کھڑی ہوئی، اس نے پچھلے پیروں کے پنجے بھی اونچے کر کے ران پر جما لیے اور چھپکلی کی طرح چمٹ گیا۔ بچہ گو تازی کتے کے برابر تھا، لیکن گائے کے قد کی گوند کے واسطے اس کا وزن کیا چیز تھا۔ موت کے آخری جھٹکے، بھڑکے ہوئے گرم خون کا جوش:

بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

خون میں لت پت، نتھنوں سے دھاریں چلتی ہوئیں، دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گرتا ہوا سر اٹھی ہوئی گردن پر، گوند دو نہایت مخدوش دولتیاں چلا کر ڈلکی بھاگی۔

تماشا دیکھتی ہوئی شیرنی نے فوراً جہاں کھڑی تھی وہیں کے وہیں بدن سکیڑ، سینہ اور پیٹ زمین سے ملا، چاہا کہ گوند پر جست کرے، لیکن بجلی کی طرح دوسرا بچہ ہوا میں معلّق نمودار ہوا۔ اس کی دُم اور پیر پیچھے پھیلے ہوے تھے، اگلے ہاتھ گردن کے متوازی آگے پھیلے ہوے تھے۔ وہ کمان سے نکلے ہوے تیر کی طرح بھاگتے ہوے گوند کی کمر پر گرا۔ دھماکے کی آواز آئی۔ گوند پھر زمین پر دراز ہاتھ پیر چلا رہی تھی، اور دونوں بچے پھر پچھلے پیروں کی زد سے بچے، اس پر چمٹے ہوے تھے۔ شیرنی نے اطمینان کا سانس لیا، سیدھی کھڑی ہوئی، اور انتہائی غرور کے ساتھ آہستہ آہستہ بچوں کی طرف بڑھنے لگی۔

لیکن جنگل سے چاروں طرف گھرے ہوے پٹیلے کے مغرب سے چلتی ہوئی ہوا میں بو آئی اور پھر آہٹ ہوئی۔ قدم بڑھاتی ہوئی شیرنی، اٹھا ہوا اگلا پیر اٹھائے، ویسے ہی رک گئی۔ نہ خود گھومی نہ سر گھمایا۔ ویسی ہی خاموش کھڑی رہی۔

ہلکی ہوا میں بُھکراہند کی بو تھی، بھاری پیروں کے پھساکے کی آواز تھی۔ پھر گستاخ بدتمیز ہاتھی اس طرف کی جرأت کر رہے تھے۔ ملکۂ دشت برہم ہوئی۔ آنکھوں میں بجلیاں، پنجوں میں خنجر ہاے خمدار نمودار ہوے۔ گھومی ہوئی دم سیدھی پھیل گئی۔ خونخوار دہانہ زمین سے مل گیا۔ اور دہاڑ! بھاری، گھٹی، ہر طرف پھیلی ہوئی دہاڑ نے چاروں طرف کے جنگلوں کو کپکپا دیا۔ شیرنی غلطی پر تھی۔ اس مرتبہ ہاتھیوں کا غول نہ تھا بلکہ صرف ایک ہی ہاتھی تھا۔ ایک کانا ہاتھی۔ مست دیوانہ، ڈیڑھ دانت کا، پہاڑ قامت، خونی اِگرُ ہاتھی۔ وہ ہاتھی جو باوجود آدھا دانت لڑائیوں کی نذر کر دینے کے، تمام ہاتھیوں کو شکست دے چکا تھا۔ وہ ہاتھی جو دنیا کے تمام جانداروں سے برسرِ جنگ، ہر ہستی کے خون کا پیاسا پھرتا تھا۔ اس کے ساڑھے گیارہ فٹ کے قد میں نہ صرف بے اندازہ قوت پنہاں تھی بلکہ ڈیڑھ سو برس کی زندگی نے قوت کے اجتماع کے ساتھ ایک صدی سے اوپر کے تجربوں سے پُر، جابر، ظالم، بے رحم، چالاک اور مکار دماغ بھی اسے عطا کیا تھا۔ وہ جس قدر ہتھے کا مالک تھا، اسی قدر اس وزن کے استعمال کرنے کے طریقوں سے بھی آگاہ تھا۔ شیرنی کی جنگل دہلا دینے والی دہاڑ اس نے سکون اور اطمینان کے ساتھ سونڈ کی نوک

منہ میں دبائے ہوئے سنی۔ اس کی بائیں طرف کی پھوٹی ہوئی آنکھ، جس میں سے دائمی سیاہ بہنے والے آنسوؤں سے مستک پر ایک کالی لکیر بنی ہوئی تھی، اپنے دید سے خالی گڑھے پر مچپائی، اور سالم آنکھ کے چھوٹے سے گول ڈھیلے نے چاروں طرف اوپر اور نیچے کئی چکر کھائے۔

کانا ہاتھی گھوما اور آہستہ آہستہ بغیر آہٹ کیے واپس لوٹا۔ پیڑ سے قریب دوگنا دور جا کر آہستہ سے دبی ہوئی ''پُر رورو'' آواز نکالی اور اس کے بعد گھنے ساکھو کے اندر ہی اندر، پیڑ سے دور ہٹتا ہوا، نصف دائرے میں چکر کھا، جھیل کے مغرب کی طرف پہنچ کر احتیاط سے دبے پاؤں کنارے کے پاس آ کر ایک بہت موٹے درخت کی آڑ میں انتظار کرنے لگا، یہاں تک کہ بے خبر شیرنی مری ہوئی گوند کمر سے منہ میں اٹھائے، پٹیرے سے سال بنی میں داخل ہوئی۔ بھاری گوند کو شیرنی نے اس طرح منہ میں اٹھا رکھا تھا جیسے بلی چوہے کو اٹھا لیتی ہے۔ البتہ اس کی گردن اور پیر لٹکے ہوئے زمین پر گھسٹ رہے تھے، اور دونوں بچے گھسٹتے ہوئے اعضا کو کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر پکڑ کر گھسیٹتے اور جھٹکے دیتے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ شیرنی ان کی اس بے موقع کارگزاریوں سے قدرے جھنجلائی، ہلکے ہلکے غراتی، دائیں بائیں کتراتی، اونچے سال بنی کے نیچے چھدری اگی ہوئی جھاڑیوں میں چلی آ رہی تھی کہ دفعتاً اس کو درختوں کے چار تنے اپنی جگہیں چھوڑ تیزی سے حرکت کرتے معلوم ہوئے۔ اور قبل اس کے کہ وہ گوند کو رکھ کر اوپر دیکھنے کو سر اٹھائے، ایک تیز دل بھیانک چنگھاڑ سے کان کے پردے تھرتھرانے لگے۔ شیرنی کی اٹھتی ہوئی نگاہیں سامنے کھڑے ہوئے ہاتھی پر گزوں اٹھتی چلی گئیں۔

شیرنی نے دیکھا کہ وہاں سیاہ بے ہنگم بھوت، گزوں اونچے سر سے بھی گزوں اونچی سونڈ اٹھائے، دیوار کی طرح سامنے کھڑا، اٹل جنگ کا پیغام دے رہا تھا۔ شیرنی کے سامنے اس کا شکار اور دائیں بائیں اس کے نوعمر اور ناتجربہ کار بچے تھے۔ خطرہ اور فوری خطرہ سامنے تھا۔ خون میں ہیجان آیا، رگیں تھرائیں، پٹھے سکڑے اور آناً فاناً میں قہر کا شعلہ تھا کہ جرأت کی بجلی تھی جو زمین سے چنچی اور پہاڑ ایسے دشمن کی بانسوں اٹھی ہوئی سونڈ تک پہنچی۔ ہوا میں معلق شیرنی چاہتی تھی کہ گرفت میں لا کر اس اٹھی ہوئی سونڈ کو جبڑوں سے چبا ڈالے اور پنجوں سے جھیر جھیر کر ڈالے، لیکن اٹھے ہوئے سونڈ کے اژدہے نے ناگن کی طرح بل کھایا۔ موت کا سیاہ لٹھا سامنے سے لپکا، بازو میں آیا، اور کئی من کا مکا شیرنی کی

پسلیوں پر گھم سے پڑا۔ بھد سے شیرنی زمین پر گری۔ ہاتھی لپکا، سیدھے پیر کی فنا کن ٹھوکر چلائی، مگر وہاں جگہ خالی تھی۔ پھرتی کا مجسمہ شیرنی کندھے پر چمٹی سخت کھال میں دانت اور ناخن گھسا رہی تھی۔ ہاتھی نے جھرجھری لی اور دو جھٹکے اپنے بدن کو اس قدر سخت دیے کہ شیرنی کی گرفت چھوٹ گئی۔ وہ پھر تین گز پر گری، اور ساتھ ہی کچل کر نقشِ زمین کر دینے والا سولہ من کا پیر، اسٹیم ہیمر کی طرح، اُس جگہ پڑا جہاں شیرنی گری تھی۔ مگر پھرتیلی شیرنی ہٹ چکی تھی اور خیال کی تیزی کے ساتھ اب کے پٹھے کو بھنبھوڑ رہی تھی۔ ہاتھی نے پھر اپنے بدن کو سخت جھٹکے دیے لیکن بے کار۔ شیرنی نے دانتوں کے پیش قبض اور ناخنوں کے نشتر سخت کھال میں انچوں پیوست کر دیے تھے۔ ہاتھی، باوجود کرب اور تکلیف کے، لمحہ بھر کو خاموش ہوا۔ پھر اطمینان کے ساتھ نصف دائرے میں گھوما۔ تنہا مکار آنکھ نے اپنا کام کیا، ایک زبردست درخت کو تاک لیا۔ ہاتھی آہستہ آہستہ اس کی طرف کھسکا، اور پھر قریب پہنچتے ہی پھرتی سے جھپٹا۔ چار فٹ موٹے درخت کے تنے اور سیکڑوں من بھاری ہاتھی کے جسم کا ایک شکنجہ تھا جس کے بیچ میں شیرنی کی ہڈیاں اور پسلیاں چرچرا رہی تھیں۔ آخری جاں گسل چیخ شیرنی کے منہ سے نکلی۔ جنگل گونج گیا۔

کانا ہاتھی بڑی دیر تک شیرنی کی لاش کو درخت اور اپنے جسم سے دبائے رگڑ رگڑ کر کچلتا رہا۔ اور جب بالکل ہی اطمینان ہو گیا تو شیرنی کی چپٹی لاش کو پہلے پیروں سے ٹھکراتا رہا، اور پھر پیر سے دبا اور سونڈ سے پکڑ، چاروں ہاتھ پیر چیر چیر کر اِدھر اُدھر اُچھال دیے۔ اور اس پر بھی جب جلال کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لوتھ دھڑ کو فٹ بال کی طرح ٹھکراتا ہوا سال بنی کے مشرق کی طرف چل دیا، اور مزروعہ سے ملے جنگل کے کنارے، کٹان کے ایک ٹکڑے میں پہنچ گیا، جہاں کٹان اور سلیپر چران کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ دو تین درخت گرائے جا چکے تھے، اور دو تین آرہ کش بھی آکر شگون کے طور پر کام شروع کر چکے تھے۔ لیکن چوں کہ ابھی پوری طرح مد نہ آئی تھی، اس لیے یہاں کانے ہاتھی کو برباد کرنے کے واسطے چند نامکمل منڈوؤں کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ یہ ان ہی کو دل بھر کر روندنے کے بعد، تھوڑا سا پھونس سر پر اچھال اور تھوڑا پھونس منہ کے ایک کونے میں دبا، چھپروں کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی سونڈ میں لے، آگے مزروعہ میں لہلہاتے گیہوں چرنے چل دیا۔

ہر شب کے معمول کے مطابق دس بارہ میل کی چہل قدمی کے بعد چران کے ٹکڑے سے نکل، کاناہاتھی صبح تین بجے کے قریب پیپریا گاؤں کے جنوب کی طرف جنگل کے کنارے آنکلا۔ جنگل سے باہر، مزروعہ زمین کے کنارے کنارے، میلوں لمبی کانٹے دار ڈالیوں، ٹہنیوں اور جھاڑیوں سے بنائی ہوئی دیوار اس کے واسطے کوئی رُکاوٹ ہی نہ تھی۔ سونڈ نیچے ڈال کر آہستہ سے جھانکڑ کی دیوار گزوں کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ اور پھر گز بھر اونچے ہرے لہلہاتے گیہوؤں میں کھڑے ہو کر ایک ایک وقت میں بوجھ بوجھ کے پودے سونڈ میں لپیٹ، جھر جھر جڑوں سمیت نوچنا شروع کر دیے اور ان پولوں کو سونڈ میں ہلا ہلا کر اگلے پیر مارتے ہوئے جڑوں کی مٹی جھٹک کر دوہرا کر کے منھ میں رکھنا اور مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ اس قدر خودی کے گھمنڈ میں کھویا ہوا تھا کہ تھوڑی ہی دیر پیشتر شیرنی کے ہلاک کرنے کے کارنامے کو بھی، اپنی طاقت کا ادنیٰ کرشمہ سمجھے ہوئے، ایک معمولی واقعے کی طرح فراموش کر دینے کا کوشاں تھا۔ وہ دنیا کی تمام طاقتوں سے بےخوف، کھیت میں کھڑا گیہوں کے پولوں پر پولے نوچتا، جھٹکتا اور چرُ چرُ کھاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے پیروں میں اور اس کی پشت پر گزوں کھیت سبز گھنے پودوں سے خالی ہو کر پیروں کے گول گول گڑھوں سے گھند چکا تھا۔

شامت جو آئی تو اس سے کچھ دور مچان پر سوئے ہوئے ایک رکھوالے کی آنکھ کھل گئی۔ چرُ مرُ جھرُ آوازیں سنیں۔ سمجھا کہ سوُر گھس آئے ہیں۔ صبح ہونے کو تھی۔ سردی پڑ رہی تھی۔ رضائی اور کملیا میں لپٹا پڑا تھا۔ ویسے ہی پڑے پڑے آواز لگائی، ''دھوآ لالالا، دھوآ آ!'' اور پھر خراٹے لینے لگا۔

مکار ہاتھی اس آواز کے سنتے ہی سُم ہو کر رہ گیا۔ کئی منٹ آدھا پولا منھ میں اور آدھا سونڈ کی نوک میں پکڑے کھڑا رہا۔ پھر پولا منھ سے نکال وہیں پھینک، سونڈ کی نوک بو لینے کو آگے بڑھائی، کان کھڑے کیے اور آہستہ آہستہ مچان کی طرف بڑھا۔ پاس پہنچ کر پھر خاموشی سے خراٹے سنے۔ ایک ایک قدم کر کے مچان تک گیا۔ لمبی سونڈ اٹھا کر مچان پر رکھی۔ آہستہ سے سوتے ہوئے آدمی کے پیر مع لحاف، کمبل اور گاڑھے کی سوزنی کے لپیٹ کر، سڑ سے اسے کھینچ لیا۔ ہوا میں دو بڑے بڑے جھکولے دیکھ کر سڑاسڑ دو دفعہ زمین پر پٹکا اور پھر پیر میں دبا کر چراچر لحاف کمبل وغیرہ چیر ڈالے۔

آدمی ان میں اب نہ تھا۔ وہ پہلے ہی جھولے میں تکیے کی طرح اپنے غلاف میں سے نکل کر دور

جا گرا تھا۔ شکاری کلواپاسی کا لڑکا بدّل گوابھی نوجوان ہی تھا، لیکن بچپنے سے اب تک جنگل کے آغوش میں رہا تھا۔ نو دس برس کی عمر سے شکاریوں کے ساتھ جانے اور جنگل میں مویشی چرانے سے اس کے حواسِ خمسہ حواسِ عشرہ میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جیسے ہی ہاتھی نے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اس کے پیر کھینچے، کسی نامعلوم حس نے اس کو خطرے کی اہمیت سے آگاہ کر دیا۔ اس نے سانس کھینچ لیا، بدن ڈھیلا چھوڑ دیا، اور جب وہ بستر کے خول میں سے نکل کر بھد سے کھیت سنچائی کی دلدل میں گرا تو اس نے چوں نہ کی، بلکہ ویسے ہی بے حس پڑا ہر ہر آواز کو غور سے سنتا رہا۔ جھرا جھر کپڑوں کے چیرنے اور پھاڑنے کی آوازیں سنیں، پھر پھنکار سے ملتی اطمینان کی سانس سنی، اور اس کے بعد پیروں کے پھساکے سنے۔ اور جب یہ پھساکے کافی دور سے آنے لگے تو پھر کیچڑ میں اوندھے پڑے ہی پڑے، آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں کے بل اونچے ہو کر، صبح کی ہلکی روشنی میں سیاہ دل، دیو قامت ہاتھی کو جنگل میں گھستے اور غائب ہوتے دیکھا۔

جب یہ کسرتی گبرو جوان کیچڑ میں پڑے، ہی پڑے، ہاتھوں کے بل اگلا دھڑ اٹھائے ہوئے، گیہوؤں کے پودوں کے اوپر سے ہاتھی کو دیکھ رہا تھا تو وہیں، اس کے پچاس قدم پیچھے منڈیر پر کھڑا ہوا، ایک اور گاؤں کا لڑکا جھلئی اس کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس ہم عمر، کمزور، بزدل اور مکار جھلئی نے مسکراتے ہوئے آواز دی، ''ارے دادا! تم اتے لکے ہو۔ آئے جاؤ۔ آئے جاؤ۔ نکس آؤ، میں ٹھاڑا ہوں۔''

بدّل نے سر گھما کے جھلئی کو دیکھا۔ تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ گو کمر میں سخت جھٹکے کی وجہ سے بہت تکلیف تھی، لیکن فوراً ''ٹھاڑا رہیو، آت ہوں!'' کہتے ہوئے بڑی تیزی سے مشتہر کرنے کے لیے گاؤں کی طرف روانہ تھے۔

جوں توں بہادر بدّل گاؤں پہنچ گیا۔ کمر کی مالش کی گئی۔ سکائی ہوئی۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو گیا۔ لیکن بے کار کی بدنامی اس کی ہو چکی تھی جس کا علاج اس کے پاس نہ تھا۔

چوں کہ میجر بوسٹ کچھ عرصہ افریقہ میں رہ چکے تھے، اور چوں کہ ان کی محبوبہ منگیتر لوئس، غرور سے مسکراتی ہوئی، حاضرین کی طرف دیکھ دیکھ کر ان کے قصے سنایا کرتی تھی، اس لیے میجر بوسٹ کے

لیے کلب میں بیٹھ کر افریقہ اعظم کے بے پایاں جنگلوں میں مہیب وحشی جانوروں کے خطرناک شکار کے قصے بیان کرنا ضروری تھے جن کے سننے سے دل کانپ جائے، رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور عقل خبط ہو جائے۔ اور جب ایسا ہوتا ہی تھا تو ایک دن ایسا بھی ہوا کہ ٹھیک اس وقت جبکہ میجر ہاتھیوں کے شکار کا ایک ایسا واقعہ جس میں ان کے دو بندوق بردار، چار قلی، چھ کے چھ ہاتھیوں کے پیروں میں رُند کے اور سونڈوں سے چر کے ختم ہو گئے تھے، بیان کر ہی چکے تھے، اور آٹھ دس حاضرین، جن میں دو اور لیڈیز بھی تھیں، ششدر خاموش بیٹھے تھے تو ایک نوعمر لفٹنٹ نے اٹھ کر جیب میں سے "ٹائمز آف انڈیا" کا ایک تہہ کیا ہوا صفحہ نکالا اور اسے اطمینان سے کھول کر سیدھا کیا اور پھر کہا، "آپ لوگ سنیں، پرسوں کے اخبار میں ایک اشتہار تھا۔ شاید آپ لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو۔" اس نے کنزرویٹو آف فارسٹس یوپی کا وہ اشتہار پڑھا جس میں پیلی بھیت ڈویژن کے کانے خونی ہاتھی کے مارنے پر پانچ سو روپے کا انعام مشتہر کیا گیا تھا۔

چنانچہ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن میجر بوسٹ، مع اپنی چھ بندوقوں اور چار ملازموں اور تین بیل گاڑی سامان کے، ملازموں کو ہندوستانی کتا کہتے، خود سفید فاکس ٹیریر کی زنجیر تھامے، مالا اسٹیشن پر اترے۔ حسبِ ہدایت از افسرانِ بالا، فارسٹ گارڈ مع قلیوں اور بیل گاڑیوں کے موجود تھا۔ اسٹیشن سے سامان لادا گیا اور جنگل کی کوٹھی میں اتار دیا گیا، جہاں صاحب بہادر نے تمام تر اطمینان اور آسائش کے ساتھ سکونت اختیار کر لی۔ اور صبح سے شام تک اسپراگس، سارڈین، ساسجز، فروٹ سیلڈ، سینڈوچز، کریم وغیرہ ایسے اقسام کے ڈبے کھلنے اور خالی ہو ہو کر پھنکنے لگے، اور دودھ، انڈے، مرغی، تازہ مچھلی، ڈبل روٹی اور ڈاک کی فراہمی کے واسطے طرح طرح کے پیادے اطراف میں دوڑنے لگے۔ اور میجر بوسٹ خود اخبار پڑھنے، خطوط دیکھنے، ان کے جوابات لکھنے، شیو کرنے، بال بنانے، کئی کئی غسل کرنے اور متعدد لباس پہننے ایسے اہم مشاغل جن میں کہ بار بار کے ناشتے اور کھانے بھی شامل تھے، مصروف ہونے کے باوجود صبح اور شام ایک دو گھنٹے شکار کے واسطے نکال کر اکثر چگتی ہوئی مرغیاں اور جنگل میں سے جھانکتے ہوئے چیتل مارنے لگے۔ اسی طرح آٹھ دن گذر گئے۔ اس عرصے میں ایک دن ایک کالا تیتر بھی انھوں نے مار لیا تھا، اور کوٹھی سے چار میل کے فاصلے پر ایک کھیت میں مہینے بلکہ سوا

مہینے پرانے ہاتھیوں کے پیروں کے نشان بھی دیکھ آئے تھے۔ غالباً شکار کے لحاظ سے میجر بوسٹ کی سرگرمیاں بس اسی حد تک محدود رہتیں، اور چار دن اور گذر جانے کے بعد وہ پھر ایک دفعہ ڈیم فول کی بوچھاریں نجی نوکروں، فارسٹ گارڈوں اور ریلوے ملازموں پر اڑاتے ہوئے، مالا اسٹیشن سے روانہ ہو کر بریلی پہنچ جاتے، لیکن اتفاقاً بدّل کو پتا چل گیا کہ ایک لال کرتی کا لال منہ والا صاحب کوٹھی میں شکار کھیلنے کے لیے ٹھیرا ہے۔ یہ تو خار کھائے بیٹھا ہی تھا، دوسرے ہی دن صبح چار بجے بلّم ہاتھ میں لے گھر سے چل دیا، اور مالا ندی کے کنارے کنارے پیروں کے نشان دیکھتا ہوا میلوں نکل گیا۔ دن چھپے گھر واپس آیا تو باپ نے پوچھا، ''ارے کہاں رہا رے؟''

بدّل بولا، ''کوٹھی میں جو صاحب ٹھیرا ہے اس نے شکار کھلانے کو رکھ لیا ہے۔ مرغی، جھانک مارتا ہے۔''

اب صرف اس امید پر کہ شاید ان ایام میں کانا ہاتھی پھر اس طرف نکل آئے، یہ روزانہ مالا کے کنارے کنارے کھوج میں روانہ ہو جائے۔ آخر چوتھے روز گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر کانے ہاتھی کا کھوج مل ہی گیا۔ یہاں پھر اس نے پچھلی رات کھیت چرے تھے اور صبح ہوتے تین میل چوڑے جنگل میں سے ہو کر مالا ندی میں گھس گیا تھا، جہاں کسی نہ کسی ٹاپو میں دن بھر قیام کر کے دوسری رات پھر کسی اور طرف نکل جانا اس کے واسطے ضروری تھا۔ بدّل اس کا کھوج پاتے ہی بھاگتا ہوا گاؤں واپس آیا۔ یہاں آ کر زمیندار کی گھوڑی نظر آ گئی۔ جھٹ پٹ کمل اس پر کس، سوار ہو، سیدھا پھر کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ سرپٹ گھوڑی دوڑاتا جس وقت کوٹھی پہنچا تو دس بجے کا وقت تھا۔ صاحب بہادر بندوقیں، جھولے، تھرماس، دوربین، کیمرا وغیرہ ایسی ہی ضروری چیزیں ہاتھی کے شکار کے واسطے تین مزدوروں پر لادے ہوئے روانہ ہو رہے تھے۔ اس نے جاتے ہی دوہرے ہو کر ہاتھ زمین سے لگا کر سلام کیا، اور کہا کہ کانے خونی ہاتھی کو میں تلاش کر کے آیا ہوں، اب دیر نہ کی جائے، فوراً چلا جائے۔ لیکن صاحب بہادر نے، باوجود اس کے جلدی مچانے کے، آدھا گھنٹہ پوچھ گچھ میں لگا دیا۔ ''کے ہاتھی ہیں؟ کانا ہاتھی بھی ان میں ہے؟ کیسے جنگل میں ہیں؟ اس جنگل میں ایسے مضبوط درخت بھی ہیں جن پر چڑھ کر نشانہ لگایا جا سکتا ہے؟ کتنی دور جانا ہے؟'' وغیرہ سوالات کیے۔ بدّل شکاری کی صورت اور سامان دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ

کس قسم کا شکاری ہے، لیکن پھر بھی لال کرتی کا بریلی کا صاحب تھا، اس کی بھاری بھاری بندوقوں کا اعتبار کرتے ہوئے اس نے جھوٹے سچے جواب دے کر صاحب بہادر کو فوراً چلنے پر راضی کرلیا۔ صاحب گھوڑی پر سوار ہوئے۔ ۴۰/۳۲ بور کا رائفل بدّل کو دیا گیا۔ اس کا بھرنا چلانا بتایا گیا۔ دوسرے دو اور جوڑی کے ڈبل بیرل ۴۵۰ بور ایکسپریس رائفل دو اور مزدروں کو دیے گئے، اور یہ لوگ گھوڑی کے آگے اور پیچھے، کبھی بھاگتے اور کبھی تیز قدم چلتے ہوئے روانہ ہوئے۔ بدّل نے میل ہی بھر کے بعد جنگل کا کنارہ پکڑ لیا، اور اس طرح گاؤں کو الٹے ہاتھ پر چھوڑ کر جنگل ہی جنگل لیے چلا جا رہا تھا، ابھی اس کو تین میل اور جانا تھا، کہ اب صاحب بہادر کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ بہت ہی زیادہ بگڑ کر دریافت کیا کہ ''آخر کہاں تک چلنا ہوگا؟''

وہ ابھی تک اسی خیال میں تھے کہ میل دو میل کی بات ہے، اس کے اختتام پر کالے ہرن کی طرح نشانہ بنا کھڑا ہوا ہاتھی آ جائے گا، چاند ماری کے معرکہ آرا صاحب بہادر دور ہی سے اسے دیکھ کر پٹ سے اسے گرا لیں گے، لیکن یہاں کچھ اور ہی نکلا۔ اور جب اس دوش کو پورا کر چکے تو پہنچے کہاں؟ ہاتھی کے پیروں کے نشانوں پر۔ اب جنگل میں گھسنے کی باری آئی۔ صاحب بہادر لگے ہاتھ پیر پھیلانے اور سوالات کرنے۔ بدّل نے پھر سبز باغ دکھائے کہ بس اب کیا ہے، آ پہنچے ہیں، مار لیا سالے کو۔ غرض کہ ایک آدمی تو گھوڑی لے کر گاؤں واپس بھیجا گیا اور باقی دونوں کے ساتھ اب پیدل چلائی شروع ہوئی۔ آگے آگے بدّل، بیچ میں صاحب، پیچھے قلی، پھر تیز تیز روانہ ہوئے۔ ایک ٹکڑا سال بنی کا آیا، دوسرا آیا، وہ بھی ختم ہوگیا، تیسرا شروع ہوا، راستہ نہ آج ختم ہوتا ہے نہ کل۔ ہاتھی کا محلّہ ہی نہیں آتا۔ شروع میں تو سال بنی میدان کی طرح نیچے صاف تھی، پھر فٹ، ڈیڑھ فٹ اونچے پودے، جھاڑیاں، گھانسیں شروع ہوگئیں۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ اونچے سال کے درختوں کے نیچے اگی ہوئی جھاڑیاں سر سے فٹوں اونچی تھیں۔ تین چار گز سے آگے کا کچھ نظر آنا تو ممکن ہی نہ تھا۔ اب میجر بوسٹ کی یہ حالت تھی کہ نہ آگے بڑھتے سمجھ میں آتا تھا نہ لوٹتے۔ ہر لحہ اور ہر طرف سے ہاتھی کی سونڈ پتوں میں سے نکل کر ان کو دبوچتی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر غضب یہ تھا کہ بدّل بڑے ہی اطمینان بخش لہجے میں صاحب کو یقین دلاتے جاتے تھے کہ بس اب تو بالکل نگیچ (نزدیک) ہے ہاتھی۔

خدا خدا کر کے دفعتاً یہ جنگل ختم ہو گیا۔ سامنے مالا ندی کا بھوری گھانس سے پٹا ہوا چوڑا پاٹ پھیلا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں گہرے سبز جنگلوں سے ڈھکے ہوے ٹاپو دکھائی دے رہے تھے۔ ندی کے کگارے کے نیچے ہاتھی چھپواں بھوری گھانس سنسناتی معلوم ہو رہی تھی۔ پُشت پر گھنے جنگل میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا، اور اس میں سے رک رک کر ''گٹ گٹ، کِٹ کِٹ، گٹ گٹ،'' کھٹ کھٹ بڑھئی کی آواز آ رہی تھی۔ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ دو بجے کا وقت تھا۔ یہاں تینوں دم لینے کو ٹھیرے۔ میجر بوسٹ نے انتہا سے زیادہ لال منھ کا پسینہ بار بار پونچھتے ہوے آگے کی گھانس اور پیچھے کے جنگل کو بری نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد شکاری تھیلے میں سے برانڈی کی چھوٹی بوتل نکال کر منھ سے لگائی۔ چند گھونٹ لیے، لمبی سانس لی، اور پھر چند گھونٹ لیے، سگار نکالا، اس کو جلایا، دس بیس کش اس کے لیے، جب جا کر پھر چلنے پر آمادہ ہوے۔ اب روانہ ہونے سے پہلے بدّل نے صاف بتا دیا کہ بس اس گھانس کے اندر جس ٹاپو میں یہ پیر کے نشان گئے ہیں، وہیں ہاتھی ہوگا، ہوشیار رہنا۔ پھر وہی آگے آگے بدّل، بیچ میں صاحب، پیچھے مزدور، ایک دونالہ ۴۵ بور رائفل صاحب کے ہاتھ میں، دوسرا ابھرا ہوا پیچھے مزدور کے ہاتھ میں، ہاتھی کے پیروں سے کھدی ہوئی گھانس، کبھی خشکی، کبھی پانی اور کبھی کیچڑ، چل پڑے۔ گھانس کا گھن اور اونچائی ایسی تھی کہ اس میں غرق ہو گئے، بلکہ یہ معلوم ہوا کہ گدلے پانی میں ڈبکی لگا کر اندر ہی اندر جا رہے ہیں۔ اپنے سے ایک فٹ بھی اِدھر اُدھر، حتیٰ کہ اوپر بھی، کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جوں توں اس گھانس کے سمندر کو پار کیا۔ وہ ٹاپو۔ یہاں پھر ایک دفعہ گھنا سرسبز جنگل، فرنوں اور پھولوں سے آراستہ، آ گیا۔ لیکن اب اس کا گھن اس بلا کا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے سے صاحب نے قطعی انکار کر دیا۔ اور پھر جب کہ یہ بات بھی یقینی تھی کہ خونی ہاتھی ضرور بالضرور اسی چھوٹے ٹاپو میں ہے، عقل نے آگے بڑھنا گوارا ہی نہ کیا۔ دل کی حرکت آٹھ روپے گز اونی سن پروف سرج کو عبور کر کے ظاہر ہونے لگی۔ صاحب بہادر دونوں ٹانگیں چیر کے ثابت قدمی سے وہیں کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے دونوں ڈبل بور بھرے ہوے رائفل سامنے درخت کے تنے سے لگا کر کھڑے کر دیے، اپنے مقدر کو کوسا، اپنے کو کوسا، بدّل کو انگریزی زبان کی تمام تر گالیاں بخشیں، اور جھولے میں سے سگار اور برانڈی کی بوتل نکال کر دونوں کا استعمال شروع کر دیا۔ جب کہ یہ سگار کے لمبے لمبے کشوں کے درمیان برانڈی

کی بوتل میں سے چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے میں مصروف تھے، بدّل کے واسطے سوائے اس کے چارہ ہی کیا تھا کہ وہ چکی کے پاٹ جیسے ہاتھی کے پیروں کے نشانوں کو کچھ دیر حسرت سے دیکھنے کے بعد ایک سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جائے۔ اس کا خیال ہرگز زیادہ دور جانے کا نہ تھا۔ محض شغلِ بے کاری۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا پیروں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چل دیا تھا۔ یہ نشان قریب پچاس گز گھانس سے جنگل کے اندر جانے کے بعد پھر گھوم کر ندی کے کنارے کے متوازی ہو گئے تھے۔ بدّل انھیں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ وہ دور نکل آیا ہے، واپس جانا چاہیے۔ اس لیے اس کے نشانوں کو چھوڑ کر ندی کے کنارے کی طرف رخ کیا۔ جھاڑیوں اور پتوں کا گھن بلا کا تھا مگر یہ جھجکتا اور بیٹھے بیٹھے کھسکتا، ان کے نیچے نیچے سے نکلتا، پھر ندی کے کنارے نکل آیا۔ لیکن جیسے ہی ریتیلے اور قدرے کشادہ کنارے آیا، اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہاں بالکل ہی تازے، ہاتھی کی واپسی کے پیروں کے نشان تھے۔ گویا ہاتھی اس وقت اس راستے سے صاحب کی طرف گیا ہے۔ بدّل نے اندازہ لگایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سو گز صاحب سے دور ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی ۴۰/۳۲ مارٹینی اکشن ونچسٹر رائفل کا لیور نیچے کھینچ کر مزید اطمینان کیا کہ کارتوس نال میں ہے، اور پھر لیور چڑھا کر رائفل دونوں ہاتھوں میں تانے واپس بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے جیسے ہی وہ بیت کی ایک جھاڑی کی آڑ سے نکلا، سامنے صاحب، ایک ہاتھ میں بوتل دوسرے ہاتھ میں سگار لیے، آنکھیں بند کیے، منھ سے دھواں نکالتے نظر آئے، اور ساتھ ہی اپنے اور صاحب کے درمیان جنگل کی آڑ میں ان کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھی بھی دکھائی دیا۔

مکار ہاتھی بے خبر شیرنی کی طرح چھپا ہوا دبے قدم بڑھ رہا تھا۔ اب چند ہی قدم اور آگے بڑھنے کی دیر تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ بدّل نے ایک بھیانک چیخ مار کر صاحب کو ہوشیار کیا۔ کانا ہاتھی اس آواز پر بجلی کی سرعت کے ساتھ گھوما اور اس چلّانے والے نئے دشمن پر جھپٹا۔ اب بدّل کے واسطے سوائے مقابلہ کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ ''مارو صاحب، مارو!'' کہتے ہوئے اس نے بندوق کندھے پر چھوائی، دھڑ سے فیر کیا۔ فوراً پھر نیچے کی۔ مٹھی میں پانچ کارتوس اور تھے۔ بندوق بھری اور پھر فیر کیا۔ پھر بھری اور پھر فیر کیا۔ ہاتھی کی چھ انچ موٹی ماتھے کی ہڈی پر یہ گولیاں ٹھساٹھس پڑتی اور

پھسلتی چلی جارہی تھیں۔ تاہم ہاتھی اس تکلیف دہ مذاق سے گھبرا کر رک گیا۔ لیکن اب بدّل کا آخری کارتوس خالی ہو کر نال سے گر چکا تھا۔ اس نے ہراساں ہو کر اُس طرف دیکھا جہاں صاحب بہادر کھڑے تھے۔ پھر اس نے مڑ کر گھانس کے کنارے کی طرف دیکھا جس میں صاحب بہادر گھس کر غائب ہوتے ہوئے اسے دکھائی دیے۔ اور اس کے بعد اس نے پھر کچھ نہ دیکھا۔ ہاتھی کے ایک ہی مکے میں یہ گرا اور تین فٹ موٹے پیر کی ایک ہی داب میں کچل کر جیتے جاگتے نوجوان انسان سے ہڈیوں، گوشت اور چھیچھڑوں کا مٹی ملواں ڈھیر ہو گیا، جس کو ٹھکرا ٹھکرا کر اور نوچ نوچ کر ہاتھی نے اور بھی زیادہ ناقابلِ تصور شیرازوں میں بکھیر دیا۔

میجر بوسٹ کا دوسرا ساتھی ان سے پہلے ہی رفو چکر ہو گیا تھا۔ تنہا صاحب بہادر جن مصیبتوں سے مالی کی کوٹھی تک واپس آئے ہیں، بس ان ہی کا دل جانتا ہے۔ تاہم خوش تھے کہ جان بچی اور لاکھوں پائے۔ کارتوسوں کا جھولا اور دونوں میں سے ایک رائفل وہیں رہ گیا تھا۔ جھولے کا تو خیر کچھ نہیں، لیکن جوڑی کے رائفل قیمتی تھے، جو چھوڑ آئے تھے۔ اس کی فکر تھی اس لیے دوسرے دن محکمۂ جنگلات کو بدّل کے دونوں ۴۰/۳۲ اور ۴۵۰ بور رائفل لے کر فرار ہو جانے یا گم ہو جانے کی باقاعدہ اطلاع دے کر صاحب بہادر اینٹھتے اکڑتے، چیختے چلاّتے بریلی روانہ ہو گئے۔

ان کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد بدّل کا بوڑھا باپ کلوا پاسی، بلّم کندھے پر رکھے، پریشان، گھبرایا ہوا، کوٹھی پر آیا اور بڑی دیر تک سونی کوٹھی کو دیکھتا رہا۔ آج یہاں چوکیدار بھی نہ تھا جس سے وہ کچھ دریافت کرتا۔ آخر ایک لمبی سانس لے کر وہ پھر واپس لوٹ پڑا اور سیدھا جنگل کی طرف چل دیا۔

صبح دس بجے سے آہیں بھرتا، سرنیچا کیے پھرتے پھرتے، آخر شام کے پانچ بجے ٹھیک اس جگہ پہنچ گیا جہاں یہ لوگ ہاتھی کے پیروں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ مالا ندی کی گھانس میں گھسے تھے۔ جیسے ہی اس نے کانے ہاتھی کے پیروں کے نشان دیکھے اور ان ہی کے برابر فوجی فل بوٹ اور بدّل کے نال دار چمڑودے جوتے کے نشان بھی پائے، یہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اور ''ہائے بھگوان! جو کا ہے بھگوان!'' ہاتھوں میں سر ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر ایکبارگی ''بدّل، بدّل! ارے

لل لہ آت ہوں!'' کہتا ہوا کھڑا ہو گیا اور نہایت تیزی سے گھانس میں روانہ ہو گیا۔ گزوں اونچی گھانس میں سُرنگ ایسا بے ترتیب راستہ کچلی ہوئی گھانس، کیچڑ اور دلدل میں بنا تھا جہاں بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھر بھی کلوا اسی پر آنکھیں گاڑے چلا جا رہا تھا، یہاں تک کہ ایک جگہ میجر بوسٹ کی واپسی کا نشان اسے نظر آ گیا تو اس وقت باپ کی محبت نے عقل کو خبط کر دیا۔ اس نے بے اختیار آواز لگائی، ''بدّل رے بدّل! آت ہوں لل لہ!'' سنسناتی ہوئی گھانس میں آواز بھر بھرائی اور پھر خاموشی ہو گئی۔

اب کلوا مجنونانہ وار اس گھانس کی اندھیری گلی میں بھاگنے لگا، یہاں تک کہ گھانس ختم ہو گئی۔ وہ جنگل کے کنارے پر پہنچا اور اندر داخل ہونے ہی کو تھا کہ دفعتاً بائیں ہاتھ کے نشانوں کی طرف گھوم پڑا۔ دس قدم اور گیا ہو گا کہ ششدر کھڑا ہو گیا۔

سامنے ہاتھی کے پیروں کی کھوندن تھی۔ جابجا سوکھے ہوئے خون کے سیاہ دھبے اور چھپکے تھے۔ انسانی جسم کے کئی ایک روندے کھوندے، مٹی میں لت پت، مکھیاں بھنکتے، بدبودار ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ بندوق کی ایک پتلی نال، خم کھائی، ہاتھی کے پیر کے گڑھے میں دھنسی پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور چرڑودے جوتے کے پاس ہی بندوق کا کندا ٹوٹا پڑا تھا۔

اس نظارے نے کلوا پاسی کو باپ کی حیثیت سے ہٹا کر ایک دفعہ پھر پرانے تجربہ کار شکاری میں تبدیل کر دیا۔ جوان بیٹے کی موت کا تعلق سرِ دست ملتوی ہو کر موت کے واقعات کی جستجو میں سارا دھیان لگ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ نہایت غور سے ایک ایک نشان کو اور ایک ایک گری پڑی چیز کو دیکھنا شروع کیا۔ پانچ عدد ۴۰۰/۳۲ بور کے پیتل کے خالی کارتوس، خون کے سب سے بڑے دھبے کے قریب سے ایک ایک کر کے بینے۔ پھر رائفل کی زمین میں دھنسی ہوئی ٹیڑھی نال کو نکالا۔ مٹی چھڑائی۔ نال میں دیکھا تو چلا ہوا ایک کارتوس اب بھی موجود تھا۔ اس نے ایک پکے شکاری کی طرح داد دی۔ ''ساباس، ساباس! بھاگا نہیں، ڈٹا رہا۔ گولی کھتم ہوے گئیں، تبھے بھی ڈٹا رہا۔'' اسی طرح بڑبڑاتا ہاتھی کے پیروں پیروں چلا۔ اس جگہ پہنچا جہاں پر سے ہاتھی صاحب کو چھوڑ بدّل کی طرف گھوما تھا۔ یہاں اس نے یہ دیکھا کہ ہاتھی اپنے بائیں طرف جب بدّل کے رُخ میں گھوما تھا تو ٹھیک بدّل کی ہی سمت نہیں گھوما تھا بلکہ کچھ زیادہ گھوم گیا تھا۔ اور پھر کچھ الٹا گھوم کر، قدرے سیدھا رُخ کر کے لیکن اب بھی کچھ دایاں رُخ

کیے ہوے، بڑھا تھا۔ کلوا بڑبڑایا، ''اُلٹی آنکھ نا ہے، سیدھی ہی سے دیکھت ہے۔'' اب اس کو یہ جستجو ہوئی کہ ہاتھی اُدھر کہاں جارہا تھا۔ اس نے تلاش کی تو صاحب کا جھولا، درخت سے لگا دونالہ رائفل بھی مل گیا۔ پھر صاحب کے پیروں کے نشان ملے۔ وہیں پر منھ سے گرا ہوا سگار اور ہاتھ سے گری ہوئی برانڈی کی بوتل ملی۔ رائفل کو کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ دونوں نالوں میں کارتوس تھے۔ جھولے کا معائنہ کیا، اس میں شکاری چاقو، دو چار شیشیاں، سگریٹ کا بند ڈبا اور ایسی ہی بہت سی چیزیں تھیں، لیکن اس نے ان کی کچھ فکر نہ کی۔ اس نے کارتوس گنے اور مزید احتیاط کے لیے نئے کارتوس رائفل میں بھر کر دیکھے۔ اتنے عرصے میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔ کلوا اسی درخت سے پیٹھ لگا کر اس کی جڑ پر بیٹھ گیا، اور پھر لڑکے کی موت کے وقوعات پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ پر ہاتھ بجھائی دینا مشکل ہو گیا۔ درخت کے پتوں سے اوس ٹپکنے لگی، اور دور مالا ندی کے باہر جنگلوں میں سے چیتلوں کے کوکنے اور گونڈوں کے ڈونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

صبح پو پھٹتے ہی کلوا رائفل اور جھولا لے کر ہاتھی کے پیروں پیروں تیز روانہ ہو گیا، اور شام تک برابر ایسے ہی چلتا رہا۔ دن میں دو ایک دفعہ گڑھوں اور نالوں کے قریب سے گذرا تو پانی پینے کو ضرور رُکا، ورنہ ایک منٹ بھی کہیں نہ ٹھیرا۔ ہاتھی نے مالا ندی کے اس ٹاپو سے دوسرے کنارے کا رُخ کیا تھا۔ وہاں سے جنگل ہی جنگل شمال کی طرف چلا گیا۔ شام ہوتے ہی کلوا نے پھر نشانوں کو جھک کر دیکھا، گوبر کو چٹکی سے مسلا، اور مایوسی کی حالت میں سر ہلایا۔ ہاتھی اس سے پورے چوبیس گھنٹے پہلے کا چلا ہوا تھا۔ اب بھی یہ نشان کافی باسی تھے، اور اب رات ہو رہی تھی۔ یعنی کلوا کو اپنا تعاقب موقوف کر کے رات گذارنا تھی، اور رات ہی ہاتھی کو پھر کسی اور طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس طرح رات بھر میں پھر ان دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھ جانے کا یقین تھا۔ لیکن کلوا کر ہی کیا سکتا تھا، مجبوراً ایک درخت پر چڑھ کر رات بسر کی۔ دن بھر کا بھوکا اور تھکا ہوا تھا۔ ایک غنودگی کی حالت اس پر طاری ہوگئی، اور اسی طرح صبح ہوگئی۔ صبح یہ پھر روانہ ہوا۔ اب اس کو نہ جنگل کے ٹکڑوں کا دھیان رہا، نہ سمت کا خیال رہا، نہ اس کا بھی اندازہ رہا کہ کس قدر فاصلہ وہ چل چکا ہے۔ تھکن اور بھوک پیروں کو ڈگمگا رہے تھے، اور تعاقب کا جنون سر پر سوار تھا۔ انتقام کی آگ دل میں لگی تھی۔ ارادے کی قوت تھی جو آگے بڑھا رہی تھی۔

دن کے ایک بجے کے قریب اس نے جھک کر ایک جگہ گوبر مسلا۔ اندر سے نرم اور تر تھا۔ کلوا کو یقین ہو گیا، ضرور صبح کا گوبر ہے۔ اسے خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ ہاتھی قریب ہی میں کہیں رکا ہوا دن گذار رہا ہے۔ اس امید کے پیدا ہوتے ہی کلوا اور تیزی سے روانہ ہوا۔ اب یہ کسی نالے گھنے کلک میں سے گذر رہا تھا، جہاں اکثر اسے چاروں ہاتھ پیروں پر ہو کر آگے بڑھنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی، کیوں کہ اس کلک میں کھیر کے چھوٹے چھوٹے کانٹے دار پودے مخلوط تھے۔ اب جو جو کلوا آگے بڑھے، کیچڑ اور دلدل زیادہ ہوتی جائے۔ ان سب باتوں سے اسے یقین ہو گیا کہ بس اس کے آگے ہی کہیں ہاتھی نے دن گذارا ہے اور شام ہوتے تک وہیں رہے گا۔ اب اس کے واسطے صرف یہی تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے یہ اس تک پہنچ جائے، ورنہ شام ہو گئی تو ہاتھی رات میں کہیں اور نکل جائے گا۔ کلک کے ختم پر بیت کی جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ یہ اور بھی زیادہ گھنی اور کانٹوں دار تھیں۔ ان میں سے تو اسے اوندھے لیٹ لیٹ کر آگے کھسکنے کی ضرورت پڑنے لگی۔ ایک جگہ ایسے ہی لیٹے لیٹے کھسک کر جھاڑی میں سے نکلا تو دیکھا کہ سامنے ہاتھی نے اپنا راستہ خود کاٹا ہے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ راستہ کاٹنے کے نشان پر کچھ دور چلا کہ پھر گوبر ملا۔ اب جو اسے چھوا تو بالکل تازہ گرم گرم۔ اب اس نے پیروں کے نشانوں کے بائیں طرف چلنا شروع کر دیا، کیوں کہ ہاتھی بائیں آنکھ سے ہی کانا تھا۔ جو جو یہ آگے بڑھتا گیا، پیروں کے نشانوں سے اور زیادہ ہٹ کر چلنے لگا۔ جنگل کے گھن کی وجہ سے بار بار اس کو پھر سیدھے ہاتھ کی طرف نشانوں کے قریب آ کر اُن کا رخ دیکھنا پڑتا تھا۔ اس وقت کلوا کی یہ حالت تھی کہ خفیف سے خفیف آواز پر اس کے کان لگے ہوئے تھے، نگاہیں دائیں بائیں ہر طرف یکساں چل رہی تھیں، دونوں مٹھیوں میں دو دو زائد کارتوس اور بھرا ہوا رائفل سامنے اٹھائے، چوکنا، جھاڑیوں کو کتراتا، ڈھونڈھتا پھر رہا تھا۔ اسی حالت میں ایک دفعہ پھر جب وہ پیروں کے نشانوں کی طرف آ رہا تھا تو اسے ڈالیوں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑھا، یہاں تک کہ وہ اپنے سے بیس قدم دور کھڑے ہوئے ہاتھی کے پاس آ گیا۔ ہاتھی ترچھا کھڑا ایک درخت کی ڈالیاں توڑ رہا تھا۔ کلوا نے دو فیر تڑا تڑ اس کی کنپٹی پر کیے، جن سے کہ ہاتھی گھبرا کر بھاگ پڑا۔ اب کلوا نے شور مچاتے ہوئے اس کا پیچھا کیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس شور کی وجہ سے ہاتھی کلوا کی طرف گھوم پڑا۔ کلوا ہاتھی کے سامنے ساکت کھڑا ہو گیا۔

اور جیسے ہی ہاتھی اس پر جھپٹا، یہ پھر اس کے بائیں طرف پھرتی کے ساتھ ہٹ گیا، اور نیزے بھر کے فاصلے سے پے در پے دو گولیاں پھر اسی کنپٹی پر رسید کیں، جن سے کہ ہاتھی گھٹنوں کے بل جھکا اور پھر دھماکے کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ گرے ہوے ہاتھی پر کلوا نے دو گولیاں اور جمائیں، اور اس کے ساتھ ہی خود بھی بندوق کا سہارا لیتے لیتے جھکتا چلا گیا اور بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اب ہاتھ پیر جواب دے چکے تھے، لیکن انتقام کی آگ اب بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے پھر پڑے پڑے بندوق کو کھولا، خالی کارتوس نکالے اور جھولا گھسیٹا۔ وہ پھر کارتوس بھر کر اور فیر کرنا چاہتا تھا، لیکن بندوق ہاتھوں سے گر گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

لیکن دوسرے دن صبح دس بجے امیر احمد فارسٹ گارڈ مع دو چوکیداروں کے جب اس طرف آئے تو کلوا پاسی ہاتھی کے پیٹ پر بیٹھے ہوے سر پکڑے رو رہے تھے۔ قانوناً ان کو گرفتار کیا گیا اور اسلحہ ناجائز کے استعمال کا مقدمہ ان پر چلایا گیا۔ اور ساتھ ہی پانچ سو روپے کے انعام کے مستحق ہونے کی بھی اطلاع دی گئی۔ اور ان سب کارروائیوں کے سلسلے میں ایک دن میجر بوسٹ کو بھی بہ سرِ عدالت سر جھکا کر اپنے شکار کے تمام واقعات صحیح صحیح دوہرانا پڑے۔ اپنے بیان میں جہاں کہیں میجر بوسٹ اڑنے کو ہوتے تھے تو فوراً ڈپٹی کمشنر، یعنی لوئس کا باپ، ان کو وہیں روک دیتا تھا، اور پھر کلوا پاسی سے اس کی تحقیقات کے مطابق سوال کرتا تھا، کیوں کہ لوئس کی خوشی تھی کہ میجر بوسٹ سے خود ان کی بزدلی کا اقرار کرایا جائے جس کے سننے کے واسطے وہ خود بھی عدالت میں موجود تھی۔

شیریں فرہاد

اگر میں یا آپ میں سے کوئی ہوتا تو ضرور رقت آمیز سروں میں یہی مصرع بار بار دہراتا:

سر بام آیئے ہم طالب دیدار بیٹھے ہیں

لیکن اندھیری سنسان گلی میں فرہاد تھوڑی دیر بعد دبی ہوئی آواز میں، عجیب منت آمیز لہجے میں کھینچ کھینچ کے ''آؤ، آؤ'' ہی کہہ کے شیریں کو بلاتے رہے اور شیریں کے سر بام نمودار ہونے میں جو جو دیر ہوتی گئی اُن کی ''آؤ'' میں درد کے سر بڑھتے گئے یہاں تک کہ ''آؤ'' سے ''عاؤ'' ہوا اور ''عاؤ'' سے ''عاعو'' ہو گیا جب جا کے کہیں شیریں صاحبہ لچکتی دبکتی، ٹہلتی ٹہلتی کوٹھی پر آئیں اور بڑے ناز و انداز سے سمٹ سمٹا کر چھجے پر بیٹھ کر نیچے گلی میں کھڑے ہوئے فرہاد کو دیکھنے لگیں۔

فرہاد نے آہ سرد بھر کر کہا، ''عا،عو۔''

شیریں نے لاپروائی سے جواب دیا، ''میاں آؤ۔''

میاں تو عہد کر چکے تھے کہ گھر میں قدم نہ رکھیں گے۔ اُس دن ریکٹ ایسا پڑا تھا کہ کمر میں آج تک درد تھا، اس لیے وہ اصرار کے ساتھ شیریں کو ہی گلی میں بلاتے رہے لیکن شیریں کو کیا غرض تھی کہ وہ جاتی۔ تھوڑی دیر بیٹھی اُن کی ''عاعو، عاعو'' سنتی رہی اور پھر ایک بار اور ''میاں آؤ'' کہتی ہوئی اٹھی اور آہستہ سے کوٹھے پر سے غائب ہو گئی۔

اب کہاں صبر ہو سکتا تھا۔ کیسا عہد اور کس کا ڈر۔ اُچک پڑوسی کی ڈیوڑھی پر اور وہاں سے پھلانگ

چھت پر آ گئے، مگر سنگ دل شیریں کوٹھے پر سے بھی نیچے جا چکی تھی۔ مجبوراً اب یہ صحن کی طرف دبے پاؤں بڑھے۔ آہستہ سے چھجے پر آئے، گردن بڑھا کر نیچے صحن میں دیکھا۔ کس قدر دلچسپ سین تھا۔ چاروں پیر جوڑ، دُم کو سمیٹ کر پیٹ سے ملا، دبک کر خاموش ہو گئے۔

صاف ستھرے مختصر صحن کو بجلی کے دو قمقموں نے روشن کر رکھا تھا اور تیسرا لیمپ مچھر دانیوں سے ڈھکی ہوئی پاس بچھی دو مسہریوں کے سرہانے جل رہا تھا۔ اسی کے برابر بجلی کا پنکھا (جس سے فرہاد کو سخت نفرت تھی) جھلل جھلل کرتا، چمکتا گھوم رہا تھا۔ کچھ فاصلہ دے کر تختوں کا چوکا تھا جس پر سفید چاندنی بچھی تھی۔ چاندنی پر بسنتی زمین، گلابی پھول اور نیلے حاشیے کا قالین بچھا تھا۔ اس پر گاؤ تکیہ، ایک طرف اُگالدان، دوسری طرف تانبے کا قلعی دار پٹاری نما پاندان اور ڈلی کی ٹوکری، تختوں کے برابر ایک چوکی پر سوندھے سوندھے دو نئے گھڑے، ایک جھجری اور ایک صراحی، دونوں کے گلوں میں موتیا کے ہار لپٹے تھے۔ لوٹے، صابن دانی، بیسن دانی سب نئے، جھلملاتے ہوئے۔

دوسری چوکی پر نعمت خانہ (جو کہ کھلا ہوا تھا)، اس کے برابر میں چھوٹی سی انگیٹھی پر دودھ کی دیگچی جس پر موٹی بالائی آ چکی تھی۔

صحن کے دوسری طرف باورچی خانے کی چنخی کے پاس مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ باورچی خانے میں سے شامی کبابوں کے واسطے اُبلے ہوئے قیمے کی بو آ رہی تھی اور ڈربے میں سے رُک رُک کر مرغیوں کی کھس پھس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فرہاد نے بڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ اس خاموش منظر کو دیکھا۔ آخر ان کو یقین ہی ہو گیا کہ گھر میں انسان کوئی نہیں ہے اور اگر ان سفید کپڑے کی کوٹھڑیوں میں کوئی ہے بھی تو ضرور سو رہا ہے، لہٰذا انھوں نے اب اور جرأت کی۔ اُٹھے اور منڈیر منڈیر باورچی خانے کی طرف چلے۔ مچھر دانی کے اندر اقبال دلہن کے پاس لیٹی ہوئی شیریں نے ان کو دیکھ لیا۔ پنجوں پنجوں مچھر دانی کھسکا، سٹ مسہری سے نیچے کود، لگیں ٹہلنے۔ کوٹھے پر سے فرہاد نے اُن کو جو دیکھا، خورش کا خیال ترک کر، جذباتِ عالیہ کی طرف رجوع ہوئے۔ عجب سوز و گداز تھا۔ فرمایا، "عاعو"

اُن دو میں سے ایک سفید حجرہ ہلا اور ساتھ ہی زوردار آواز آئی، "وہ دیکھو، وہ دیکھو! وہ آ گئے آپ کے فرہاد۔"

دوسرے سفید حجرے میں سے مہین لوچیلی آواز آئی، ''یہ نہ کہیے! یہ نہ کہیے کہ آپ کے فرہاد۔ فرہاد ہوگا تو اس چڑیل شیریں کا، میرا کیوں ہونے لگا۔''

''تو تمھارا فرہاد کون ہے؟''

''میرا کوئی بھی نہیں... اور... اور... سوائے آپ... اور...''

''کہو، کہو۔ چپ کیوں ہوگئیں؟''

''بھئی ہوگا۔ میں نے تو ابھی ابھی پیروں میں مہندی لگائی ہے۔ کچھ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ اللہ، آپ ہی اُٹھ کر نعمت خانہ بند کر دیں۔''

سفید حجرے میں حرکت ہوئی۔ لرزا، کانپا اور شق سا ہوا۔ فرہاد صحن کی طرف سے گلی کی طرف نکل گئے اور اقبال احمد صاحب، الیکٹرک سپلائی کمپنی کے نوجوان، کلین شیو شفٹ انجینئر صاحب، سنہری عینک لگائے، ''ساقی'' کا سالنامہ ہاتھ میں لیے، سیاہ دھاریوں کا نائٹ سوٹ پہنے، نمودار ہوئے۔ نعمت خانے کے پاس گئے تو اُن کی تین ماہ کی بیاہی ہوئی بیگم یا دلہن نے لوچ، منت، غرور، محبت اور شرم پانچوں حربوں کو ادا کرنے والے ایک عجیب لہجے میں کہا، ''کبابوں کے واسطے اُبلا ہوا قیمہ تو ہے۔ آپ جیتے رہیں۔ بھئی ذرا اور بڑھ جایئے، اس کی پتیلی بھی اٹھا لایئے اور یہ دودھ بھی سب نعمت خانے میں رکھ دیں۔''

اقبال احمد بغیر ایک لفظ بولے آہستہ سے باورچی خانے کی طرف مڑے، اندر گئے۔ جسم سے دور چٹکی میں لٹکائے ہوئے دھویں سے کالی پتیلی لائے، اس کو اندر رکھا۔ پھر دودھ کی پتیلی رکھی۔ نعمت خانہ بند کیا۔ اب چلے ہی تھے کہ پھر آواز آئی۔

''رحیمن سرِ شام ہی گھر چلی جاتی ہیں۔ کتنا ہی کہوں کہ اے بوا ذرا رک جاؤ مگر وہ کب سنتی ہیں۔ نہ معلوم دڑبہ بند کیا کہ نہیں۔ بھئی اس کو بھی دیکھ لیجیے۔''

اقبال احمد نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی مسہری سے دڑبے کا رخ کیا۔

''آخر شوق میں شوق، یہ بلی پالنے کا کیا شوق ہے؟ یہی حرام زادی تمھاری شیریں شہر بھر کے بلّے بلا کر لائے گی۔ ابھی تو ایک ہی فرہاد آئے ہیں۔ دیکھو تو درجنوں آئیں گے۔''

شیریں اپنی جنس کی فطرت کے مطابق محلے کے حلوائی کے کبڑے بلے کو اپنی دو چار ادائیں دکھا کر پھر اقبال دلہن کے پاس گھس آئی تھیں۔ دلہن نے اپنا حنائی ہاتھ بلی کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا،

''کیوں ری شیریں! تیرا ایسا ہوائی دیدہ ہوا ہے؟''

شیریں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خرخر کرتے ہوئے سر کو اور بھڑا کر دلہن کے ہاتھ سے رگڑتی ہوئی چلیں تو دم کی نوک تک چلی آئیں۔

لیکن اقبال احمد مرغیوں کے ڈربے سے واپس لوٹے تو اپنی مسہری پر نہ آئے بلکہ دالان کی طرف بڑھے، تو فوراً نسیمہ (دلہن) نے چونک کر کہا، ''اب کہاں چلے؟ اے کہاں جا رہے ہیں، بولیے تو۔''

''فرہاد کی دعوت کا سامان کرنے۔''

''بھئی خدا کے لیے، نہیں! آپ کو ہماری جان کی قسم، کچھ نہ کہیے گا۔ بلی کو نہیں مارنا چاہیے۔ سنا نہیں، بلی کو مارو تو روئی کے گالے سے مارو۔ واہ، آپ تو خوب ہیں۔ اس روز موئے کے تھاپی اس زور سے ماری۔ مجھے وہم آتا ہے۔ بھئی کیا کر رہے ہیں؟ آخر ارادہ کیا ہے؟''

''کچھ نہیں، دعوت کرنے کا ارادہ ہے۔ تھوڑی بالائی کھلاؤں گا فرہاد صاحب کو۔''

یہ کہتے ہوئے اقبال احمد کمرے میں غائب ہو گئے اور وہاں سے چھوٹی میز، ایک مراد آبادی بڑی سی تھالی اور بجلی کے تار کی ایک لچھی لیے ہوئے آئے، میز پر تھالی رکھی، تھالی کے بیچوں بیچ میں طشتری میں تھوڑی سی بالائی اور دودھ رکھا، پھر بجلی کا ایک تار ننگا کر کے تھالی کے نیچے دبا دیا اور دوسرا چینی کی طشتری میں دودھ میں ڈال دیا اور جب یہ سب ہو گیا تو پلگ لگا دیا۔

''اوئی اللہ، اس وقت تو شیریں تم وبال جان ہو گئیں۔ ایک ساں چائیں مائیں، چائیں مائیں، گھسی چلی آ رہی ہیں۔ اے رحیمن، اے رحیمن بوا، تم تو کوٹھری میں جاتی ہو تو بیٹھ جاتی ہو۔ اے چلو آؤ۔ لاؤ گھی۔ بس بس، دو ہی ٹکڑوں بھر کا اور چاہیے ہے۔ لاؤ، جلے جاتے ہیں۔ عیدو میرا بھیا، جلدی سے دھو لا۔''

کٹکٹاتے جاڑے، شام کا وقت، منٹوں میں تو رات ہوتی ہے۔ میاں نے پانچ بجے کا وقت

پارٹی کا بتایا تھا۔نسیمہ نے جلدی جلدی سب طرح کا پکوان، شاخیں، سوہال، کھجوریں، نمک پارے، خستہ کچوریاں، آلو، قیمہ، پوریاں، تلے انڈے سب تیار کر لیے تھے۔ نان پاؤ کے ٹکڑے تل رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہتی تھی، آج ضرور میاں ان سب کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے، کہ سائیکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔ ''آئی میاں!'' کہتی ہوئی رحیمن دوڑی۔ نسیمہ نے دوپٹے کے آنچل سے چولھے میں سے اُڑی ہوئی منھ پر کی راکھ پونچھی۔ مسٹر اقبال احمد چوخا کے دار اُونی ہوز، خاکی نیکر، نیلا بلیزر پہنے، گلے میں چھ انچ لمبی، تین انچ چوڑی بو لگائے، سر پر بانکا، فاختئی مرغی کے پر سے آراستہ فیلٹ کیپ اوڑھے، گھر میں داخل ہوے۔ ہاتھ کا پلندہ تخت پر رکھا۔ ڈورے نوچے، کاغذ پھاڑا۔ اس میں سے چار ڈبے نکلے۔ مکھن کا ڈبا، رس بھری جام کا ڈبا، پنیر کا ڈبا اور ۵۵۵ سگریٹ کا ڈبا۔ جیب سے چاقو نکال اُنھیں کے کھولنے میں مشغول ہو گئے اور جب سب سے ضدی مکھن کا ڈبا بھی بہ ہزار خرابی کھل گیا تو بیوی کو آواز دی۔

''کیوں بھئی، اب نکلو گی بھی کہ نہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک تمھارے پکوان میں سے کچھ بھی تیار نہیں ہوا۔ میں تو سمجھتا ہی تھا۔''

''جی نہیں، سب ہو گیا۔ سب تیار ہے۔ اے لیجیے، میں ابھی آئی۔'' یہ کہتی ہوئی نسیمہ باورچی خانے سے ایک پیر کی پھٹی ہوئی چپل گھسیٹتی ہوئی نکلی۔

''آخر نئی چپل کس دن کے واسطے اٹھا رکھی ہے؟ خیر ہوگا، تم سے تو کہنا فضول ہے۔ لاؤ ڈبل روٹی لاؤ، جلدی لاؤ، سینڈوچز بناؤں۔ دنیا کی بیویاں یہ کام کیا کرتی ہیں، یہاں ہم خود کرتے ہیں۔ بیوی ہماری کچھ جانتی ہی نہیں۔ کیا بتاؤں، امین آباد میں ان چیزوں کے لینے میں دیر ہو گئی۔ اے بھئی لاؤ۔ کھڑی کیا سن رہی ہو۔ لاؤ ڈبل روٹی، انڈے اور انگیٹھی بھی۔''

نسیمہ کی صورت افسردگی، گھبراہٹ، پریشانی، خوف، مری ہوئی آواز میں پوچھا، ''نان پاؤ۔ نان پاؤ؟''

''ہاں ہاں نان پاؤ۔ ارے ڈبل روٹی کہو نا۔ ہائے افسوس۔ مر گئے نان پاؤ کے کھانے والے اور مر گئے نان پاؤ کے پکانے والے، لیکن ہماری بیوی آج بھی نان پاؤ ہی کہتی ہیں۔ ریکٹ منھ سے نہ نکلا، جب کہا تھا پی۔ اچھا ڈبل روٹی نہ سہی، نان پاؤ سہی، وہ ہے کہاں؟''

''مجھ سے بھول ہوگئی۔''

''اچھا کوئی نیا شگوفہ کھلا ہے۔ ہاں بھئی، کیا بھول ہوگئی؟''

''میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔''

''ارے کچھ کھل کر کہو تو سہی۔''

''اب آپ جو جی چاہے کہیے۔ بے شک مجھ سے قصور ہوگیا۔ کل آپ نے کچھ کہا تو تھا میں نہ معلوم کیا سمجھی۔ میں نے تو نان یا...... ڈبل روٹی کے میٹھے ٹکڑے پکا دیے۔''

اقبال احمد کے ہاتھ کی کہنی تخت پر ٹک گئی۔ سر ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹک گیا۔ مری ہوئی آواز میں:

''اچھا وہ انڈے؟''

نسیمہ کی کچھ جان میں جان آئی۔ کچھ کھلی آواز میں اطمینان کے لہجے میں بولی، ''وہ تو تیار ہیں۔ سب تلے رکھے ہیں۔''

''ہائیں! افسوس، افسوس! آملیٹ بھی ختم۔ ہائے ری قسمت!''

نسیمہ کے منھ پر اب ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ آنسو ڈبڈبا آئے۔ خاموش سنتی رہی۔

''ارے، میں تو سمجھتا ہی تھا کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ پارٹی کیا ہوگی، اَور ہنسی ہوگی۔ کیا کرتا، سب سر ہوگئے، ترقی ہوئی ہے، پارٹی دو، پارٹی دو۔ اسسٹنٹ انجینئر ہوگئے ہو۔ اس روز رابرٹسن نے پارٹی کی۔ کیسی... خیر، اس کو جانے دو۔ مقبول نے پارٹی دی۔ کس قدر اس کی بیوی سلیقہ مند ہے۔ کیک بھی گھر کے ہی بنے ہوے تھے۔ اچھا جو میں کل کیک لایا تھا وہ تو ہیں یا انھیں بھی کچھ کر ڈالا؟''

نسیمہ نے کیک لا کے دیے۔ عیدو کو آہستہ سے بلایا۔ اپنا پکایا ہوا سامان پلیٹوں میں لگا لگا کر رکھا۔ اقبال احمد نے عیدو کو ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوے ڈیوڑھی کے کمرے میں میز پر سب سامان لگایا اور ہر ہر طرح عیدو کو سب سمجھا دیا کہ یوں چاے لانا، یہاں کھڑے رہنا۔ اس طرح سے برتن رکھنا اور اٹھانا۔ غرض کہ نیا چھوکرا اور ہندوستانی ناشتہ، قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ سب تیار کر ہی چکے تھے، ہنستے ٹھٹے لگاتے چاروں دوست، جن کو مدعو کیا تھا، سائیکلوں پر آ گئے۔

خدا کا شکر ہے کہ پارٹی ہر طرح سے کامیاب رہی۔ رابرٹسن نے دہی بڑے، بہت ہی مزے لے

لے کر کھائے اور کہا کہ "ہماری میم صاحب کو بھی ایسا پکانا آ جائے تو اچھا ہے۔ آپ کی بیگم سکھا دیں گی؟"

مقبول نے تو صاف کہہ دیا، "یار یہ اچھا کیا کہ یہ چیزیں تیار کروائیں۔ واللہ لطف ہی آ گیا۔"

کیک کسی نے چھوئے بھی نہیں۔ اقبال احمد بہت خوش تھے۔ خیر، بگڑی بات بن گئی۔ نیا چھوکرا عیدو بالکل جنگلی، لیکن خیر وہ بھی خاموش رہا۔ کوئی خاص بدتہذیبی نہ کی۔ ایک دو دفعہ ان لوگوں کی ہنسیوں میں خواہ مخواہ خود بھی شامل ہونے کی شروعات ضرور کی، لیکن اقبال نے جوں ہی گھورا فوراً دانت بند کر لیے۔

ناشتہ بڑے قرینے اور سلیقے سے ختم ہوا اور عین اس وقت جب کہ یہ لوگ میز پر سے اٹھنے ہی کو تھے، آسمان پر سے ایک بلائے ناگہانی پھنکاریاں بھرتی اور گزوں اچھلتی ٹپکی کہ اللہ کی پناہ! میز الٹی، برتن ٹوٹے، مہمان بھاگے، آپس میں ٹکرائے، کرسیوں میں الجھے اور گرے۔

عیدو صاحب نے تین ہی بجے سے موقع بہ موقع تھوڑی تھوڑی چیزیں چرا کر تانبے کی بیسن دانی میں جمع کی تھیں تاکہ رات کو فرصت میں ان کا مزہ لیا جائے۔ بیسن دانی روشندان کے پاس ہی پتے سے ڈھکی رکھی تھی۔ مقدر کے کھوٹے فرہاد صاحب، شیریں کے فراق میں پھرتے پھرتے، اس کے پاس آ گئے۔ ناک میں بو کیسے نہ جاتی، اور تر مال کی بو آ رہی ہے تو کیسے چھوڑ دیں، لیکن بیسن دانی کا منھ تنگ تھا، سر اندر تو چلا گیا مگر باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ اندھا بھینسا بن گئے۔ آگے پیچھے ہٹتے ہٹتے روشندان میں سے ٹپک پڑے، اب جو گرے اور اتنے بہت سے اجنبی آدمیوں کی ایسی ایسی آوازیں سنیں تو پھر کیا تھا — چاروں پنجوں کے ناخن نکالے، پھنکاریاں بھرتے زمین سے آسمان کی طرف رجوع ہوتے تھے اور آسمان سے زمین پر گرتے تھے۔ ظالم دو دو گز اُچھل رہا تھا۔

ہر طرف تاریکی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ ہلکا ہلکا دھواں محلے کی چھتوں پر پھیل رہا تھا۔ افق مغرب پر سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی یادگار، گہرے سیاہی مائل بادل کے دو چار ٹکڑے شرمندۂ وجود تھے۔ لیکن ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ سی دور، بہت دور بازار کی طرف سنائی دے رہی تھی۔ پاس ہی ایک مکان سے کسی

شیر خوار بچے کی ایک سانس اور ایک سُر میں رونے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ اطراف کی گہرائیوں اور کوٹھے کی دیواروں کی جڑوں میں سیاہی قدم جما چکی تھی۔ شیریں کوٹھے کی لونا لگی دیوار پر ساکت، اپنے سامنے کی منڈیر پر نگاہیں جمائے، افسردہ بیٹھی کسی گہری سوچ میں غلطاں معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سونچ بس افسردگی ہی تک محدود تھا۔ واقعات کی یاد، ان کا تسلسل، حادثات کی وجہ اور اُن سے نتیجہ نکالنا، یہ سب باتیں وہ بے چاری کہاں جانتی تھی۔ جب بھی وہ اپنی سہیلی نسیمہ کو رنج اور تکلیف میں دیکھتی تھی تو اس پر بھی رنج کا جاں گُسل غلبہ چھا جاتا تھا۔ نسیمہ کیوں اور کس لیے جسمانی تکلیف اور روحانی کوفت میں مبتلا ہے، اس سے اس کو کیا سروکار۔ اس کو گذشتہ کے بھی وہ دونوں واقعات یاد نہ تھے جب پہلے دو دفعہ نسیمہ کے یہاں ستوانسے بچے پیدا ہوے تھے اور اب یہ تیسری باری تھی۔ وہی ستوانسا بچہ پیدا ہوا، اور نہ صرف خود ہی پیدا ہوتے مر گیا بلکہ ماں کو بھی بلاوا دیتا گیا۔

پہلوٹھی کی دفعہ زچہ خانہ میکے میں ہوا تھا۔ ماں کے علاوہ خالہ، ممانی اور بھائی سب تیماردار تھے۔ دوسرے کی دفعہ میکے نہ جا سکی لیکن ماں زندہ تھی۔ گو قسم کھائی تھی کہ ماں کے گھر قدم نہ رکھیں گی لیکن وقت پر پیٹ پکڑے دوڑی چلی آئیں۔ اب کے کون کرتا۔ ماں چل بسیں، خالہ نے انکار کر دیا، بھاوج خود پورے دنوں سے۔ سسرال والے نئے پکھیرو، نام و نمود کے دیوانے، گز بھر اونچے ہوے تو اِترا گئے۔ نیچے کی دنیا آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

اقبال احمد اسی گوشت پوست کے بنے، ٹھیک اسی ڈھرے پر چل رہے تھے کہ جیسے ہی سیڑھی اوپر چڑھتے تھے نیچے کی سیڑھی کھود ڈالتے تھے۔ شفٹ انجینئر سے اسسٹنٹ انجینئر ہوے، پرانے دوستوں کو طلاق دی، نئے بڑھیا دوست پیدا کیے۔ اسسٹنٹ سے ریزیڈنٹ انجینئر ہوے تو اُن سے بھی بے تکلفی چھوڑی، پورے سے زیادہ اخلاق برتا، سادگی چھوڑی، کمال ہمدردی اور محبت جتائی، کس خوب صورتی سے اُن کو بھی دھتا بتائی۔ اب جو جورو کی طبیعت خراب ہوئی تو کون آیا، مسز جھا، مسز رحمٰن، مس فرحت وغیرہ۔ ایسی پرندیاں لپ اسٹک لگائے، کیمرے، ناولیں، چھتریاں ہاتھوں میں لیے، فاشسٹ اور سوشلسٹ مسائل پر گفتگو کرتی، لپ جھپ کرتی، قہقہے لگاتی آئیں، چاے پی، چاکولیٹ کھائے، سگریٹ پیے، بیس منٹ، آدھ گھنٹہ ٹھہریں، ہمدردی جتائی، نصیحتیں کیں، معالج بنیں اور چل دیں۔ چلتے

چلتے پھر ہمدردانہ نصیحتیں کرتی گئیں۔

''مسٹر اقبال، آپ کو چاہیے کہ ضرور آپ ایک نرس کو ہفتے دو ہفتے کے واسطے کرائے پر رکھ لیں۔ یہ دائی لوگ کیا جانیں مریض کو رکھنا۔ اور مریضہ کو بالکل اٹھنے بیٹھنے نہ دیں۔ آرام کریں، بالکل آرام، شور وغل کچھ نہیں۔ آپ بھی ان کے کمرے میں بہت کم جائیں بلکہ بالکل نہ جائیں۔ خاموشی، آرام، بس... اور... اور مکان... مکان بھی ٹھیک نہیں۔ کیوں نہیں آپ شہر سے باہر کوئی چھوٹا سا مکان لے لیتے؟ بڑے سستے مکان مل جائیں گے۔''

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے شوہر کی نام لیوا مسز ہیل، سند یافتہ نرس، مبلغ چار روپے یومیہ پر نسیمہ کی تیمارداری کے لیے دوسرے ہی دن تعینات ہو گئیں اور اس باکمال سحر نواز معالجے نے اپنی ان تھک کوشش اور توجہ سے، بہت جلد لب گور نسیمہ کو قطعی موت کے ہاتھوں سے کھینچ کر طویل عرصے کے لیے مردہ زندگی بسر کرنے کو چھوڑ دیا۔

اس کو، نہ معلوم کب اور کس وقت، کمرے میں اندھیرا سا تھا، کچھ ہوش سا آیا۔ افسردہ دل لرزاں تھا، ہاتھوں میں کپکپی تھی، سر میں چکر تھا۔ اماں وہیں تھیں کہ نہیں، یاد پر قابو نہ تھا۔ آنکھیں کھولیں، کسی کو پھرتے دیکھا۔ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ مسز ہیل گھومیں۔ بیگم کو ہوش میں پایا۔ ''او کھدا، او کھدا۔ تیرا شکر کر۔ بیگم، اب اچھا ہے۔ فکر نہ کرے۔ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔''

نسیمہ نے ایک جنبش اور محسوس کی۔ آنکھیں اور کھولیں، بینائی نے ترقی کی، ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ دماغ ٹھیرا، یاد اور حافظے نے ہلّہ بولا۔ عقل نے دستگیری کی۔ مکان... گھر... عورت... میم بلکہ ڈاکٹرنی... اس کے بازو میں... مرد... اپنا مرد... وہ... وہ... وہ... اللہ شکر، تیرا شکر... وہ، وہ کیا کر رہے ہیں؟... ڈاکٹرنی کو تک رہے ہیں، اور اس طرح تک رہے ہیں! ڈاکٹرنی حسین ہے۔ وہ، ہاں، اُنھیں نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ اِدھر اب بھی نہیں دیکھا۔ ان کی آواز۔ ''مسز ہیل...'' انگریزی... انگریزی...

میم کی آواز۔ انگریزی... انگریزی۔ ''مسز اقبال...'' انگریزی...... انگریزی۔

''آنکھیں بند کر کے سنوں۔''

آنکھیں بند کرلیں اور آوازیں مدھم اور ''ڈولی آئی ہے... ڈولی آئی ہے...'' کی آوازیں تیز ہونے لگیں۔ ہر طرف سے ''ڈولی آئی ہے، ڈولی اُتروالو'' کی آوازیں ہوئیں اور پچاسوں ڈولیاں نسیمہ کے چاروں طرف ناچنے لگیں۔

اندھیری دیوار پر آہستہ سے فرہاد کا سر نمودار ہوا، پھر سینہ، پھر پیر بھی اوپر آئے، اور اب فرہاد دیوار دیوار شیریں کی طرف بڑھے۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ انتہائے فلک پر سرخی کا ایک دھبا باقی تھا۔ بچہ اب بھی رو رہا تھا۔ دور کہیں ایک ڈھولک بھی بجنا شروع ہوگئی تھی۔ دو ایک گھریلو چمگادڑ ہوا میں سپاٹے بھر رہے تھے۔ فرہاد ''آؤ، آؤ'' کرتے شیریں کے قریب آئے لیکن وجہ در وجہ اسباب جانے، شیریں کے حیوانی دیدوں میں دو آنسو تھے۔ وہ دیوار سے کوٹھے پر کودی اور وہاں سے نیچے تیزی سے غائب ہوگئی۔

صدقے، صدقے، شیریں، تیری متبرک آنکھوں کے صدقے۔ دنیا بھر کے سچے موتی تیرے ان دو آنسوؤں پر نثار۔

اور چوں کہ اس زمانے میں شیریں اکثر افسردہ اور غمگین رہتی تھی اس لیے فرہاد کے دل پر بھی بڑا اثر تھا۔ وہ بے چارا اپنی سی ہر کوشش شیریں کا غم غلط کرنے کے لیے کرتا رہتا تھا۔ گلیوں کے چوہے، دیواروں پر کی گلہریاں یا کسی دور دراز مکانوں میں سے جھپٹا ہوا طوطا منھ میں دبائے ہوئے شیریں کے پاس آتا تھا اور اس طرح سے شیریں کو ان اَدھ مرے جانوروں سے کھیل کود میں مشغول کر لینے میں کبھی کبھی کامیاب ہو جاتا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے مشغلے کے بعد پھر شیریں کچھ بیزار سی معلوم ہونے لگتی تھی۔ فرہاد کو اپنی ان ناکام کوششوں کو جاری رکھنے کے واسطے بھی بڑی مشکلوں کے سامنے کرنے پڑتے تھے۔ اب وہ قریب قریب روزانہ اقبال احمد کی زد میں آ جایا کرتا تھا لیکن معمولی جوتے، رول، پیپر ویٹ وغیرہ سے وہ کچھ زیادہ خائف نہ تھا۔ اس کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی تھی کہ جس طرح سے بھی ہو وہ شیریں کا غم غلط کرے۔ لیکن اکثر شیریں اس کو نہ ملتی تھی اور وہ اس کی تلاش میں کمروں میں بھی گھس جاتا تھا اور

چوں کہ فطرت سے مجبور تھا اس لیے اس دن جب اس نے کھلے ہوئے نعمت خانے میں سے پنیر کی بو سونگھی تو شیریں کی تلاش ملتوی کر دی۔ نعمت خانے کی طرف بڑھا۔ لیکن جیسے ہی وہ اندر گھسا دھڑ سے نعمت خانے کا دروازہ بند ہو گیا۔ فرہاد بڑے زور سے اچھلا۔ اس کا سر ڈھکنے سے ٹکرایا اور ساتھ ہی، ہاتھ میں ستلی لیے، اقبال احمد دوڑتے ہوئے نعمت خانے کے پاس آئے۔ فرہاد نے پھنکاریاں بھرتے ہوئے پیٹھ پر کے بال کھڑے کر کے پنجوں کے ناخن نکال نعمت خانے کی جالی کو کھکوڑ مارا۔ ممکن تھا کہ وہ سخت جالی کو نوچ کر باہر نکل بھاگتا لیکن مہلت ہی نہ ملی۔ پہلے تو چاروں طرف سے بیت پڑنے لگے، پھر فرشی دری دوہری کر کے نعمت خانے پر ڈال دی گئی۔ اب جو دروازہ کھلا اور وہ اس میں سے جھپٹا تو دری میں الجھا۔ خدا کی پناہ! کس مصیبت کا سامنا تھا۔ اوپر سے دبایا گیا، چاروں طرف سے دری کی تہوں میں لپیٹا گیا۔ اس لپٹنے کی حالت میں سانس گھٹتی تھی۔ ہاتھ پیروں کی ہڈیاں چاروں طرف کے دباؤ سے ٹوٹی جاتی تھیں۔ پنجے چلاتا تو کس طرح سے۔ اُلٹ اُلٹ کر ہر ہر پہلو سے رکھا گیا، پھر اس کی دم دری سے باہر کھینچ لی گئی جس پر کہ ایک ستلی اس زور سے کھینچ کر باندھی گئی کہ تکلیف سے اس کا برا حال ہو گیا۔ اس کش مکش کی حالت میں بڑی دیر تک وہ مبتلا رہا۔ خدا خدا کر کے اس دری میں سے جب اس کی رہائی ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو ایک ٹین کے چھوٹے سے تنگ و تاریک ڈبے میں مقید پایا۔ اس کی دُم کے وسط میں اب بھی ایسی تکلیف تھی کہ اس کو معلوم ہوتا تھا کہ دُم وہاں سے کٹ کر گر جائے گی۔ وہ بے چارا سر گھما کر اپنی دُم تک منھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا۔ کیوں کہ گھومنا مشکل تھا۔ اس تنگ و تاریک قید خانے میں ہوا کا گذر تھا اور نہ روشنی کا۔ عمر بھر میں پہلی مرتبہ اندھیرے سے سابقہ پڑا تھا۔ پنجے چلاتا بھی تو وہ بھی کارگر نہ ہوتے۔ ناخن ٹین پر کھچ کھچاتے ہوئے پھسلتے تھے۔

اس نے تکلیف اور غصے میں ''نہ عاؤں، نہ عاؤں'' کہنا شروع کر دیا لیکن اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اسی حالت میں گھنٹوں گذر گئے۔ اسے نہ معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی اس کا فولادی قید خانہ ہلتا تھا، کبھی پھر ساکت ہو جاتا تھا۔ کبھی ہلتا تھا تو ہلتا ہی رہتا تھا۔ یہاں اس کی یہ حالت تھی کہ دم گھٹتے گھٹتے بے چارہ عجیب نیم بے ہوشی کی حالت میں تن بہ تقدیر پڑا تھا۔ آواز بھی کمزوری سے نہیں نکلتی تھی۔ اسی حالت میں اسے کچھ تازہ ہوا معلوم ہوئی۔ اس نے لمبا سانس لیا، جان میں جان آئی، پھر اسے کچھ روشنی

معلوم ہوئی اور تازہ ہوا بھی اور آئی۔ کوئی اس کا ڈبا کھول رہا تھا۔ کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ یہ بھی اب پیش آنے والی ہر مہم کے واسطے تیار ہو گیا۔ ٹھک۔ ڈھکنا کھلا۔ جھک سے اجالا ہوا فش شوں، فرہاد پھنکارے اور بڑی زور سے اچھلے۔ مسز ہیل۔ ''آئی مائی جیزس کرائسٹ'' کی کیک بھرتی ہوئی صوفے پر پیچھے جھکیں اور فرہاد صاحب چاروں پنجوں کے بیس ناخن ہوا میں چلاتے ہوئے ان کی گود میں اترے۔ مگر چوں کہ دونوں میں ایک دوسرے سے کچھ بھی دل بستگی کا واسطہ نہ تھا، اس لیے جس آنا فانا میں یہ وصل ہوا تھا اس سے بھی جلد دونوں میں فصل ہو گیا۔ میم صاحب غسل خانے کی طرف اور فرہاد صاحب برآمدے کی طرف بھاگے۔ ان کو تو غسل خانے کا دروازہ بند کر کے امن حاصل ہو گیا لیکن فرہاد بے چارے کی دُم کے پیچھے جھن جھناتی چھن چھناتی ایک ایسی بلا دوڑ رہی تھی کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھی۔ جو جو یہ جان توڑ کر بھاگتا، وہ جھن جھناتی مصیبت اس کا پیچھا کرتی تھی۔

بھاگتے بھاگتے بے دم فرہاد حضرت گنج کے چوراہے پر پہنچے۔ وہاں پورے دو درجن سیاہ سفید کبڑے بابا لوگ، مختلف قسم کے شیطانی مشاغل میں مصروف، ہوا خوری کر رہے تھے جنھوں نے چاروں طرف سے فرہاد پر یورش کی۔ کسی کی کک پڑی، کسی کی ہاکی اسٹک، اور ایک ڈھائی فٹ کا چقندری تو ایسا ہٹلر نکلا کہ اس کا لنگر پیچ فرہاد کی دُم پر پڑا اور پڑتے ہی پیچ پڑ گئے جس کی وجہ سے اینچا تانی فرہاد کی طرف سے ہوئی کہ فرہاد کو چار و نا چار اپنی آدھی دُم وہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ خیر دُم گئی تو غم نہیں، جان تو بچا لایا، اور دم کے ساتھ جھنجھنوں سے تو پیچھا چھوٹا جو کہ تانبے کے تار سے اس کی دم سے بندھے ہوئے، اس کی دم کے ساتھ بھوت کی طرح لگے ہوئے، ڈرا ڈرا کر دَم ہی نکالے دیتے تھے۔ اب دُم اور دُم کے جنجال سے سبک دوش ہو کر ہلکا پھلکا بھاگا تو اس نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔ راستے، گلی، کوچے اور محلوں کے جاننے کی کیا ضرورت تھی، گھر کی سمت تک کے دریافت کرنے کی اس کو حاجت نہ تھی۔ قدرت نے بلیوں کو ایک خاص حس ایسی دی ہے، چاہے جہاں اور جتنی دور ان کو بند کر کے لے جاؤ اور چھوڑ دو، جب چلیں گی تو سیدھی گھر کی طرف۔ دُم شکستہ فرہاد بھی چھتیں، دیواریں، مُہریاں، گلیاں پار کرتے، کتوں سے بچتے، مرغیوں، کبوتروں اور چوہیوں کے دل دہلاتے، پٹتے پٹاتے اور راستے بھر بقیہ دُم کے فاؤنٹین پن سے سرخ روشنائی کی بوندیں ٹپکاتے، آخر گھر آ ہی گئے۔

لیکن زمانہ ایک حالت پر نہیں ٹھہرتا۔ فرہاد اور شیریں کی زندگی نے اب ایک نیا دور اختیار کر لیا تھا۔ محبت کی پُر مسرت جستجوئیں اور ناکامیاں، مہمیں اور پریشانیاں، مع اپنی پُر سحر دلچسپیوں کے، ختم ہو چکی تھیں۔ اب ایک پھیکی اور سیدھی سادی زندگی یہ دونوں نسیمہ کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ فرہاد حلوائی کی دکان سے بالکل بے واسطہ ہو کر یہاں ہی دن رات رہتا تھا۔ اب اس گھر میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اقبال احمد نے یہاں آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ وہ اپنی نئی بیوی مسز ہیل کو مسز اقبال بنا کر حضرت گنج میں رہنے لگے تھے۔

وہ غزالِ پا شکستہ سے سوا مظلوم نسیمہ، بے زبان، یاس کی پتلی شیریں، اور شیریں فرہاد ہی کیا، گھر بار، کپڑا پیسہ بلکہ خود اپنی جان سے لاپروا، ایک مسلسل اچنبھے اور بے ہوشی کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ گو اقبال اب بھی اس کو پچاس روپے مہینہ خرچ کے لیے دیتے تھے لیکن اس کو روپے کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس روپے سے دلچسپی رکھنے والے افراد، یعنی رحیمن اور عیدو، نے باورچی خانے اور کوٹھڑیوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ باقی ماندہ گھر پر بظاہر قبضہ شیریں اور فرہاد کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ دونوں کمرے، کوٹھڑیوں اور برآمدے کے کونے کونے میں پڑے پھرتے تھے۔ گھر میں ہر طرف گرد اور کوڑا، پھٹے ہوئے کاغذ اور کپڑوں کے چیتھڑے پڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ صحن میں جا بجا گھاس اُگ کر اس پر کپڑوں میں چمٹنے والی بالیاں اُگ آئی تھیں۔ مرغیوں کے دڑبے کے اوپر اور چاروں طرف چڑپٹے کے چھتے اُگے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی کے پاس ایک اونچا اگالدان اتنے عرصے سے اوندھا پڑا تھا کہ اب وہ قریب قریب آدھا چولائی میں چھپ گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے کونے میں عیدو کے کھائے ہوئے آموں کے درخت اُگ آئے تھے۔ خود نسیمہ کی چارپائی کو برآمدے کے ایک کونے میں پڑے پڑے اتنا عرصہ گذر گیا تھا کہ چارپائی کے نیچے فرش پر چوکور نشان الگ نظر آتا تھا۔

نسیمہ کا سارا وقت بیٹھے چھالیا کترتے یا ''راہِ نجات'' اور ''حلیمہ دائی'' کی کتابوں میں سے کسی کو پڑھنے میں گذرتا تھا۔ اس کے پاس نہ صرف یہی دو کتابیں تھیں بلکہ کسی اور کتاب کے پڑھنے کی اس میں قابلیت بھی نہ تھی۔ یہ دونوں کتابیں اسے حفظ سی ہو گئی تھیں اور انھیں کو بار بار پڑھتی تھی۔

حلیمہ دائی کی مختصر اور سادہ نظم کے ہر ہر شعر میں اسے عجیب وغریب پراسرار کشف اور درد پنہاں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مقدس کتاب (جس کے اشعار کے لفظ بہ لفظ معنی بھی وہ نہ سمجھ سکتی تھی) ایک آنے والی پرسکون اور اصلی زندگی کے مژدوں سے پُر تھی۔ وہ اس کو معصوم جذبے اور ایسے سچے اعتقاد کے ساتھ پڑھا کرتی تھی کہ آنسوؤں کی قطار اس وقت تک نہ ٹوٹتی تھی جب تک کہ کتاب اس کے سامنے رہتی تھی، اور چونکہ بیوی کے آنسو بہتے تھے اس لیے رحیمن کا فرض تھا کہ خود بھی ٹپ ٹو ئیاں آنسوؤں سے ساتھ دیں یا کم از کم سڑاسڑ ناک ہی سونت سونت کر پلنگ کے پائے سے پونچھتی رہیں۔

ایک روز سہ پہر کے وقت نسیمہ حلیمہ دائی کا قصہ پڑھ رہی تھی۔ حسبِ دستور رحیمن پلنگ کی پٹی پکڑے زمین پر اکڑوں بیٹھی سن رہی تھی۔ نسیمہ دو پیسے والی کتاب کے پارہ پارہ اوراق کو دونوں ہاتھوں سے تکیے پر دبائے، ہل ہل کر ایک سادے درد انگیز میلاد کے راگ میں ایک ایک شعر کو دو دو اور تین تین بار ادا کر رہی تھی اور دوپٹے سے آنسو پونچھتی جاتی تھی، کہ یکا یک عیدو، اپنی کنکیا چھوڑ، تھپڑ تھپڑ بھاگتا ہوا کوٹھے سے نیچے دوڑا آیا اور ہانپتا ہوا پاس آ کر بولا، ”بیگم صاحب، کوئی آیا ہے۔“

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ نسیمہ نے منھ اونچا کر کے پوچھا، ”کون ہے؟ کہتا کیوں نہیں؟“

”بیوی! کیا معلوم کون ہے!“

”اے رحیمن! دیکھو جا کر۔ پوچھو کون ہے۔“

ڈیوڑھی سے بھرائی، گھبرائی ہوئی آواز آئی، ”اقبال احمد! اقبال احمد!“

نسیمہ کے منھ پر مسرت اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس نے جلدی سے سر پر دوپٹہ درست کیا اور پھر ”اے دیکھنا رحیمن، میاں بھائی ہیں میاں بھائی!“ کہتے ہوئے چارپائی سے نیچے اتری۔ سٹرپٹر سٹرپٹر جوتیاں پہنتی چار قدم آگے بڑھ کر مودب کھڑی ہوگئی۔ رحیمن نے سمٹ سمٹ کر دوپٹہ سنبھالنے، ہنسی کے روکنے کے سو سونخروں کے بعد ڈیوڑھی میں جھانکا، پھر اندر دبکیں، ہمٹیں، آدھی ٹیڑھی ہوئیں اور شیریں آواز نکالنے کی کوشش میں چیں چیں کر کے منمنائیں، ”آیئے میاں، اندر آیئے۔“

لمبا قد، سفید کپڑے، سیاہ چھدری ڈاڑھی، چوڑا چہرہ، سرخی مائل گندمی رنگ، ایک ہاتھ میں عصا دوسرے ہاتھ میں چمڑے کا ہینڈ بیگ، نسیمہ کے بھائی منشی کاظم حسین سب رجسٹرار تیزی سے گھر میں داخل ہوے، اور بیچ انگنائی میں جھجک کر مستقل طور پر ساکت کھڑے ہو گئے۔ نسیمہ نے مجبوراً تیسری دفعہ جھک کر تسلیم کی۔ نسیمہ کے بھائی نے بہ آواز بلند کلمہ پڑھا، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰه۔

نسیمہ گھبرا گئی۔ شرم و لحاظ کو قدرے پس پشت ڈالتے ہوے آگے بڑھی۔ ''خیر تو ہے میاں بھائی؟ میرے اللہ، خیر تو ہے۔ کیا بات ہے میاں بھائی؟''

منشی کاظم حسین صاحب، نگاہیں نسیمہ پر ایک ساں جمائے ہوے، سیدھے ہی کھڑے کھڑے، گھٹنے ٹیڑھے کرتے ہوے آہستہ آہستہ نیچے ہوے۔ عصا اور ہینڈ بیگ کو ملائمت سے زمین پر رکھ کر پھر ویسے ہی نگاہیں جمائے ہوے آہستہ آہستہ سیدھے ہوے۔ دونوں ہاتھ اٹھائے، ماتھے اور آنکھوں پر سے پھیرتے ہوے ڈاڑھی کی نوک تک لائے اور پھر قرأت سے ''شکر الحمد للہ!'' کہا۔

یہ سین شیریں فرہاد دونوں کے سوا سب کے لیے پر ہیبت تھا چناں چہ آگے آگے فرہاد اور ان کے پیچھے شیریں گھر کو چھوڑ زینے سے ہوتے ہوے کوٹھے پر پہنچ گئے اور کئی گھنٹے واپس نہ آئے۔

اس عرصے میں بھائی بہن میں کافی گفت و شنید ہو جانے سے قدرے پھر سکون پیدا ہو گیا۔ کاظم نے بتایا کہ اس کو اقبال احمد کا تار ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر اپنی بہن کا آخری دیدار کرنا ہے تو کرلو کیوں کہ وہ حالتِ بیماری میں دم توڑ رہی ہے۔ گھنٹوں کی مہمان ہے۔

نسیمہ نے اب اپنی پوری سرگذشت سنائی اور اقبال کیا کہ بے شک وہ اپنے خطوط میں ان کو صحیح حالات سے آگاہ نہ کرتی تھی، اور بے شک بھائی کے بلاوے کے خط اس کو ملے جن کا وہ کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ اس نے اس وقت بھی زار و قطار روتے ہوے ہچکیاں لے لے کر کہا، ''میاں بھائی، آپ جییں ہزاروں برس، پھلیں پھولیں، خوشیاں کریں، بہویں لائیں۔ یہی میری دعا ہے، یہی میری تمنا ہے۔ لیکن مجھے تو، میرا تو یہی گھر ہے۔ جیتے جی اب اس کو کیسے چھوڑوں؟ اسی گھر کی دہلیز پر میرا دم نکلے، یہی میری آرزو ہے۔ قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ اس گھر کو چھوڑوں تو دنیا اور آخرت دونوں میں منھ کالا ہو۔ یہ میرا گھر ہے، میں اس کو کیسے چھوڑ دوں؟''

کافی احتیاط اور بار بار آزمانے کے بعد یہ دونوں گھر میں تو آ گئے لیکن رات بھر سوئے ہوئے کاظم حسین کی ڈاڑھی اور ڈنڈے کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے رہے اور صبح ان کے بیدار ہوتے ہی یہ دونوں پھر گھر سے بھاگ کوٹھے پر پہنچ گئے اور کوٹھوں کوٹھوں پھرنے لگے۔ فرہاد نے برابر ہی کے دو منزلہ مکان کے زینے میں دھنی کے اندر چھپا ہوا گلہری کا ایک جھونجھ ڈھونڈ لیا۔ یہ بڑا ہی پر لطف مشغلہ تھا۔ شیریں اور فرہاد بار بار لکھوری اینٹوں کی دیوار میں پنجے جما کر دھنی تک چڑھنے کی کوشش میں مشغول ہو گئے۔ حالانکہ وہاں تک پہنچنا ان کے لیے ناممکن تھا، پھر بھی ان کو دیوار پر چڑھنے اور گرنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا کیوں کہ گلہری خانم دیوار کی کانس پر بیٹھی، دُم پھلائے، چرّر چر چر چر ایک ساں شور مچا رہی تھیں اس لیے یہ دونوں اور خوش ہو ہو کر اُن کو اور ڈرا رہے تھے، لیکن اسی اثنا میں شیریں کو اپنے گھر میں بڑی پاٹ دار آوازیں جھر جھراتی اور تھر تھراتی سنائی دیں۔ فوراً اس کا دل کھٹکا۔ نسیمہ کی یاد آئی۔ سیدھی گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اقبال احمد اور کاظم حسین گھر کے آنگن میں کھڑے گلے پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے پر زبانی حملہ کر رہے تھے۔ نسیمہ باورچی خانے کا کھمبا پکڑے کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔ رحیمن زمین پر اکڑوں بیٹھی نسیمہ کی پنڈلی پر ماتھا ٹیکے رو رہی تھی۔ وہ مہینوں بلکہ برسوں بیوی کی خوشنودی کے واسطے حلیمہ دائی کے قصے پر نسیمہ کے ساتھ روتی رہی تھی۔ اس نے مہینوں نہیں بلکہ برسوں دو آنے سیر کا نمک لا کر دیا تھا۔ لیکن یہ نجی اور پیشے کی باتیں تھیں۔ آج ان سب جذبات کو ایک طرف کر کے وہ دل توڑ توڑ کے رو رہی تھی۔ آج اس کا دل نسیمہ کی معصوم ہستی، نسیمہ کی پاک اور سچی ذات اور صرف ذات ہی سے جدا ہونے کے غم میں بیٹھا جاتا تھا۔

برآمدے میں گھڑونچی کے پاس عیدو کھڑے رو رہے تھے اور کٹورے پر کٹورا پانی کا پی رہے تھے۔ آج ڈور، کنکیوں، لٹو اور پھرکیوں کی محبت غائب ہو کر ایک سچی اور پیاری ہستی، ماں سے بھی زیادہ مشفق دیوی کے چھٹنے کا غم ان کو بے تاب کیے ہوئے تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نسیمہ کی کتابوں کا جزدان بن جائے اور ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ چلا جائے۔ چونکہ یہ خیال بار بار ناممکن معلوم ہوتا تھا، اس لیے پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا اور بھر بھر کٹورے پانی پیتا تھا۔ شیریں کا بس نہ چلتا تھا

کہ کیوں کر اقبال احمد اور کاظم حسین دونوں کا ٹیٹوا چبا جائے۔ اس کو اس سے کچھ واسطہ نہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں، لیکن ان دونوں کا ایک دوسرے پر گلے پھاڑ پھاڑ کر چلانا بہت ہی ناگوار تھا۔ وہ نسیمہ کے پیروں کے اِردگرد بار بار پھرتی تھی اور بے کس ماؤں ماؤں کرتی تھی۔

سسکیاں، ہچکیاں، ماؤں ماؤں کچھ کام نہ آئے تو پھر یوں اُجڑا اور یوں اُجڑا نسیمہ کا چھوٹا سا گلشن جس میں بہار آتے ہی جا چکی تھی، جو برسوں سے پامالِ خزاں پڑا سنسناتا تھا، آج وہ بھی نہ رہا۔ چل چلاؤ۔ خاتمہ۔ خاتمہ!

کچھ سامان اِدھر سے اُدھر ہوا، کچھ اندر سے باہر، کچھ باہر سے اندر۔ مٹی کے چند گھڑے پھوڑے گئے، کچھ کاغذات پھاڑے گئے، کچھ پھٹے پرانے کپڑے پھاڑے گئے، کچھ بانٹے اور پھینکے گئے۔ چینی کے ٹوٹے برتن، خالی ٹین اِدھر اُدھر پھینکے۔ گھر کا کوڑا دو چند اور سہ چند ہوا یعنی نسیمہ کا اسباب بندھا اور ٹھیک ہوا۔ بند گاڑی کھڑکھڑاتی آئی، سامان رکھا گیا۔ نسیمہ نے مڑ کر اس سات برس پرانے قید خانے کو پھر دیکھا۔ آخری مرتبہ پھر ابل کر روئی۔ شیریں کیا کرتی، ماؤں ماؤں کرتی ایک ساں صدقے ہوتی تھی۔

کاظم حسین نے گھر کا، ”بس رو چکیں۔ اب بھی دل نہیں بھرا؟ اٹھو خدا کے لیے!“

نسیمہ نے شیریں کو گود میں لے لیا اور بھائی کے پیچھے پیچھے گھر سے نکل، گاڑی میں سوار ہو گئی۔ جانوروں کو بھول جاؤ، ان سے بے توجہ ہو جاؤ تو اس کا ان کو شکوہ نہیں ہوتا۔ محبت اور توجہ کرو تو وہ مشکور ہوتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ شیریں کو آج پورے ایک برس کے بعد نسیمہ نے گود میں لیا تھا۔ اس کو اس کی انتہا سے زیادہ خوشی تھی۔ حالانکہ گاڑی کی کھڑکھڑ اور ہل جل اور دھچکوں سے بہت گھبرا رہی تھی لیکن نسیمہ ہی سے چمٹی بیٹھی رہی۔ اب گاڑی اسٹیشن پر پہنچی۔ تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ آیا۔ سامان اترا، یہ لوگ اترے، لیکن یہاں بے شمار آدمی ہر طرف پھیلے ہوئے آ جا رہے تھے اور اُن میں پچاسوں خوفناک کتے بھی پھر رہے تھے۔ شیریں کا نسیمہ کے برقعے کے اندر دم گھٹتا تھا، باہر اُن سب کو دیکھ کر دل دہلتا تھا۔ یہاں آ کر وہ بہت پریشان تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ کدھر جائے اور کدھر چھپے۔ ایک دفعہ ہاتھوں سے نکل، کھوئی ہوئی نسیمہ کے پیچھے پہنچی۔ دو کتے اس پر جھپٹے، بے چاری بھاگی اور ایسی

بھاگی کہ پھر نہ اُسے پتا چلا کہ وہ کہاں ہے اور نسیمہ کدھر ہے۔ فطرت کا تقاضا تھا کہ چل اسی گھر کی طرف چل۔ عقل کوتاہ بھی یہی کہتی تھی، وہی گھر، وہی بیوی ہوں گی، چنانچہ آٹھوں حواس کی مدد سے یہ روانہ ہوئی اور سیدھی گھر کی طرف چل دی۔

جس وقت وہ گھر پہنچی، دن کے دو بجے تھے۔ اِکا دُکا چیلیں آسمان پر منڈلا رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بگولے چھت پر سے ہوتے ہوئے صحن میں اترتے تھے اور صحن کے کونے میں چکر لگا رہے تھے۔ یہاں کاغذ کے پرزے، جھاڑو کے تنکے، دونوں کے پتے بار بار اِدھر اُدھر سے لپک لپک کر گول گول چکر گھمیاں کھاتے ہوئے چھت کی طرف اڑتے تھے اور پھر یاس اور حسرت کی حالت میں گر کر بے حس ہو جاتے تھے۔ گھر میں ہر طرف کوڑا تھا۔ باورچی خانے کے سامنے کوئلے کا گھڑا ٹوٹا پڑا تھا۔ کوئلے اور راکھ بکھری پڑی تھی۔ برآمدے میں نسیمہ کی برسوں پرانی چارپائی، برسوں پرانی جگہ سے دور، دو پاؤں پر دیوار سے لگی کھڑی، اوپر کے دونوں ہاتھ پھیلائے، دعا کی حالت میں گریاں معلوم ہوتی تھی۔ ان کے پاس رحیمن کا ٹین کا پاندان خالی اور اوندھا پڑا رو رہا تھا۔ خاموش، دنیا سے علیحدہ، راہبوں کی سی زندگی بسر کرنے والے اس گھر کے تین نفر برسوں سے اس اُجڑے ہوئے گھر میں، سب سے الگ تھلگ چپکے پڑے، زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کسی طرح کا اُن کے وجود سے دنیا پر کوئی بار نہ تھا اور نہ یہ دنیا میں مخل تھے، مگر آج وہ بھی نہ تھے۔ ڈیوڑھی میں تالا پڑا تھا۔ گھنٹوں شیریں اور فرہاد ماؤں کرتے پھرے مگر سب بے سود۔ شام ہوگئی، اندھیرا چھانے لگا مگر اس گھر میں چراغ جلانے والا کوئی نہ تھا۔

اقبال احمد کی صورت سے ایک سے زیادہ دوسرے کو نفرت تھی۔ شیریں اور فرہاد دونوں اس کو حقیر اور ذلیل نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جو کچھ ہوا، وہ پرانے دوست نہ تھے نہ سہی، گھر تو یہ اُن کا ہی تھا۔ اس ظالم کو کیا حق تھا کہ وہ اس طرح سے گھر میں گھس کر کھڑ بڑ کرتا، سامان اٹھاتا رکھتا پھرے۔ ان دونوں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ چاہے جو کچھ بھی بھگتنا پڑے، وہ اس گھر کو نہ چھوڑیں گے۔ کمروں میں سامان کے پیچھے چھپے ہوئے یہ دونوں اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک اقبال احمد ان کے پاس نہ آ جاتا تھا۔ پھر دونوں وہاں سے بھاگ کر دوسرے کمرے میں، اور سامان کے پیچھے جا چھپتے تھے۔ اقبال احمد پسینے

میں شرابور، منہ میں سگار دبائے، میزوں اور کرسیوں کو گھسیٹتے، چار پائیوں کو دھکیلتے، برتنوں کو کھڑ کھڑاتے مسلسل دو گھنٹے تک پھرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے کمروں میں تالے لگائے، گھر سے باہر نکلے، ڈیوڑھی میں تالا لگایا اور بے بی آسٹن پر بیٹھ کر گرد میں اٹے چل دیے۔ یہ واقعہ نسیمہ کی روانگی کے دوسرے روز ہوا اور اس طرح شیریں اور فرہاد سچے عاشق و معشوق کی طرح ایک ساتھ مرنے کے واسطے کمرے میں چھوڑ دیے گئے۔

کچھ دیر تو اپنے اس طرح قید ہو جانے کی اہمیت کو یہ لوگ نہ سمجھ سکے۔ گھر میں خاموشی ہو جانے کے بعد انھوں نے کمرے کے بے ترتیب سامان میں چھلی چھلیا کھیلی۔ سامان جس قدر تتر بتر تھا اُتنی ہی اُن کو اس سے دلچسپی تھی، کیوں کہ اس میں سے ایک آدھ چوہے یا چوہیوں کی کھسکھساہٹ معلوم ہوتی تھی اور کبھی کبھی ان کی جھانکتی ہوئی کھوپڑیاں ان کو نظر آتی تھیں۔ کافی جستجو کے بعد فرہاد نے ایک چوہا بھی پکڑ لیا اور جب اُسے ادھ مرا سا چار پائی پر لایا تو برابر کی میز کے اوپر رکھی ہوئی کرسی پر سے شیریں نے جست کی اور چوہے کو چھین لیا۔ کچھ دیر تک چھینا جھپٹی ہوا کی۔ لیکن اب شام ہو رہی تھی، کمرے میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ ختم برسات کی گرمی سے کمرے میں گھٹن معلوم ہوتی تھی۔ مرے ہوئے چوہے کو چھوڑ کر یہ دونوں دروازے کے پاس آئے۔ بار بار اس کے سامنے ٹہلے، پنجوں سے کھس کھسایا، کمرے میں چکر لگایا اور پھر دروازے کے پاس آ گئے۔ اس کمرے کا یہ ہی ایک دروازہ تھا، دوسرے کی تلاش بے کار تھی۔ پھر بھی یہ کمرے میں رات بھر چکر لگا کر ساری رات اَور دروازوں کی تلاش بھی کرتے رہے اور ہر چکر میں اس دروازے کی درار میں ناک رگڑتے تھے۔ ان کو اس کمرے میں کھانے کے واسطے مطلقاً کچھ میسر نہ تھا۔ ایک کونے میں البتہ تانبے کی مٹکی میں پانی بھرا رکھا تھا اور اس کو چاٹ چاٹ کر باہر نکلنے کی بے سود کوشش میں متواتر پھرتے رہے یہاں تک کہ دوسرا دن بھی گذر گیا۔

بلیاں چوہے کا شکار شوقیہ کرتی ہیں اور صرف سر چبا کر اس کو پھینک دیتی ہیں۔ ان کے مذہب میں چوہا کھانا جائز نہیں ہے۔ اب بھوک کے مارے یہ حالت ہو گئی تھی کہ روزِ گذشتہ کا مرا ہوا چوہا دونوں نے خوب کھایا اور اب جو پیٹ میں غذا پہنچی اور بھوک میں چوہے کے گوشت کی لذت معلوم ہوئی تو دونوں نے مل کر اب چوہے اور چوہیوں کی تلاش شروع کر دی، لیکن افسوس کہ اُن کی بتیس گھنٹے کی متواتر

موجودگی کی وجہ سے سب چوہے اور چوہیاں اس کمرے اور اس کمرے کے بلوں پر لعنت بھیج کر چل دیے تھے۔ غرض یہ کہ بھوکے پھرتے پھرتے ان کو چار دن اور چار راتیں ہوگئیں۔ اب یہ دونوں کونوں کھتروں میں سے جھینگروں کی تلاش کر کے کھا رہے تھے۔ صرف پانی زندگی کو کہاں تک برقرار رکھتا۔ جو جو وقت گذرتا گیا ان کی قوت زائل ہوتی گئی۔ اب یہ دونوں کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے "ماؤں" اور "عاؤں" کی صدائیں از خود نکالتے تھے۔ ان کے چکرائے ہوئے دماغ اور دھندلی آنکھیں ہر کونے میں انھیں جھانکتے ہوئے چوہے اور چوہیاں دکھاتی تھیں۔ یہ بار بار اُمید کی قوت پر اٹھ کر جاتے تھے اور پھر ڈگمگاتے ہوئے "ماعوں ماعوں" کی دم توڑ آوازیں نکالتے دروازے کے پاس آجاتے تھے۔

جو جو وقت گذرتا گیا ہاتھ پیر اور حواس جواب دیتے گئے، آوازیں کمزور ہوتی گئیں اور ان کے درمیان وقفے بھی زیادہ ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ دسواں دن بھی گذر گیا۔ شیریں، جو فرہاد سے کچھ دور پڑی تھی، خاموش ہوگئی۔ فرہاد اب بھی آدھ آدھ گھنٹے کے بعد نحیف "عععا" کی آواز نکالتا تھا۔ اس کی کمزور آنکھیں کبھی کبھی از خود روشنی سے منور ہو جاتی تھیں۔ وہ چاروں طرف غذا کی تلاش کرتی تھیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا تھا۔ اِنھیں آخری دم کے سنبھالوں میں اس نے چاروں طرف دیکھا تو اسے ایک طرف گوشت کا چھوٹا سا ڈھیر معلوم ہوا۔ پچھلے پیروں کو زمین پر گھسیٹتا ہوا اگلے پنجوں کے سہارے آگے کھسکتا بڑھا، مگر وہاں کیا تھا، دھوکا تھا۔ گوشت نہ تھا، اس کی محبوبہ شیریں کا خشک ڈھانچا آخری اور کمزور سانسیں اب بھی لیتا ہوا موجود تھا۔ ہاں، شیریں وہی شیریں تھی۔ اس کو دیکھا، سونگھا، گھوما اور پھر انچوں انچوں، پنجوں سے نڈھال دھڑ کو گھسیٹتا، دروازے کی درار تک آیا اور پڑ گیا۔ ایک ایک منٹ کئی کئی گھنٹے کے برابر تھا۔ چکر تھے، غنودگی۔ پھر زندگی کی لہری دوڑی، خون میں ہیجان سا ہوا، آنکھوں میں بصارت آئی اور پھر وہی گوشت کا دھوکا ہوا۔ فرہاد گھسٹتا ہوا اس طرف گیا، مگر گوشت نہیں وہ تو شیریں تھی۔ اس نے سونگھا۔ بو تھی، شیریں کی بو تھی، اور شیریں کی بو میں گوشت کی بو تھی۔ اس نے چاہا پھر وہاں سے واپس ہو، لیکن نقاہت نے مجبور کر دیا۔ اسی کوشش میں اس کا سر بے قابو ہو کر کچھ سے زمین پر گرا۔ بے ہوشی سی چھا گئی اور پھر جب ہوش آیا تو گوشت کی بو آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو شیریں کا تن لاغر اب بھی بقید حیات تھا۔ دفعتاً فرہاد کے نامکمل حیوانی دماغ نے شیریں اور غذا دونوں کو ایک ہی نقطۂ خیال میں

وابستہ کر دیا۔ ایک ایک انگل آہستہ آہستہ اس نے اپنا سر بڑھایا، جبڑا کھولا اور شیریں کا گلا دبایا۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں، فرہاد کو دیکھا اور آخری مرتبہ خفیف ''ماؤں'' کی آواز نکالی۔ فرہاد نے پورا زور لگا کر تیز دانت شیریں کے نرخرے میں گھسا دیے اور پھر ساکت سا ہو گیا۔ اس سے زیادہ قوت اب اس میں نہ تھی۔ رستے رستے سوکھے ہوئے خون کی چند بوندیں نکلیں، زبان پر آئیں۔ دو دو بوند اور دو دو بوند خون اس کے حلق سے اُترا اور آہستہ آہستہ قوت کا ہیجان فرہاد کے دست و پا میں پیدا ہوا۔ اب اس نے گوشت بھی کھایا۔ قوت آئی۔ پیاس معلوم ہوئی۔ مٹکی میں سے جا کر پانی پیا۔ آنکھیں کھل گئیں، ہاتھ پیروں میں جان آ گئی۔ اصلی تڑپتی ہوئی بھوک از سرِ نو پیدا ہوئی۔ اب یہ معمولی غذا کی طرح شیریں پر جھک گیا، یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد چند ہڈیوں کے سوا شیریں کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

طویل فاقے کے بعد شکم پُر فرہاد نشے کی حالت میں ایک صندوق پر بیٹھ کر نیند کے جھونکے لینے لگے، اور ابھی اسی حالت میں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باہر گھر میں کھٹ پٹ ہوئی۔ اقبال احمد اور چند ملازموں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ اس کمرے کے دروازے کی کنڈی کھٹکی، دروازہ کھلا۔ تھکے نشے میں چور، کمزور اور پیٹ پھولے ہوئے فرہاد بادلِ ناخواستہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ڈگمگاتے، جھومتے آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل زینے پر سے ہوتے ہوئے کوٹھے پر چل دیے۔

عرصے تک لوگوں نے بدہیئت، سیاہ، دُم کٹے بلے کو بھیانک آوازیں نکالتے دیواروں دیواروں پھرتے دیکھا۔ عقل اور حافظے سے مجبور فرہاد اس واقعے کے بعد مدتوں شیریں کو کوٹھوں کوٹھوں، گلیوں گلیوں اور گھروں گھروں تلاش کرتا پھرا۔

فرہاد، اے حیوانی فرہاد، ناشنیدہ ظلم کے بانی فرہاد، تیری ہستی قابل قدر ہستی ہے۔ شیریں کی موت کتنے ہی برے پہلو کیوں نہ دیکھی جائے، وہ ایک موت تھی جو آناً فاناً میں آ گئی، جس کے مصائب وہیں ختم ہو گئے۔ مگر آہ نسیمہ! تجھ کو موت کب آئے گی؟ تیری مصیبتیں کب تک ختم ہوں گی؟ تو کب تک بھائی کے گھر میں روٹیاں تھوپے گی، برتن مانجھے گی، اور کب تک بدمزاج ضدی بھتیجے بھتیجیوں کے زیرِ مشق رہے گی؟

بے زبان

پانچ سو روپے کے انعام کا اعلان سن کر باری باری سب ہی نے کوشش کی۔ ہندوستانی چابک سوار، کابلی پٹھان، توپ خانے کے گورے اور سپاہی، ایک کے بعد ایک کتنے ہی گھوڑی پر سوار ہونے کے واسطے سرکس کے دائرے میں داخل ہوئے اور طرح طرح سے کوششیں کیں، لیکن گھوڑی پر سوار ہونا تو درکنار، اس کی راس تک چھونا نصیب نہ ہوئی۔ جو بھی آگے بڑھا، دونوں کان پیچھے سکیڑ، دانت نکال، ہنہنا کر گھوڑی ایسی کاٹنے کو دوڑی کہ بہت سے تو جب ہی گرتے پڑتے سرکس کی دیوار پھاند باہر بھاگے، اور اگر ایک آدھ ڈھیٹ بیت یا چابک گھماتا کھڑا بھی رہ گیا تو پھر گھوڑی نے گھوم گھوم کے ایسی دولتیاں چلائیں کہ آخر مجبور ہو کر اس کو بھی پشیمان اور شرمندہ باہر آنا پڑا۔

سرکس کے منیجر نے، جو نیچی سی دیوار کے باہر کھڑا تھا، چاروں طرف سر گھما گھما کے، تماشا دیکھنے والوں کو مخاطب کر کے پھر اعلان کیا: ''اتنا جنٹلمین سپاہی اور جوان چاروں طرف ہے۔ کوئی اور آئے، آئے، آئے! جس کا ہمت ہو۔ جو کوئی اس گھوڑی پر بیٹھے گا اور چار کدم چلائے گا، سرکس کمپنی اس کو پانچ سو روپے انعام دے گا۔'' چاروں طرف کوچوں، کرسیوں اور پھر چھت تک اٹھتی چلی گئی بنچوں پر ہزاروں آدمی بیٹھے تھے، سرکس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لیکن اب کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کوئی آئے۔ ہر طرف سب خاموش، شرمندہ سے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے تماشے کے چھوٹے سے گول چکر کے بیچ میں چمکدار سیاہ، چکنی چپڑی، تندرست، نوجوان، پھرتیلی، چلبلی گھوڑی گردن کو محرابی خم دیے، ہنہناتے ہوئے، سر کو

جھٹکے دے دے کر اور دُم کی چَوری جھپکا جھپکا کر، اگلے پیروں سے زمین پر ٹاپیں مار رہی تھی۔ اس کی اس حرکت میں فتح کی مسرت، حسن کا غرور اور شباب کی پھڑک عیاں تھی۔ اُور اس وقت جب کہ دنیا بھر کی نگاہیں اس سیاہ گھوڑی پر جمی ہوئی تھیں، سرکس کا چور دروازہ آہستہ سے کھلا۔ سَن سے بھاگتی ہوئی ایک لڑکی ہوا کی طرح آئی۔ بجلی کی طرح اس کا ہنٹر کوندا۔ گھوڑی اچھلی، پھڑکی اور بھاگی۔ ہنٹر کوندا اور پھر کوندا۔ گھوڑی جان توڑ، سرکس میں چکّر لگانے لگی۔ اب سب کی نگاہیں اس سفید انسانی بچھڑی پر جم گئیں۔ بوٹا سا قد، دوہرا جسم، سیاہ بال، کھال سے چمٹا چست سرکس کا لباس۔ حسن تھا، جادو تھا، قہر تھا کہ سحر تھا۔ اس کے ہاتھ، اس کے پیر، اس کا سینہ، اس کی گردن، اس کا سر، اس کی آنکھیں، ہر ایک کششِ دل کا مرکز تھا۔ اور کیوں؟ اس لیے کہ وہ ایک مجسمۂ شباب تھی۔ اس کی ہر بات میں شوخی تھی، شرارت تھی۔ ہاتھوں میں پھڑک تھی، پیروں میں تھرک تھی، گردن میں لچک تھی، آنکھوں میں چمک تھی۔ دنیا اس کو تکتی تھی اور وہ بے خبر تھی۔ ہنٹر گھماتے گھماتے ایک دفعہ وہ لپکی۔ سپاٹے بھرتی گھوڑی پر ہاتھ لگاتے ہی بجلی کی پھرتی سے سوار ہو گئی۔ دونوں ہاتھوں سے کھلے ہوئے بالوں کو سنوارا، اور پھر بھاگتی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر کھڑی ہو گئی۔ گھوڑی نے چکّر پر چکّر اور تیزی سے لگانا شروع کر دیے۔ اس وقت اس کے کھلے ہوئے سیاہ بال، گلابی ربن کی بندش سے آدھے آزاد، پیچھے پیچھے پھر پھراتے، اس کی چست پاجامے میں ملفوف گول گول ٹانگیں ہلکے ہلکے لچکتی تھیں۔ دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے تھے۔ سرپٹ بھاگتی ہوئی گھوڑی پر وہ ایک رقص سا کر رہی تھی۔ سب کی نگاہیں اِدھر لگی ہوئی تھیں۔ وہاں چور دروازہ آہستہ سے پھر کھل چکا تھا۔ چکر لگاتے لگاتے ایک دفعہ اُدھر گھوم، گھوڑی مع سوار اس کے اندر غائب ہو گئی۔ کئی سکنڈ تک تماش بین سکتے کی سی حالت میں خاموش رہے، اور پھر تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

سرکس کے لکھنؤ آنے کے چند ہی دن بعد سارے شہر میں گھوڑی اور لڑکی کا شہرہ ہو گیا۔ ان دونوں کے حسن، خوبصورتی، شرارت اور شہ سواری پر طرح طرح کے اظہارِ خیال ہونے لگے، اور بیسیوں روایتیں، افواہیں پھیلتی چلی گئیں۔ کسی کا خیال تھا کہ لڑکی آوارہ ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ سرکس والوں کا سخت نگرانی کرنا اور کسی کو ہوا تک نہ لگنے دینا مصلحت سے خالی نہیں۔ بعض کا شبہ تھا کہ لڑکی اور مالک

سرکس کے گہرے تعلقات ہیں۔ اور بعض کو یقین تھا کہ لڑکی مالک کی بیٹی ہے۔ مگر اصل میں یہ سب عقلیہ گدّے ہی تھے، کیوں کہ سرکس کے کارکنوں اور اداکاروں سے ملاقات یا واقفیت کسی کو بھی حاصل نہ تھی۔ سرکس کے چھوٹے بڑے جانور، ان کے پنجرے اور کام کرنے والوں کی چھولداریاں، سب کے چاروں طرف اونچی اونچی قناتیں کھڑی کر کے ان کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سرکس کے مالک یا منیجر کی اپنے لوگوں پر سخت ہدایت تھی کہ وہ کسی سے نہ ملیں جلیں اور نہ باہر جائیں۔ ایسی حالت میں لکھنؤ کی مخصوص خلقت، یعنی شوقین، آوارہ منش اور مفلس شرفا، قناتوں کے چاروں طرف اور بھی زیادہ چکّر لگانے لگے۔ کوئی قناتوں کے نیچے سے جھک کر دیکھتا تھا، کوئی دروازے میں سے جھانکتا تھا۔ اور اس طرح سے اگر کسی کو ہاتھی کے پیروں، شیر کے کٹہرے یا ایک آدھ آدمی کی جھلک نصیب ہو جاتی تو پھر وہ طرح طرح کے چشم دید افسانے بیان کرتا پھرتا تھا۔ ان سب باتوں کا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شہرت نواب محمود علی خاں تعلقہ دار ڈلیاباد تک پہنچی، اور ایک دن وہ خود سرکس کا تماشا دیکھنے آئے، جہاں ان کے واسطے نشستیں مخصوص کر کے آراستہ کر دی گئی تھیں۔ نواب نے سب کرتب حیرت سے دیکھے اور پسند کیے، لیکن سب سے زیادہ اس لڑکی اور گھوڑی کا کھیل پسند کیا۔ تماشا ختم ہونے پر انھوں نے منیجر سرکس کو اپنی نشست پر طلب کیا اور بڑی دیر تک ان کے سرکس کی تعریفیں کیں، خاص کر اس لڑکی کی، یہاں تک کہ انھوں نے انعام دینے کے واسطے لڑکی کو بھی اپنے پاس بلانا چاہا۔ مگر جب منیجر سے یہ معلوم ہوا کہ لڑکی کا تماشا کرنے کے علاوہ باہر آنا ممکن نہیں ہے تو منیجر کے لیے اپنی رسٹ واچ اور پچاس روپے لڑکی کے واسطے انعام بھجوا دیے۔ نہ صرف یہی بلکہ دوسرے روز پھر تماشے میں بہت پہلے سے آ گئے۔ منیجر کو بلوایا۔ دنیا بھر کی باتیں اور ہر پھر کے لڑکی کے متعلق اور گھوڑی کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن اس وقت منیجر اپنا زیادہ وقت نواب صاحب کو نہ دے سکا۔ اسے تماشے کی جلدی تھی اس لیے چلا گیا۔ تماشا ختم ہونے پر وہ خود ہی پھر آ گیا۔ نواب صاحب نے سو سو کے پانچ نوٹ سرکس کو انعام میں دیے۔ بڑی دیر تک باتیں کی، اتنی کہ رات گئے واپس ہوئے۔ دوسرے دن نواب صاحب نے منیجر کو اپنے محل پر صبح کے کھانے پر دعوت دی۔ نواب صاحب کی اس خاص توجہ اور مہربانی کا مطلب منیجر سرکس بھی پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ سو سے اوپر محل، پینسٹھ برس کی عمر، نواب صاحب کی دولت اور اس کے

استعمال سے کون ایسا تھا جو واقف نہ تھا۔ جہاں دیدہ، جہاں گشت مینیجر نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہی موقع ہے، جو کچھ بھی کمایا جا سکے کما لیا جائے، اس لیے اس نے بڑی تدبیر اور دوراندیشی سے کام لیا۔ کھانے کے بعد جب اصل معاملے کی باتیں شروع ہوئیں تو اس نے پہلے تو بڑی ہی پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر کی۔ اس معاملے میں کچھ سننا ہی نہ چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکی کا باپ اور بڑا بھائی دونوں ساتھ ہیں، سخت نگرانی کی جاتی ہے، کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن پھر بعد میں جب اس کو بہت کچھ لالچ دیا گیا تو بہت ہچکچاہٹ کے بعد ایک تجویز اس طرح پیش کی:

''نواب صاحب، آپ کے اخلاق اور مہربانی نے مجھ کو مجبور ہی کر دیا۔ لیکن حضور دیکھیں کہ میں کس قدر خطرناک کام کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ اگر کچھ بھی گڑبڑ ہو گئی تو دس بارہ برس جیل خانے میں چکّی پیسنا پڑے گی۔ بہر حال اب جو کچھ بھی ہو، آپ کا کام تو پورا کروں ہی گا۔ کل اتوار کا تماشا ختم کر کے ہم لوگ پرسوں یہاں سے کانپور جانے والے ہیں۔ آپ پیر کی صبح کو اپنا موٹر خود ہی لے کر ہم لوگوں کی قناتوں کے دروازے پر آئیں اور انتظار کریں۔ لڑکی کی طبیعت کچھ خراب بھی رہتی ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے واسطے موٹر ہے، اور اس دھوکے سے لا کر اس میں سوار کر دوں گا۔ اس کو شبہ بھی نہ ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ اس سے کوئی بات نہ کریں، خاموشی سے بٹھائے لیے چلے جائیں۔ محل میں جا کر پھر جو بھی ہو اس کے ذمے دار آپ ہیں، جو کچھ بھی انتظام کرنا ہو کر لیں۔ رہا میرا اور میرے آدمیوں کا معاملہ، تو اب جو قسمت میں بدا ہو۔ لڑکی کے غائب ہوتے ہی اس کے باپ اور بھائی میری بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔ نہ معلوم کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ تاہم اتنا تو مجھے ضرور ہی کرنا ہوگا کہ لڑکی کے چلے جانے کے بعد پولیس میں باقاعدہ اطلاع کروں، ورنہ میں کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ اس کے باپ اور بھائی کی زبان بند کرنے کے واسطے بھی ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ اور اس لیے میں حضور سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ دس ہزار سے کم میں یہ کام کرنے پر میں ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس میں مجھے کیا ملے گا، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ پولیس اور اس کے رشتے داروں کو دے دلا کر کچھ مل گیا تو مل ہی گیا ورنہ گھاٹے میں چکّی پیسنا تو بدا ہی ہے۔ نواب صاحب، میں تو پھر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اس لڑکی کا خیال چھوڑ دیں۔ وہ آپ کے بس کی چیز نہیں۔''

سرکس بیس دن لال باغ میں ٹھیرا۔ اتوار کی شام کو آخری مرتبہ تماشا کر کے پیر کی صبح کو یہاں سے کوچ کا سامان ہونے لگا۔ صبح اندھیرے ہی سائیس گھوڑوں کو لے کر پیدل روانہ ہو گئے تھے۔ باقی جانوروں کے پنجرے چھکڑوں پر لادے جا رہے تھے۔ لوگوں کی چھولداریاں گرا گرا کر تہہ کی جا رہی تھیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی کام میں مشغول تھا۔ ایک طرف ایک ہاتھی بیٹھا تھا جس پر بہت سامان لدا ہوا تھا، اور اس پر چند بندر بندھے ہوے تھے۔ اب یہ بھی روانہ ہونے کے واسطے تیار ہو گیا تھا۔ باقی ہاتھی ابھی یوں ہی کھڑے جھوم رہے تھے۔ منیجر کا چھوٹا سا خیمہ ابھی لگا ہوا تھا، اور وہ اس کے سامنے آرام کرسی پر لیٹا نواب صاحب کی آمد کا منتظر تھا۔ ایک آدھ آدمی اِدھر اُدھر سے آ کر اس سے کچھ پوچھ گچھ کر جاتا تھا جس پر وہ ان کو معمولی ہدایتیں بھی دے دیتا تھا، اور پھر گھڑی کو دیکھ کر انتظار میں لیٹ جاتا تھا۔ نو بجے کے قریب نواب صاحب کے موٹر کا ہارن بجا۔ منیجر فوراً اٹھ کر قناتوں سے باہر گیا۔ وہاں ایک بہت بڑے موٹر میں، جس پر پردے لگے ہوے تھے، نواب صاحب خود کُرتا پاجامہ پہنے ڈرائیور کی جگہ بیٹھے تھے۔ منیجر نے پاس جا کر سلام کیا۔ نواب صاحب کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ استعجاب سے سرخ تھا۔ مسکرا کر گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا، "کہیے!"

منیجر: (اطمینان سے) سب انتظام ٹھیک ہے!

نواب صاحب: (جلدی سے) بہتر ہے۔ پھر جائیے، جلدی کیجیے۔

منیجر: (نہایت اطمینان سے) میری طرف سے مطمئن رہیں۔ اب آپ بھی تو مجھے اطمینان دلائیں۔ دیکھیے نواب صاحب، اس واقعے کے بعد میرا آپ کے محل پر جانا کسی طرح ٹھیک نہ ہوگا۔ اور نہ آپ کا یا آپ کے کسی آدمی کا ہی آنا ٹھیک ہوگا۔ دوسرے کسی اور شخص کا بیچ بھی میں پسند نہیں کرتا۔

نواب صاحب: (جلدی سے گدی کے نیچے سے نوٹوں کا بنڈل گھسیٹ کر اور ان کو کھولتے اور بند کرتے ہوے) آپ کی رقم آپ کے اطمینان کے واسطے موجود ہے۔ ایک ہاتھ سے لڑکی کو سوار کیجیے، دوسرے ہاتھ سے اپنا معاوضہ لیجیے۔ جائیے جلدی کیجیے۔ میرا یہاں اس طرح زیادہ ٹھہرنا نازیبا ہے۔

منیجر نے ایک دفعہ نوٹوں پر پھر نظر ڈالی۔ مسکراتا ہوا قناتوں کے گھیرے کے اندر گیا۔ اپنے

ڈیرے کے پاس جا کر اس میں جھانکا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اندر سے وہی لڑکی، وہی تماشا کرنے کا چست لباس پہنے، مسکراتی ہوئی نکلی اور منیجر کے پیچھے پیچھے چل دی۔ باہر موٹر کا انجن پہلے ہی سے گنگنا رہا تھا۔ نواب صاحب اسٹیرنگ گیئر دونوں ہاتھوں سے تھامے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ جونہی یہ دونوں پاس آئے، نواب صاحب نے للچائی ہوئی ایک نگاہ جلدی سے لڑکی پر ڈالی۔ اس کے گال سرخ تھے، ہونٹوں پر لالی تھی۔ ماتھے پر سے ہوتا ہوا گدی کے چاروں طرف ایک ربن بندھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے سیاہ بال کھلے شانوں پر پڑے تھے۔ وہ نواب صاحب پر ایک نگاہ ڈالتی ہوئی مسکراتی موٹر کے پاس آئی۔ منیجر نے دروازہ کھول دیا اور وہ اس میں بیٹھ گئی۔ منیجر دروازہ بند کر کے نواب صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے کھسکتے ہوئے موٹر میں سے نوٹوں کا بنڈل منیجر کو دے دیا اور رفتار بڑھا دی۔ لمحہ بھر میں موٹر سامنے کے موڑ پر گھوم کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ قناتوں سے باہر فٹ پاتھ پر منیجر صاحب تنہا، مسکراتے ہوئے، نوٹوں کے گڈے میں سے پرتیں ہٹا ہٹا کر کچھ دیر دیکھتے رہے اور پھر ان کو پتلون کی جیب میں ٹھونستے ہوئے اندر روانہ ہوئے۔

موٹر سڑک پر غیں غیں، اِدھر گھوم، اُدھر گھوم، یہ جادہ جا، نکلا چلا گیا، یہاں تک کہ شہر کا کنارہ آ گیا اور اب وہ سیدھا ڈلیاباد کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں پوری سخت گیری اور احتیاط کے ساتھ سب انتظام ہو چکے تھے۔ محل کے زنانے پھاٹک میں جونہی موٹر داخل ہوا، بڑا پھاٹک بند کر لیا گیا۔ اس کے اندر کے صحن میں دو چار کیاریاں، چند درخت اور پودے تھے۔ ایک طرف تین چار ملازم بیٹھے تھے۔ ایک لمبے دالان کے سامنے اونچا سا چبوترا تھا۔ موٹر اس کے سامنے رکا۔ موٹی سی ادھیڑ عمر کی ایک ماما، چاندی کا منوں زیور پہنے، موٹر کے پاس آئی۔ دروازہ کھولا۔ بڑے ٹھسّے سے بولی، ''اتریے۔ آیئے، میرے ساتھ چلی آیئے۔'' لڑکی اب بھی اسی طرح خاموش، مسکراتی ہوئی، خوش خوش، پھرتی سے اتری اور اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے چل دی۔ ماما نے برآمدے کے کونے پر ایک دروازہ کھولا۔ یہ زینہ تھا۔ دونوں اوپر چڑھے۔ ایک اور چھوٹا سا صحن ملا۔ اس کے دوسری طرف ایک بہت بڑا آراستہ کمرہ تھا، جس میں زمین پر فرش، قالین، گاؤ تکیے تھے۔ دیواروں پر بھدی رنگین تصویریں اور بڑے بڑے آئینے تھے۔ ایک طرف ایک بہت بڑی مسہری مچھر دانی سے ڈھکی ہوئی تھی، دوسری طرف تختوں کا چھوٹا سا تختہ تھا۔ اس پر

بھی چاندنی، قالین، گاؤتکیہ وغیرہ لگے تھے۔ جا بجا چاندی کے اگالدان رکھے تھے۔ قالینوں کے کونوں پر اگر کی بتیاں جل جل کر خوشبودار دھویں سے کمرے کو معطر کر رہی تھیں۔ ایک چوکی پر لوٹا، صراحی، صابن دانی، بیسن دانی سب چاندی کے رکھے تھے۔ فرش پر گاؤ تکیے کے برابر قالین پر ایک گنگا جمنی پاندان، دوسری طرف آبنوسی عطردان رکھے تھے۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی میز پر سبز رنگ کے پٹانے دار خوان پوش سے ڈھکی ایک سینی رکھی تھی۔ کمرے کی چھت اور دیواریں طرح طرح کے رنگوں سے بنے ہوئے پھول اور پتیوں سے نظروں کو گھائل کیے دیتی تھیں۔ چھت پر رنگین شیشے کے دو جھاڑ لٹک رہے تھے۔ ماما لڑکی کو لیے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئی، تختوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور الٹے پیروں واپس لوٹ گئی۔

لڑکی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ ہر چیز کو حیرت سے دیکھا۔ تختوں کے پاس گئی، پیر لٹکا کر بیٹھی، لیکن فوراً ہی جھک کر آبنوسی عطردان کو چھوا، اور پھر سیدھی ہو گئی۔ چاروں طرف دیکھا، کوئی دیکھتا تو نہیں ہے۔ پھر جھک کر عطردان کے نقوش پر ہاتھ پھیرا۔ نواب صاحب انگنائی کی دوسری سمت کے ایک کمرے میں سے جھانک رہے تھے۔ باہر آ کر ہنستے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ ''ہاں عطر لگاؤ، عطر لگاؤ۔ یہ تمھارے ہی واسطے ہے۔'' ان کے آنے پر لڑکی سیدھی ہو بیٹھی اور ان کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکرائی۔ نواب صاحب نے اور آگے بڑھتے ہوئے کہا، ''کس غضب کی تمھاری مسکراہٹ ہے!'' اور اور آگے بڑھے۔ دونوں ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھائے۔ آفافاناً میں لڑکی کے مسکرانے میں تغیر پیدا ہوا۔ ہنسی غائب ہو کر متانت پیدا ہوئی۔ معاً متانت سے پریشانی اور پریشانی سے غصے کے آثار اس کے چہرے پر آئے۔ اب وہ ساکت کھڑی اس سفید بوڑھے کو غصے سے تک رہی تھی۔ نواب صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ ''دنیا کا ہر عیش یہاں تمھارے واسطے مہیا کر دوں گا۔ اب تم کو میرا ہی ہو کر رہنا ہوگا'' پھر اپنا ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ لڑکی پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ دنوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے کو رگڑ ڈالا۔ پھر کندھوں پر پڑے ہوئے گیسو سر سے نوچ، صاحب کے سامنے زمین پر دے مارے، اور اس کے بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنی آواز نکالی: ''آوا وا آ! آوا وا آ!'' نواب صاحب مجسمہ حیرت بنے ساکت کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے چودہ برس کی

بدہیئت، گونگی لڑکی غصے میں بھری، بے ہنگم آوازیں نکال رہی تھی۔ زور زور سے ہاتھ رگڑنے سے اس کے چہرے کا غازہ جابجا سے اڑ چکا تھا جس سے کہ اس کا اصلی سیاہ رنگ چتکبرا ہو گیا تھا۔ چہرے پر ایک زخم کا بدنما داغ دائیں گال سے لے کر کنپٹی تک چلا گیا تھا۔ دوسرا داغ خشخشی بالوں سے آراستہ سر کے بیچوں بیچ نمایاں چمک رہا تھا۔

وہاں نہ باپ تھا نہ بھائی۔ مکروہ صورت لاوارث لڑکی، فکر کون کرتا۔ البتہ گھوڑی کی فکر میں سب ہی پڑ گئے۔ کانپور پہنچ کر اب ہر ایک کی یہ کوشش ہونے لگی کہ لڑکی کی جگہ وہ لے لے۔ انھوں نے طرح طرح سے اسے رام کرنے کی فکر کی، لیکن پیار، دلاسا، مار، پھٹکار کچھ بھی کارگر نہ ہوے، کیوں کہ بچپنے سے انھی لوگوں نے روزانہ اس کے ہزاروں سوئیاں چبھو چبھو کر اسے دنیا بھر کے انسانوں سے خائف کر دیا تھا۔ یہ لوگ سرکس کے گھیرے میں لا کر، طرح طرح کے لباس بدل کر، اس کے پاس آتے تھے اور اس کے سوئیاں چبھویا کرتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک وہ تھان پر بندھی ہے خیریت ہے، اور جہاں اس جگہ سے ہٹی یا آواز ہوئی، سواے اس لڑکی کے جو بھی پاس آئے گا کسی نہ کسی طرح سوئی ضرور چبھوئے گا۔ اس کو ہر انسان سے دلی نفرت اور عداوت ہو گئی تھی۔ اس کی قدرتی محبت کا رجحان دنیا بھر سے سمٹ کر اس لڑکی پر قائم ہو چکا تھا۔ وہ نوعمر، بے زبان جانور، عاشق کی طرح محبت کرنے کو بے قرار، معشوق کی طرح محبت کیے جانے کا منتظر، صرف ایک ہی ہستی، اس گونگی لڑکی، کی منتظر، کالی گھوڑی خاموش کھڑی سر کو جھٹکے دیتی اور دُم سے مکھیاں جھلتی تھی۔ نہ آنکھوں میں اشک نہ لب پر فریاد۔ اگاڑی پچھاڑی بندھی کھڑی ہے۔ کبھی دو ایک منھ گھاس کھالی اور کھڑی ہے، کان آگے کیے، پیچھے سے سر کو جھٹکے دیے۔ دُم کی چوری چل رہی ہے۔ خاموش کھڑی ہے۔ اس خاموشی میں انتظار ہے، غم ہے اور پھر انتظار ہے۔ اس پر طرح طرح کے ظلم ہوے، طرح طرح کی مار پڑی، ہر ہر طرح سے اس پر سوار ہونے کی کوشش کی گئی، مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس کو لڑکی کا انتظار تھا۔ وہی اس پر سوار ہو سکتی تھی، دوسرے کو کیسے پاس آنے دیتی۔ یہاں تک کہ جب پیروں میں سندے ڈال کر اور منھ پر مہرا باندھ کر اس کو چلنے، دولتی چلانے اور کاٹنے سے بھی بالکل ناکارہ کر دیا گیا تو پھر اس نے دھڑا دھڑ اپنے تئیں کھڑے قد سے

گرا گرا دیا، لیکن کسی کو سوار نہ ہونے دیا۔ اسی طرح دن دن بھر اس پر سختیاں ہوئیں۔ اور جب بھی لوگوں نے ہار کے جھک مار کے پھر اسے تھان پر لا کے باندھا، وہ خاموش کھڑی ہوگئی۔ نہ آنسو نہ آواز، نہ سرد آہیں نہ فریاد۔ خاموش، خاموش! بے زبان کی ایک وہی زبانِ خاموشی۔ سر کو دو ایک جھٹکے دیے، دم ہلائی، خاموش کھڑی ہے، گھنٹوں کھڑی ہے۔ دو جھٹکے سر کو دیے، دم ہلائی اور کھڑی ہے۔ سرکس والوں میں اُدھر یہ ہو رہا تھا کہ ''اچھا اب سالی کو جلاّب اور فاقے دیے جائیں''، اِدھر اس نے خود دانہ اور گھاس چھوڑ دیا۔ بانسوں کی مار سے اور کھڑے قد سے گر گر پڑنے سے بدن پھوڑا ہو رہا تھا۔ لڑکی کی یاد میں دل بے قرار تھا۔ ہر طرف آنکھیں اسی کو ڈھونڈتی تھیں۔ نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ اوپری چوٹیں، اندرونی غم۔ چند دن اور جو گذرے تو گھوڑی کی صورت ہی اور ہوگئی۔ بھڑکتی، تھرکتی ہوئی موٹی تازی سیاہ چمکتی بچھڑی کے بجائے ست، مریل، میلی، سیاہ، نچی کھچی گھوڑیا، سر جھکائے اونگھتی ہوئی سی کھڑی ہے۔ ٹانگوں پر مکھیاں، آنکھوں پر بھنگے چمٹے ہوئے ہیں۔ کبھی دم ہلالی تو ہلالی، ورنہ سر نیچا ہے کھڑی ہے۔ عجیب حالت ہوگئی۔ آخر ایک دن جب سرکس کانپور سے بھی کوچ کرنے لگا، اس کا نیلام بول دیا۔ پینتیس روپے اُور مالک سرکس کی جیب میں آئے اور گھوڑیا بھی یہاں سے رخصت ہوگئی۔ قصہ ختم ہوا۔ چار دن کے بعد بھولے سے بھی کوئی کیوں ان کو یاد کرتا۔ کیسی لڑکی، کس کی گھوڑی۔ گھاس کوڑا، اس کا کیا۔ پڑا ہے تو پڑا ہے، نہیں تو آندھی آئی اڑ گیا، پانی آیا بہہ گیا۔ یہ دونوں بھی دنیا کے سمندر میں تھپیڑے کھاتے بہتے چل دیے۔ ایک مشرق اڑا اور دوسرا مغرب بہا۔ پتھر کی سلیں دل کے عارضے سے آزاد ہیں، صدیوں پہاڑ پر بیٹھی جیتی ہیں۔

جاڑے جاتے ہیں، بہاریں آتی ہیں، جگ پر جگ، صدیاں آتی اور جاتی ہیں، قوموں پر قومیں آتی ہیں، نسلوں پر نسلیں جاتی ہیں، پر یہ بیٹھی بیٹھی تکتی ہیں۔ اور ہم آندھی کے تنکے، اب اڑے، جب گرے، پل بھر ہی اڑتے ہیں۔ پھر بھی قسمت کے مارے الفت، محبت، یاس وحسرت، آرزو اور تمنا کا گھروندا، یعنی لپ لپ کرتا دل، پہلو میں لیے پھرتے ہیں۔ اتفاق نے اکٹھا کر دیا، ہل گئے۔ حادثات نے جدا کر دیا اور الگ ہوگئے۔ نہ اس کا کوئی گھر نہ دوارا۔ سرکس کی زندگی کیا تھی صبح کا خواب تھا۔ چونکتے تو کچھ نہ تھا۔ گھوڑی کے لیے یکہ تھا، یکے والا تھا، کانپور کی سڑکیں گلیاں تھیں۔ اُدھر لڑکی کے لیے چولھا

تھا، برتن تھے، سل تھی اور بٹا تھا، اور دو بیبیوں کی خدمت تھی۔ مصالحہ پیسنا، برتن مانجھنا، کھانا پکانا، گھر بھر کو کھلانا، بچا کھچا خود کھانا اور پھر اسی کو دُہرانا، یہی زندگی تھی۔ برس پر برس گذرے۔ گونگی لڑکی بے زبان، سل پر ہلدی دھنیا مرچیں، دونوں ہاتھوں میں بٹا، اکڑوں بیٹھی، آگے پیچھے، آگے پیچھے ہل ہل، جسم مجسم مصالحہ پیسنے لگا ہے۔ اور دل! کمبخت دل! سرکس، سیاہ گھوڑی، گھوڑی کی محبت بھری نگاہیں، اس کی خمیدہ گردن، اس کا خوشنما ماتھا، اس کا سر گھما کے دیکھنا، اس کا تھرکنا، اس کا ہلنا، اس کو گھاس دانہ دینا، اس کی دوڑ، اس کی سواری، اس پر کرتب، ہزاروں آدمیوں کا حیرت سے دیکھنا۔ وہ تالیاں! وہ تالیاں! جب دنیا تکتی تھی، دنیا حیرت کرتی تھی۔ یہی زندگی تھی، یہی زندگی کا معراج تھا۔ لیکن یہ سب نہ آنکھیں دیکھ سکیں نہ کان سن سکے۔ لوگوں سے نہاں، دنیا سے پنہاں، گیلی گادہ لکڑیوں کے دھویں میں پھو پھو کرتے ہوے، کالی چکنی ہنڈیوں کو سرسراتے جاڑوں کی راتوں میں مانجھتے ہوے، نہ مٹنے والی اور نہ ٹلنے والی یاد بے زبان کو ستاتی تھی۔ جاڑوں میں کٹ کٹ کانپتے ہوے، گرمی میں پسینے سے شرابور ہانپتے ہوے، برسوں، برسوں گونگی نے وہی گذرے ہوے دن یاد کیے، پر قسمت نے کسی پہلو کوئی پلٹا نہ کھایا۔ اور زمانہ پلٹا بھی تو کیا پلٹا، نہ ماں باپ تھے نہ بھائی بہن، نہ رشتہ دار تھے نہ ملنے والے۔ شوہر نہیں، اولاد نہیں۔ اس کی زندگی میں کوئی تغیر ہو ہی کیا سکتا تھا۔ امید بھی کیا ہوتی، تمنا ہی کیا ہوتی۔ بے آسرا، بے آرزو دن کٹتے گئے۔ نواب محمود علی خاں نے چیخ چلّا کے، ندامت اور خجالت کا غصہ نوکروں پر اتار کے، لڑکی کو کالے خاں باورچی کے سپرد کر دیا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔ آپ نواب صاحب کے ملازم، بقدر حیثیت خود بھی آقا کے قدم بہ قدم چلتے تھے۔ زیادہ نہیں تو گھر میں دو ہی بیویاں تھیں۔ لڑکی تھی کم عمر، اُن دونوں نے اس خیال سے کہ کہیں سوتن بن کر نہ کھڑی ہو، خوب ہی دُرگت بنائی۔ چڑھے شباب میں لڑکی ان کے حوالے کی گئی تھی۔ سگھڑ بیویوں نے سلیقے سے شباب کو بڑھاپے میں بدلنا شروع کر دیا۔ چند سال میں لڑکی سے بڑھیا ہو گئی۔ جوتے کھاتے، خدمت کرتے، پندرہ برس گذر گئے۔

ہم روز دیکھتے ہیں کہ صبح کو ہلکی روشنی میں ہر چیز خوش حال، تر و تازہ، شاداب ہوتی ہے۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلتے ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں، پھول مسکراتے ہیں، سبزہ لہلہاتا ہے۔ اور پھر

چند ہی گھنٹے بعد چوندھیاتی دھوپ میں ہر چیز دہکتی ہے، جھلستی ہے، ہوائیں گرم اور خاک آلود ہو جاتی ہیں، چڑیاں اِدھر اُدھر چھپ جاتی ہیں، پھول نڈھال ہو کر کمھلاتے اور گرتے ہیں۔ ہریاول پر دھوپ پڑتی ہے، خاک چھاتی ہے۔ دن رات یہی قدرت کے پلٹے ہیں۔ پھر کون سی حیرت کی بات ہے، سرکس کی وہ تندرست سیاہ چمکتی شوخ گھوڑی کانپور میں نیلام ہونے کے چند دن بعد یکے میں جُتنے والی گھڑیا ہوگئی۔ اپنی پیٹھ پر کسی کو نہ بیٹھنے دیا تو کیا؟ کھڑ کھڑاتا بھاری یکہ دُم کے پیچھے لگ گیا۔ اب ٹخ ٹخ مکویا، سٹاسٹ چابک۔ دن بھر شہر کی گلیوں اور اسٹیشن کے پھیرے ہونے لگے۔ دن بھر کی تھکی شام کو گھر آئی۔ ڈھیری سی ملائی ہوئی، تھوڑا دانہ تھوڑی گھاس ملی۔ رات بھر مچھروں نے کاٹا۔ صبح ہوئی پھر چل دی شہر بھر کی خاک چھاننے۔ نہ شباب رکا نہ جوانی ہی آئی۔ اس مار اور محنت سے دونوں ہی بھاگ گئے۔ بچھڑی سے یکے کی گھڑیا ہوگئی۔ اسٹیشن پر جتی کسی کھڑی اونگھ رہی ہے۔ مزدوری مل گئی، سامان رکھا گیا، سواریاں بیٹھ گئیں تو یکے والے نے اس کو دو جھٹکے دیے، چابک چلایا۔ ٹخ ٹخ کی۔ گھڑیا نے دم ہلائی، سر اوپر نیچے، اوپر نیچے ہلایا، اور پھر منڈیا نیچے۔ غوطے میں کھڑی ہوگئی۔ ''گھوڑی او گھوڑی! تیرا ستیاناس ہو، چل! ٹخ ٹخ۔ ٹخ ٹخ۔'' سٹ چابک سٹ چابک۔ گھڑیا نے پھر دم ہلائی، سر ہلایا، دم ہلائی، سر ہلایا، اور کھڑی ہے۔ پھر اس کو کرارے جھٹکے دیے گئے۔ ''او گھوڑی، او گھوڑی! چل تیرا ستیاناس لگے۔ ٹخ ٹخ۔ ٹخ ٹخ۔'' اب پیروں سے زیادہ سر کو اوپر نیچے ہلاتی ٹھمک ٹھمک گھوڑی چل پڑی، تو اور سٹاسٹ سٹاسٹ چابک پڑنے لگے۔ راستہ چلنا دشوار ہو گیا۔ ایک روز حسبِ معمول گھڑیا یکہ کھینچتی ٹھمک ٹھمک چلی جا رہی تھی۔ بازار میں ایک جگہ اسے روکا گیا۔ رُک گئی۔ منڈیا نیچی کر کھڑی ہوگئی۔ یکے پر پردے پڑے تھے۔ اس میں دو زنانی سواریاں تھیں، ایک مرد ساتھ تھا۔ مرد وہی کالے خاں باورچی تھے۔ سواریوں میں ایک بیوی، دوسری گونگی ماما تھی۔ کالے خاں نے ایک دکان پر سے زنانے گرگابی جوتے لا کے پردے کے اندر سر ڈال کے بیوی کو دکھائے۔ ان میں دو پسند آئے، پہن کر دیکھے، پھر ان دو میں سے ایک لینے کو بتایا۔ میاں جوتے لے کر پھر دکان کی طرف چلے۔ بیوی کی نیت اس جوڑے سے اُس جوڑے پر ڈانوا ڈول ہوئی۔ اب کیا کرتیں۔ گونگی کو اشارہ کیا، بلا، میاں کو بلا۔ وہ بے چاری اپنی زبان میں چلائی، ''آ وا وا! وا آ وا!'' پژمردہ دل بوڑھی گھوڑی نے برسہا برس کے بعد پھر وہی آواز سنی۔ وہی آواز جو کبھی

محبت کا پیغام تھی، وہ آواز جس سے زندگی کی گذری ہوئی پُر مسرت گھڑیاں وابستہ تھیں۔ یکا یک یہ آواز جو آئی، گھوڑی چونک، دونوں کان پیچھے دبا، خاموش کھڑی ہوگئی۔ بازار کی چیخ پکار میں میاں نے آواز نہ سنی، اس لیے گونگی نے پھر وہی آواز نکالی۔ گھوڑی نے کان آگے پیچھے ہلاتے ہوئے پھر اس آواز کو سنا۔ دنیا کی تمام آوازوں میں یہی ایک آواز تھی جو اس سے تعلق رکھتی تھی۔ برسوں برسوں اس کے لیے کان ترستے رہے تھے، برسوں برسوں سے اس آواز کے سننے کی ناامیدی ہو چکی تھی۔ ''یہ آواز، یہ آواز! لڑکی آگئی، مل گئی! کہاں ہے؟ چلی جائے گی۔ پھر نہ ملے گی۔ کیا کروں؟ کیا کروں؟'' غالباً کچھ اسی قسم کے خیال گھوڑی کے دماغ میں آئے ہوں گے، یا جو کچھ بھی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ دُوسرا کے جو گھوڑی نے اس آواز کو سنا تو پھر یہ معلوم ہوا کہ اس مریل گھوڑی میں کسی نے بجلی بھر دی۔ اس نے ایک دفعہ ہنہنانے کی تڑپ ماری۔ جال میں پھنسے ہوئے جنگلی ہرن کی طرح وہ تڑپی اور پھڑکی۔ دیکھتے دیکھتے ساز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ گھوڑی آزاد، بموں میں سے نکل، یکے کے چاروں طرف پھرنے لگی۔ وہ رکتی، بھاگتی، کبھی الف ہوتی، کبھی دولتیاں چلانے لگتی۔ کان سکیڑے، دانت نکالے، یکے کے گرد گھومنے لگی۔ چاروں طرف سیکڑوں آدمی جمع ہو گئے تھے، لیکن سب خوف زدہ، بھاگنے کے واسطے تیار، دور ہی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اِن ہی میں یکے والا اور میاں کالے خاں بھی شامل تھے، جو کہ فاصلے ہی سے نمایاں اچھل کود اور بلند تر چیخوں سے اپنی وابستگی اس غلاف پوش یکے سے ظاہر کر رہے تھے، جو کہ اب ٹیڑھا، بموں کو لٹکائے، رکوع کی حالت میں خاموش کھڑا تھا، اور اس کے اِرد گرد خوفناک، وحشی، کالی گھوڑی اس ارادے سے طواف کر رہی تھی کہ اگر کوئی پاس آیا تو جان ہی لے لے گی۔ اور سفید پردے کا یکہ بیچ میں عجیب مظلومیت سے ساکت ٹیڑھا جھکا کھڑا تھا۔ دراصل یہ معلوم ہو رہا تھا کہ دعا مانگ رہا ہے۔ اس کے پردوں کے اندر بھی بالکل خاموشی تھی۔ بیوی ڈر کے مارے بے ہوش ہو چکی تھیں۔ گونگی پردے کا ایک کونا ہٹائے، یکے کے ڈنڈے پکڑے، خاموش بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو برابر ایک کے بعد ایک گالوں پر سے بہہ کر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اس کے چاروں طرف دو ہزار آدمیوں کا ہیجان تھا، اور ارد گرد گھوڑی کے وحشیانہ کرتب تھے۔ اس نے اِس وقت اپنی پرانی دنیا کو پھر ایک دفعہ زندہ ہوتے دیکھا۔ اس کے مردہ ہاتھ پیروں میں ایک روح سی دوڑی۔ وہ پردے ہٹا، یکے

سے کود، سڑک پر لمحہ بھر کھڑی ہوئی اور پھر ہزاروں ششدر آدمیوں کے سامنے وہ بدصورت، لاغر، ادھیڑ عمر کی عورت گھوڑی کی طرف لپکی اور اُچھل اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑی بھی جدھر اس کا منھ تھا ادھر ہی سیدھی سرپٹ دوڑ پڑی۔ لوگوں کی بھیڑ کائی کی طرح پھٹتی گئی، اور گھوڑی تیر کی طرح نکل یہ جا وہ جا، نکلی چلی گئی۔

بوڑھی عورت کو لیے بوڑھی گھوڑی بے تحاشا بھاگی۔ چوراہوں پر ہوتی، جگہ بے جگہ گھومتی، بازاروں میں کتراتی، بھاگتی چلی گئی۔ محلّوں پر محلّے گذر گئے اور وہ بھاگتی ہی چلتی چلی گئی، یہاں تک کہ شہر کا کنارہ بھی آیا اور نکل گیا۔ اب لمبی سیدھی کالی روڈ تھی۔ اس پر بھی وہ دونوں میلوں میلوں چلے گئے۔ پانچ اور دس اور پھر پندرہ میل ہو گئے تو پھر دونوں مسکین بے زبان مسافر اُس اصلی منزلِ مقصود کو پہنچ گئے جدھر ہم سب دنیا کے مسافر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ پندرہ میل کے بعد بڈھی گھوڑی کے پیر لڑکھڑائے، سرپٹ بھاگتے میں ٹھوکر کھائی، منھ کے بل زمین پر گری۔ اس کا بھی سر پاش پاش ہو گیا، گونگی عورت کی بھی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی جس نے کہ گھوڑی سے بھی دس گز آگے پکی سڑک پر پٹخنی کھائی تھی۔

اے دوست! نہ رنجیدہ ہو۔ یہی وہ آخری منزلِ مقصود ہے جس کے حاصل کرنے کے واسطے یہ دونوں جدا جدا جی رہے تھے۔ ورنہ اور کیا تھا؟ کس کا آسرا تھا؟ کس حصول کی تمنا تھی؟ شباب لٹ چکا تھا۔ جوانی اجڑ گئی تھی۔ بڑھاپے میں ایک کہیں، دوسرا کہیں، کسی نہ کسی طرح راہیِ ملکِ عدم ہوتے۔ چند منٹ کی ہی سہی، آخر یکجائی پھر ہوئی۔ پھر وہی شباب کا مشغلہ چندے نصیب ہوا۔ اور یہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ڈراپ سین ہوا۔

۲

باقیات

افسانے

واللہ العالم بالصواب

میں تو نہ اچھی روحوں کا قائل ہوں نہ بری کا۔ نہ بھوت پریت ہی کو مانتا ہوں نہ پیروں اور ولیوں کے سایۂ عاطفت کا قائل ہوں۔ لیکن بعض دفعہ واقعات کچھ اس طرح جمع ہو جاتے ہیں کہ انسان کی عقل کام نہیں کرتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چکرا کر انسان توہم پرستی میں پڑ جاتا ہے۔ کبھی بھوتوں سے ڈرتا ہے، کبھی قبروں کو پوجتا ہے، کبھی خبط الحواس انسانوں کو ولی اور قطب سمجھنے لگتا ہے، ورنہ دراصل ایک ننگا اور پاگل انسان، چند بوسیدہ ہڈیوں پر اینٹ اور چونے کا ڈھیر، مرگھٹ کا گھنا پیپل کا درخت، اپنے اندر کسی خاص قوت کو پنہاں رکھتا ہے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، کبھی کبھی واقعات اس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ انسان ان باتوں کو ماننے کے واسطے خواہ مخواہ مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ ہمارے ساتھ بھی ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جو کہ میں یہاں درج کرتا ہوں۔ اب اس سے نتیجہ نکالنا اور اصلیت پر پہنچنا پڑھنے والے ہی پر چھوڑتا ہوں۔ جو صاحب جس نتیجے پر چاہیں پہنچ جائیں۔

ایک روز حسب دستور محمود، احمد اور ان کی پارٹی کے لوگ بغیر اطلاع کے سہ پہر کی گاڑی سے آ دھمکے۔ وہی ہو حق، وہی اودھم، وہی بیگم کا جزبز ہونا۔ شاہ گڑھ کا چھوٹا سا گھر، ذرا سی بستی۔ سب میں ہل چل مچ گئی۔ قہقہوں سے مکان گونجنے لگا۔ کمروں کا فرنیچر اور سامان الٹ پلٹ ہونے لگا۔ اندر گھر میں گھی، دودھ، انڈے اور مرغیوں کی پرداخت ہوئی۔ مزید راشن کی تلاش میں کئی آدمی روانہ کر دیے گئے۔ برتنوں کو خدا حافظ کہہ کر چائے روانہ کر دی گئی۔ باہر، حسب دستور، برج اور گانے اور قہقہوں اور شکار کے

قصے اور گلاس پیالوں اور کرسیوں کے شہید ہونے اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں پر شرط بدبد کر گول بازی میں جب اندھیرا ہوگیا تو خانو کی بے سری تانیں۔ رشید (مرحوم) کے بے وجہ قہقہے دھیمے پڑ گئے۔ صاحب زادے اور للن میاں بھی اپنی اپنی رائفلیں لے کر چاند ماری سے آگئے۔ تاشوں کو مہلت ملی، برج کی کالیں بند ہوگئیں، تو اب کام کی بات چیت ہوئی کہ کل کا کیا پروگرام ہے۔ سب نے اپنی اپنی رائے دی۔ کوئی قلعے کے ہانکے کے واسطے تھا، کسی کا خیال تھا کہ شاہ گڑھ کے ہرنوں سے باز پرس کی جائے، کوئی صاحب چاہتے تھے کہ مینا کوٹ کی جھاڑیوں میں مرغے پھر بہت آگئے ہیں ان کا شکار کیا جائے۔ لیکن میں نے یہ رائے دی کہ علی الصباح اٹھ کر یہاں سے موٹر ٹرالیوں پر بائیفر کیشن چلنا چاہیے۔ وہاں سے ہاتھیوں پر بیٹھ کر چوکا ڈھائے میں گھس کر گوند مارے جائیں۔ میں نے یہ اس وجہ سے کہا تھا کہ اول تو مجھے بائیفر کیشن پر ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ دوسرے میری رائفل کے کارتوس ختم ہوگئے تھے، صرف تین باقی تھے۔ مسعود خاں سب انسپکٹر ٹانڈے کے پاس بھی ۲۷۵ بور تھا اور انھیں حال ہی میں کارتوس منگانے بھی تھے۔ میرا خیال تھا کہ راستے میں ان سے کچھ کارتوس لے لوں گا، اس لیے یہ رائے پیش کی تھی۔ میری اس رائے کی تائید پروفیسر عصمت، احمد میاں، رشید اور صاحب زادے نے بہت زور سے کی، جس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اس پروگرام میں ان کو برج کھیلنے کا کافی وقت مل رہا تھا۔ جب یہ رائے منظور ہوگئی تو محمود میاں نے اس میں یہ ضمیمہ اور لگایا کہ کل کا پروگرام تو یہ ہوا، اور رات کاٹنے کا پروگرام یہ ہے کہ میں اور سید میاں (یہ میں ہوں) اور جلن ماموں میں کٹ تھروٹ چلے اور تم لوگ برج کھیلو۔ منظور؟ میں نے کہا، منظور۔ محمود بولے، پھر وقت خراب کرنے سے کیا فائدہ، بچھ جائے۔ چنانچہ میں نے جلدی جلدی کل کے واسطے جو انتظام کرنا تھے کر دیے۔ ٹانڈے سے ٹھاکر صاحب کو ایک ہاتھی کے واسطے رقعہ روانہ کر دیا۔ کالے خاں محاسب کو بلا کر رام پیاری ہتھنی کو اسی وقت بائیفر کیشن چلے جانے کی ہدایت کر دی۔ سردار کو بلا کر سمجھا دیا کہ اپنا سامان درست کر لے۔ پہلی ہی موٹر ٹرالی کے پیچھے اپنا ٹھیلا باندھ لے۔ ان سب باتوں سے فارغ ہو کر اب جو کٹ تھروٹ میں لگا تو صبح ہوگئی۔ پروفیسر، احمد میاں، رشید مرحوم اور صاحب زادے تو شاید ایک بجے یا دو بجے سو گئے مگر ہم تینوں، میں، محمود، جلن ماموں، ایک منٹ نہ سوئے۔ ایسے ہی تاشوں میں صبح ہوگئی۔ دونوں موٹر ٹرالیاں آ کر کھڑی تھیں۔ ایک ایک پیالی

چاے پی کر ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ سب سے اگلی ٹرالی احمد میاں، خانو، للن میاں، پروفیسر وغیرہ کو لے گئی۔ ان کی ٹرالی کی دُم میں سردار صاحب کا ٹھیلا مع لوازمات باورچی خانہ باندھ دیا گیا۔ رشید صاحب برتنوں کے بکس پر بیٹھ گئے۔ ان کے روانہ ہونے کے تھوڑی دیر بعد میں، محمود میاں، جلن ماموں، صاحب زادہ میاں، دوسری ٹرالی میں بیٹھ گئے۔ بلدیوا ٹرالی میں پائیدان پر بیٹھ گیا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ کئی دن سے کہرا اور بدلی تھی۔ اس صبح کہرا اور بھی زور پر تھا۔ یہاں نیپال کے دامن میں موسم سرما میں ہر سال سخت کہرا چھاتا ہے اور کسی کسی سال تو مہینوں دھوپ نہیں نکلتی۔ آسمان بادلوں اور کہر سے سفید معلوم ہوتا ہے۔ اُن دنوں بھی یہی حالت تھی۔ اسی واسطے آہستہ رفتار سے جا رہے تھے۔ جس وقت ہماری ٹرالی کلی نگر سے نکل کر ٹانڈے کے برابر آ گئی تو میں نے احمد میاں سے معذرت کی اور ان کو سمجھا کر راضی کیا کہ میں اور ٹرالی مین بلدیوا یہیں اترے جاتے ہیں۔ تم لوگ چلو، وہاں سب انتظام ہے۔ ہاتھی موجود ملیں گے، سردار ساتھ ہے۔ ابھی کچھ ناشتہ کر لینا۔ گیارہ بجے تک میں بھی آ جاؤں گا۔ کھانا وانا کھا کر بارہ ایک بجے تک چلیں گے۔ میں مسعود خاں سے کارتوس لے کر ابھی آتا ہوں۔ وہاں مسعود خاں نے بہت روکا اور جب میں کسی طرح نہ رکا تو اپنا دہلویا گھوڑا لے جانے پر مجھے مجبور کرنے لگے، مگر میں نے اسے بھی انکار کر دیا۔ پانچ میل کا راستہ ہے، کوئی بات نہیں ہے۔ جنگل یہاں سے میل بھر پر شروع ہو جاتا ہے۔ پیدل ہی جاؤں گا۔ راستے میں شاید کچھ شکار ہی مل جائے۔ میں نے سواری سے بھی انکار کر دیا۔ مسعود خاں نے دو سو کارتوس منگائے تھے۔ ان میں سے آدھے میں نے لے لیے اور چل دیا۔ اب قصہ آگے بیان کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ میں ٹرالی لائن، نہر شاہ گڑھ، ٹانڈہ، بائیفر کیشن وغیرہ کا ایک نقشہ سا کھینچ کر یہ واضح کر دوں کہ یہ جگاہیں ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں، جنگل کس طرح پھیلے ہوئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

شاہ گڈھ اے آر کے آر (ARKR) لائن پر پیلی بھیت سے دوسرا اسٹیشن ہے۔ یہاں سے دو فٹ کی ایک لائن شروع ہو کر تین میل کے بعد نہر ساردا کی ہردوئی والی شاخ سے جا ملتی تھی، اور پھر اسی شاخ کے کنارے کنارے جا کر اصل نہر ساردا کے ساتھ ساتھ بن بسا تک چل گئی تھی۔ شاہ گڑھ سے بائیفر کیشن ساڑھے گیارہ میل پر ہے۔ بائیفر کیشن کے معنی ہیں وہ مقام جہاں سے ایک چیز دو حصوں میں

تقسیم ہوجائے، چنانچہ سارد انہر اس مقام پر دو شاخوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ بائیفر کیشن سے اگر جنگل میں سے ہوکر جایا جائے تو چار میل جنگل میں سے، ایک میل سادہ میدان کے بعد مادھوٹانڈا پانچ میل ہے، لیکن ٹرالی لائن کا راستہ چھ میل سے زیادہ کا ہے۔

ساڑھے آٹھ یا نو بجے ہوں گے جب میں مادھوٹانڈا سے چل کر ٹھیک اس جگہ پہنچا جہاں براہی کی سڑک جنگل میں داخل ہوتی تھی۔ بلدیوا سے رائفل لے کر میگزین بھری اور گھنے بلّی کے جنگل میں گھس گیا۔ یہاں سے سیدھا بائیفر کیشن کا رخ کیا اور تیز قدم چل پڑا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ گیارہ بجے سے پہلے پہنچ کر مہمانوں سے جا ملوں۔ آسمان پر کہر اور بادل بدستور تھے۔ یہ تک معلوم نہیں ہوتا تھا کہ سورج کس جگہ ہے۔ سردی بھی خوب تھی۔ ایک طرح موسم خوشگوار تھا۔ بلدیوا میرے پیچھے پیچھے، میں رائفل ہاتھ میں لیے، نال زمین کی طرف، گھنے جنگل میں آنکھیں گڑوئے، چاروں طرف دیکھتا چلتا رہا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک جانور کی بھی جھلکی تک نہ معلوم ہوئی۔ چلتے چلتے اب مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں بہت دیر سے چل رہا ہوں۔ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ اپنی رفتار کے حساب سے مجھے کب کا بائیفر کیشن یا اس کے اطراف میں ہر دوئی برانچ نہیں تو کھیری برانچ پر کسی جگہ نکل آنا چاہیے تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ سامنے پتلے اور گھنے سال کے درختوں میں کچھ ہلن سی معلوم ہوئی۔ میں حسب قاعدہ ٹھٹک کر ساکت کھڑا ہوگیا۔ مگر وہاں تو کھٹ پٹ کی سی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں، چری سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں آرہی ہیں۔ ارے یہ کیا! اور آگے بڑھ کر سڑک بھی ہے۔ یہ کون سی سڑک ہے؟ میرے سیدھے ہاتھ پر بلدیوا تھا۔ اس کی طرف جو گھوما تو دیکھتا کیا ہوں کہ جنگل کا کنارہ لگا ہوا ہے۔ آگے بڑھ کر باہر جو ہم دونوں نکلے تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سامنے میدان پڑا تھا۔ ہم دونوں ٹھیک اسی جگہ جنگل کے کنارے تھے جہاں سے گھسے تھے۔

''ارے بلدیوا، یہ کیا ہوا؟''

''ساحیب، سمجھ نہیں پڑتی کا ہوا۔ گھومت گھومت تے کے تے آئے گئے۔''

برسوں جنگل میں گھومنے والا، کبھی اس طرح نہ بھٹکا تھا۔ اپنی اس حماقت پر خود ہنسی آگئی اور ٹھٹھے مارتا ہوا پھر بائیفر کیشن کی سیدھ لے کر جنگل میں گھس گیا۔ ''بلدیوا، اب دیر ہوجائے گی۔ تیز چلنا

چاہیے۔ لوگ کھانے پر انتظار کریں گے۔"

"چلے ساجیب، ساتھ نہ چھیڑیو،" بلدیوا نے ڈٹ کر جواب دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا قد چھ فٹ کا ہے اور ٹانگیں بھی (غالباً) کچھ زیادہ ہی لمبی ہیں۔ میری چال بہت تیز ہے، اس کی وجہ سے دوسرے لوگ میرے ساتھ چلنے سے گھبراتے ہیں۔ اسی واسطے برابر ٹرالی والے بدلتا رہتا تھا۔ اِدھر قریب ایک سال ہوا اتفاقاً یہ بلدیوا ہاتھ آ گیا۔ میرے ساتھ چل لیتا تھا اور میرا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ دوبارہ میں اپنی پوری رفتار سے بائیفرکیشن کی سیدھ لے کر روانہ ہوا۔ بلدیوا بھی کبھی تیزی سے چلتا اور کبھی بھاگتا۔ دائیں بائیں ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا۔ لیکن چلتے چلتے ایک دفعہ پھر جب کہ میں بائیفرکیشن پر، یعنی ٹھیک جگہ پر، نکلنے کی امید کر رہا تھا، ہم دونوں براہی کی سڑک سے سوسوا سو قدم مغرب کی طرف اسی کنارے پر پھر نکل آئے۔ اب تو مجھے غصہ آ گیا۔ بلدیوا کے سوا اور کون تھا، اسی کے سر ہو گیا۔ "او جانگلی! الو! پھر مجھے بہکا دیا۔ کئی دفعہ منع کیا مگر مرغے کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔ برابر باتیں ہی کرتا رہا۔" بلدیوا نے بہت کچھ معافی مانگی کہ وہ بالکل بے گناہ ہے، مگر میں نے ایک نہ سنی۔ سب الزام اسی کے سر تھوپ کر اب کی اس سے کہا کہ وہ آگے آگے چلے اور میں پیچھے رہوں گا۔ جب بھی وہ دائیں یا بائیں ہوگا فوراً اسے بتاؤں گا۔ پھر جنگل سے باہر کھڑے ہو کر سیدھ باندھی اور اسی سیدھ پر آگے ایک درخت کے پاس بلدیوا کو کھڑا کیا۔ اب اسے چلنے کا حکم دیا۔ جب وہ درخت آ گیا تو فوراً کسی دوسرے درخت کو اسی سیدھ میں تاک لیا۔ جہاں بلدیوا سیدھی یا الٹی طرف غلط ہوا فوراً منع کیا۔ اس طرح کرتے ہوئے چلا۔ لیکن بلی کا گھنا جنگل، دس بارہ گز سے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اسی سیدھ در سیدھ درختوں کا اندازہ لگاتا تھوڑی ہی دور چل سکا۔ پھر بھی "دائیں کو ہٹ"، "بائیں کو ہٹ" کرتا ہوا چلتا رہا۔ اور اب کی کچھ زیادہ دیر نہ لگی تھی کہ بڑے اطمینان سے جنگل کے اندر ہی اندر ایک گول چکر لگا کر پھر اسی کنارے پر نکل آئے۔ یا اللہ، یہ کیا ماجرا ہے! آج میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

"ارے بلدیوا، تو ہی بتا کہ یہ کیا بات ہے؟" "ساجیب، بوجھ نا ہی پڑتی ہے۔ اب آپ ہماری مانو، کنارے کنارے چلو، پھر نہر پکڑ لو۔" "کیوں بے وقوف، اب بتاتا ہے! اور اگر اب بھٹکا تو تیرا سر توڑ دوں گا۔ تیری شامت ہی آ جائے گی۔" "موری مانت کب ہو ساجیب۔ اب کی چلیو، سیدھا سیدھ

نکال لے چلوں تو کہنا۔'' اب بلدیوا نے رہنمائی قطعی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اگر میں کبھی ٹوکوں بھی تو فوراً جواب دیتا، ''بولو نہ ساحیب، اب چلے چلو۔ بولونا ساحیب۔'' چلتے چلتے جب ایک گھنٹہ ہوگیا تو میں نے کہنا شروع کیا، ''ارے تو بھٹک گیا ہے،'' اور پھر وہی ہوا کہ بھٹک گئے اور اب کی بائیں کو کٹتے کٹتے ایک دائرہ بنا کر پھر وہیں کے وہیں نکلے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ایک گول گھیرا بنا کر براہی کی سڑک پر جنگل کے اندر اسی کسی جگہ پر آ گئے۔ کیوں کہ اس جگہ سڑک براہی کے علاوہ اور کوئی سڑک ہی نہ تھی اس لیے یہ طے شدہ امر تھا کہ سڑک براہی کی ہے، لیکن سمتوں کا بالکل دھیان نہ ہونے سے بھی پتا نہ چلتا تھا کہ کس طرف براہی کا رخ ہے اور کس طرف باہر کا۔ آخر میں نے سوچا کہ ڈھائی تین بجے کا وقت ہے، اب اگر کوئی گاڑی اس سڑک پر سے گذری ہوگی تو جنگل سے باہر ہی کو نکلنے والی گاڑی ہوگی۔ بیلوں کے پیر دیکھے۔ سب سے تازہ پیر کے نشان پر چل پڑا۔ ایک میل چلنے کے بعد پھر اسی مقام پر آ گیا جہاں سے کہ صبح آٹھ بجے سفر شروع کیا تھا۔ اب یہ حالت کہ بھوک اور غصہ، پیاس اور جھنجھلاہٹ، تھکن، اور تاؤ پر تاؤ آ رہے تھے۔ جاؤں گا تو اسی جنگل کے ٹکڑے میں سے ہو کر جاؤں گا۔ بلدیوا نے بھی اس غصے اور جھلاہٹ کے موقعے پر خاموشی اختیار کر لی۔ بغیر آپس میں بات کیے، ایک لفظ بھی بولے، پھر دونوں جنگل میں گھس گئے۔ مجھ پر جتنی تھکن سوار ہوئی تھی اتنا ہی غصہ بڑھ گیا۔ اور جتنا غصہ بڑھتا جاتا اتنا ہی تیز چلتا جاتا تھا۔ اب بندوق کندھے پر، منھ پر پسینہ، پیروں اور گھٹنوں پر دھول، چل رہا ہوں، چل رہا ہوں۔ شاید ڈھائی گھنٹے چلتے چلتے ہو گئے ہوں گے کہ بلدیوا نے کچھ کہنا چاہا، ''ساحیب، ابھی کچھ پایا تھا میں نے۔'' کانپتی ہوئی مگر سخت آواز میں بہت زور سے کہا، ''چپ! بلدیوا چپ!'' لیکن اس کے پاؤں لڑکھڑائے۔ وہ پسینے میں نہایا ہوا اور میں بھی پسینے میں نہایا ہوا۔ چل رہے ہیں اور چل رہے ہیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ آخر ایک جگہ بلدیوا رک گیا اور بولا، ''ساحیب، اب نا چپ رہیوں۔'' ایک پیڑ کے تنے پر ہاتھ رکھ کر اور اس کے اوپر لال چینٹیوں کے چھتے کی طرف اشارہ کر کے: ''یاد یکھو؟ یا درکھت دیکھو؟'' میں نے جھلا کر کہا، ''ہاں، تو پھر؟'' وہ بولا، ''ساحیب، یا درکھت، تین واری یا ہی درکھت دیکھا ہے۔ ہم تو گھوم کریا ہی درکھت پر آتے ہیں۔'' اب تو مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ معلوم ہوا جیسے سر گھوم رہا ہو۔ سب غصہ وغیرہ فرار ہو گیا۔ تھکن ایسی معلوم ہوا کہ گرا پڑتا تھا۔ یہ معلوم ہوا کہ کسی سحر میں پڑ گیا ہوں۔ ابھی کچھ ہوش

آیا ہے اور شاید پھر اسی جادو کی سی بے ہوشی چھانے والی تھی۔ اب تو میں نے ہمدردی طلب لہجے میں بلدیوا سے کہا، ''ارے بیٹا، اب نکلیں تو کیسے۔ کسی طرح یہاں سے باہر نکلیں اور کسی طرف چلیں۔'' اس سوال پر تو اب بلدیوا کو بھی پریشانی ہوئی۔ سوچتے سوچتے بولا، ''کاہو تو اسی درکھت پر چڑھ کر دیکھوں۔'' میں نے کہا، ''یہ ٹھیک ہے۔ ارے دیکھ، لال چینٹیوں کے چھتے سے بچ کر ہی چڑھنا۔'' اور میں نے اس کو سہارا دے کر ایک موٹی سی ڈال پر لٹکا دیا۔ وہ درخت کے اوپر تک چڑھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر چیخا، ''ساحیب، جا کنارہ ہے۔ تمرے پیچھے کنارہ ہے۔''

ہم دونوں تھکے ہارے، بھوکے، اور پیاس سے بے حال، اب جنگل کے کنارے کنارے نہر کی طرف چلے۔ شام ہو چکی تھی۔ دن کی روشنی تیزی کے ساتھ کم ہو رہی تھی۔ ڈیڑھ میل چلنے کے بعد جس وقت میں نہر کو پار کر کے (اس زمانے تک نہر مکمل نہیں ہوئی تھی، اس لیے پانی ابھی نہیں چھوڑا گیا تھا) ٹرالی لائن پر پہنچا تو کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ اب چار میل کا فاصلہ ہمارے سامنے تھا۔ روانہ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے ابھی روانہ ہوئے ہی تھے کہ پیچھے سے ٹرالی کی آواز آئی۔ دونوں رُک گئے۔ ٹرالی جب پاس آئی تو معلوم ہوا کہ سردار نے مادھوٹانڈے سے میرے ہی واسطے یہ ٹرالی بھیجی تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس پر بیٹھ کر تھوڑی دیر میں بائیفرکیشن پہنچ گئے۔ مہمانوں میں سے ابھی تک کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے جاتے ہی سردار سے کھانا مانگا اور جب چائے غیرہ پی لی تو سب حال پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ایک بجے تک سب نے میرا انتظار کیا، پھر کھانا کھا لیا۔ اس کے بعد تین بجے تک اور انتظار کیا۔ ٹھاکر صاحب کا ہاتھی کہیں گیا ہوا تھا اس لیے وہ نہ بھیج سکے۔ اکیلی رام پیاری ہی تھی۔ اس پر احمد، محمود، ماموں رشید، ممن میاں اور پروفیسر چلے گئے تھے۔ جلن ماموں، صاحبزادے اور خانو پیدل ہی گئے ہوئے تھے۔ لیکن ابھی میں باتیں ہی کر رہا تھا کہ وہ لوگ بھی آ گئے۔ ہاتھی پر اور کچھ پیدل۔

ایک ہی وقت میں بہت سی آوازیں۔

للن میاں: کیوں سید میاں، یہ کہاں کا طریقہ ہے؟ ہم کو چھوڑ خود غائب ہو گئے۔

احمد میاں: ارے سید پیارے، محمود تو آج بچ ہی گئے۔

جلن ماموں: خانو نے دیکھا کیسا زبردست سانبھر مارا ہے۔

رشید: ارے پروفیسر نے تو گلدار مار لیا۔ یہ دیکھو۔ کالے خاں، ہاتھی بٹھالو۔

محمود میاں: ارے بھئی سردار، میرے لیے خوب اسٹرانگ چاے لانا۔

رام پیاری پر سے اچھے قد و قامت کا ایک گلدار اتارا گیا۔ دو مزدوروں نے لٹھیا میں لٹکا ہوا سانبھر کا ایک سر لا کر رکھ دیا۔ سینگ اچھے تھے بلکہ بہت اچھے تھے۔ جلن ماموں اور صاحب زادے نے دو مرغے، ایک مرغی اور ایک کالا تیتر رکھ دیا۔

ادھر سردار نے بھی پوریاں، انڈے، ٹکیاں اور چاے وغیرہ بھر کر سارا ناشتہ لا کر رکھ دیا تو اب جا کر شور مچانے والے منھ انڈے اور چاے سے کچھ کچھ بند ہوے۔ بات چیت قرینے پر آئی۔

محمود: سید میاں، یہ کیا حرکت تھی؟ خود کیوں رہ گئے؟ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔

میں: بھائی کیا بتاؤں۔ اچھا میں پھر بتاؤں گا، پہلے تم تو بتاؤ کیا ہوا تھا۔

محمود: آپ کو یہ نہ چاہیے تھا۔ مسعود خاں نے روک لیا اور رک گئے۔ مہمان یہاں بڑا انتظار کر رہے تھے۔

میں: نہیں بھائی، میں تو اسی وقت وہاں سے چل پڑا۔ راستہ بھول گیا۔ کچھ عجیب قصہ ہے۔ پھر بتاؤں گا۔ پہلے تم لوگ اپنا قصہ سناؤ کیا ہوا تھا۔

احمد: ملا جی کی جھانسی! یہ ٹھیک نہیں۔ کیوں صاحب، چلے ہیں ہم کو بہکانے۔ راستہ بھول گئے اور سید میاں!

میں: ارے مجھے تو فی الحال چھوڑو۔ میں پھر بتاؤں گا۔ پہلے یہ تو بتاؤ گلدار کس نے... (میری بات کاٹ کر)

پروفیسر: آہا آہا، اِدھر! آہا آہا (چٹکی چٹکی بھر کی موچھوں کو تاؤ دیتے ہوے) اسی خاکسار نے وہ گیدڑ مارا ہے۔

میں: بکومت، چپ رہو۔

محمود: ارے بھائی ایک ہاتھی، وہ بھی چھوٹے سے گدے کا۔ میں، بھیا للن میاں، رشید اور پروفیسر گھس پل کر بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے لیکن اِدھر تو بھیا ایک ساں ڈھکیلے جائیں، اُدھر پروفیسر ایک انچ

بھی نہ کھسکے۔ میں بڑی مصیبت میں ہاتھی کی دم کے پاس، ایک ہاتھ سے رسا پکڑے، دوسرے سے بندوق لٹکائے چلا جارہا تھا۔ نہر پار کی، پھر چوکا کے ڈھائے میں اترنے لگے۔ وہیں پر اتفاق سے ایک تین شاخہ درخت مجھے نظر پڑا۔ میں نے ہاتھی رکوا کر بھیا سے کہا کہ میں تو اس تین شاخ پر بیٹھا جاتا ہوں۔ ترائی سے جنگل میں یا اُدھر سے اِدھر آتا جاتا اگر کوئی جانور نکلا تو مارلوں گا۔ یہ لوگ نشیب میں جا کر گونند ڈھونڈیں اور واپسی میں مجھے پھر یہیں سے اتارلیں۔

احمد: ہاتھی ہم نے رکوادیا۔ تین شاخہ ابھی اونچا تھا۔ محمود ہاتھی پر کھڑے ہوگئے۔ نیچے ان کی ٹانگوں کو سہارا دیا گیا تو یہ گدالے کو پکڑ کر اوپر چڑھ گئے۔ جب اطمینان سے بیٹھ گئے تو ہم لوگ چل دیے۔ کلک اور نرکلوں میں پھرا کیے۔ دو ایک گونداٹھے بھی لیکن فیر نہ ہوسکا۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد واپس آگئے۔ اب محمود کے درخت کے قریب آئے تو محمود ہاتھ سے چپ رہنے اور آہستہ آہستہ بڑھنے کا اشارہ کررہے ہیں۔ یہ خیال ہوا کہ ضرور کسی جانور پر فیر کیا ہے اور زخمی جانور آس پاس ہی پڑا ہے۔ میں نے چاروں طرف جلدی جلدی نظر دوڑائی لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ اب ہم درخت کے قریب آ گئے لیکن محمود برابر انگلی کے اشارے سے چپ رہنے کو کہہ رہے ہیں۔ خیر، بالکل خاموشی سے ہاتھ پاؤں ملاکر کھڑا کردیا، لیکن اب ہتھنی نے برابر کلبلانا شروع کردیا۔ پچھلی کھڑی ہی نہ ہو۔ مہابت آنکس اٹھائے تو اوپر سے محمود کھس کھس کرکے کہیں، ہوں، ہوں! نہیں، مارو نہیں۔ بندوق ہم کو پکڑا کر محمود بچارے لٹک کر گدے پر کودے اور تنے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر نیچے کھس کھساتے رگڑتے پھسل آئے۔ تمام کوٹ بھی پھٹ گیا۔ ہاتھی پر آتے ہی بولے، بڑھالو، بڑھالو۔ ہاتھی بڑھایا گیا۔ ابھی تک ہم کو کچھ خبر نہیں ہے۔ جب اس پیڑ سے پچاس ساٹھ فٹ آئے تو محمود نے ہاتھی رکوالیا۔

پروفیسر: اور میں نے بندوق اٹھا کر ٹھائیں سے گولی دی۔ فاختہ کی طرح نیچے آپڑا۔

احمد: چپ رہو۔ چپ رہو۔ سنیے سید میاں، محمود نے ہاتھی رکوایا۔ اب بھی میں اُدھر ہی اُدھر دیکھوں۔ جب محمود نے بندوق اسی درخت کی چوٹی کی طرف چھتیائی تو میری نگاہ پڑی۔ میں نے بھی فوراً ہی رائفل سنبھالا۔ محمود کا فیر ہوتے ہی گلدار اوپر سے گرا اور گرتے ہوئے پر ہوا میں للن میاں نے ۴۰ ابور کے دو فیر کیے۔ پھر بھی گر کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک گولی میں نے رسید کی۔

محمود: بھیا، پروفیسر کی بات رہ گئی، وہ بھی کہہ دو۔

للن میاں: بھئی کمال ہی کر دیا۔ جوں ہی محمود نے بندوق کی نال آسمان کی طرف کی، آپ کی نگاہ پڑ گئی۔ کیسی پھرتی کی ہے! میرا چسٹر گھسیٹ، کمبل کھینچ، دونوں چیزیں اوڑھ، سب کے بیچ میں سکڑے ہوئے اوندھے پڑے ہیں۔ واللہ! یاد رہے گی بھائی کی یہ حرکت بھی۔

میں: ارے یار، تو قصہ کیا تھا؟

محمود: سید میاں، حضرت گلدار اسی درخت پر پہلے ہی سے موجود تھے۔ تین شاخہ بہت اونچے پر تھا، اتنا کہ ہاتھی کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر مشکل سے چڑھایا گیا تھا۔ وہ درخت بھی کم بخت عجیب قسم کا تھا۔ تین شاخہ کی دو شاخیں تو ایسی ہی معمولی تھیں، وہیں پر ٹوٹ ٹاٹ کے ختم ہو گئی تھیں۔ اور تیسری شاخ یعنی اصل تنا جہاں میں بیٹھا تھا وہ پھر سیدھا بہت اونچا چلا گیا تھا۔ اوپر پھر سات آٹھ ڈالیوں اور پتوں کی ایک چھتری سی تھی۔ ان ہی میں یہ حضرت گلدار بیٹھے تھے۔ بھیا تو ہاتھی لے کر چلے گئے، میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اوپر پتوں میں کھس کھس ہوتی۔ میں نے خیال کیا، مور ہو گا یا بندر۔ میں بیٹھا رہا۔ اب ایک دفعہ حضرت جو ہلے تو سارا درخت ہل گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو جناب سر پر سوار ہیں۔ بڑی طبیعت گھبرائی۔ نیچے اترنے کی سوچی، مگر وہ بھی ناممکن۔ اتنی اونچائی پر، پھر پورے تنے پر ایک ڈالی بھی نہیں۔ فیر بھی کرتا ہوں تو حضرت زخمی ہو کر سیدھے میرے سر پر ہی گرتے ہیں۔

محمود اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔ میں نے کہا، پھر؟

محمود: پھر کچھ بھی نہیں۔ آگے کا قصہ تو آپ نے سن ہی لیا۔

میں: سر پر گلدار، اور تم بیٹھے رہے؟

محمود: ہاں۔

میں: اوپر گلدار بیٹھا ہے، نیچے تم بیٹھے ہو۔ دونوں بیٹھے ہیں؟

محمود: ہاں۔

میں: تم ہاتھی کے آنے کے انتظار میں ہو، اور گلدار تمھارے ہٹنے کے انتظار میں ہے، اسی

طرح دو گھنٹے گذارے؟

محمود: ہاں۔

میں: شاباش ہے بھائی تم کو!

محمود: شاباش کی کیا بات ہے؟ موقع ہی ایسا آ گیا تھا۔ سوائے چپکے بیٹھے انتظار کرنے کے میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ نہ کہیں جا سکتا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شاخ دار درخت پر تو بلی کی طرح نہایت پھرتی سے یہ چڑھ جاتا ہے، لیکن سیدھے ننگے درخت پر اسے چڑھنے اور خاص کر اترنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اچھا یہ تو ہوا۔ اب سچ مچ بتایئے، آپ راستہ کیسے بھولے؟

میں: ہاں، راستہ بھول گیا تھا۔ مگر ٹھہرو، پھر بتاؤں گا۔ پہلے خان کے سانبھر کی بھی سن لوں، ہاں بھئی خانو۔

خانو: سید میاں، کچھ بھی نہیں۔ سانبھر میں نے نہیں مارا، شیر کا مارا اور کھایا ہوا پڑا تھا۔ سینگ اچھے تھے، دیکھتے ہی دل لوٹ گیا۔ چاقو سے سر کاٹ لائے۔ سڑ چلا ہے، بو آنے لگی ہے۔ اچھا اب آپ اپنی واردات سنایئے۔

میں نے تفصیل سے اپنا قصہ سنایا، جس کو بڑی دلچسپی سے ہر ایک سنتا رہا۔ اور جب میں اپنا واقعہ بیان کر چکا تو تھوڑی سی چیں چخ کے بعد ہر ایک اسی بات پر متفق ہو گیا کہ بس یہ اثرات اسی فقیر (جو کہ ہم سے اگلی ٹرالی والوں کو بھی ملا تھا) کی برکت ہیں، اور میں چوں کہ مرتد قسم کا آدمی ہوں، میں نے اس رائے سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ ''اچھا، اگر مان لیا بھی جائے کہ فقیر کی برکت سے محمود کی جان بچی تو اس ظالم کو مجھے دن بھر راستہ بھٹکانے سے کیا ملا؟''

''آپ کا نہ جانا بھی بہتر ہوا۔''

''اجی اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔''

''سید میاں، یہ فقیروں کے راز ہیں۔''

وغیرہ وغیرہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

ان ہی باتوں میں رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ جلدی جلدی سب نے اپنا اپنا سامان سمیٹا۔ پھر

موٹر ٹرالیوں پر سوار ہو کر سب شاہ گڑھ واپس آئے۔ یہاں کھانا تیار تھا۔ میں تو کھانا کھاتے ہی پڑ کر سو گیا، کئی رات کا جاگا، دن بھر کا تھکا ہوا تھا، لیکن ان لوگوں نے برج پھر رات بھر کھیلی۔ دوسرے دن شاہ گڑھ کے قلعے کا ہانکا کیا گیا۔ کوئی خاص بات ایسی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے اس ہانکے کو بھی تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ایک دو جھانک مارے گئے۔ پانچ ہی بجے شکار سے گھر واپس آ کر ہم سب چائے اور انڈے کے حلوے میں چمٹے ہوئے تھے کہ مسعود خاں سب انسپکٹر مادھوٹانڈہ بھی آ گئے۔ گپ شپ بات چیت کے بعد کل کے قصے بیان کیے گئے۔ پھر مجھے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ راستہ بھولنے کا حال بتانا پڑا۔ انھوں نے اس قصے کو ایک خاص دلچسپی سے سنا۔ ہر ہر بات کو کرید کرید کر اس طرح پوچھا کہ مجھے بھی تعجب ہوا۔ فقیر کا حلیہ دریافت کیا۔ ٹھیک ٹھیک جگاہیں دریافت کیں جہاں سے میں جنگل میں گھسا تھا اور پھر واپس نکلا تھا۔ میں نے دو ایک دفعہ پوچھا بھی کہ تم اس قدر کیوں دلچسپی لے کر ہر بات کو پوچھ رہے ہو۔ کچھ بولے نہیں۔ جب سب کچھ سن چکے تو تھوڑی دیر خاموش رہ کر کچھ سوچتے رہے۔ پھر مسکرا کر بولے کہ ''واقعی محمود اور آپ دونوں کی جانیں خطرے میں آ گئی تھیں۔ آپ بڑے خطرے میں پڑ گئے تھے۔ یہ انھیں شاہ صاحب کی برکت تھی۔ معلوم ہے سید میاں، اگر آپ ویسے ہی سیدھے نکل کر بائیفر کیشن کے قریب سے چلے جاتے تو کیا ہوتا؟ وہیں پر آدھے میل جنگل کے اندر سلطانہ ڈاکو اور اس کا گینگ پڑا ہوا تھا۔ کل دن بھر وہ لوگ وہیں چھپے رہے۔ سرِ شام نکل کر رات کے نو بجے انھوں نے براہی کے اتر میں بن کٹا گاؤں کو لوٹا، اور اب شیر کوٹ کی ترائی میں کہیں موجود ہیں۔ اسی واسطے تو میں سات بجے کی گاڑی سے پیلی بھیت، صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا رہا ہوں۔ بھئی خوب بچے سید میاں۔ اور سو کارتوس بھی ساتھ تھے۔ ارے دس نہ پانچ، سو کارتوس! غضب ہو جاتا۔ نہ معلوم ان کارتوسوں سے اور اس رائفل سے کیا کیا غضب ڈھائے جاتے۔ بڑی خیریت ہو گئی۔ بھئی وہ فقیر مجھے مل جائے تو مزہ ہی آ جائے۔''

میں نے کہا، ''تو یار، تمھارے خیال میں کیا وہ فقیر نہیں تھا؟''

مسعود خاں: تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ وہ ضرور اسی گینگ کا آدمی تھا۔

میں: بہر حال کوئی بھی ہو۔ میرے اس راستہ بھولنے کو اور اس فقیر سے کوئی بھی واسطہ نہ تھا۔

افسوس کہ اس فلسفے پر اس سے آگے اور باتیں نہ ہوئی۔ دوسری گپاسنکیں شروع ہوگئیں۔ ان ہی میں شام ہوگئی۔ سات بجے کی گاڑی سے مسعود خاں اور یہ سب لوگ بھی چلے گئے۔ لیکن ناظرین نے خیال کیا ہوگا کہ کس مزے سے خود بخود یہ فلسفیانہ اور عالمانہ گفتگو کسی ایک خاص نتیجے پر پہنچنے والی تھی۔

خیر، وہ باتیں ختم ہوگئیں۔ وہ وقت نکل گیا۔ برسوں گذر گئے۔ میں بھی ان واقعات کو بھول سا گیا۔ کوئی تین برس کے بعد ایک دفعہ جب کہ میں بریلی سے پیلی بھیت آرہا تھا، بھوجی پور اسٹیشن پر بہت سے سپاہیوں اور قیدیوں کو دیکھا۔ ان ہی میں بلدیوا صاحب بھی ہتھکڑی اور بیڑیوں سے آراستہ موجود تھے۔ میرے پاس سے اسی زمانے میں نوکری چھوڑ کر چل دیے تھے۔ اب جو اُن کو اس حال میں دیکھا تو رنج ہوا۔ وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ سلطانہ کے گینگ کی گرفتاری کے سلسلے میں آپ بھی ایک فرد ہیں۔ بڑا تعجب ہوا۔ جب گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا، از خود پرانے واقعات یاد آنے لگے اور اس یقینی نتیجے پر تو پہنچ ہی گیا کہ اس دن کا دن بھر بھٹکنا بلدیوا صاحب کی مہربانی تھی۔ مجھ پر رحم کھا کر برابر مجھے سلطانہ کی ملاقات سے محروم کر رہے تھے۔ لیکن پھر شک کی گنجائش یہ پیدا ہوئی تھی کہ آیا ان کا یہ ترحم اس فقیر کی دعا کا اثر تھا یا میری خوش قسمتی کے باعث تھا — واللہ العالم بالصواب۔

اب میں سمجھا

دہلی میں مال روڈ اور اسٹیشن روڈ پر ہوپ لین، جہاں کہ زیادہ تر مزدوروں اور قلیوں کی آبادی ہے، ایک بیرک نما بھونڈے سے ایک منزلہ مکان کے ایک کمرے میں ایک خوبصورت نوجوان آدمی کمرے کی پشت پر نیچی کھڑکی کے قریب ایک اسٹیل بکس پر بڑی دیر سے ساکت بیٹھا باہر دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ضرور ہیں مگر نہ وہ آسمان کو ہی دیکھ رہی ہیں اور نہ نیچے کے بوسیدہ مکان کو۔ غمگین چہرہ بتا رہا ہے کہ اس کا دماغ تفکراتِ دنیا کے طوفان میں تھپیڑے کھا رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں سستی نیلے چوخانے کی ٹائی اور دوسرے ہاتھ میں سرج کے کوٹ کا کالر ہے جو کہ اس کی گود میں رکھا ہے۔ سفید قمیص کی آستینیں کہنیوں سے اوپر لپٹی ہوئی ہیں۔ فاختائی فلالین کی پتلون میں دونوں پیر سیدھے دیوار کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف کھری زمین پر ایک بستر بچھا ہوا ہے جس کے تکیے کا غلاف میلا ہے اور بیچ میں سے پھٹا ہوا۔ بچھونے میں چادر نہیں ہے بلکہ ایک نیلی لال رنگ کی سوزنی ہے۔ کمبل کے روئیں اڑ چکے ہیں، سرے بٹے ہوئے، ڈوریوں کی جھالر کہیں کہیں باقی ہے، زیادہ تر ٹپک چکی ہے۔ ایک کونے میں مٹی کا ایک گھڑا رکھا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک لوٹا بھی رکھا ہے۔ باقی کمرے میں اور کچھ نہیں ہے۔ اس کمرے کا دروازہ بند ہے، شاید اس لیے کہ اس کمرے کے آگے متواتر آمد و رفت ہو رہی ہے۔ بچے، عورتیں، بوڑھے، بوڑھیاں، جن میں ہندو، مسلمان اور عیسائی تینوں ذاتیں شامل ہیں، برابر آ جا رہے ہیں۔ یہ کمرہ اوپر کے گیارہ کمروں میں سے پہلا، زینے کے پاس والا کمرہ ہے۔ ان کمروں کے آگے

ایک لمبا کٹہرے دار چار فٹ چوڑا چھجا چلا گیا ہے جس کے آخر میں تین سنڈاس ان تمام کرایہ داروں کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ قطار بھر کے کمرے نہایت میلے ہیں۔ چھجے کے کٹہرے پر جا بجا میلے کپڑے اور گودڑ لٹکا ہے۔ اس مکان کی چھت پر قدرے بہتر مکانات ہیں۔ ان میں زیادہ تر اینگلو انڈین اور کرسچین رہتے ہیں۔ ان ہی مکانوں میں سے ایک اس لڑکے کی کھڑکی کے سامنے ہے۔ یہ لڑکا، جس کا نام مقبول ہے، کامل دو گھنٹے سے اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ دیسے تو دماغ کے ہیجان سے آنکھیں مستقل حالت میں ٹکٹکی باندھے نگاہ کے تار فضا میں منتشر کر رہی تھیں لیکن کبھی کبھی سامنے کی چیزوں پر جم جاتی تھیں۔ اتفاقاً اس کی نگاہ پڑی۔ سامنے برآمدے میں ایک اینگلو انڈین بانس کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس تام چینی کی ایک پلیٹ میں کچھ کھانا بھرا ہوا رکھا تھا اور وہ اپنے تیرہ چودہ برس کے لڑکے سے کہہ رہا تھا، ''جاؤ کھول دو۔'' لڑکا ہنستا ہوا دوڑا گیا اور مکان کی آڑ میں غائب ہو گیا۔ کچھ دیر کے تحمل کے بعد اس آدمی نے آواز دی، ''جیک! جیک!'' آواز کے ساتھ ہی ایک بڑے بڑے بالوں کا قد آور کتا جھپٹا مار کر آ گیا اور فوراً سر جھکا کر پلیٹ کی طرف لپکا۔ لیکن مالک نے اطمینان کی سنجیدہ آواز میں کہا، ''نہیں، جیک، نہیں!'' یہ کہنا تھا کہ بھوکا کتا، دُم نیچی کر کے، بدن سمیٹ، چار قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اب لڑکا بھی آ گیا اور وہ بھی دیکھنے لگا۔ کتے نے کھانے کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر سر اٹھایا، لڑکے کو دیکھا۔ دم ہلائی، پھر کھانے کو دیکھا، پھر مالک کو، اور پھر لڑکے کو۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے سے اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہے کہ ''دیں گے، کھانے کو دیں گے، کھانے کو دیں گے۔ ابھی ان کی خوشی نہیں ہے، لیکن دیں گے۔'' مالک نے کہا، ''ہاں جیک!'' کتا کھانے پر لپکا لیکن قبل اس کے کہ وہ کھانے میں منھ ڈالے، مالک نے پھر اسی آواز میں کہا، ''نہیں!'' کتا آہستہ آہستہ ہٹ کر چار قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو کر پھر انتظار کرنے لگا۔ لیکن اس کی صورت پر اطمینان تھا، خوشی تھی۔

مقبول نے بس اتنا ہی دیکھا اور کہتا ہوا اٹھا، ''اب میں سمجھا۔'' اب اس نے جلدی جلدی صندوق کو کھول کر کپڑے بدلے۔ پائجامہ پہنا، جانماز نکالی، وضو کیا۔ عصر کی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا، نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی صورت پر ندامت کے نہایت گہرے آثار نمایاں تھے۔ نماز کے بعد کوئی دعا نہیں مانگی، صرف یہی تین چار دفعہ کہا، ''پروردگار، مجھے معاف کر دے۔ بے شک میں کتے سے بھی بدتر ہوں۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقبول پر جو کچھ گذر رہی تھی بڑی سخت تھی۔ یہ ایک شریف خاندان اور امیر گھر کا بچہ ہے۔ اس کے باپ سب جج تھے۔ بچپنا عیش میں گذرا۔ طالب علمی کا زمانہ شہزادوں کی طرح کاٹا۔ اسکول میں سب سے ہونہار، سب سے زیادہ زندہ دل بھی تھا۔ ہاکی ٹیم کا کیپٹن، اسکول کے ڈراموں کی روح رواں، گانے میں یکتا، پڑھائی میں سب سے اول۔ کھیلتے کودتے ہنستے گاتے میٹرک پاس کیا۔ کالج میں گیا۔ وہاں بھی چراغ ہو کر چمکا۔ مگر ایف اے پاس بھی نہ کیا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ گھر میں کیا رکھا تھا۔ کوئی جمع نہ تھی۔ مفلسی نے آگھیرا۔ ماں اور چار چھوٹے بھائی بہنوں نے جوں توں دن کاٹے۔ کبھی فرنیچر اور کبھی زیور بکا۔ اس نے ٹیوشنیں کیں۔ کچھ اس نے مدد لی، کچھ امیدوں کے ہوائی قلعوں سے گھر والوں کو بہلایا، اور مردمی سے بی اے بھی پاس کر لیا۔ آگے چلنے کی امید ہی نہ تھی، خیال کیا۔ تین برس متواتر نوکری کی تمام تر کوششیں کر ڈالیں جن میں سیکڑوں عرضیاں، ہزاروں کوششیں، پچاسوں منتیں، دعائیں اور تعویذ شامل تھے، مگر نوکری عنقا ہوتی چلی گئی۔ اول اول پچاس ساٹھ کی ایک آدھ ملتی بھی نظر آتی تھی مگر اس وقت نگاہیں اس سے اوپر کی طرف تھیں۔ اب مجبوراً جب ان ہی کی تلاش کی تو یہ بھی منھ چھپانے لگیں۔ حتیٰ کہ پچیس تیس تک کی نوکری کرنے پر بھی راضی ہو گیا، مگر یہ بھی اب دسترس سے باہر تھیں۔ آخر میں جب انتہا ہی ہو گئی تو ماں سے کہا، میں دہلی جاؤں گا۔ اس نے کانوں کی صرف دو بالیاں باقی تھیں، بیچ کر لڑکے کو دہلی روانہ کر دیا۔ یہاں اس کا خیال تھا کہ بڑا شہر ہے، ہزاروں دفتر ہیں، لاکھوں کام ہیں، کہیں تو جگہ مل ہی جائے گی۔ دوسرے ریلوے ٹریفک میں ایک جگہ ہے، ایک سو بیس کی تنخواہ ہے، خود جا کر کوشش کروں گا، شاید مل ہی جائے۔ یہاں آیا۔ ہوٹل اور سرائے مہنگے تھے، جیب میں پیسے کم تھے، یہ تدبیر سوجھی۔ اس مکان کا ایک کمرہ چار روپے مہینے پر لے کر صندوق بستر یہاں ڈال دیا۔ دن بھر دفتروں دفتروں مارا پھرا۔ آخر ریلوے میں ایک صاحب اس کے والد کے ملاقاتی مل گئے۔ انھوں نے مدد کی۔ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ سے یہ کہہ کر ملا دیا کہ میرا بھائی ہے۔ لیکن اسے ایک اور خبر معلوم ہوئی کہ تین سو عرضیاں ہیں اور صرف دو جگہیں ہیں۔ عرضیوں میں سے پچاس چھانٹ کر ان کا امتحان ہوگا۔ پھر کوشش شروع کر دی۔ ہیڈ کلرک تک پہنچا، ان کی خوشامد کی۔ کچھ ان صاحب نے زور لگایا۔ خدا خدا کر کے ان پچاس میں بھی آ گیا۔ امتحان میں بیٹھا۔ سب پرچے اچھے کیے۔ امید سے زیادہ

اچھے کیے۔ تیسرے دن نتیجہ معلوم ہوا۔ پچاس میں سے پانچ سب سے اوپر کے چن لیے گئے تھے۔ ان میں بھی اس کا نام تھا۔ اب معلوم ہوا کہ آٹھ دن کے بعد زبانی امتحان ہوگا جس میں بول چال، وضع قطع اور علمیت سب کا لحاظ کیا جائے گا۔ اس کی بھی تیاری کی۔ تین قمیصیں تھیں۔ دو پھٹ چکی تھیں۔ تیسری میلی تھی، اور دھونے پر شاید وہ بھی جواب دے جاتی۔ ایک قمیص نئی سلوائی۔ ایک ٹائی نئی لی۔ جوتے کی حیثیت بگڑ چکی تھی، لیکن کیا کیا جاتا۔ پالش کی ڈبیا مول لی، اور پالش ہی سے اس کو زندہ کیا۔ ایک پتلون اور ایک کوٹ اچھی حیثیت کا ابھی تھا۔ شکر خدا کا، وقت پر کام آ ہی گیا۔ اب اس زبانی امتحان کا اس کو ڈر نہ تھا۔ تندرستی اچھی، وجیہہ صورت، انگلش قریب قریب مادری زبان ہو رہی تھی۔ انسانوں اور آدمیوں میں زندگی گذاری تھی۔ یہی چیزیں وہاں دیکھی جاتی تھیں۔ ماں کو بھی نہایت مسرت بخش خط لکھ دیا۔ بن سنور کر انٹرویو میں گیا۔ وہیں انٹرویو کے دوسرے ہی روز اعلان ہوگیا کہ وہ منتخب ہوگیا ہے۔ اب کیا تھا۔ آ کر دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھیں۔ ماں کو تار دے دیا، میں نوکر ہوگیا۔ اب صرف یہ ہی فکر تھی کہ جیب بالکل ہلکی ہے۔ سات روپیہ میں مہینہ کیسے کٹے گا؟ لیکن خدا پر شاکر تھا۔ دوسرے دن ہفتہ تھا، تیسرے دن اتوار۔ چوتھے دن پیر کو دفتر گیا۔ وہاں جا کر یہ معلوم ہوا ملک الموت آہستہ آہستہ اس کی روح قبض کرنے لگا۔ پہلے تو — اور پھر — اور پھر سن گن — اور پھر ایک نئی صورت، اور پھر صاحب کے دفتر میں ہیڈ کلرک اور پھر کلرکوں کا آنا۔ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ اس جگہ پر رکھے جانے کے واسطے ایک گورنمنٹ کے منتخب کردہ آدمی کے واسطے بھی جگہ تھی۔ مگر ابھی تک گورنمنٹ کا منتخب کردہ کوئی نہیں تھا۔ اب ایک لڑکا گورنر صاحب کی چٹھی لے کر آ گیا ہے۔ معاملہ پیش ہے۔ کب گھنٹے بجے؟ کب دوپہر ہوئی؟ کب صاحب ٹفن پر گئے؟ کب آئے؟ کچھ پتا نہ چلا۔ بس اتنا کہ مقبول نہیں لیا جاسکتا۔ ایک بے روح انسان دفتر سے چلا۔ چار میل بغیر غلطی کیے، بغیر راستہ بھولے، یہاں پہنچ کر اس کمرے میں آ کر صندوق کھڑکی کی طرف کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اور جب کتے کے منہ کے آگے سے بھری پلیٹ ممنوع کردی گئی تو بولا، ''اب میں سمجھا۔'' بے شک، پہلے وہ ششدر تھا بلکہ کچھ اور بھی — ظہر کی نماز کا کئی دفعہ اس کو خیال آیا، لیکن اس نے فکر نہ کی۔ ویسے ہی بیٹھا رہا۔ نماز قضا کردی۔ اب وہ نادم تھا، اپنے مالک سے شرمندہ تھا۔ اسے یقین کامل تھا کہ نہیں، وہ پیٹ بھرے گا۔ کچھ دیر ضرور ہے مگر وہ بھوکا نہیں رکھے گا۔

صبح کو بعد نماز فجر خاموشی سے کپڑے پہن کر وہ پھر چل دیا۔ دل اس کے تابع ضرور تھا مگر واقعات اور حالات کو کس طرح جھٹلاتا۔ جیب میں اب چھ روپے اور نو آنے اَور تھے۔ دو دن کے بعد مکان کا مہینہ ختم ہونے والا تھا۔ دہلی سے گھر تک کا کرایہ پانچ روپے چار آنے۔ ایک روپیہ پانچ آنے میں دو جگہ گاڑی بدلوانے کے واسطے دو آنے قلی کے چاہییں تھے، چار آنے دہلی کے اسٹیشن تک پہنچنے کے واسطے اور چار ہی آنے اپنے گھر تک یکے میں جانے کو۔ اب صرف بارہ آنے اور تھے۔ دو دن اور کوشش کرنے اور پھرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ سگریٹ کہاں سے پی سکتا تھا، بیڑی سے مجبور تھا۔ دن کا کھانا تو تین دن پہلے ہی سے چھوڑ چکا تھا۔ ان ہی بارہ آنے کا ہر ہر طرح حساب لگاتا ہوا ایک دفتر سے دوسرے دفتر پھرتے پھرتے جب دو بج گئے، ایک جگہ ان ہی بڑی بلڈنگوں میں اس کی نظر ایک سائن بورڈ پر پڑی جس پر ''ہز ماسٹرز وائس'' لکھا تھا۔ پہلے تو مقبول دیکھتا ہوا چلا گیا لیکن پھر کچھ سوچ کر رکا۔ واپس آیا۔ دوسری منزل پر پہنچ کر دفتر میں گیا۔ چوں کہ اب مشق کافی ہوگئی تھی، اطمینان سے اپنا کارڈ نکال کر چپراسی کو دیا اور کہا، ''جاؤ، صاحب کو دو۔'' دفتر کافی بڑا تھا۔ دس بارہ کلرک کام کر رہے تھے۔ یہ ان کو دیکھتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد چپراسی نے اس کا کارڈ لاکر واپس کیا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا، ''کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔'' اب وہ واپس ہی ہونے کو تھا کہ ایک خیال آیا۔ ایک کارڈ اور نکال کر اس میں مقبول حسین بی اے کے نیچے پنسل سے لکھ دیا۔ ''کلاسک میوزیشین،'' اور ڈانٹ کر چپراسی سے کہا، ''جاؤ یہ دو اور یہ بھی واپس دے دینا،'' یعنی وہ کارڈ جس پر لکھا تھا کہ کوئی خالی جگہ نہیں ہے۔ چپراسی بھلا آدمی تھا۔ وہ پھر منیجر کے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں سے کارڈ لیے ہوئے نکلا اور بولا، ''یہ صاحب نہیں، دوسرا بڈھا صاحب کے پاس بھیجا ہے۔'' وہاں سے پندرہ منٹ کے بعد آیا اور بولا ''صاحب بلاتا ہے۔'' یہ دونوں دفتر کے برابر سے ہوتے ہوئے ایک دروازے پر پہنچے جسے چپراسی نے نہایت احتیاط سے آہستہ سے کھولا۔ چپراسی اور مقبول اس میں داخل ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں تین چار الماریاں تھیں۔ ایک میز اور ایک کرسی پر ایک کلرک بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کی پشت پر ایک دروازہ اور تھا۔ اب یہ آہستہ سے اس میں داخل ہوئے اور چپراسی ان کو چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا اور اس میں سامان بہت مختصر تھا۔ بیچ میں ایک میز اور تین کرسیاں تھیں۔ اس پر ایک بوڑھا انگریز بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ کمرے کے ایک

طرف ایک بہت بڑا ہارمونیم رکھا تھا۔ ایک کرسی اس کے سامنے تھی، اور ایک طرف دیوار کے برابر ایک عدد بنچ تھی۔ مقبول جا کر میز کے پاس کھڑا ہو گیا۔ تین چار منٹ تک بڈھے نے سر ہی نہیں اٹھایا۔ پھر اس کے بعد سر اٹھایا تو پہلے گھنٹی بجائی اور پھر اشارہ کر دیا۔ پھر کئی منٹ کے بعد سر اٹھایا۔ بولا، ''کلن خان کو بلاؤ اور بابو کو بولو آئیں۔'' تھوڑی دیر میں دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک کاغذوں کا پلندہ لیے ہوئے، صاحب کی میز کے برابر میں کھڑا ہو گیا اور دوسرا آ کر ہارمونیم پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے ایک دفعہ ان کی طرف سر گھما کر کہا، ''گاؤ!'' اور کاغذات دیکھنے لگے۔ بابو پیش کرتا جائے اور وہ پڑھ پڑھ کر دستخط کرتا جائے۔ کچھ دیر بعد پھر اس نے مقبول کی طرف دیکھ کر کہا ''گاؤ!'' مقبول نے پوچھا ''کیا گاؤں؟'' بولا، ''کچھ گاؤ'' اور پھر کام میں لگ گیا۔ مقبول کا دل تو رو ہی رہا تھا، اس نے بھی بغیر سوچے سمجھے جو منھ میں آیا شروع کر دیا۔ ایک دو دفعہ سادی طرح اتنا ہی کہا، ''گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے،'' پھر دیس کا لٹکا لگا کر جو دوسرا مصرعہ ''اجڑے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے'' کہا تو کچھ وہ خود جھوم سا گیا۔ اس نے پھر پہلے مصرعے کو تھوڑا سا اور دیس کا رنگ دے کر ادا کیا۔ پھر جو پلٹا لیا تو صاحب بہادر لکھنا وکھنا چھوڑ کرسی گھما کر بیٹھ گئے۔ اب تو اس نے بھی دل کھول کر اسی مصرعے کو ادا کرنا شروع کر دیا۔ دل میں تو چوٹ تھی ہی، مقبول بھول گیا کہ کہاں ہوں، کیا گا رہا ہوں۔ مجروح دل کی آہیں تھیں جو دیس کے سروں میں نکل رہی تھیں۔ جس وقت وہ اس پر آتا تھا ''اجڑے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے'' تو بڈھے صاحب بھی جھوم جاتے تھے۔ آدھے گھنٹے متواتر اسی شعر کو کہتا رہا۔ آخر بڈھے صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے منع کیا، اور نہایت سلیس اردو میں کہا، ''بس کیجیے بھائی، تشریف لے آیئے۔'' مقبول آ کر اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کو سخت حیرت تھی کہ انگریز اور ایسی صاف زبان، گویا لکھنؤ کا رہنے والا باتیں کر رہا ہے۔ بڈھا اس کی حیرت کو سمجھ گیا۔ بولا، ''آپ کو میری زبان اور لہجے پر تعجب ہے نا؟ بات یہ ہے کہ میں فارسی کا اسکالر ہوں۔ عربی معمولی آتی ہے۔ اردو میں بھی کچھ واقفیت پیدا کر لی ہے۔ اب آٹھ برس سے ہندوستان میں ہی ہوں۔ پھر دن رات کا کام بھی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ تین چار برس کی کوشش میں ہندوستان کے آدمی انگریزی بولنے لگتے ہیں اور اگر کوئی شخص چھ مہینے بھی انگلستان رہ آتا ہے تو لہجہ بالکل یورپین سا کر لیتا ہے۔ پھر میرے واسطے کون سی مشکل کی بات ہے؟''

مقبول نے کہا، ''صاحب، یہ سب ٹھیک ہے، لیکن ایک انگریز کا اردو پر اس قدر عبور بڑی تعجب کی بات ہے، جب کہ بہت سے انگریز جو کہ ہندوستان میں ہی پیدا ہوتے ہیں، عمر بھر یہیں رہتے ہیں، لیکن ایک لفظ صحیح نہیں بول سکتے۔'' بڈھے صاحب نے کہا، ''اوہو، آپ سمجھے نہیں۔ ارے صاحب، اینگلو انڈین کو تو ماریے گولی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بہت سے یورپین جو کہ چھ سات برس پہلے ہندوستان میں ایسے کاموں پر رہ چکے ہوں جہاں انھیں عوام سے ہی کام پڑتا ہو، اگر چہ ایسی نہیں تو بالکل ہی صاف بات چیت کر سکتے ہیں۔ ایسی کہ اگر پردے کی آڑ میں بٹھا کر ان سے باتیں کی جائیں تو آپ یہ یقین نہ کریں گے کہ یہ یورپین ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ کچھ ان لوگوں میں رواج ہی یہی چلا آتا ہے کہ خود جب بات کریں گے تو زبردستی زبان کو بگاڑ کر۔ مجھ کو خود اکثر ایسے انگریز نما آدمیوں سے نفرت ہے۔ شکایتاً منع بھی کیا کہ ایسے نہ بولیں، اور صاف اردو بولنے میں بعض لوگوں کی بے عزتی ہوتی ہے۔ خیر چھوڑیے اس کو، مطلب کی بات ہونا چاہیے۔ تو جناب عطائی ہیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں ہے، ساز پر ساتھ دے سکتے ہیں۔ آپ کی آواز میں درد ہے لیکن بات یہ ہے کہ غیر معروف لوگوں کے ریکارڈ پبلک میں مشکل ہی سے مقبول ہوتے ہیں۔ تاہم میں آپ کو موقع دوں گا، بلکہ میں آپ ہی کے ایسے کسی آدمی کی تلاش میں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو آپ بھیرویں میں ادا کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے میز کی طرف گھوم کر ایک پرچہ نوچ کر اس پر قلم سے لکھنا شروع کیا:

خون روتی ہیں شامِ غم میں ہر دم آنکھیں

دلِ پر درد ملا ہے مجھے پرنم آنکھیں

مقبول کو پرچہ دیتے ہوے بولا، ''آپ اس کو لیتے جائیں۔'' پھر ایک ڈائری کے ورق الٹتا ہوا اسے دیکھنے لگا۔ ''ہاں آپ اسے لیتے جائیں۔ اچھی طرح تیار ہو کر آئیں۔ کل نہیں، پرسوں بھی نہیں۔ اچھا آج آٹھ ہے۔ آپ بارہ تاریخ کو چھ بجے، یہاں نہیں ریکارڈنگ ہال میں تشریف لائیں۔ پتا دفتر میں معلوم کرلیں۔ چھ سے نو بجے تک ہم لوگ ریہرسل کرتے ہیں۔ پھر ریکارڈنگ گیارہ بجے سے شروع ہوتی ہے۔'' مقبول نے کہا، ''معاف کیجیے، لیکن میں پوچھنے کے واسطے مجبور ہوں۔ اجرت کیا ملے گی؟''

''آپ کو ہم ابھی زیادہ نہیں دے سکتے لیکن اس بھیرویں کے واسطے ہم آپ کو تین سو روپے دیں گے،''

بڈھے صاحب نے کہا۔ مقبول کے سر سے پیر تک سنسنی دوڑ گئی۔ تین سو روپے! لیکن فوراً ہی اس کو اپنی حالت کا خیال آیا۔ چار دن کیسے کاٹے؟ کیا کھائے؟ دو دن بعد کوٹھری بھی خالی کرنا پڑے گی۔ اگر ریل کے کرائے کو صرف کیے دیتا ہے تو ڈر لگتا ہے نہ معلوم کیا ہو۔ لیکن ڈر کی بات ہی کیا ہے؟ اب کسی بات کا ڈر نہیں۔ یہ خیالات بجلی کی طرح اس کے دماغ میں دوڑ رہے تھے کہ بڈھے نے کہا کہ میں آپ کو لیٹر آف ایگریمنٹ دیے دیتا ہوں۔ مقبول نے کہا، ''ہاں ٹھیک ہے۔ اور کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ مجھے کچھ بالکل معمولی رقم بطور پیشگی دے دیں۔ لیکن شاید آپ ایسا نہ کرسکیں گے کیوں کہ میں تو بالکل اجنبی ہوں۔'' بڈھے نے کہا، ''نہیں نہیں، بڑی خوشی سے۔ ہم کو پیشگی دینے میں کیا ڈر ہے۔ ہمارا بیوپار تو بالکل نرالا ہے۔ آپ کا مال دیکھ لیا، یعنی گانا سن لیا۔ اب کیا آپ پیشگی کے سو پچاس لے کر بھاگ جائیں گے اور باقی کے چھوڑ دیں گے؟'' مقبول نے کہا، ''نہیں صاحب، مجھے آپ صرف پچیس روپے فی الحال دے دیں۔''

مقبول دفتر سے نکلتے ہی سیدھا اپنی کوٹھری کو واپس گیا۔ وہاں سے کپڑے بدل کر بازار گیا۔ آج اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا۔ نہایت خوشی خوشی نماز پڑھی۔ اس کے بعد دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھی۔ دعا کے واسطے ہاتھ اٹھا کر آنکھیں بند کرلیں۔ منھ پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اب وہ اپنے مالک حقیقی کے آگے تھا۔ بس دل میں اتنا ہی کہا، ''اب میں سمجھا۔ میرے پیارے آقا، میں سمجھ گیا۔ تیرا کتنا ذرا بیوقوف ضرور ہے مگر تو بڑا پیارا مالک ہے۔'' مقبول نے یہ چار دن نہایت خوشی کے ساتھ گذارے اور کچھ تھوڑا بہت آرام بھی کیا۔ کوئی فضول خرچی نہیں کی، کھانا البتہ دونوں وقت کھایا۔

بارہ تاریخ کی شام کو بن سنور کر وقت مقررہ پر ریکارڈنگ ہال میں پہنچ گیا۔ کئی گویے اور گانے والیاں وہاں موجود تھیں۔ ان کو دیکھ کر اور اپنے کو بھی ان ہی میں شامل دیکھ کر اس کو صدمہ ہونے لگا لیکن فوراً ہی چھوٹے بھائی اور بہنوں کی مسکراتی صورتیں، ماں کا غمزدہ چہرہ سامنے آگیا۔ اس نے دل میں کہا، ''کیا ہے، سب خیال ہے، وہم ہے۔ کوئی بے عزتی نہیں ہے۔ میں میں ہی ہوں، یہ لوگ یہ لوگ ہی ہیں۔'' وہ پھر خوش ہو گیا، بالکل خوش، پہلے سے زیادہ۔ تین سو روپے اب جیب میں آتے ہیں۔ پہلے

دو ایک لوگ اور گاتے رہے۔ پھر اس کی باری آئی۔ اطمینان سے ہو بیٹھا۔ ہارمونیم ماسٹر نے بھیرویں کے سر چھیڑے۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ سارنگی بھی چلی اور اس نے گانا شروع کر دیا۔ یہ خوش خوش گا رہا تھا۔ اس کا دماغ روپیہ لے کر گھر پہنچنے کی خوشی میں لگا تھا۔ اتنے میں اس کی نگاہ ہارمونیم ماسٹر پر پڑی۔ وہ الجھ رہا تھا۔ یہ فکر میں تھا کہ کیا معاملہ ہے کہ طبلیے نے کہا، ''کہاں بہک رہے ہیں صاحب؟'' اب اس کو خود اپنے عیب نظر آنے لگے۔ اس نے فوراً گھوم کر ریکارڈنگ ماسٹر کو دیکھا۔ وہ بیٹھا ٹکے کے چار چار منھ بنا رہا تھا۔ مقبول نے سنبھالا لینا چاہا لیکن بے سود۔ کبھی بے تالا پڑ جاتا کبھی سُر سے ہٹ جاتا۔ اب اور ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ پھر کوشش کی لیکن اور بہکا۔ انچارج نے جز بز ہو کر کہا، ''بس بس، میرا وقت نہ خراب کیجیے۔ مجھے ایسے گانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

جس طرح کوئی پھولوں کے گہنے کو دو سکنڈ میں دونوں ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دے، یہی مقبول کی امیدوں کا حال ہوا۔ اور ساتویں آسمان سے پھسلا اور زمین پر آ گرا، اور نہایت دھماکے کے ساتھ۔ اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ منھ خشک ہو رہا تھا۔ وہ انچارج سے کچھ کہہ رہا تھا، لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ناچار مقبول نے عاجزی سے کہا، ''اچھا، لیکن آپ کے دفتر سے پچیس روپے پیشگی دیے گئے تھے۔ اس میں سے کچھ خرچ ہو گئے ہیں، باقی واپس کر دوں۔'' انچارج نے کہا، ''وہ آپ کی اجرت ہے۔ وہ روپے واپس کون مانگتا ہے۔ آپ جائیں۔''

ایک دفعہ پھر مقبول کی لاش چلتی ہوئی چاوڑی بازار میں سے گذری۔ جسمانی صدمے کی انتہا سے آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے، اور روحانی صدمے کی انتہا سے آدمی کا دماغ معطل ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پیر از خود چلتے ہیں لیکن دماغ دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح صاف ہو جاتا ہے جس میں خیال کا نشان بھی نہیں رہتا۔ مقبول کی بھی یہی حالت تھی۔ نہ کتا تھا نہ مالک تھا۔ نہ لینا تھا نہ دینا تھا۔ اسی حالت میں آ کر ویسے ہی کپڑے پہنے پہنے چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ اسے پتا نہیں کہ کب لیٹا، کب سویا، کب جاگا، یا سویا بھی یا تمام رات اسی حالت میں لیٹا رہا۔ صبح نو بجے کے قریب اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ کسی دماغی وسوسے کی بنا پر نہیں بلکہ شاید جسمانی تھکاوٹ سے۔ آنسوؤں سے جب چہرہ تر ہو گیا تو اس کو کچھ ہوش سا آیا۔ تمام واقعات یاد آئے۔ اب اسے دراصل رونا آیا۔ لیکن اس نے اس خیال کو بھی

جھڑک دیا۔ تکیہ منھ پر رکھ کر خود ہی خود گنگنانے لگا۔ گنگناہٹ ہلکے ہلکے گانے میں بدلی اور پھر نہ معلوم کب اور کیوں کر آواز تیز ہوگئی۔ وہ بس یہ ہی دو مصرعے کہہ رہا تھا۔

ایک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آئے
ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

جلے ہوئے دل کی آہیں تھیں، بھیرویں کے سر نہ تھے۔ تڑپتے ہوئے دل کے شعلے تھے، تانیں تھیں۔ وہ خود نہیں گا رہا تھا بلکہ زخمی سینے کا ہر تار لرزاں تھا۔

مقبول اپنے خیال میں کتا بنا کھڑا تھا اور اس کا مالک اس کے سامنے تخت شاہانہ پر بیٹھا تھا۔ مگر یہ کتا اس طرز کا نہ تھا۔ یہ کتا راضی بہ رضا کی حد سے گذر کر شاکی بہ رضا تھا۔ گستاخانہ نالے کر رہا تھا۔

ایک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آئے
ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

کمرے کے دروازے پر آدمیوں کا ٹھٹ تھا۔ اس میں ایک بڈھا انگریز بھی تھا اور وہ گھبرا گھبرا کر لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ دروازہ توڑ ڈالو نہیں تو یہ آدمی ایسے ہی گاتے گاتے مر جائے گا۔ لوگ پتھر بنے اس کا گانا سن رہے تھے۔ آخر جب اس نے دروازے کو بہت جھٹکے دیے تو چٹخنی گر گئی۔ وہ اندر آ گیا۔

وہ بڈھا انگریز اور مقبول ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ دوسرے روز مقبول شرمندہ سا دفتر میں بیٹھا تھا۔ بڈھا انگریز اپنے عہدے سے مستعفی ہو چکا تھا اور اس نے اپنی جگہ مقبول کو دے دی تھی۔ ''میں اس بات سے خوش ہوں کہ اس روز اتفاقاً اس طرف پہنچ گیا اور میں نے اس حالت میں تمھاری جان بچالی۔ اور اس سے زیادہ اس کی خوشی ہے کہ میرے بعد اس کمپنی میں تمھارا ایسا آدمی اس کی سرپرستی کرے گا۔'' بڈھے انگریز نے یہ کہتے ہوئے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کو اپنی کرسی پر بٹھا دیا۔

گڈھا نہیں بھرتا

ناواقف لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ گورنمنٹ کے تمام محکموں میں سب سے عجیب وغریب محکمہ نہر کا ہے۔ لیکن ناظرین اگر اس محکمے کی صرف ان دو خصوصیات پر غور کریں گے تو خود سمجھ جائیں گے۔ اول یہ کہ اس کے علاوہ تمام محکمے ایک دوسرے سے دست وگریباں کی طرح الجھے ہوے ہیں، یہ ایک تنہا الگ ہے۔ نہ اسے کسی اور سے سروکار ہے اور نہ کسی اور محکمے والا اس کے کاموں میں دخل دے سکتا ہے۔ دوئم یہ کہ بقیہ تمام محکمے طرح طرح سے روپیہ حاصل کر کے خزانے میں جمع کرتے ہیں اور یہ خاموش، مسکین صورت، معصوم وضع گروہ روپیہ خزانوں سے نکال کر اطمینان سے خرچ کرتا ہے۔ اب اس محکمے کے بقیہ حالات ناظرین خود تصور کر لیں۔

یہاں ایک ہستی بڑی قابل تعریف عجائبات قدرت میں سے ہوتی ہے (سب اوور سیئر کیسے کہوں، بگڑ جائیں گے) آپ بابو جی ہیں۔ بڑے سیدھے، بڑے نیک۔ خاکساری آپ کا شیوہ ہے، انکساری آپ کی طینت ہے، لیکن وہیں تک یعنی صاحب علاقہ صاحب کے ڈیرے یا بنگلے تک۔ اس سے ہٹ کر آپ ذرا کچھ بھی جاتے ہیں، ذرا تن بھی جاتے ہیں اور ذرا اکڑ بھی جاتے ہیں۔ اور بھئی، اگر ایسے ویسے ہی کہو کہ "ہمری چکیا بلیا بھی بنائے دیو" تو ان کو "گتہ" بھی آجاتا ہے۔ ذرا یہ ہی عادت بری ہے۔ ویسے آدمی بڑے بھلے مانس ہیں۔ صورت تو دیکھو، عینک بھی لگی ہے، داڑھی بھی رکھی ہے، صافہ بھی دھرا ہوا ہے۔ خاکی کوٹ پہنے ہوے ہیں جس کی بڑی بڑی چار جیبیں کاغذوں اور

پاکٹ بکوں سے بھری ہیں۔ ان ہی میں کہیں سوفٹ کا فیتہ بھی ہے، میژر منٹ بک بھی ہے، ہیڈ رسید بک بھی ہے۔ ارے یہ کیوں نہ ہوگی! اپنے ہاتھوں کی دس انگلیوں کے نشان، پیروں کی دس انگلیوں کے نشان، اپنی بیوی کی بھی سب انگلیوں کے اور سالے کی سب انگلیوں کے، ارے ہاں مالی کی بھی سب انگلیوں کے نشان خرچ کر چکے ہیں۔ پچیس تیس روپے کی رسیدیں ابھی اور بنانا ہیں۔ جہاں کوئی ملاقاتی مل گیا، ٭ ٹ کتاب نکالی، کچھ دستخط لیے، کچھ انگوٹھوں اور انگلیوں کے نشان لیے۔ چلو کام بن گیا۔ مزہ ہی مزہ ہے۔

بابو جی بڑے تجربہ کار ہیں۔ دنیا کی اونچ نیچ سب ہی کچھ دیکھنا پڑتی ہے۔ اگر کسی بڑے تعمیر کے کام پر تعیناتی ہوگی تو پھر ٹھیکیدار کا باپ بھی بغیر پانچ روپے سینکڑہ دیے بل نہیں بنوا سکتا۔ اگر چالو نہر پر آ گئے تو بھی دال دلیا نہیں گیا ہے۔ لیکن اگر کہیں کوئی بگڑے دل صاحب علاقہ آ گیا، یا اگر کہیں کسی بالکل ہی چھوٹی چالو نہر پر پہنچ گئے جہاں سال بھر میں لے دے کران کے سرکل میں تین چار سو ہی کا خرچ ہے، تو پھر مصیبت ہی آ جاتی ہے۔ دن کاٹنا مشکل ہو جاتے ہیں۔ تنخواہ تو چالیس روپیہ اور خرچ دو سو روپے مہینے کا۔ بس یہی ہوتا ہے کہ گھر کی پونجی میں سے خرچ ہونے لگتا ہے۔

ایک بابو جی اسی قسم کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے، یعنی ایک چالو نہر پر تھے۔ کوئی نیا کام ان کے ہاں نہیں ہو رہا تھا۔ وہاں سال بھر میں چھ سات سو روپے نہر پر خرچ ہوتے تھے۔ اس میں سے زیادہ سے زیادہ دو تین سو ان کی جیب میں آ سکتے تھے۔ کچھ تو دراصل صَرف ہی کرنا پڑتے تھے۔ پھر اس مرے پر سو درّے یہ تھے کہ ایک سخت قسم کے صاحب علاقہ سر پر تھے۔ یہاں سے یہ لکھتے تھے:

بہ خدمت حضور فیض گنجور جناب صاحب صاحب علاقہ صاحب بہادر حصہ دوئم
نہر گنگ شمالی۔

عرض فدوی یہ ہے کہ کمترین چند مرتبہ عرض داشت کر چکا ہے کہ رجھا مکرونہ میل سات پر بھینسوں نے چل چل کر نہر کی پٹری کو خراب وخستہ کر دیا ہے۔ فدوی کو اجازت دی جائے کہ مذکورہ بالا پٹری کی مرمت کروا دے جس میں کہ تقریباً بارہ سو روپیہ خرچ ہوگا۔

واجب جان کر عرض کیا گیا ہے۔

کمترین فدوی

ل۔م۔ن۔

سب اوورسیئر۔ سرکل نمبر ۵

وہاں سے جواب آتا تھا کہ نہیں، بعد برسات جب سالانہ مرمت ہوگی جب ہی سب ہو جائے گا۔ ناک میں دم تھا۔ اول تو خرچ ہی کرنے نہ دے اور جو اجازت بھی دے تو ایسے کام پر جہاں دراصل خرچ کر دینا پڑتا ہے۔

مگر بابو جی تھے سمجھدار، تجربہ کار، بقول شخصے کچھ عرصہ دم سادھے پڑے رہے۔ آخر وہی ہوا، ایک دم پو بارہ ہو گئے۔ صاحب علاقہ صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ ایک نیا ولایت پلٹ صاحب بہادر آ گیا۔ اب بابو جی نے اطمینان کا سانس لیا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ گاہے بہ گاہے حاضری دیتے رہے، اور معاملات یہیں تک رکے رہے۔ وہ کہیں، ''ول بابو، کیسا ہے؟'' اور وہ ہاتھ جوڑ کر دانت نکال کر کہیں، ''جی حضور، اچھا ہوں۔'' یہاں تک تو ہولیا۔ اب آگے قدم دھرتے بابو جی کا بھی دل دھک دھک کرے۔ ڈریں کہ نیا جناور ابھی ولایت سے چلا آ رہا ہے، کہیں اُچک نہ جائے۔ آخر ایک دن دل کڑا کر کے لکھ مارا کہ نہر کے کنارے ایک گڈھا ہو گیا، اس میں پانی مرتا ہے۔ حکم ہو جائے تو اسے پٹوا دیا جائے۔ وہاں سے جواب آ گیا: ''ہاں۔'' تیسرے ہی دن گڈھا پاٹنے کا پچاس روپے کا بل اپنے سالے کے نام بنا بھجوا دیا۔ لیکن اتنے میں کیا ہوتا۔ خیر، پھر لکھ دیا کہ وہ گڈھا پٹ تو گیا ہے لیکن ابھی پوری طرح نہیں پٹا ہے۔ زیادہ خرچ ہوا جاتا تھا اس لیے رہنے دیا تھا۔ اگر اجازت ہو جائے تو پھر اس پر کام لگا دیا جائے، تقریباً آدھا کام اور باقی ہے۔ اس کی بھی اجازت مل گئی اور سو روپے کا بل بنا کر بھیج دیا۔ لیکن یہ بھی کم تھے۔ موقعے کے منتظر تھے کہ بیس دن بعد اتفاقیہ بارش ہو گئی۔ جھٹ لکھ دیا کہ بارش کی وجہ سے اس گڈھے میں جو نئی مٹی ڈالی تھی بیٹھ گئی ہے، اگر اجازت ہو جائے تو اب تھوڑا سا خرچ اور ہے، اور یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ اس مرتبہ پھر اجازت آ گئی اور دو سو روپیہ کا مٹی ڈلوائی کا بل پھر بن گیا۔ اب کوئی ڈیڑھ مہینہ گذر گیا۔ پیسے پیسے کی حیرانی تھی۔ آخر کچھ عادت سی پڑ گئی تھی۔ صاحب بہادر بھی اجازت

دے دیتے تھے۔ سوچ ساچ کر لکھا کہ اس گڈھے میں کافی روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور اب اس کو پوری طرح سے پاٹے بغیر چھوڑنا اچھا نہیں ہے۔ ایک کونا ابھی باقی ہے، اجازت ہو جائے تو اسے بھی بھر دیا جائے تاکہ ہمیشہ کی تکلیف چلی جائے۔

جواب آیا کہ تم فوراً اپنا جواب تحریری دو کہ کیوں پہلی ہی دفعہ گڈھا نہیں پٹ گیا؟ کیوں دوسری دفعہ بھی کام باقی رہا؟ کیوں تیسری مرتبہ بھی کام باقی رہ گیا؟ کس جگہ اور کس موقعے پر وہ گڈھا ہے؟ کیسے وہ گڈھا پڑا؟ کب وہ گڈھا پڑا؟ ہم سات تاریخ کو تمھارے سرکل کے معائنے کو آتے ہیں۔ تم اپنی سرحد پر ملو۔ ہم گڈھے کو خود دیکھیں گے۔

خط پڑھنے کے بعد کئی روز تک بابو جی کا کھانا پینا اڑ گیا۔ تین دن سوچ بچار میں گذارے۔ چوتھے دن لکھ مارا کہ حضور جب دورے پر تشریف لائیں گے تو فدوی سب باتوں کا جواب دے گا۔ حضور میرا پہلا خط ملاحظہ فرما لیں۔ اور تیسرے دن، تن بہ تقدیر، صاحب بہادر کے معائنے کے واسطے گھوڑی پر بیٹھا اپنی سرحد پر موجود ہو گئے۔ صبح آٹھ بجے سے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اور پھر اس سرے سے لے کر آخری سرے تک پہنچا دیا۔ اسی طرح دن کے بارہ بجے تک کوئی بارہ میل کے سرکل کے کئی چکر کیے۔ راستے بھر تمام گرد و نواح کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ''اس جگہ شکر کی کاشت بہت اچھی ہوتی ہے۔ حضور، یہاں کا زمیندار بڑا سرکش ہے۔ حضور، اگر اس جگہ گول نکل جائے تو یہاں وہاں کی آب پاشی ہو سکتی ہے۔ حضور، اس گاؤں کے پیچھے جھیل ہے۔ چڑیا کا شکار اچھا ہوتا ہے۔ کسی دن آپ شکار پر ضرور تشریف لائیں۔'' دو ایک مرتبہ صاحب نے جھنجھلا کر کہا، ''ول، وہ گڈھا کدھر ہے؟'' ''حضور، بتلاتا ہوں، آگے آئے گا۔'' یہ کہہ کر بابو جی نے ٹال دیا، اور پھر باتوں میں لگا لیا۔ لیکن ایک بجے بھوک سے جھنجھلایا ہوا بھوکا صاحب گھوڑے سے اتر پڑا اور پیر پٹخ پٹخ کر بولا، ''بابو، بولو گڈھا۔ ہم گڈھا مانگتا ہے۔'' ''حضور، باتوں میں بھول گیا۔ واپسی میں بتاؤں گا۔ اب حضور ٹفن کھا لیں۔ خانساماں ٹفن لیے حاضر ہو گیا ہے۔ واپسی میں ضرور بتاؤں گا۔''

تین بجے شام کو واپسی شروع ہوئی، اور اب صاحب بہادر نے ہر میل پر پوچھنا شروع کیا، ''گڈھا کہاں ہے؟'' ''گڈھا آگے ہے۔'' بابو جی اپنی گھوڑی ذرا اور آگے بڑھا کر کہتے۔ جب ایک

میل باقی رہ گیا تو صاحب بہادر غصے سے کانپنے لگے اور بولے، ''بابو گڈھا۔ بابو گڈھا۔ جلدی بولو، گڈھا کہاں ہے؟'' ہاتھ کو بہت زور زور سے گھما کر چیخ چیخ کر ''بابو ہم کو جھوٹ بولا۔ ابھی تم بولے گا گڈھا کدھر ہے۔''

بابو جی کچھ دیر تو سر جھکائے کھڑے رہے، پھر انھوں نے آہستہ سے قمیص اٹھا اور پیٹ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، ''حضور، یہ گڈھا ہے۔ کیا کروں، یہ بھرتا ہی نہیں۔'' صاحب بہادر پہلے تو آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہے، پھر مسکرا کر بولے، ''ول، تم پہلے کیوں نہیں بولا تھا؟ بوت بڑا گڈھا ہے۔ ایسا نہیں بھرے گا۔ اچھا ہم سمجھا۔''

صاحب بہادر سمجھ گئے۔ پوری طرح سمجھ گئے۔ اگر بابو جی کو لڑکی کی شادی کرنا تھی تو صاحب بہادر کو بھی ایک نئی رائفل خریدنا تھی۔ ان کے علاقے میں ایک جگہ نیا پل اور کوٹھی بن رہی تھی۔ دونوں کام تقریباً تیس ہزار کی قیمت کے تھے۔ ان ہی کاموں پر بابو جی کو تبدیل کر دیا گیا۔

حضت وہ تو نکل گئے

میرا اور مسعود کا یہ خیال تھا کہ امتحان کے بعد ہم دونوں دو تین دن اور ٹھہریں گے اور اچھی طرح سے لکھنؤ کی سیر کریں گے۔ لیکن امتحان ختم ہونے سے پہلے ہی پیسے ختم ہو گئے۔ جس دن آخری پرچہ کر کے ہم ہوٹل میں واپس آئے تو واپسی کے ٹکٹوں کے علاوہ تین چار روپے اور باقی تھے۔ ناچار یہ قرار پایا کہ سامان درست کر کے سب تیار کر لیا جائے اور ایک تیز سواری پر بیٹھ کر یہاں کا امام باڑہ، گھنٹہ گھر اور چوک کو ایک نگاہ دیکھ ہی آنا چاہیے۔ پھر آٹھ بجے رات کی گاڑی سے کوچ بول دیا جائے۔ جلدی جلدی سامان درست کر کے ہم دونوں امین آباد ہوٹل سے نیچے اترے۔ پارک کے نکڑ پر یکوں اور تانگوں کا ہجوم تھا۔ اُدھر چلے۔ مسعود سر تھے کہ گھنٹوں کے حساب سے تانگہ ٹھیرالو۔ میں نے ان کو مطلع کیا کہ وہ بے دال کے بودم ہیں۔ اس میں زیادہ خرچ ہو جائے گا، اس لیے فی الحال یکے پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔ اب یکوں میں تلاش شروع ہوئی۔ مسعود صاحب نے ایک یکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں مضبوط اور تندرست جانور جتا ہوا تھا۔ میں نے ان سے انگریزی میں کہا کہ تم میں شئے لطیف کی کمی ہے ورنہ تیز یکہ نہ ڈھونڈتے۔ اول تو یہ کرایہ زیادہ مانگے گا۔ دوسرے آندھی پانی کی طرح گئے اور آندھی پانی کی طرح آئے، اس طرح کہیں سیر ہوتی ہے۔ آخر ایک یکہ مطلب کا مجھے نظر ہی آ گیا۔ مُیار چھوٹا سا ٹٹو، مونڈی نیچے کیے تین ٹانگوں پر حالت مراقبہ میں تھا۔ چھوٹے سے یکے میں ٹھیٹ لکھنوی یکے والے، پٹھے، اس پر چار انچ کی دوپلی ٹوپی، چوڑی دار پائجامہ، انگرکھا پہنے، پیر سکیڑے، گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے، غین بیٹھے تھے۔ میں نے

مسعود کی طرف غرور کے طور سے ہنستے ہوئے کہا، ''دیکھو وہ ہے یکہ جس پر ہم چلیں گے۔''

مسعود بولے، ''مالک اور گھوڑا دونوں افیونی۔'' مجھے بہت برا معلوم ہوا لیکن پھر بھی میں نے تمکنت سے ان کو سمجھا دیا، ''میاں ابھی صاحبزادے ہو، ناسمجھ ہو۔ اینچی نہیں ہیں، یادِ رفتگاں میں غرق ہیں۔ اجڑے ہوئے دربارِ اودھ کی نشانیاں ہیں۔ تم ان کی قدر و منزلت کیا جانو۔'' یہ کہہ کر میں یکے کی طرف بڑھا۔ اب سوچا کہ آواز دوں۔ جگاؤں تو کن لفظوں سے کہ تہذیب سے خالی نہ ہوں، محاورے کے خلاف نہ ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ ڈرتے ڈرتے سوتی ہوئی متبرک ٹھوڑی پر انگلی چھوائی تو یکے والے صاحب اس زور سے اچھل پڑے کہ میں بھی اچھل پڑا۔ یکہ بھی ہل گیا۔ ٹٹو کو بھی کچھ ہوش آ گیا۔ دُم کی چوری کو ایک دفعہ دائیں اور ایک دفعہ بائیں طرف ہلا کر پھر غوطے میں پڑ گیا۔ یکے والے صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر لاحول اس پیاری قرأت سے ادا کی کہ اس میں چار عدد نون غنے شامل کر دیے۔ میں نے داد دی، ''سبحان اللہ! آپ تو اچھے خاصے قاری ہیں۔ مگر اس وقت کی قرأت بے موقع ہے، میں تو انسان ہوں۔'' بڑے میاں بہت بگڑے، ''واں حضت واں! یہ بھیں کوئی انسانیت ہیں کہ اچھیں خاصیں بیٹھے بٹھائیں مرد آدمی کو چوکاں دیاں اور پھر اب فرماتے ہیں کہ لاحول نہ پڑھیں۔ ہم تو دو روپیوں کا آسراں لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ بڑے آئیں آ کے چوکا دیاں۔''

میں نے کہا، ''ارے بھائی اسی واسطے تو چونکا دیا کہ کچھ مزدوری بھی کرو گے کہ سوتے ہی رہو گے؟ اچھا بتاؤ، کتنے گھنٹہ ہوگا۔'' بڑے میاں نے سنبھل کر فرمایا، ''میاں گھنٹے کاں حساب تو فیشن والے تانگوں سے کیجیے۔ آپ کو چلنا کہاں ہے یہ تو فرمائیں۔'' میں نے بتایا کہ ''ہم لوگ پردیسی ہیں، شہر کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ چوک سے ہوتے ہوئے حسین آباد اور آصف الدولہ کا امام باڑہ دیکھتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔'' معلوم ہوا کہ چار کوس کا چکر ہے، لیکن پردیسی ہونے کی وجہ سے ایک ہی روپیہ لے لیا جائے گا۔ میں خوش ہو گیا، لیکن مسعود کا منہ کلکتہ سلیپر کی طرح کھنچا ہی رہا۔ خیر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے یکے والے صاحب کا نام پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ممن صاحب۔ میں نے کہا، ''تو پھر اب چلیے۔'' جواب ملا، ''جیسں تو چلتاں ہوں، آپ لوگ تیار رہیں۔'' میں نے کہا، ''بسم اللہ۔'' ممن صاحب نے پینترا بدل کر فٹ بھر کی لکڑی میں بالشت بھر کا بندھا ہوا تاگا گھوڑی کے کولھوں پر چٹ سے لگایا۔ ''ٹخ ٹخ، چل ں

چل ں'' کا حکم گھوڑی کو دیا۔ اس نے چھ دفعہ سر کو اوپر نیچے کیا جیسے کوئی بڑھیا او کھلی میں موسل چلاتی ہو، اور بس۔ میں نے کہا، ''جانور تو چلتا ہی نہیں۔'' فرمایا، ''چلتیں ہی چلتیں چلے گا۔ منھ کا نوالا تو نہیں ہے۔''

جب آخر گھوڑی چل ہی پڑی تو میں نے پھر نبن صاحب سے گفتگو شروع کی۔ سب ہی طرح انھیں چھیڑا، مگر اللہ کے بندے نے ہاں اور نہیں کے دو جوابوں میں ٹال ٹال دیا۔ کچھ باتیں نہ کیں، خاموش ہی رہے۔ چلتے چلتے ایک اجڑے سے بازار میں جا رہے تھے کہ نبن صاحب بولے: (اب نبن صاحب کی گفتگو بغیر نون غنوں کے لکھی جائے گی تا کہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ ہاں شائقین اگر چاہیں تو خود متواتر غنے نون ملاتے جائیں۔)

نبن صاحب: میاں صاحب زادے، اب دیکھیے میں تو آپ کو لیے ہی چلتا ہوں۔ مزدوری تو میری ہو ہی جائے گی۔ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو مجھے چار آنے دے دیں۔

مسعود: واہ جی واہ، ابھی سے؟ اور بڈھن، کرو گے کیا؟

نبن صاحب: حضور، ذری کے ذری آپ یہیں توقف کریں۔ بندہ دو چھینٹے لگا کر ابھی آتا ہے۔ طبیعت سست ہو رہی ہے۔ چونچالی آ جائے گی۔ پھر دیکھیے، حضور کو کیسی سیر کراتا ہوں۔

مسعود تو نہیں نہیں کرتے ہی رہے، مگر مجھے ترس آیا، پیسے میری ہی جیب میں تھے، نکال کر دے دیے۔ بڑے میاں بولے، ''واللہ! شرافت اسے کہتے ہیں۔ اے میاں سلامت رہیے۔'' یہ کہہ، یکے کو ایک گلی کے پاس چھوڑ، چل دیے۔ آدھ گھنٹہ ہم دونوں نے انتظار کیا۔ اس کے بعد آپ آئے۔ اور اب جو آئے تو نہایت شگفتہ۔ خوب باتیں کرنا شروع کر دیں۔

نبن صاحب: میاں کیا پوچھتے ہیں لکھنؤ کو۔ اب کیا۔ اجڑ گیا۔ نہ وہ زمانہ ہے نہ وہ باتیں ہیں۔ اسی قیصر باغ میں کیا کیا جشن ہوتے تھے۔ کیسے مہ وشوں کے مجمعے رہتے تھے۔ کیا کیا محفلیں ہوتی تھیں۔ اب کیا ہے۔ ان آنکھوں سے وہ زمانہ بھی دیکھا اور میاں یہ بھی دیکھ رہے ہیں۔

مسعود: بڑے میاں، آپ بھی نوابوں میں سے ہیں؟

نبن صاحب: اجی سرکار، کوئی نوابوں ہی پر تھوڑے موقوف ہے۔ ہم نے سب کچھ دیکھ ڈالا۔ ہمارے نوابوں سے بڑھ کر وقت ہو گئے اور گذر گئے۔ جدھر سے ہم نکل جاتے تھے لوگوں کی

نظریں اٹھتی تھیں۔ اب کیا رہا ہے۔ سانسوں کا شمار ہے۔ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ سب چل دیے، ہم رہ گئے۔ نواب مسعود قدر اور پہلکی قدر ہمارے لنگوٹیا یار تھے۔ آج چھ سات برس کا عرصہ ہوا وہ بھی چل دیے۔

مسعود: ارے واہ رے بڈھے! میں تو زندہ بیٹھا ہوں۔ مجھے مارے ڈالتا ہے!

میں: چپ رہو جی، بدتمیزی مت کرو۔ جی نبن صاحب، تو آپ کا وقت بگڑ گیا؟ پہلے آپ رئیس ہوں گے؟

نبن صاحب: اے صاحب، رئیس کیا چیز ہیں۔ دولت ہماری غلام تھی غلام۔ ہم روپے پیسے کی فکر نہ کرتے تھے۔ جوانی کی امنگیں تھیں۔ اس وقت کا خیال نہ تھا۔ خدا طرح طرح سے دیتا تھا اور ہم لٹاتے تھے۔ ایک ہی جلسے میں رات بھر میں سو اشرفیاں اللہ رکھی پر سے نچھاور کر دیں۔ عیش باغ میں ساون کا میلہ۔ ہائے ہائے، نہ پوچھیے۔ ہم دولھا بنے پھرتے تھے۔ لوگ اس کے متمنی ہوتے تھے کہ ہم ان سے بات کریں۔

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

پھر اللہ نے دیا اور پھر مٹا دیا۔ اور پھر دیا اور پھر مٹا دیا۔ اے صاحب، ایک دفعہ آخری موقع پھر ہاتھ آیا۔ مگر نصیبوں کی خرابی سے کچھ نہ رہا۔ لیکن میاں، اب کی دفعہ میرا قصور نہ تھا۔ جو کچھ کیا اغن صاحب نے کیا۔ مٹا دیا اغن صاحب نے۔ اب وہ بھی روتے ہیں اور ہم بھی ہاتھ ملتے ہیں۔ میاں صاحبزادے، مقدر کی خرابی اسے کہتے ہیں۔ ذری سی چوک میں آدمی مارا جاتا ہے۔ کیا جو کچھ تو اغن صاحب نے ہی کیا۔ (ماتھے پر ہاتھ مار کر) افسوس، کاش مجھے معلوم ہوتا! میں کیا جانتا تھا۔ مگر صاحب، چوک مجھ سے بھی ہو گئی۔

مسعود: ارے بھائی کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا ہوا تھا۔

نبن صاحب: جی بتاتا ہوں... لیکن... وہ... میاں ایک چونی اور دے دیجیے۔ میری آدھی مزدوری تو دیکھیے اللہ آپ کا بھلا کرے ہو ہی گئی ہے۔ اور تکلیف نہ ہو تو ذری دیر بیٹھے رہیے۔ میں ابھی ابھی آیا۔

یہ کہہ، چونی اور لے، بڑے میاں پھر یکے سے اتر کر ایک گلی میں چلے گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد پھر تشریف لائے۔ گھوڑی کو بمشکل تمام جب رفتن مصدر کے گیئر میں ڈال دیا تو پھر ہم دونوں نے اصرار کیا کہ ہاں صاحب وہ اغن صاحب نے کیا ستم ڈھایا تھا ہم کو بھی تو معلوم ہو۔

نبن صاحب: اے خضت، نہ پوچھیے، ستم ہی ڈھا دیا، کہیں کا بھی نہ رکھا۔ ورنہ آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ صاحب، قصہ یہ ہے کہ خدا مغفرت کرے استاد فدن صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، اور میں بھی انھیں اسی نظر سے دیکھتا تھا۔ خدا غریق رحمت کرے، بڑے خوبیوں کے آدمی تھے، مگر ذرا سنکی تھے۔ جس بات کی دُھن ہوگئی تو ہوگئی۔ ایک دفعہ جو مچھلی کے شکار کی دھن لگی تو اب طرح طرح کی ڈوریں بندھ گئیں۔ بیسیوں چارے اور جلاب ڈھونڈ ڈھونڈ کر تیار کر لیے۔ انگل انگل بھر کی مچھلیوں سے لے کر دو دو گز کی مچھلیاں پکڑ ڈالیں۔ کیمیا کا شوق ہوا تو سیکڑوں طرح کی جڑی بوٹیاں ڈھونڈ لائے۔ غرضیکہ یہی رہتا تھا۔ کبھی رمالی ہے، کبھی جادو، کبھی عملیات ہیں۔ انھیں باتوں کی وجہ سے ہم لوگ انھیں استاد کہتے تھے۔ یکہ و تنہا رہتے تھے، یہیں آپ کے حسین آباد میں۔ دو کوٹھریاں، ایک دالان تھا۔ اس میں پڑے رہتے تھے۔ عجیب صفتوں کے آدمی تھے سرکار۔ ایک دن دوپہر کو، برسات کا زمانہ تھا، میں ٹہلتا ہوا ان کے پاس چلا گیا۔ خاموش بیٹھے تھے۔ میں بھی جا کر پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کہا، ”کہیے فدن صاحب، آج کل کیا سنک ہے؟“ ذرا تنک مزاج بھی تھے، بگڑ کر بولے، ”سنک ہے سنک... تم سنک ہی سمجھتے ہو؟ سنو تم نے کبھی کشفِ نفس کا عمل بھی سنا ہے؟ کبھی عملِ تقلیدِ خیال بھی سنا ہے؟ عملِ پرواز بھی سنا ہے؟“ میں نے کہا، ”نہیں خضت، میں نے تو ان میں سے کسی کا نام بھی نہیں سنا۔“ بولے، ”پھر کیا بک رہے ہو؟“ میں نے کہا، ”قبلہ کچھ تو بتائیے کہ یہ کیا ہوتے ہیں۔“ ایک قلمی نسخہ پاس رکھا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ کر بولے، ”یہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ دو لفظوں میں تم کو بتا دوں؟ میاں دن چاہییں دن۔ ہفتوں لگ جائیں گے۔“ میں نے کہا، ”اچھا یہ بتائیے کہ ان عملیات سے کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں۔“ بولے، ”فائدے بڑے عجیب عجیب ہیں۔ مثلاً ایک فائدہ یہی ہے کہ انسان اس عمل سے اڑ سکتا ہے۔ تمام خیالات فاسق کو علیحدہ کر کے دل اور دماغ کو رجوع کرنے سے اول تو انسان کا رفتہ رفتہ وزن کم ہوتا ہے اور پھر جس میں جیسی مقدرت اور قدرت ہو، کافی مشق کے بعد اڑنے بھی لگتا ہے۔ وزن تو میں اپنا

زائل کر لیتا ہوں۔ ہاں اڑنے میں ابھی دیر ہے۔ صبح کو ایک انگل کے قریب زمین سے اونچا ہوا تھا۔"
میاں، آپ یقین کیجیے کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ استاد فدن صاحب کو میرا ہنسنا بہت ناگوار ہوا۔ کہنے لگے، "اچھا لے دیکھ!" یہ کہہ میرے سامنے بالکل سیدھے ساکت کھڑے ہو گئے۔ کوئی دس منٹ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تو خود بخود زمین سے اونچے ہونے لگے۔ میں نے جلدی سے چھت کو دیکھا مگر وہاں رسی نہ کچھ۔ کوئی ایک بالشت اٹھ گئے ہوں گے کہ دھم سے پھر نیچے آ گئے۔ مجھے سخت حیرت۔ بڑا پریشان۔ میں نے کہا، "استاد یہ نہیں۔ اب کی پھر اٹھو تو جانیں۔" استاد تاؤ میں پھر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ کوئی دس منٹ کے بعد میاں، یقین جانیے، ان کے پیر تو زمین سے اونچے ہونے لگے۔ قریب ڈیڑھ بالشت کے اونچے ہو کر کوئی ایک سکنڈ وہیں رکے رہے اور پھر دھم سے آئے۔ لیجیے میاں، چوک تو آ گیا۔ گول دروازہ یہی ہے۔ اس کے اندر چوک ہے۔ آپ لوگ جا کر سیر کر آئیں۔ اور میاں اللہ سلامت رکھے، ایک چونی اور دے دیجیے تو میں دو چھینٹے لگا لوں۔

نبن صاحب چھینٹے لگانے چل دیے، اور ہم دونوں اس گندے تنگ بازار میں پچاس ساٹھ قدم جا کر واپس آ گئے اور پھر یکے میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد جو نبن آئے تو مسعود نے کہا، "بس اب واپس۔ آپ ہم کو امین آباد ہی پہنچا دیں۔ سیر تو ہو چکی۔ چھ بج رہے ہیں، آٹھ بجے کی گاڑی سے ہم کو جانا ہے۔" چنانچہ یکہ پھر واپس ہو لیا اور نبن صاحب نے داستان شروع کر دی۔

نبن صاحب: جی حضور، تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ بھول گیا۔

میں: ایک بالشت زمین سے اونچے ہو کر دھم سے پھر زمین پر آ گئے۔

نبن صاحب: جی جی۔ حضور دیکھیں بندے کو کس قدر حیرت اور پریشانی ہوئی ہو گی۔ واللہ! میں تو سکتے کی سی حالت میں رہ گیا۔ آنکھیں ملیں۔ لاحول پڑھی۔ اپنے ہاتھ میں چٹکی لے کر دیکھی کہ کہیں سوتو نہیں رہا ہوں۔ دماغ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا، "استاد، ذرا تسلی کرو۔ میں اپنے ہوش حواس درست کر لوں۔ ذرا نگالی نکالو، چراغ جلاؤ۔" استاد فدن صاحب اٹھے۔ سامان درست کیا۔ دو ایک دم لگا کر میں نے ان سے بھی اصرار کیا کہ بھائی صاحب، آپ بھی دم لگا لیں۔ خدا مغفرت کرے استاد بڑے خوبیوں کے آدمی تھے۔ دوستوں یاروں کی خاطر سامان دلچسپی رکھتے تھے۔ خود زیادہ شوق

نہ تھا۔ دوستوں کے اصرار پر ان کی دل شکنی بھی نہ کرتے تھے، شریک ہو جاتے تھے۔ جب زمانہ بھی اور تھا۔ ہر چیز سستی تھی۔ خدا کی مار اس زمانے پر! سرکار، دو ہی چھینٹے لیتے ہیں اور چونی کٹھیا سی نکل جاتی ہے۔ بندہ پرور، ایک وہ وقت تھے۔ ڈبل کے چار چسکے، اور چائے کی پیالی گھاتے میں۔ اے قبلہ، یہیں گول دروازے میں ننھی بلاقن کی دکان پر ملتے تھے۔

مسعود: (جھلا کر) جہنم میں گئی ننھی بلاقن۔ تمھارے استاد کا کیا حشر ہوا؟

ننھن صاحب: اے ہاں میاں، دیکھیے بات میں بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ تو قبلہ، جب نشے پانی سے چونچال ہو لیے تو ہم نے پھر کہا، ''اچھا استاد، اب سہی۔'' استاد کو بھی مزہ آنے لگا تھا۔ بولے، ''میں تو بھائی بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہوں۔ مشق پر موقوف ہے۔ دماغ کا کام ہے۔ جس قدر دھیان ادھر ہوا اتنا ہی اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔ سب دماغی طاقت کا کام ہے۔ انسان کے ارادے پر منحصر ہے۔ لو دیکھو، اب کی دو فٹ تک اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' استاد فدن صاحب پھر جو سیدھے تانت سے کھڑے ہوئے تو اب کی تو ایک ہی منٹ کے بعد اٹھنے لگے، اور اٹھتے اٹھتے چھت میں جا لگے۔ سر دھنی میں چھو گیا۔ سرکار، اس زمانے کے مکانوں کی چھتیں بھی یونہی سی اونچی ہوتی تھیں۔ ایک منٹ تک فدن صاحب کا سر دھنیوں کے جالوں میں گھسا رہا۔ اس کے بعد ایک دفعہ دھم سے گر ہی تو پڑے۔ اب کی سنبھل نہ سکے، کہنیوں کے بل گرے۔ میں نے لپک کر اٹھایا۔ سر کا جالا چھڑایا۔ کہا، ''بھائی، دم لے لو، اطمینان سے کام کرو۔ واللہ! یہ تو بڑی بات ہاتھ آ گئی ہے۔ دیکھو خدا کو کیا منظور ہے۔'' میں یہی کہہ رہا تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ چوں سے بولا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اغن صاحب سر ڈالے ہیں۔ بولے، ''استاد، کیا ہو رہا ہے؟ میں آؤں؟'' اتنا کہا اور ہنستے ہوئے آ گئے۔ اب کیا کر سکتے تھے۔ دراصل مجھ سے ہی غلطی ہو گئی۔ مجھے پہلے ہی سے کنڈی لگا لینی چاہیے تھی۔ میں نے اغن صاحب سے کہا، ''اچھا اب کنڈی لگائے آؤ۔'' حضرت کو جب سب حال معلوم ہوا، بولے، ''تو بھائی، باندھو سوپ استاد کے شانوں پر۔ ہم بھی دیکھیں کیسے اڑتے ہیں۔'' میں نے کہا، ''پھر وہی سفلوں کی سی باتیں شروع کیں! واللہ اچھا نہ ہوگا۔ یہ موقع دل لگی کا ہے؟ صبر سے بیٹھو، استاد دم لے لیں۔'' اغن صاحب بولے، ''دم تو یارو، میں بھی لگاؤں گا۔ تم لوگ تو رچے ہوئے ہو۔ کوٹھڑی مہک رہی ہے۔'' خیر میاں، دو دو چھینٹے لے لیے۔ ہائے واللہ! استاد کا بھی کیا دم تھا۔ پھر اصرار

کرنے سے شریک ہوگئے۔ تو میاں استاد پھر کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا، ”ٹھیرو، تسلی کرلو۔“ جلدی سے ان کے پیروں کے نیچے ان کا لحاف تو شک لاکر بچھا دیا اور کہا، ”لیجیے استاد اب غم نہیں، چاہے سر کے بل بھی غوطے کیوں نہ ماریے۔“ استاد کو بھی اطمینان ہوگیا۔ پھر چھت میں سر لگا کر تین چار منٹ معلق رہے، اور اگرے۔ میں نے کہا، ”استاد، استادی تو جب ہے کہ آہستہ آہستہ نیچے آیئے۔ یہ بھی کیا کہ ڈھیلے کی طرح بھد سے نیچے آگرے۔ اے جب دماغی قوت اور ارادے ہی پر موقوف ہے تو لگاؤ کدّ و کا زور۔“ استاد نے کہا، ”اچھا۔“ پھر کھڑے ہوگئے۔ اب کی گرے تو نہیں مگر ایسے بھی نیچے نہیں ہوے جیسے کسی کی شرمائی ہوئی نظریں۔ کٹی کنکیا کی طرح اتاتے پتاتے نیچے آگئے۔ میں نے کہا، ”خیر، بسم اللہ بری نہیں ہے۔ پھر کوشش کرو، یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔“ حضور تین چار دفعہ کے بعد اب تو بالکل سہولت سے اترنے لگے۔ اغن صاحب اور میں دونوں دم دلاسا دیتے رہے۔ لیکن صاحب اغن کی وہی نادانی کی باتیں۔ اب سر ہیں استاد کے۔ میں نے کہا، ”نہیں، اب زیادہ پریشان نہ کرو۔ تھک گئے ہوں گے، آرام کرنے دو۔ چلو اب چلیں۔“ میاں میں ان کو اپنے ہی ساتھ گھسیٹ لایا۔ راستے میں لگے اغن صاحب زمین آسمان ملانے۔ کبھی کہیں، ”استاد کو کلکتہ لے چلیں گے۔“ کبھی کہیں، ”ٹکٹ لگائیں گے، بڑے لاٹ کو تماشا دکھائیں گے۔“ میں نے کہا، ”ابھی رسانیت سے کام لو رسانیت سے۔ روپیہ کمانے کے تو اب لاکھوں طریقے ہیں۔ روپیہ تو اب بہا بہا پھرے گا۔ لیکن پہلے استاد کی مشق پوری ہو جانے دو۔ ابھی تو کھڑے ہی اٹھتے ہیں۔ لیٹ کر اٹھنا آجانا چاہیے اور سہولت سے اترنا چاہیے۔ بلکہ اور بھی اچھا یہ ہو کہ پینگ لیتے ہوے نیچے آئیں اور پھر اٹھتے چلے جائیں۔ ایک ہاتھ پھیلا ہوا اور دوسرا سینے پر، یہ معلوم ہو کہ خود تو سو رہے ہیں اور کوئی پینگ دے رہا ہے۔ لیکن دیکھو یار اغن، یہ سب خاک میں مل جائے گا جو ابھی کسی کو بھی اس کی رتی بھر بھی خبر ہوگئی۔ ابھی تو یہ سب راز ہی رہنا چاہیے۔ اور بھائی، آمدنی میں بھی استاد کا حصہ اول رکھنا ہوگا۔ دیکھو تم جلدی نہ کرو۔ سہولت سے کام لو! میں استاد کو راضی کرلوں گا۔ روپے میں چھ آنے ان کے اور پانچ پانچ آنے ہم دونوں کے۔“ اغن صاحب کی عقل میں بات ذرا دیر میں آتی ہے، مگر میاں میرے سمجھانے سے وہ سمجھ گئے۔ دوسرے دن استاد کو میں نے سب اونچ نیچ سمجھائی۔ ہائے کیا معقول آدمی تھے! میاں میری سب باتوں پر راضی ہوگئے۔ اب ہم دونوں نے پھر انھیں مشق کرانی شروع کردی۔ اے حضت، شام تک استاد

لیٹ کر بھی اٹھنے لگے، اور نہایت سہولت سے۔ جیسے وہ لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ زمین سے چھت تک جاتے تھے ویسے ہی آہستہ آہستہ پھر نیچے آجاتے تھے۔ شام تک چھت میں جالوں کا نام نہ رہا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو میں نے کہا، ''لو دن بھر ہو گیا ہے۔ آؤ ٹہل آؤ! بھائی تمھاری صحت بھی تو مقدم ہے۔ میوے والی گلی تک ہو آئیں۔'' میاں یہ سرا بھی ایک خاص اڈا تھا۔ ہاہا! سب مٹ گیا۔ ہاں میاں ہم تینوں چلے۔ مگر میں نے دیکھا کہ استاد کی چال میں کچھ فرق ہے۔ کچھ ایسے چل رہے تھے جیسے... اجی یہ بچوں کے کھیلنے کے ربڑ کے پھکنے ہوتے ہیں نا۔ ان میں ہوا بھر کرا گر لڑھکایا جائے تو وہ اچھلتا اچھلتا لڑھکتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے استاد چل رہے تھے۔ میں نے کہا، ''واہ استاد، کیا بات ہے!'' اب جو صورت دیکھتا ہوں تو پریشان۔ میں نے کہا، ''کچھ بتاؤ تو!'' بولے، ''نہ معلوم کیا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں روئی کا گالا ہو گیا ہوں۔'' میں نے ان کا ہاتھ ٹٹولا۔ ''اماں جاؤ بھی، نہ کہیں۔'' استاد بولے، ''یہ مطلب نہیں ہے۔ مجھے پکڑ کر اٹھاؤ تو۔'' اغن نے دونوں ہاتھ ان کی کمر پر رکھ جو ذری یونہی سا زور لگایا تو کندھوں سے اونچا اٹھا لیا۔ ہیں یہ کیا! میں تو دیکھوں حضت، ان کا تو وزن ہی غائب تھا۔ استاد بولے، ''میں سمجھتا ہوں اگر اُچکوں تو حسین آباد کا امام باڑہ اُچک جاؤں۔'' میں نے کہا، ''خدا کا واسطہ یہ نہ کرنا۔ اول تو گناہ عظیم، اور پھر تمام راز افشا ہو جائے گا۔ میں جادوگر کیسے بنوں گا۔'' خیر میاں، چوک قریب آ گیا تھا، آتے جاتے لوگوں کی نگاہیں پڑتیں، اس لیے ایک طرف سے میں دوسری طرف سے اغن صاحب ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ان کو دبائے ہوئے لے کر چلے۔ وہاں پہنچ کر دو ایک چھینٹے استاد کو بھی لگوا دیے اور اسی طرح ان کو واپس لائے۔ اب میں نے ہزار اغن کو منع کیا مگر نہ مانے۔ استاد کو پھر کچھ دیر مشق کرائی۔ اب استاد لیٹے ہی اونچے ہوں، چھت کے ایک کونے سے پینگ لیتے ہوئے زمین تک آئیں، اور ویسے ہی اٹھتے ہوئے دوسرے کونے میں چلے جائیں۔ خیر میاں، استاد کو لٹا کر ہم لوگ چلے آئے۔ صبح کو مجھے جانے میں دیر ہو گئی۔ چھمی کے ہاتھ میں دنبل نکلا ہوا تھا، اس میں نشتر لگوانے انھیں شاہ مینا کے اسپتال لے گیا۔ جب یہاں سے فارغ ہو کر استاد کے مکان پر پہنچا تو اغن صاحب دروازے پر کھڑے۔ منھ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے کہا، ''خیر تو ہے؟'' کہا، ''غضب ہو گیا!'' میں نے کہا، ''اماں کچھ تو کہو۔'' بولے، ''کچھ نہ پوچھو۔'' ''اے بھائی بتاؤ تو سہی! اماں استاد کیسے ہیں؟'' میاں یقین مانیے کہ اغن کے آنسو نکل پڑے۔ بولے،''

اندر چل کر دیکھ لو۔" میرا دل دھک سے ہوگیا۔ اندر گیا۔ استاد اچھے خاصے چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ ہاں صورت متفکر تھی، اور ان کی گود میں سل رکھی تھی۔ میاں میں اغن کی طرح تو ہوں نہیں۔ میں جا کر اطمینان سے ان کے پاس مونڈھے پر بیٹھ گیا اور پوچھا، "کہیے استاد، کیا حال ہے؟" استاد کچھ دیر تو بولے نہیں، پھر کہا، "بات یہ ہے کہ ارادے کی قوت ضرورت سے زیادہ صرف کردی۔ میرا وزن گھٹتے گھٹتے بالکل ہی غائب ہو کر اب نفی کی طرح رجوع ہے۔ رات بھر پلنگ پر پیٹھ نہیں لگی۔ وہ تو کہو لحاف میرا بھاری ہے۔ ساری رات اسی سے چپکا رہا۔ صبح رفع حاجت کے واسطے اٹھا تو چھت میں جا لگا۔ جب یہ آئے اور انھوں نے پیر پکڑ کر کھینچے تو نیچے آیا۔ بچارے نے پیشاب پیخانہ کرایا، منھ دھلایا۔ اب اس سل سے دبا بیٹھا ہوں۔" حضور یہ سب سن کر فکر تو مجھے بھی ہوگئی، مگر میں اپنے کو تھامے رہا۔ کچھ غور و فکر کے بعد میں نے اغن کی طرف دیکھ کر کہا، "کیوں میاں، ہو نہ صاحبزادے! تم استاد کو ہولا ہولا کر مار ہی ڈالتے۔ اللہ نے خیر کرلی جو میں جلدی آگیا۔" میں نے استاد کو دلاسا دیا، "آپ پریشان نہ ہوں۔" حضور، میں ان کے جوتے لے کر چوک گیا۔ ایک موچی کو دونی تھمائی اور موٹے موٹے سیسے کے سول چڑھوا کر لے آیا۔ جوتے استاد کو دیے۔ کہا، "لو پہنو۔ چلو پھرو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہاں اب الٹی مشق کرنا پڑے گی۔" استاد جوتے پہن کر خوش تو ہوگئے لیکن ان کے دل پر جیسے وحشت سی چھا گئی۔ دماغ کا کام تھا۔ ارادے کی قوت لگانا تھی۔ وہاں ان کی طبیعت اچاٹ۔ کمر میں رسی بندھی ہے، چھت میں چمٹے ہیں۔ ہم دونوں ان کو نیچے سے ڈھارس دے رہے ہیں۔ "ہاں بھائی فدن صاحب، لگاؤ اپنے ارادے کا زور اور اترو نیچے!" وہ ایک دو انچ نیچے آتے ہیں اور پھر چھت میں جا چپکتے ہیں۔ آخر میں نے اغن کو اشارہ کیا کہ تم چپ رہو۔ استاد کو ڈوری پکڑ کر نیچے گھسیٹا، کہا، "بیٹھو، جوتے پہن لو۔ دو ایک چھینٹے لے لو۔ گھبراتے کیوں ہو؟ کون سا غضب ہوگیا؟ اماں پہلے اوپر کو زور لگاتے تھے، اب نیچے کو لگانا ہے۔ بات تو وہی ہے۔ قوت ارادہ ہاتھ سے نہ جانے دو۔" استاد نے کہا، "مجھے نیند آرہی ہے، سوؤں گا۔" میں نے کہا، "کیا حرج ہے۔" ان کے پلنگ کے نیچے بستر کو ستلیوں سے تان دیا اور استاد کو لٹا دیا۔ استاد اس کے نیچے چپک گئے۔ اب میں نے پھر اغن صاحب کو سمجھایا کہ "دیکھو بھائی، استاد پریشان ہیں۔ ان کا دل بہلاؤ۔ تفریح کراؤ۔ جلدی نہ کرو۔ اب الٹی مشق کروانا ہے۔ ان کا دل و دماغ حاضر ہونے دو۔" سہ پہر کو استاد کو جگایا، منھ ہاتھ

دھلائے۔ چار چھ چھینٹے ہم دونوں نے لگائے۔ استاد کو بھی دو تین چھینٹے لگوا دیے۔ پھر ان کو لے کر گول دروازے ہوتے ہوئے میوے والی سرائے گئے۔ پرانے دوست احباب کا مجمع تھا۔ بات چیت میں دل بہلا۔ استاد گو عادی نہ تھے، یہاں افیون نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی تھی، خوب گولیاں اڑائیں۔ شرابور ہو گئے۔ ان کا غم غلط ہوتا دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی۔ اب ہم تینوں پھر چلے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ دوسری تاریخ کا چاند تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی تھی۔ یہ ٹھیری کہ گومتی کے کنارے سیر کی جائے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی۔ استاد کی طبیعت تو سنکی ہی تھی، سنک آ گئی۔ ''میں تو سوؤں گا۔'' نشے کے ایسے زیادہ عادی بھی نہ تھے، ان کا کہنا بھی بے جا نہ تھا۔ مگر وہاں ہم ان کو کہاں سلاتے۔ ہزار سمجھایا گیا مگر نہ مانے۔ وہاں شاہی کے پرانے گرے پڑے خالی مکان تھے۔ اُستاد ایک کو دیکھ کر بولے، ''میں تو یہاں سوؤں گا۔'' نہ مانے۔ خیر، میں نے جیب سے رسی نکالی، استاد کی کمر میں باندھی۔ جوتے اتارے۔ ان کو ڈیڑھ دو گز اونچا کر کے رسی اغن صاحب کو دی کہ پیر کے نیچے دبا لیں۔ ہم دونوں اکڑوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں استاد سو گئے۔ میں نے اغن سے کہا، ''دیکھو، استاد کی ضد ہے۔ خیر یونہی سہی۔ لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ نہ سونے دیں گے۔'' میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح کا شامیانہ ہونا چاہیے۔ کرسیاں بنچیں کیسی ہوں۔ ٹکٹ درجہ اول دس ہزار روپے کا ہو کہ زیادہ کا۔ اور ادھر اغن صاحب خود پینک میں آ کر مجھ پر لڑھک پڑے۔ میں بھی چونک پڑا۔ بولے، ''اے ہے، رسی چھوٹ گئی۔'' میں نے کہا، ''واللہ تم بھی عجیب انسان ہو۔ فدن صاحب اگر جاگ پڑے اور برسوں کی پرانی چھت اور جالوں میں اپنے کو چمٹا ہوا پایا، بہت بگڑیں گے۔ یہ کیا کیا!'' میاں امین آباد آ گیا۔

ہم دونوں چونک پڑے۔ واقعی امین آباد آ گیا تھا۔ ہوٹل سامنے تھا۔ مسعود نے گھڑی جو دیکھی بوکھلا گئے۔ ''یار پونے آٹھ ہو گئے۔ بڑے میاں یہاں سے اسٹیشن کا راستہ کتنی دیر کا ہے؟''

''اے حضور، دس منٹ کا راستہ ہے، بات کرتے میں تو اسٹیشن آتا ہے۔''

مسعود: اچھا تو ہم کو اسٹیشن تک اور چھوڑ دو۔ وہ سامنے ہوٹل میں سامان ہے ہم ابھی رکھ لیتے ہیں۔

''اے حضور مجھے کب انکار ہے۔ میں خدمت کے واسطے حاضر ہوں۔ پر میاں، برا نہ مانیے

گا۔ یہاں تک کی مزدوری میں وہ چونی اور باقی ہے، وہ بھی دے دیجیے۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔ آپ اسباب رکھیں اور میں ابھی آیا۔'' مسعود صاحب بولے، ''دے دو بھائی۔'' دو سوٹ کیس دو بستر رکھنے کے بعد چھ چھ انچ جگہ ہم دونوں کو بھی مل گئی۔ اس پر بیٹھ کر آدھ گھنٹہ انتظار کیا۔ اب پھر چل دیے۔ تھوڑی دیر صبر کے بعد مسعود نے کہا، ''ہاں بڑے میاں صاحب، پھر کیا ہوا؟'' بڑے میاں پھر خاموشی کے ساتھ بولے، ''پھر کیا ہوتا۔''

مسعود: آخر...

بڈھا: بس اب اپنے نصیبوں کو روتے ہیں۔

مسعود: ارے ظالم! تو ہوا کیا؟

بڈھا: (بڑی لمبی سانس لے کر) ہوتا کیا، اس کوٹھڑی میں چھت ہی نہ تھی۔ اندھیرے میں لٹکی ہوئی رسی ٹٹولی، نہ ملی تو دیا سلائی جلائی۔ استاد فدن صاحب کہاں۔ اے حضت وہ تو نکل گئے۔

گیارہ بجے رات کو تیسرے درجے کے مسافر خانے میں سوٹ کیسوں پر بستر رکھے دونوں اپنے اپنے اڈوں پر چڑھے ہوئے صبح کے انتظار میں بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے مسعود سے کہا، ''یار اب تو صبح اسی طرح کرنی ہے۔ پھر سوچ کس بات کی ہے؟'' مسعود پہلے تو خاموش رہے پھر میری طرف غور سے دیکھ کر بولے:

''کیوں جی، استاد فدن صاحب اب بھی چلے جا رہے ہوں گے؟ نہ معلوم کہاں تک چلے گئے ہوں گے۔ نہ معلوم کب تک چلے جائیں گے۔''

فنا

شہر بریلی کے عزت نگر اسٹیشن کے تیسرے کوارٹر کی انگنائی میں تین پلنگ بچھے ہیں۔ ایک پر ایک دس برس کی لڑکی لیٹی ہے۔ دوسرے پر اس کی ماں اور پانچ برس کا اس کا بھائی لیٹا ہے۔ تیسرا پلنگ ابھی خالی ہے۔ تار بابو جی اسٹیشن پر ہی ہیں، کچھ دیر میں آئیں گے۔ گرمی کا موسم ہے۔ رات کے نو بجے ہیں۔ دسویں تاریخ کا چاند قریب قریب سر پر چمک رہا ہے۔

''اماں، چاند میں کون ہے؟'' لڑکے نے چت لیٹے لیٹے چاند کو دیکھ کر پوچھا۔

ماں: اس میں بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔

لڑکی نے چاند کو دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا، ''اور اماں، اس کے پاس بکری بھی تو بندھی ہے۔''

لڑکا: نہ کہیں، نہ کہیں۔ کہاں ہے اماں؟ مجھ کو تو نہ بڑھیا دکھائی دیتی ہے نہ بکری۔ (ماں کو جھنجھوڑ کر) بتائیے کہاں ہے اماں؟ آپا تو کہا کرتی تھیں سب جھوٹ ہے۔ ان کی کتاب میں تو لکھا ہے چاند میں بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔ اماں آپا کب آئیں گی؟ اللہ ان کو بلا لیجیے۔

ماں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا، ''ہاں میاں، بلا لوں گی۔''

لڑکی: اماں، دولھا بھائی تو کہہ گئے تھے جلدی لے آئیں گے۔ اب پھر کیوں عید پر لانے کو لکھا ہے؟ عید کو تو بہت دن ہیں۔ نہ معلوم عید کب آئے گی۔

قادر بابو مرلی دھر اسٹیشن ماسٹر کو گالیاں دیتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ لڑکی اور بیوی اٹھ

بیٹھیں۔ قادر بابو نے بیوی کو مخاطب ہو کر سنانا شروع کیا، ''دیکھا سُور پنا؟ کیسا متعصب ہے! مگر آج تو بیٹا کی طبیعت جھک ہو گئی ہو گی۔ میں نے بھی سب معاملہ صاف صاف بتا دیا۔ ان کے ہاتھ کا کاغذ صاحب کو پیش کر دیا۔ صاحب نے پھر جو ڈانٹنا شروع کیا، کوئی کسر تھوڑی رکھی۔ اب تو معاملہ ئی ایس تک جائے گا۔''

لندن سے سات میل پر نیوشائر روڈ پر ڈاکٹر بیکر اپنی ذاتی وسیع لیبوریٹری میں، جو کہ انھوں نے اپنے موروثی مکان میں چند نئے کمرے تعمیر کروا کر قائم کی ہے، بڑی دیر سے بیٹھے ایک قسم کے جراثیم کا معائنہ ایک خردبین سے کر رہے ہیں۔ ویسے تو بہت سے سلائڈ پاس رکھے ہیں، لیکن اس سلائڈ پر ان کی خاص توجہ ہے۔ ان دونوں کو بار بار ایک ایک کر کے دیکھتے ہیں۔ ٹھڈّی کو الٹے ہاتھ کی چٹکی سے پکڑا ہوا ہے۔ گہری سوچ میں بیٹھ جاتے ہیں، اور پھر چونک کر ان سلائڈوں کو ایک ایک کر کے خردبین کے نیچے لگا کر دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف ایک نوٹ بک کھلی رکھی ہے۔ کبھی کبھی اس پر کچھ یادداشت بھی لکھ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر بیکر خردبین لگائے بیٹھے تھے کہ لیبوریٹری کا دروازہ زور سے کھلا اور ان کی انیس برس کی اکلوتی بیٹی تیزی سے اندر داخل ہوئی اور اندر آ کر باپ کے کندھے کو جنبش دے کر غصے اور غم کے لہجے میں بولی:

''پاپا، اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں نہ آتی۔ میں نے صبح بھی تم کو یاد دلایا تھا، آج میری سالگرہ ہے، مگر تم کو مطلق پروا نہیں۔ دیکھو، مہمان آدھے سے زیادہ آ گئے ہیں اور تم نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے۔'' باپ نے سر اٹھا کر لڑکی کو دیکھا تو اس کے آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ فوراً کھڑا ہو گیا اور لڑکی کو پیار کر کے بولا:

''پیاری بیٹی نے، معاف کرنا۔ تم چلو، میں ابھی کپڑے بدل کر آتا ہوں۔''

نے باپ سے رخصت ہو کر جیسے ہی پھر ہال میں گئی تو کیپٹن آرتھر کا موٹر آ کر رکا۔ نے کا دل بانسوں اچھلنے لگا۔ اس کو آرتھر سے محبت تھی اور ایسی کہ اب اس محبت کا چھپانا اس کے واسطے بڑا مشکل کام ہو گیا تھا۔ اس لیے یہ چاہتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اس کا اور آرتھر کا سامنا نہ ہو۔ مہمانوں میں

سے دو چار آرتھر کے استقبال کو باہر نکلے۔ فے بھی ان کے پیچھے پیچھے ساتھ چلی۔

ملک عرب میں طائف کے پہاڑی سلسلے کے مشرق کی طرف طائف سے اسی میل کے فاصلے پر لق ودق ریگستان کے بیچ، دس بارہ کھجوروں کے درختوں کے درمیان، ایک پرانے کنویں کے کنارے، چار اونٹ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہیں زمین پر ایک عورت، دو بچے اور ایک بڈھا بیٹھا ہوا ہے۔ ایک جوان بدّو بارہ فٹ گہرے کنویں میں گھسا ہوا ایک کپڑے کو کنویں کی کیچڑ میں تر کر کر کے اس میں کا پانی چمڑے کی چھوٹی سی مشک میں ٹپکا رہا ہے۔ ہر دو منٹ کے بعد عورت آواز دیتی ہے، ''یا حامد کے باپ! جلدی کر، اب دیر نہ کر!'' اور ہر آواز پر بچے سہم کر ماں سے چمٹ جاتے ہیں، لیکن حامد کا باپ اطمینان سے کیچڑ میں کھڑا کپڑے میں کیچڑ کا پانی جذب کرتا ہے اور پھر اسے مشک میں نچوڑ لیتا ہے۔ دفعتاً افق مغرب سے ہلکا سا گرد و غبار نمودار ہوتا ہے۔ بڈھا، جو کہ برابر مغرب اور شمال مغرب کی طرف نگاہیں گڑائے ہوئے تھا، کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

''اے میرے بیٹے، سعودی آگئے ہیں۔ میں نے ان کا اڑتا ہوا گرد و غبار دیکھا ہے۔'' بدّو فوراً کنویں سے باہر نکل آیا۔ مشک کو ایک اونٹ کے کجاوے سے لٹکا کر جلدی جلدی عورت اور بچوں کو ایک اونٹ پر سوار کرتا ہے، دوسرے پر بڈھے کو، اور ایک پر خود سوار ہو کر چاروں اونٹ بھگاتا ہوا دور مشرق کی طرف ریتے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ مغرب کی سمت سے غبار برابر آگے بڑھتا چلا آتا ہے۔ اب غبار میں چند سوار نظر آتے ہیں۔ آندھی کی طرح یہ لوگ بڑھتے بڑھتے ان ہی کھجوروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ آٹھ بندوقوں سے مسلح سعودی عرب ہیں۔ گھوڑے اور سوار سب پسینے سے شرابور ہیں۔ جس وقت یہ کنویں کے پاس پہنچتے ہیں، ان میں سے ایک بولا، ''اے ہمارے افسر، ثامن بن حارث کے اونٹ تیز نہیں ہیں۔ ہمارے گھوڑوں سے بچ کر اب وہ نہیں بھاگ سکتا۔ اس لیے کیوں نہ ہم اتر کر اس کنویں سے اپنی اور گھوڑوں کی پیاس بجھالیں۔ گھوڑے بے حال ہو رہے ہیں۔''

ان سواروں کے نوجوان افسر نے حکم دیا، ''اچھا، اگر میرے ساتھی تیری یہی خوشی ہے تو مجھے بھی منظور ہے۔ تیری تدبیر بہتر ہے۔''

سب نے اپنے گھوڑوں کی باگیں تان دیں اور ہانپتے ہوئے گھوڑے کھجوروں کے اردگرد کھڑے ہوگئے۔ سب سوار اتر پڑے۔ لیکن جیسے ہی ان میں سے ایک کنویں کے کنارے گیا، اس نے آواز دی، ''یہ کنواں قریب قریب خشک ہے۔ اس میں کیچڑ ہی کیچڑ ہے جس میں سے پیاس بجھانے میں بہت وقت خراب ہوگا۔ بہتر ہے ہم لوگ چل دیں۔ اپنا کام سرانجام دینے کے بعد واپسی میں یہاں ٹھہر کر دیکھا جائے گا۔'' چنانچہ پھر سب سعودی گھوڑوں پر سوار ہوکر گرد اڑاتے ثامن بن حارث کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔

جرمنی کا کونسل جنرل ہیزن برگ، ایک سن رسیدہ، جہاں دیدہ، پرانا سپاہی، شنگھائی کی بندرگاہ میں جرمن کونسل بلڈنگ کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا دو جرمن انجینئروں سے، جو کہ ملاحوں کا لباس پہنے ہیں، بہت اطمینان اور مسرت سے باتیں کر رہا ہے۔

تینوں کے آگے پورٹ وائن کے گلاس رکھے ہیں جس میں سے وہ لوگ برابر مزے لے لے کر چسکیاں بھرتے جاتے ہیں۔ دو سگار کے بکس بھی میز پر رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک بکس پر ہیزن برگ ہاتھ رکھ کر بولا، ''سینگر ہاسن! دیکھو ان نقشوں میں اور جو پہلے مہیا ہوئے تھے، بڑا فرق ہے۔ تم نے دیکھا، دراصل ضرورت ان کی تھی۔ برجر، مجھے خوشی ہے کہ تم کامیاب ہوئے، اور اگر تم بھی یہ نقشے حاصل نہ کرسکتے تو پھر میرے خیال میں کوئی اور اس کام کو سرانجام نہ دے سکتا۔''

برجر نے وائن کا گلاس میز پر رکھ کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور پھر ہنستے ہوئے کرسی کو کھینچ پیچھے کی طرف جھکا کر، چھت کی طرف منہ کرکے سگریٹ کا دھواں ہلکے ہلکے اڑانے لگا۔ یہ اس کا خاص انداز ہے، اور بجائے گفتگو میں شامل ہونے کے اور جواب دینے کے یہ بار بار ایسا ہی کرتا ہے۔

سینگر ہاسن نے مزید وائن اپنے گلاس میں انڈیلتے ہوئے جواب دیا، ''ہاں، ان نقشوں کا حاصل کرنا ضرور بہت دشوار کام تھا۔ کیا یہ بھی آپ معلوم کرسکتے ہیں کہ اس طرز کے کتنے طیارے جاپان نے تیار کرلیے ہیں؟ مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے کارخانوں کو فی الحال کام کی کثرت سے سخت دشواریاں اٹھانی پڑیں گی۔ اچھا، ربر کے معاہدے کا کیا ہوا؟''

هیزن برگ: میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں جرمن قوم کا اقتدار ہرگز ہرگز ضائع نہ ہونے دوں گا۔ اب دنیا کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ جرمن ایک زندہ قوم ہے، اور ہمیشہ رہے گی۔ تم کو یاد ہے کہ جاوا کے معاملے میں میں نے کس قدر سختی سے کام لیا تھا۔

سینگر ہاسن: ہاں، لیکن یہ معاملہ جاپان کے ساتھ ہے۔ مجھے کم امید ہے کہ یہاں ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی تم کو کامیابی آسانی سے ہو سکتی ہے۔

ہیزن برگ نے جوش میں آ کر گلاس میز پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں میز پر پٹک کر جواب دیا، ''جرمنی کے ارادے اٹل ہیں۔ اس کی کامیابی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ تم کو معلوم ہے، ضرورت کے وقت کے واسطے ہم نے کیا کیا انتظام کر رکھے ہیں؟ (برجر کی طرف غور سے دیکھ کر) برجر جانتا ہے۔ کیوں برجر، ہم تیار ہیں؟'' برجر نے پھر ایک دفعہ ہنس کر کرسی کو پیچھے کی طرف جھکا لیا، اور منھ اونچا کر کے سگریٹ کا دھواں آہستہ آہستہ نکالنے لگا۔

عزت نگر اسٹیشن پر کے پلیٹ فارم پر مرلی دھر بابو اور چار بابو کھڑے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ قادر بابو اکیلے تار گھر کی کھڑکی میں، دونوں کہنیوں پر ٹھڈی ٹیکے، خاموش بیٹھے ان کی باتیں سن رہے ہیں کہ تیسری دفعہ پھر ان کا پانچ برس کا لڑکا تاگا بندھا ہوا ٹین کا ٹکڑا کھڑ کھڑاتا گھسیٹتا ہوا بلانے آیا۔ ''چلو، اماں جلدی بلاتی ہیں۔'' ''جاؤ میں ابھی آیا،'' قادر بابو نے فوراً جواب دیا۔

ایک بابو: یارو، کچھ ہو یارو، دنیا میں جگہ کی کمی تھی۔ جگہ تو اب بہت سی ہو جائے گی۔ اب پھیل پھیل کر رہیں گے۔ بھئی اس تارے میں دس بیگھے زمین پر میں بھی اپنا قبضہ جما لوں گا۔

دوسرا بابو: کیوں جی، اگر اس میں بھی آدمی ہوئے تو نہ معلوم کیسے ہوں گے؟

تیسرا بابو: ارے یار، سنو سنو، جب وہ تارا آ ملے گا تو پل بنائے جائیں گے اور اس پر بھی سیکڑوں میل کی ریل بچھائی جائے گی۔ اسٹاف کی ایک دم ضرورت ہو گی۔ میں بھی اپلائی کر دوں گا ڈی ٹی ایس کی جگہ کے لیے۔ جی یاد ہے، بصرہ ریلوے پر جب مانگ آئی ہے؟ کیسی کیسی اچھی جگاہیں لوگوں کو ملیں گی۔

چوتھا بابو: (یہ بابو انٹرمیڈیٹ سائنس تک پڑھے ہوے ہیں) اے واہ، کیا کہنا! یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انجن کے پیچھے آہستہ سے ٹنڈر جوڑ دیا، ایسے ہی مزے سے یہ تارا بھی دنیا کی دم میں چپکا دیا جائے گا۔ تارا اور دنیا دونوں کی ایسی ٹکر ہوگی کہ دونوں کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ کیا کوئی آدمی بھی بچ رہے گا؟

دوسرا بابو: اچھا؟ پھر جب سب ہی کو مرنا ہے تو کیا غم ہے۔

مرلی دھر: وید کے انوسار سب کچھ ہی ہو سکتا ہے اور سب جھوٹ ہے۔ یہ سنسار پرتھم سے یوں ہی چلا آتا ہے اور یوں ہی چلا جائے گا۔

قادر بابو کا لڑکا پھر آیا اور اب کے اس نے ٹین کے ٹکڑے کو گھما گھما کر ایک کھمبے پر مارنا شروع کیا جس سے کہ کافی کھڑکھڑاہٹ ہونے لگی۔ آخر قادر بابو اٹھ کر کوارٹر کی طرف چلے۔ ان میں سے کسی بابو نے کن انکھیوں سے قادر بابو کو جاتے ہوے دیکھا اور مسکراتے ہوے کہا، ''میاں جی، بہت پریشان ہیں۔'' ''آج کا سماچار کیا لکھتا ہے؟ چلو، اخباروں کی بکری تو خوب بڑھ گئی۔''

جب قادر بابو گھر میں پہنچے تو ان کی بیوی نے روہانسی آواز میں کہا، ''بھئی خدا کے واسطے، بتاؤ کیا افواہیں اڑ رہی ہیں؟ میں تو دو دن سے سن سن کر دوانی ہوئی جاتی ہوں۔ ابھی پڑوسن آئی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ اخبار والا تو کہتا ہے کہ بڑا غضب ہونے والا ہے۔ (آنسو پونچھتے ہوے) بھئی تم میری لڑکی کو تو بلا دو، سب ایک جگہ تو ہو جائیں۔ سسرال میں تو کوئی اس کا ہاتھ بھی نہیں پکڑے گا۔''

قادر بابو: اور یہاں تم ہاتھ پکڑے رہوگی؟

بیوی: (کھسیانی ہنسی ہنس کر) ارے ہوگا۔ مریں تو سب ساتھ ہی مریں۔ خیر اس سب کو جانے دو۔ تم جا کر میری لڑکی کو لے آؤ۔

قادر بابو: تم بھی بالکل پاگل ہو۔ میں کئی دفعہ تم کو سمجھا چکا ہوں کہ ایسی افواہیں نہ معلوم کتنی دفعہ اخباروں میں نکل چکی ہیں۔ ابھی قیامت کہاں؟ نہ حضرت عیسیٰ آئے، نہ کانا دجال پیدا ہوا، قیامت آگئی؟ ایک دفعہ اور ہوا تھا۔ میری عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی جب بھی یہ غل مچا تھا کہ ایک تارا آرہا ہے۔ زمین سے ٹکرائے گا اور دونوں پاش پاش ہو جائیں گے۔ پھر کچھ بھی نہ ہوا۔ یہ تو انگریزوں کی اڑائی ہوئی

باتیں ہیں۔ ہندوستانیوں کو بہکاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں بہادر ہیں یا بزدل۔

بیوی: (رو کر) اچھا، ہوگا۔ بھئی تم میری لڑکی کو لے آؤ۔ اوئی، تین مہینے ہو گئے۔ لوگوں کے یہاں چالے ہوتے ہیں۔ یہاں لڑکی کو جو سسرال میں پنچا اس کے بعد بلانے کا نام ہی نہیں۔ اے بلانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم جا کر نہ لاؤ گے وہ لوگ خود سے نہ بھیجیں گے۔

''تھری او فائیو سیون!'' فے نے پھر جھنجلا کر ٹیلیفون پر کہا، ''ہاں ہاں، ۳۰۵۷۔'' تھوڑی خاموشی کے بعد گھنٹی بجی۔ فے نے کہا، ''ہلو، کون؟ کیپٹن آرتھر سے بات کرنا ہے۔ اچھا، ٹھیرو،'' فوراً پنسل اٹھا کر ٹیلی فون ڈائرکٹری اپنی طرف گھسیٹ کر کہا۔ نمبر ڈبلیو ۳۴۷۶ کہتی گئی اور کاغذ پر لکھتی گئی۔ اس کے بعد پھر اس نمبر پر ٹیلی فون کو ملایا۔ ''کون ہے؟ دیکھو کیپٹن آرتھر کو ملا دو۔'' پانچ منٹ کے انتظار کے بعد ہلو کی آواز دوسری طرف سے آئی جسے کہ فے فوراً پہچان گئی۔ ''کیپٹن آرتھر، کیا تم مشغول ہو؟''

''ہاں بہت! ناچ گھر بھرا ہوا ہے اور بہت زور کا ناچ ہو رہا ہے۔ ہم سب بالکل اپنے کو بھولے ہوئے ہیں۔ ناچ اور گانے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ یہ بھی یادگار رہے گی۔ کہو کیا کہتی ہو؟''

فے: میں بالکل تنہا ہوں اور دل گھبرا رہا ہے۔

ٹیلی فون: ایسی حالت میں تم کو فوراً یہاں آ جانا چاہیے۔ اگر دنیا تباہ ہی ہونی ہے تو پھر کیوں نہ زندگی کا لطف دل بھر کر اٹھا لیا جائے۔ ورنہ یہ زمانہ بھی یادگار رہے گا۔

فے: تمھارے ساتھ میں کوئی ہے؟

ٹیلی فون: ہاں، تمھاری ایسی ڈرپوک دو لڑکیاں اور ہیں جو کہ میری مہمان ہیں۔ ویسے تو سارا ہال بھرا ہوا ہے۔ تم بھی آ جاؤ۔

فے خاموش ہو گئی تو پھر آرتھر نے تقاضا کرنا شروع کر دیا۔ ''بولو۔ بولو۔ جواب دو، آتی ہو؟''

فے: تم آ کر مجھے لے جاؤ۔ میرا شوفر نہیں ہے اور اس وقت خود موٹر چلانے کی ہمت نہیں ہے۔

ٹیلی فون پر ہنسنے کی آواز آئی۔ ''اچھا، اچھا۔ تیار رہو، آتا ہوں۔'' ٹیلی فون رکھنے کے بعد فے برآمدے میں آ کر ٹہلنے لگی۔ چڑیا کے پنجرے کے پاس سے گذری تو اس کے پاس دانہ کم نظر آیا۔ تھوڑا

سادانہ ڈبے سے نکال کر اس میں ڈالا اور پھر ٹہلنے لگی۔ دس بارہ منٹ گذرے ہوں گے کہ ایک موٹر پھاٹک میں گھسا۔ اس کو تعجب ہوا کہ آرتھر بہت جلد آ گیا، لیکن جیسے ہی موٹر قریب آیا، معلوم ہوا آرتھر کا نہیں ہے، کوئی اور بیٹھا ہے۔ اب جو غور کیا تو اس کے باپ کا پرانا دوست پروفیسر مک لیگن اس میں سوار تھا۔ یہ فوراً آگے بڑھی۔ جیسے ہی موٹر رکا اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا، ''گڈ ایوننگ پروفیسر۔ آپ نے تو تمام دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ سب سے پہلے آپ نے تارے کے آنے کی خبر دی۔ اور اب بھی آپ کے بیانات برابر شائع ہو رہے ہیں۔''

مک لیگن: ہاں پیاری بیٹی فے، مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی۔ مجھے خاموش ہی رہنا تھا۔ کم سے کم دس پندرہ دن تو اور دنیا والے بے خبر رہتے اور پھر تو سیکڑوں اسٹرانومسٹ خود ہی دیکھ لیتے۔ یہ خبر پھیلتی جب بھی۔ تمھارے ڈیڈی کہاں ہیں؟

فے اور مک لیگن برآمدے میں آئے۔ ''پاپا تو اسی طرح اپنے کیڑوں میں لگے ہیں، بلکہ اور بھی زیادہ محو رہتے ہیں۔ صبح سے لیبوریٹری میں ہیں۔ بڑی مشکل سے کھانے کے واسطے میں گھسیٹ کر لائی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے فے نے آہستہ لیبوریٹری کا دروازہ کھولا۔ اندر بجلی کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ دن ہو رہا تھا۔ دروازے کے برابر ڈاکٹر بیکر کا ایک سب اسسٹنٹ مردہ صورت بنائے متفکر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر بیکر حسب دستور بڑی خردبین پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں اور بائیں سیکڑوں بوتلیں، ٹیوب، سلائڈ، دو بڑی ڈائی جسٹر اور مختلف قسم کے چھوٹے بڑے آلات رکھے تھے۔ جیسے ہی یہ لوگ پاس گئے ڈاکٹر بیکر نے سر اٹھا کر ان کی طرف عجیب مایوس انداز سے دیکھا اور بولے، ''میں سمجھتا ہوں کہ جراثیم انسان اور حیوان سے بہت پہلے ہی مر جائیں گے۔ بہت کمزور ہو رہے ہیں۔ نہ معلوم کس بات کا اثر ہے۔''

مک لیگن: تم اب بھی جراثیم میں ہی لگے ہو؟ ان کو چھوڑو۔ یہ زندہ رہیں یا برباد ہو جائیں۔ بس اب ان کو چھوڑو۔ اب تو یہ دیکھنا ہے کہ نسل انسانی میں سے بھی چند فرد کسی طرح سے زندہ رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ (فے کی طرف دیکھ کر) معاف کرنا، مجھے خیال نہیں رہا کہ تم موجود ہو۔ جاؤ باہر چلی جاؤ۔ یہ باتیں عورتوں کے سننے کی نہیں ہیں۔

فے: میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ نہ میں بچہ ہوں اور نہ میں عورتوں کی طرح کمزور دل ہوں۔

یہاں گرمی بہت ہے۔ آپ اور پاپا دونوں چلیں۔ میں چائے منگا کر دوں گی۔ دونوں کو کچھ ناشتہ بھی کر لینا چاہیے۔

ڈاکٹر بیکر نے ہنس کر کہا، ''ہاں، فے کا خیال ٹھیک ہے۔ میں بھی بھوکا سا ہوں۔ میری لڑکی کی رائے ہمیشہ عمدہ ہوتی ہے۔ چلو باہر چلیں۔'' تینوں لیبوریٹری سے باہر آ کر جب برآمدے میں آئے تو پورچ میں ایک موٹر اور کھڑا تھا، اور آرتھر ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا سگار پی رہا تھا۔ ڈاکٹر بیکر نے پروفیسر مک لیگن سے آرتھر کو ملایا۔ تینوں بیٹھ گئے۔ فے نے گھنٹی بجائی۔ ملازم کچھ دیر بعد چائے بنا کر لایا جو کہ فے نے سب کو بنا کر پیش کی اور فے نے پھر اسی سلسلۂ کلام کو چھیڑا۔ ''پروفیسر مک لیگن، پاپا آپ کی مدد کس طرح کر سکتے ہیں؟ یا آپ خود بھی کیا کر سکتے ہیں؟ یہ انتہائی چھوٹی چیزوں کے ماہر ہیں، اور آپ انتہائی بڑی چیزوں کے۔ وہ جراثیم کی پیدا ہونے، پلنے بڑھنے کی اسٹڈی کرتے ہیں۔ اور آپ ستاروں، سیاروں اور سورجوں اور چاند کی چال ڈھال اور گردوں کے معائنے کرتے ہیں۔ پھر نسل کی بقا کے لیے آپ دونوں کیا کر سکتے ہیں؟''

مک لیگن: بھئی تو دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن مجھ کو یقین ہے کہ اگر میرے دوست بیکر میرا ساتھ دیں گے تو شاید ہم کچھ انتظام ایسا کر سکیں کہ ایک دو جوڑے انسان کی نسل کے بچ رہیں۔ میری کچھ تدابیر ہیں جو کہ میں (بیکر کی طرف مخاطب ہو کر) تم سے بیان کروں گا۔

کیپٹن آرتھر: کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے خیال میں زمین اور تارے کی ٹکر سے کوئی جاندار نہ بچے گا؟

مک لیگن: میرے خیال میں تصادم سے بہت پہلے ہی آندھیوں کی تیزی اور سمندروں کی طغیانی سے تمام جاندار مر جائیں گے۔ تارے کی کشش سے تمام سمندروں کا پانی ایک طرف سمٹ کر اس قدر اونچا ہوگا کہ اونچے سے اونچے پہاڑ بھی ڈوب جائیں گے۔ ایسی حالت میں اگر تمام ملک بلکہ تمام دنیا متفق ہو کر کوئی ایسا آلہ بنائے کہ دو مرد اور دو عورتیں ہی بچ رہیں تو پھر ایک دفعہ یہ دنیا انسانوں سے آباد ہو سکے گی۔

ڈاکٹر بیکر: بات دراصل یہ ہے کہ اس دنیا کا دوبارہ کسی جاندار سے آباد ہونا ہی ناممکن ہے

کیوں کہ جراثیم کی زندگی پر تو ابھی سے اثر پڑنے لگا ہے۔ اور اگر ایسا انتظام ہو جائے جس کا ذکر مک لیکن نے کیا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ چند اہم اور ضروری جراثیم بھی نہ بچالیے جائیں۔

کیپٹن آرتھر: (بات کاٹ کر) معاف کیجیے، میرے خیال میں نوح کی کشتی بنانا سب سے زیادہ کارآمد ہوگا، اور اگر اس میں کتے کی بھی جگہ ہو تو پھر میرے نیوفاؤنڈ لینڈ کے کتے برنس کا ضرور خیال رکھا جائے۔ بہت اچھی قسم کا ہے۔

فے: چپ بھی رہو۔ تمھارا مذاق بہت بے موقع ہے۔

آرتھر: میرا یہاں اور زیادہ ٹھیرنا بھی بے موقع ہے۔ ڈانس میں میرا سخت انتظار ہو رہا ہوگا۔ اگر چلتی ہو تو چلو، اب دیر نہ کرو۔

ڈاکٹر بیکر: کیا تم فے کو ڈانس میں لے جا رہے ہو؟ ضرور ضرور۔ جاؤ فے، دل بھر کے تفریح کرو۔

ثامن بن حارث جس وقت ریتے کی چھوٹی پہاڑیوں کی آڑ میں پہنچ گیا تو اس نے اونٹ روک دیے۔ اس کی عورت اور اس کا باپ دونوں اس کی اس حرکت سے گھبرا گئے۔ باپ چلایا، ''یا ثامن، کیا کرتا ہے؟ موت کے منھ میں از خود جاتا ہے۔'' ثامن اپنے اونٹ سے کود کر ان دونوں کے اونٹ کو بٹھانے لگا اور بولا، ''اترو، جلد اترو۔ موت اٹل ہے، موت اٹل ہے، مگر صرف میرے ہی واسطے۔ تم ان پہاڑیوں کی آڑ آڑ شمال کی طرف پیدل بھاگو اور میں ان اونٹوں کو لے کر مغرب کی طرف بھاگتا ہوں۔ تعاقب میرا ہی ہوگا۔ صرف میں ہی مارا جاؤں گا۔ تم لوگ بچ جاؤ گے۔ چلو چلو، بھاگو۔ واللہ اے باپ! دیر نہ کر۔ تجھ کو اور ان بچوں کو خدا کی پناہ میں دیا۔ قسم ہے رب کی اے باپ تو دیر کر رہا ہے۔''

بڈھا اپنے اونٹ سے نہ اترنا تھا نہ اترا اور بولا، ''ثامن، میرے بیٹے، تیری تدبیر بہتر ہے۔ تو بھاگ اپنی عورت اور بچوں کو لے کر۔ قسم ہے مجھ کو پیدا کرنے والے کی، میں تجھ کو دشمنوں کی رائفلوں کا نشانہ بننے کے واسطے چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ اگر تجھ کو بچوں کی محبت ہے، اگر تجھ کو بنو بوکاف کی نسل قائم رکھنا ہے تو تو ان کو لے کر بھاگ اور میں اونٹوں کو لے کر دوسری طرف جاتا ہوں۔ اگر دشمنوں نے مجھ کو زندہ

گرفتار کرلیا تو شاید بڈھا سمجھ کر چھوڑ دیں لیکن تجھ کو وہ ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ بس اب دیر نہ کرو ورنہ سب کی موت ہے، اور ہماری موت شاید باقی قبیلے کی بھی موت کا باعث ہو جائے۔ واسطہ خدا کا بھاگ، اے لڑکے بھاگ۔''

ثامن پہلے تو جزبز جھنجھلاتا رہا، لیکن جب باپ کا ارادہ بالکل مستحکم دیکھا تو فوراً دونوں بچوں کو کندھوں پر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا اور کہا، ''اچھا اے باپ، تیرا خدا حافظ ہے۔ اب تو قیامت میں ہی ملنا ہوگا۔'' عورت اور ثامن پہاڑیوں کے نیچے نیچے بھاگتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ بڈھے نے جلدی سے اپنے اونٹ کے کجاوے میں سے ایک رائفل نکالا۔ اس میں پانچ کارتوس رکھے۔ باقی کارتوس کرتے کے دامن میں باندھ کر جھولے میں ڈال لیے۔ اپنا اونٹ سب سے آگے کر کے اونٹوں کی ڈوریاں درست کر کے روانہ ہو گیا۔ یہ اونٹوں کو بھگاتا ہوا جس قدر تیز ہو سکتا تھا چلا جا رہا تھا کہ آخر سوار قریب آ گئے۔ ان کی آوازیں آنے لگیں۔ بڈھا فوراً رائفل سنبھال کر اپنے اونٹ کی دم کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ ہلتی ہوئی نال ایک دفعہ ایک سکنڈ کے لیے ایک شست پر ٹھیری اور اس کی نال سے ناگن کی طرح شوراج کی زبان چمکی اور ریگستان کی سنسان ہوا میں بندوق کی آواز، پھر گولی کے نشانے کی صدا اور پھر طبلے کی ہلکی سی تھاپ صاف سنائی دی۔ سب سے آگے والے سوار کی لاش گھوڑے سے گر کر ریتے پر لڑھکتی چلی گئی۔ گھوڑا ایکا یک اپنے ہلکا ہونے پر متعجب سا ہوا۔ کچھ ٹھٹکا، گھوم کر لاش کو دیکھا، ایک طرف بھاگا اور پھر لاش کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ریگستان میں دونوں تنہا موجود ہیں۔ بھاگتے ہوئے اونٹ اور تعاقب کرتے ہوئے گھوڑے، بہت دور نکل گئے۔ رائفل کے فائروں کی آوازیں آ رہی ہیں۔

شنگھائی کی بندرگاہ میں عالی شان جہاز مسافروں سے بھرا ہوا تھوڑی دیر میں روانہ ہونے کے واسطے پوری طرح تیار کھڑا تھا۔ اس کے کٹہرے پر جھکے ہوئے بہت سے آدمیوں میں سینگر ہاسن بھی تھا جو کہ آج جرمنی جا رہا تھا۔ اسے ہیزن برگ کا انتظار تھا۔ جوں ہی اس نے اس کا زرد موٹر آتے دیکھا یہ گینگ وے کی طرف روانہ ہوا اور آدھے زینے پر ہیزن برگ سے ہاتھ ملایا اور پھر دونوں واپس لوئر ڈیک پر آ گئے۔ ہر طرف آدمیوں کی چہل پہل تھی، اس لیے یہ لوگ ٹہلتے ٹہلتے نوکسل کی طرف چلے۔

ہیزن برگ نے پوچھا، ''تم نے اپنا کیبن دیکھا؟ پسند آیا؟ میں نے تمام تر ہدایتیں کردی تھیں۔ غالباً اس جہاز کا سب سے بہترین کیبن تم کو ملا ہوگا؟''

سینگر ھاسن: میں تمھارے خیال کا بہت شکرگزار ہوں۔ کیبن ٹھیک ہے۔ کیپٹن کے کیبن کی طرف ہے۔

ھیزن برگ: آہ، آہ! مجھے کیپٹن سے بھی کام ہے۔ برجر، کیا تم مہربانی کر کے اسے بلالاؤ گے؟

برجر ''ہاں ضرور'' کہتا ہوا چلا گیا۔

ھیزن برگ: دیکھو، اب چوں کہ اس تارے کے تصادم کا خیال ہر ہر طبقے میں اثر کر رہا ہے، اس لیے میں جلدی نہیں کروں گا۔ میں ان تینوں مال کے جہازوں کو ابھی ایک ہفتہ اور روکے لیتا ہوں۔ ہم کو اس موقعے سے جو کچھ بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے کیا وجہ ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ گندھک کا بھاؤ بہت گرے گا۔

سینگر ھاسن: ٹھیرو، لیکن بتاؤ تو، اس ہونے والے تصادم کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے۔

ھیزن برگ: میری رائے کچھ نہیں۔ میں اسٹرانومسٹ نہیں ہوں جو کچھ رائے دے سکوں۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ اگر سو تارے بھی دنیا پر حملہ کرنے آرہے ہوں تو مجھ کو کیا۔ میں اپنی قوم کی اس وقت تک خدمت کرتا رہوں گا جب تک کہ یہ دنیا قائم ہے۔ (ہنس کر) اگر آٹھ دن اور ہیں تو آٹھ دن اسی طرح کام کرتا رہوں گا جیسے ہمیشہ کرتا تھا۔ ہم کو اپنے کاموں میں آخری وقت تک یہ خیال رکھنا چاہیے کہ دنیا ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، اور ہماری قوم کو بھی ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔

سینگر ھاسن: ہاں ہاں، یہ تو ہے ہی، لیکن پھر بھی یہ ہری بھری، زندگی سے پُر، مشاغل سے وابستہ، تمدن کے جدوجہد کی آماج گاہ دنیا، یہ دنیا (ہاتھ پھیلا پھیلا کر) کیا ہمیشہ کے واسطے تباہ ہو جائے گی؟ (پھر دونوں ہاتھ چاروں طرف پھیلا کر) یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ شہر ایک ہی تصادم سے ریزہ ریزہ ہو کر دھول اور غبار بن کر بے پایاں فضا میں ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے بلبلے کی صورت میں پھرے گا؟

ھیزن برگ: (دبی ہوئی کچھ مردہ سی آواز میں) ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔ بڑی افسوسناک بات

ہوگی۔ (فوراً آواز درست کرکے) یہ باتیں ہم سے کچھ سروکار نہیں رکھتیں۔ تم سنگاپور پہنچتے ہی وہاں جانا۔ تم کو کافی وقت ملے گا۔ اور اگر ضرورت ہو تو جہاز کو دو چار گھنٹے روک لینا۔ تمام معاملہ خود طے کرنا اور مجھے فوراً اطلاع دینا۔

برجر کیپٹن کو لیے ہوئے آیا۔ کیپٹن نے سلام کیا اور مزاج پرسی کی۔ ''یور ایکسی لینسی، آپ اچھے ہیں؟ میرے لیے کیا حکم ہے؟''

ھیزن برگ: میں تم سے مل کر خوش ہوں۔ تمھارا جہاز سب طرح ٹھیک ہے؟ مجھے خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ لیٹ ہو جائے۔ سنگاپور وقت پر پہنچنا چاہیے۔

کیپٹن: مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے میرا جہاز لیٹ ہو جائے۔ ہاں (ہنس کر) اگر وہ خونی ستارہ میرا راستہ روک لے تو وہ الگ بات ہے۔

ھیزن برگ: (ناگوار لہجے میں) یہ بات فضول ہے۔ کام کی باتیں کرو۔ دیکھو اگر میرے دوست سینگر ہاسن تم کو دو چار گھنٹے سنگاپور میں روک لیں تو تم رک جانا۔ میرے تحریری حکم تم کو مل گئے ہیں؟

کیپٹن: جی ہاں۔

ھیزن برگ: اور وہ بڑا لفافہ؟

کیپٹن: ہاں، یور ایکسی لینسی۔

ھیزن برگ: ٹھیک ہے، وہ لفافہ تم خود لے جا کر دینا۔ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جائے۔ دیکھو جہاں تک ہو سکے جہاز لیٹ نہ ہونے پائے۔

کیپٹن نے اپنی گھڑی کو دیکھا اور مسکرا کر بولا، ''میرے خیال میں سفر شروع ہونے سے پہلے ہی جہاز تو لیٹ ہو رہا ہے۔ ایک منٹ گذر گیا۔''

ھیزن برگ: اوہو معاف کرنا، مجھے افسوس ہے۔ اچھا سینگر، خدا حافظ۔

یہ کہتے ہوئے ہیزن برگ جہاز سے نیچے اترا۔ اپنے موٹر پر پہنچ کر برجر کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ برجر نے کہا، ''مجھے اپنی طرف الگ جانا ہے۔'' وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور یہ خود اکیلا ہی اپنے

موٹر کو چلاتا ہوا چل دیا۔

گونشنگھائی کی آدھی سے زیادہ آبادی چینیوں کی ہی ہے لیکن بیرونی آدمی بھی کافی تعداد میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، اوران میں انگریز بہت زیادہ ہیں۔ اکثر اخبارات بھی انگریزی میں شائع ہوتے ہیں۔ گھنے شہر میں اخبار بیچنے والوں کی تیز آوازیں آج انتہا سے زیادہ سنائی دے رہی ہیں۔ ہزاروں آدمی ہر طرف اخبار پھیلا کے ان صفحوں کو طرح طرح سے ہوا کی پریشانی سے بچائے، نگاہیں اخبار پر جمائے، محو نظر آرہے ہیں۔ آدمیوں کی سڑکوں پر اس قدر شدت تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شہر کی ساری آبادی اس وقت میں نکل کر سڑکوں پر آگئی ہے۔ لیکن یہ تمام مجمع زندگی اور چہل پہل سے خالی تھا۔ ہر شخص اداس یا کھسیانا تھا۔ اکثر جگہ ایک اخبار پڑھنے والے کے گرد پچاس ساٹھ تک بے پڑھے چینی خاموش کھڑے سنتے نظر آتے تھے۔ اخبار بیچنے والے بری طرح چلا رہے تھے۔

''لندن کے مک لیکن اور جاپان کے ماہر شانگ چانگ کی رائے میں اختلاف۔ ستارے میں ایک عجیب قسم کا انکشاف۔''

''دلا کی لاما پی چانوشونگ کو آسمانی اطلاع۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''امریکہ کا ماہر فن ہینڈرسن لکھتا ہے: دنیا کے واسطے کوئی خطرہ نہیں۔''

ہیزن برگ کے ہاتھوں نے موٹر ایک جگہ از خود روک ہی دیا تھا، اور حالانکہ اس کا دماغ اس کے جذبات سے سخت ترین جنگ کر رہا تھا کہ وہ اخبار نہ خریدے، اس قسم کی خبروں کو نہ پڑھے، بلکہ آنے والے تارے سے بالکل بے خبر رہے، لیکن پھر بھی س نے ایک اخبار خرید کر برابر کی خالی سیٹ پر رکھ لیا۔ چاہتا تھا کہ موٹر اسٹارٹ کر کے چلے، لیکن نگاہیں خود اخبار پر پڑیں۔ سامنے کی صفحے کی سرخیاں اپنے آپ اس کے دماغ میں اترتی چلی گئیں۔ اس نے اخبار اٹھالیا۔ شہر، مجمعے، اور اپنی پوزیشن کو بھول کر اخبار میں محو ہو گیا۔

قادر بابو کی بیوی سکینہ صبح کی آندھی کے بعد سے بہت پریشان تھی۔ سرِ شام ہی سے کھانا پکا کر لڑکے کو کھلا پلا کر سلا دیا تھا۔ لڑکی سے ہزار کہا کہ وہ بھی کھالے، مگر اس نے نہ کھایا۔ باپ کا انتظار کرتے

کرتے وہ بھوکی ہی سوگئی تھی۔ بیچاری سکینہ سروتا لیے ڈلی کترتی، کبھی کبھی پنکھا جھلتی، میاں کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب قادر بابو ہوا کے بند ہونے اور گرمی کے تیز ہونے کی شکایت کرتے گھر میں داخل ہوے۔ بیوی کھڑی ہوگئیں۔ پنکھا جھلنے لگیں اور بولیں، ''اے بھئی، اتنی دیر کیوں کی؟''

قادر بابو: کیا بتاؤں کس قدر مسافر چل رہا ہے۔ کام سے کام ہے۔ ہزاروں تار دوڑ رہے ہیں۔

بیوی: اے ہے، تم کو پھر بھی اپنے گھر کا خیال نہ آیا۔

قادر بابو (جو کہ دراصل کام دھام سب چھوڑے، طرح طرح کی سچی جھوٹی خبروں، افواہوں اور گپوں کے سننے میں لگے تھے) بولے، ''واہ جی واہ، میں کام چھوڑ کر چلا آتا؟ کام سے کام ہے۔ اب بھی سیکڑوں تار پڑے ہیں (یہ بالکل درست تھا۔ انھوں نے تین چار تار ہی ڈسپیچ کیے تھے، باقی ویسے ہی پڑے تھے۔) لاؤ کھانا دیتی ہو کہ نہیں؟''

بیوی: ہاں ہاں، کھالینا۔ اے جی سنتے ہو، دیکھو تم ہی کہہ رہے ہو کہ بڑا مسافر چل رہا ہے۔ (آواز میں رقت) سب جلدی جلدی اپنے پیاروں کے پاس جا رہے ہیں۔ (ایک دفعہ روتے ہوے) ہائے میری بچی، ہائے میری بچی! ارے مرادآباد کون دور ہے، اب بھی جا کر لے آؤ۔ (رونے کی آواز دبا کر) مرلی دھر کی گھر والی آئی تھی۔ صبح کو وہ سب لوگ اپنے میکے جا رہے ہیں۔ مرلی دھر کہتے ہیں، نوکری رہے یا جائے، وہ چلے جائیں گے۔

قادر بابو کو اس سے بھی زیادہ معلوم تھا، جنکشن کا قریب قریب آدھا اسٹاف بھاگ چکا تھا، مگر قادر بابو نے یہ ظاہر نہ کیا اور بولے، ''اچھا صبح سویرے اٹھا دینا۔ یہاں سے کسی تانگے میں جنکشن چلا جاؤں گا۔ وہاں سے نو بجے میں آپ بیٹھ جاؤں گا۔ لاؤ اب کھانا دے دو۔ بھوک کے مارے برا حال ہے۔'' لڑکی سوتے سے اٹھی تو باپ سے لپٹ کر رونے لگی۔ شاید خواب دیکھا تھا۔ ڈری ہوئی تھی۔ تینوں الٹا سیدھا کھانا کھا کر سو گئے۔ پریشانی کے بعد نیند بھی گہری آتی ہے۔ کوئی چار بجے رات کے، شہر کی طرف سے بھیانک شور و غل بتدریج شروع ہوا اور بڑھتے بڑھتے اس قدر تیز ہوا کہ ہوا میں ہاؤں

ہاؤں کی گونج کے علاوہ کچھ نہ رہا۔ان لوگوں کی بھی آنکھ کھل گئی۔لڑکی ماں سے چمٹ گئی۔ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے قادر بابو کو دیکھنے لگی۔قادر بابو کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔وہ کوارٹر کے دروازے تک جائیں اور پھر پلنگ پر آ کے بیٹھ جائیں۔ابھی تک یہ لوگ بے خبر تھے کہ کیا ماجرا ہے۔ابھی تک ان لوگوں کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تھا۔خوف سے زبانیں بند تھیں۔کوارٹر کے باہر نتھو پوائنٹ مین کی آواز آئی، ''ہے رام! ہے رام! ہمارے پاپوں کی سزا دینے آرہا ہے۔'' قادر بابو پھر کھڑے ہوئے، کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا، باہر گئے۔نتھو کو دیکھا، مشرق کی طرف ہاتھ جوڑے آسمان کی طرف تک رہا تھا، اور آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا، ''ہے رام، سنسار پر کرپا کرو۔ ہے رام، بچالے اس دنیا کو۔'' قادر بابو نے متحیر ہو کر افق مشرق کو دیکھا۔سرخ دھندلے رنگ کا کافی بڑا ایک پورا چاند نظر آیا۔وہ آہستہ آہستہ مشرق کی طرف گھوما تو چودھویں تاریخ کا پورا چاند اپنا شفاف ہنستا ہوا چہرہ لیے ہوئے درختوں میں چھپنے کے واسطے تیار تھا۔قادر کو معلوم ہوا کہ گویا کہ یہ چاند ہنس کر کہہ رہا ہے، ''الوداع، اے ناقدر دل۔'' جس طرح کہ کسی کے گولی آ کر لگ جائے، قادر دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ کر ''ہائے ہائے'' کہتا ہوا زمین پر بیٹھا، اور پھر کھڑا ہو گیا، پھر بیٹھا اور پھر ہائے ہائے کرتا کھڑا ہو گیا۔اس کی بیوی بھی شوہر کی آواز سن کر باہر آ گئی۔کیسا پردہ، کیسے بچے۔ماں اور بیٹی دونوں نے بغیر کسی کے بتائے دونوں چاند دیکھے۔ایک ایک کر کے دونوں بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔چھوٹا لڑکا بے خبر سو رہا ہے۔چار میل کے فاصلے کے شہر کی آوازیں مل کر ہاؤں ہاؤں سے زمین اور آسمان کو تھرا رہی ہیں۔نتھو بھی نئے چاند کے آگے ماتھا ٹیک کر بے ہوش ہو گیا۔قادر بابو دونوں ہاتھ سے سینہ پکڑے ہائے ہائے کرتا ان سب کو چھوڑ کر ایک طرف کو چل دیا۔

آرتھر فے کو اپنے برابر بٹھا کر موٹر کو پوری تیزی سے آندھی پانی کی طرح چلا لیکن لندن شہر میں داخل ہونے پر اس کو اپنی رفتار معمول سے بھی کہیں زیادہ کم کر دینی پڑی۔سڑکوں پر بے پناہ ہجوم تھا۔اخباروں کے بڑے بڑے اشتہار طرح طرح کی خبروں کی سرخیاں بتا رہے تھے۔ایک بہت بڑے اشتہار کی سرخی تھی: ''کل ۱۵ تاریخ کو صبح ۹ بجے بشپ آف لندن ہائیڈ پارک میں عام مجمعے میں دنیا کی

حفاظت کے واسطے دعا مانگیں گے۔'' ایک لڑکا چلا رہا تھا: ''پارلیمنٹ میں خبروں پر سنسر عائد کرنا نامنظور ہوا۔'' ''جاپان میں ایک نیا آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑا''۔ ایک جگہ چوراہے پر موٹر رکا تو فے نے ایک اخبار لیا، لیکن یہ پیسے نکالتی رہی اور اخبار بیچنے والا اخبار دے کر نہایت بے فکری سے بڑھتا چلا گیا۔ فے نے پہلے سب سرخیوں پر جلدی جلدی نظر ڈالی۔ ''تارا بغیر دوربین کی مدد کے ۱۸ تاریخ کو دکھائی دے گا۔'' ''امریکہ کے پریسیڈنٹ نے تمام قوموں سے اپیل کی ہے کہ سب مل کر ان کی مدد کریں۔ وہ ایک زبردست آلہ تیار کرنا چاہتے ہیں جس سے کہ تمام دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔'' ''پروفیسر مک لیگن نے اخباروں کے نمائندوں سے ملنے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔ وہ کسی عجیب کام میں مصروف ہیں جس کی نوعیت ابھی تک نامعلوم ہے۔'' ''فرانس میں ایک بہت زبردست لوہے کا گولہ بنانے کی تدبیر بہت جلد زیر عمل آنے والی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس گولے میں بند ہو کر چند انسان آنے والی مصیبت سے بچ رہیں گے۔'' دنیا کسی طرح خطرے میں نہیں ہے: سرکارکس میں ہڈلے کا بیان۔ لارڈ لینڈرفولڈ کا برٹش قوم کو پیغام۔ ان کو امید ہے آخر میں یہ خطرہ غلط ثابت ہوگا۔ لوگ اپنے کاروبار نہ چھوڑیں۔'' فے نے اس آخری پیغام کو پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر فے آرتھر کی طرف دیکھتی رہی، پھر اس نے اخبار کو نوچ کر پھینک دیا اور آرتھر کی طرف عجیب انداز سے دیکھنے لگی، اور پھر سوچ کر بولی، ''تم مجھے لے چلو۔ ناچ میں ایسا لگا دو کہ میں یہ سب بھول جاؤں۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ کوئی تیز شراب پلاؤ۔'' اندر جا کر دونوں نے کاؤنٹر پر ایک ایک کاک ٹیل کا پیالہ لیا اور آرتھر ان دونوں لڑکیوں کو بھی ڈھونڈ لایا جن کے بارے میں اس نے ٹیلی فون پر کہا تھا۔ فے نے دیکھا کہ دراصل بڑی بہن بے انتہا خوبصورت تھی، لیکن اس کو کوئی رشک نہ ہوا، اور بولی، ''غالباً تم میرے آنے سے پریشان ہو گی۔'' وہ لڑکی جس کا نام لورنا تھا، بالکل صاف دلی سے بولی، ''نہیں، بلکہ میں تمہارے آنے سے خوش ہوں۔ جتنی بھی زندگی باقی ہے، ہم کو چاہیے کہ ہم اس کا لطف اٹھالیں۔ اب حسد اور خودغرضی کا وقت باقی نہیں ہے۔ تم اور آرتھر ناچو۔ میں تھک گئی ہوں۔ میں بیٹھ کو دیکھوں گی۔'' ہال سینٹ کی خوشبو اور بجلی کی ہلکی ہلکی روشنیوں اور لباسوں کی طرح طرح کی رنگینوں اور باجے کے راگوں سے پر تھا جس میں نوجوان دیوانہ وار ناچ رہے تھے، اور قطعی بے فکری سے شراب نوشی ہو رہی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں بھی شراب کی کثرت سے بے خود اور

مدہوش ہوتی چلی جارہی تھیں۔ صبح ہوتے، گوآرتھر کے بھی پیر لڑکھڑا رہے تھے، اس نے تینوں مدہوش لڑکیوں کو ایک ملازم کی مدد سے باری باری اپنے موٹر میں ڈالا۔ پہلے لورنا اور اس کی بہن کو چیرنگ کراس کے قریب اتارا اور پھر فے کو لے کر روانہ ہوا۔ صبح کی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ غیر معمولی طریقے پر ہزاروں گھنٹیاں گرجوں میں بج رہی تھیں۔ لاکھوں عورتیں، بچے اور بڈھے گرجوں کی طرف جارہے تھے۔ فے اس قدر مدہوش تھی کہ اس کو کچھ خبر نہ تھی کہ کیا ہورہا ہے۔ اس کو اپنے گھر پہنچنے اور اپنے کمرے میں لٹائے جانے کی بھی خبر نہ تھی۔ گیارہ بجے دن کے اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سر میں درد تھا۔ کچھ دیر اس نے سر پکڑ کر گذشتہ رات کے واقعات یاد کرنا چاہے۔ اس کو صرف یہاں تک یاد تھا کہ جب وہ از خود رفتہ ہورہی تھی کسی نوجوان نے آکر اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ناچنے میں لگالیا۔ اس کے آگے اس کو کچھ یاد نہ آیا۔ فے سر پکڑے غسل خانے میں گئی اور بڑی دیر تک سر پر ٹھنڈا پانی ڈالتی رہی۔ جب سر کا درد کچھ ہلکا ہوا تو کپڑے پہن کر اپنے کمرے سے نیچے اتری۔ ہال میں ہوتی ہوئی کھانے کے کمرے میں گئی۔ وہاں اس کو ایک ملازم ملا۔ فے نے پوچھا کہ اس کے پاپا نے کھانا کھالیا، تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بیکر کل شام سے پروفیسر مک لیگن کے ساتھ گئے ہوئے ہیں۔ اس کو تعجب ہوا کہ کل شام سے رات کو بھی نہیں آئے، ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا۔ ملازم نے کہا، ''کل شام سے شہر کے تمام لوگوں نے اپنا کام چھوڑ دیا ہے۔ آپ کے گھر کے اور ملازم بھی بہت ہراساں تھے۔ لیکن میں نے اور بڈھے بٹلر نے مل کر ان کو سمجھایا کہ اگر کچھ ہونا ہے تو ہوکر رہے گا۔ بوکھلانے سے کیا ہوتا ہے۔ جس خدا نے ہماری نجات کے واسطے اپنے پیارے بیٹے کو ہماری مدد کے واسطے بھیجا اور ہمارے گناہوں کے عوض اس کو صلیب پر لٹکانا گوارا کیا، وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ ہم سب نے آپس میں قسمیں لے لی ہیں کہ ہم آخر وقت تک اپنے مالکوں کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ بڈھا بٹلر جیکب بھی باہر موجود ہے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطمینان دلانا چاہتا ہے۔''

فے: ہاں ہاں مجھے اطمینان ہے۔ اچھا، جیکب کو بلالو۔

کہ اتنے میں ایک ملازم نے ایک بند لفافہ لاکر دیا جس پر لکھا تھا: ''میری پیاری بیٹی فے''۔ فے نے گھبرا کر خط کھولا اور پڑھنا شروع کردیا۔

مجھے یقین ہے کہ تم میری غیر موجودگی سے پریشان ہوگی لیکن میں اور پروفیسر مک لیکن ایک ایسے کام میں مشغول ہیں کہ وہ شاید اس دنیا میں نسل انسان قائم رکھنے میں کامیاب ثابت ہو۔ اب شاید میں کبھی گھر واپس نہ آسکوں۔ یہاں پر دن رات کا ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر ہم لوگ ایک لائف بوٹ بنانے میں لگے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ضرورت کے وقت تک تیار ہو جائے۔ تمھاری پریشانی دور کرنے کے واسطے میں یہ ہی طریقہ مناسب سمجھتا ہوں کہ سب حال صاف صاف لکھ دوں۔ وزیر اعظم، وزیر جنگ، امیر البحر اور پندرہ بڑے بحری انجینئروں کی کمیٹی کے آگے ہم نے اپنی تجویز پیش کی تھی۔ رات کے ایک بجے تک اس کے ہر ہر پہلو پر نظر ڈالنے کے بعد آج صبح سے سرکاری جنگی جہازوں کے کارخانے میں پانچ ہزار آدمی اس لائف بوٹ کو بنانے کے واسطے ہمارے سپرد کر دیے گئے ہیں۔ سات اور لندن کے بڑے کارخانے اس کے اجزا بنانے میں لگے ہیں۔ گورنمنٹ تمام تر مدد دے رہی ہے۔ مجھے ایک سیکنڈ کی فرصت ناممکن ہے۔ اگر تم چاہو تو یہاں آکر مجھ سے مل سکتی ہو۔ پیاری بیٹی، اصلیت کا چھپانا غالباً جرم ہوگا۔ یہ ایک یقینی اور یقینی امر ہے کہ اب دنیا، کم از کم موجودہ دنیا، تباہ ضرور ہو جائے گی۔ تم بہتر سے بہتر جس طرح اپنا وقت کاٹ سکتی ہو کاٹو۔ اگر تم کو یقین ہے کہ پھر زندگی ہے، تو ضرور تم عبادت میں وقت گذار دو، ورنہ میری رائے میں تفریح سب سے بہتر مشغلہ ہوگا۔

تمھارا چاہنے والا باپ، بیکر

اس خط کو پڑھ کر فے کا ایک دفعہ دل تڑپا کہ وہ باپ کے پاس چلی جائے۔ کھانے کی میز پر سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے شوفر کو موٹر نکالنے کا حکم کہلا بھیجا اور خود اوپر جا کر جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے نیچے آئی۔ موٹر پر سوار ہو کر سرکاری جنگی جہازوں کے کارخانے کی طرف روانہ ہوئی۔ اس عرصے

میں دن کے بارہ بج چکے تھے۔ راستے میں تھیٹر پڑا۔ اس کو خیال آیا کہ شاید آرتھر موجود ہو، کیوں کہ اس وقت بھی بالکل رات کی طرح ناچ ہو رہا تھا۔ اس نے موٹر رکوائی، اندر گئی اور تمام میں تلاش کیا۔ آرتھر وہاں نہ تھا۔ اتنے میں ایک اجنبی نے آکر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور بولا، ''تم کو کوئی ساتھی نہیں ملا؟ چلو میرے ساتھ ناچو۔'' دونوں ناچ میں مشغول ہو گئے۔ ناچتے ناچتے وہ اس کو بار کی طرف لے گیا اور شمپین اس کو پیش کی۔ اس کو پینے کے بعد پھر ناچ میں یہ دونوں لگ گئے۔ اب وہی شراب کا دور، کبھی ناچ اور کبھی کسی کوچ پر ایک دوسرے کے ہم آغوش جا بیٹھنا ہونے لگا۔ بیچ بیچ میں بہت اعلیٰ قسم کا ہلکا ناشتہ بھی کھاتے جاتے۔ آخر میں پھر اسے ہوش نہ رہا۔ اس نے سنبھلتے سنبھلتے کہا، ''مجھے کہیں لے جا کر لٹا دو۔'' صبح نو بجے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک اجنبی جگہ سوتے پایا۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ کیسے یہاں آئی۔ پھر گذشتہ دن اور رات کے واقعات یاد آئے۔ اس وقت اس کو پھر باپ یاد آیا۔ یہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ اپنا لباس، جو کہ شرمناک حالت میں تھا، درست کیا۔ کمرے کے باہر نکلی۔ دیکھا تو جس جگہ وہ تھی وہ ایک معمولی سا ہوٹل تھا جو کہ نہایت ہی بے ترتیبی کی حالت میں تھا۔ کوئی ملازم بھی نظر نہ آیا۔ دروازے کے قریب ایک آدمی، جو کہ ظاہراً مالک ہی معلوم ہوتا تھا، ایک کرسی پر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا جس نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے ایک دفعہ نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر زمین کی طرف نگاہیں کر لیں۔ یہ بھی ایک لفظ بولے بغیر ہوٹل سے نیچے اتر کر سڑک پر آ گئی۔ دیکھا تو ٹھیک اس جگہ پر سڑک بالکل ہی سونی تھی، ایک نفر بھی نہ تھا۔ البتہ ایک طرف سے برابر کے ایک مکان میں سے دو بچوں کے بری طرح رونے کی آواز آ رہی تھی۔ نے تیزی سے اسی طرف بڑھی جدھر سے بھنبھناہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ سامنے کے چوراہے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سنٹرل ایوی نیو روڈ پر وہ آ گئی تھی جس پر ایک گرجے کے آگے لاکھوں عورتیں اور مرد زمین پر بیٹھے تھے۔ دور تک سڑک ان سے بھری ہوئی تھی جن میں سے قریب قریب ہر ایک رو رہا تھا۔ بچے چیخ رہے تھے۔ مرد سسکیاں لے رہے تھے۔ عورتوں کی حالت بہت ابتر تھی۔ نے جب ان کے پاس پہنچی تو خود بھی بیٹھ گئی۔ دائیں بائیں ہر ایک سے بات کرنا چاہی۔ وجہ پوچھی، مگر کوئی نہ بولا۔ ایک ادھیڑ مزدور نے جھنجھلا کر کہا، ''اے عورت، کیا تو اب تک سو رہی تھی؟'' نے نے گردن گھما کر مجرمانہ لہجہ میں کہا، ''ہاں، میں دراصل سو رہی تھی۔'' اس پر مزدور نے غصے میں کہا، ''سوتی

تھی تو جا جہنم میں۔'' یہ کہتے ہی پھر جلدی سے آواز بدل کر بولا ''ارے لڑکی، معاف کرنا۔ مجھے معاف کرنا۔ اے عیسیٰ خدا کے بیٹے، مجھے معاف کر۔ میری زبان سے پھر بری بات نکلی۔ ہائے میں گناہ گار ہوں۔ گناہوں کا عادی ہوں۔'' دونوں ہاتھ سے سر پیٹ کر: ''ہائے میں دوزخ میں جاؤں گا۔ میرے گناہ مجھے نہ چھوڑیں گے۔'' فے نے اور بھی زیادہ پریشان ہوکر چاروں طرف دیکھا۔ اس کے بالکل ہی برابر میں بیٹھا ہوا ایک نوجوان بولا، ''کیا تم کو نہیں معلوم کہ وہ آ گیا ہے؟'' ''کون؟ کون؟'' فے نے گھبرا کر کہا۔ وہ آدمی بولا ''وہی، وہی، موت کا پیغامبر۔ وہی تارا۔ صبح ہوتے خون میں ڈوبا، اصلی چاند سے بھی بڑا، وہ نکلا۔ ہمارا پرانا پیارا چاند حسرت سے اس کو دیکھتا تھا۔ آہ! وہ دنیا کو نگل جانے والا تارا آخر آ ہی گیا۔'' فے کو یہ معلوم ہوا کہ اب تک جس کو وہ بھیانک خواب سمجھی تھی خواب نہ تھا۔ اصلیت، ایسی بھیانک اصلیت۔ بس ختم، بس ختم۔ فنا، یہ دنیا فنا، یہ پیاری حسین دنیا فنا، وہ اور کل جہاں فنا۔ موت، موت، ہر چیز کی موت، پہاڑ اور ندیوں کی موت، ملکوں اور سمندوروں کی موت، آنے جانے والے موسموں کی موت، دنوں اور راتوں کی موت۔ موت، زندگی کی موت۔ اس کا سر چکرا گیا۔ وہیں سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ جہاں ہزاروں بے ہوش تھے، فے بھی بے ہوش پڑی تھی۔

حارث نے باوجود چار گولیاں کھانے کے مرتے مرتے اپنے نہ خطا ہونے والے نشانے سے ایک ایک کر کے اپنے تمام تعاقب کرنے والوں کو گرا دیا تھا۔ ثامن کو اس کی خبر نہ تھی۔ وہ بچوں کو خود اٹھائے بیوی کا ہاتھ پکڑے برابر جا رہا تھا۔ کبھی کبھی بھاگنے کی بھی کوشش کرتا لیکن عورت کی وجہ سے مجبور ہو جاتا تھا۔ کہتا، ''عصبہ، تیرے پیر کیسے بھاری ہیں۔''

عورت: یا خالد کے باپ، میں تھک گئی ہوں۔ میرا سانس چڑھتا ہے۔ میں چلوں گی، ضرور چلوں گی، تیز چلوں گی، لیکن بھاگ نہیں سکتی۔

بدو: اچھا نہ بھاگ، تیز ہی چل۔ تیرا باپ تو بڑا بہادر تھا، بڑا جری تھا، تو ایسی کمزور ہے۔ دیکھ، میرے ہاتھ پر زور دے کر کچھ دیر بھاگ۔ مجھے ایک ایک ساعت بھاری ہے۔ تاخیر میں ظلم ہو جائے گا۔ ہم اور ہمارے بچے تو قتل ہی ہو جائیں گے، لیکن پھر اطلاع نہ پہنچنے سے ہمارا تمام قبیلہ بھی قتل کر دیا

جائے گا۔ تیز چل عصبہ تیز چل۔

عصبہ: مجھے پیاس لگی ہے۔ ایک گھونٹ پانی پلا دو۔

ثامن: میں کہہ چکا ہوں، مشک چھوٹی ہے اور اس میں پانی بھی کم ہے۔ وہ میرے اور تیرے واسطے نہیں ہے، بچوں کے واسطے ہے۔ اگر تو چلتی رہے گی تو صبح ہوتے ہم ایک نخلستان میں سے ہو کر گذریں گے۔ وہاں ایک چشمہ سرد اور میٹھے پانی کا ہے۔ پھر تو اس سرد پانی میں سے سیر ہو کر پینا۔ عصبہ، تو تو بڑے دلیر خاندان سے ہے۔ کچھ تو اور تیز چل۔

اس تپتے ہوئے ریگستان میں جہاں نہ درخت تھے نہ پہاڑ، جہاں نگاہ ٹھیرنے کے واسطے بھی کوئی چیز نہ تھی، یہ دونوں بھنگوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ چاروں طرف جھلملاتی ریت کا سمندر تھا کہ جس کا کنارہ بھی نہ تھا۔ عصبہ اس میں چلتی تھی اور چلتی تھی لیکن پھر اسی ریت کے سمندر کے بیچ میں اپنے کو پاتی تھی۔ کبھی شوہر کے ڈر سے چلتی تو کبھی بچوں کی محبت میں بڑھتی، مگر ریت کا سمندر ختم نہ ہوتا تھا۔ عصبہ ہر طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتی تھی، مگر کچھ نہ نظر آتا تھا۔ وہی ہموار ریت کا میدان۔ اس پر آسمان کے بیچوں بیچ سے ایک انچ اپنے کو الگ نہ پاتی تھی۔ پیاس کی شدت تھی۔ پیروں میں لغزش تھی۔ سینے میں سانس نہ سماتا تھا۔ ''ال مویا! ال مویا!'' کہتی ہوئی عصبہ گر پڑی۔ گرم گرم ریت اس کی آستینوں اور گریبان میں چلی گئی، مگر وہ نہ اٹھی۔ بھد سے گرنے کی آواز سن کر بدو گھوما۔ اس کی صورت پر رحم اور محبت کی ایک ہلکی جھلک آئی اور غائب ہو گئی۔ اس نے مہیب صورت بنا کر خشک آواز میں کہا، ''یہ عورت نہیں چل سکتی۔ اس کو یہاں زندہ چھوڑنے سے مار ڈالنا بہتر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گود والے بچے کو سیدھے کولھے سے الٹے کولھے پر لے کر سیدھا ہاتھ آزاد کیا اور کمر پر باندھے پیش قبض کو ٹٹولا۔ عصبہ نے روتی ہوئی آواز میں کہا، ''مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔ میں چلوں گی، میں چلوں گی۔''

جب عصبہ پھر چلنے لگی تو ثامن بولا، ''دیکھ میں تو دو بچوں کو اور ایک مشک کا بوجھ بھی اٹھائے ہوں لیکن تجھ سے اکیلا بھی نہیں چلا جاتا۔'' کندھے پر جو بچہ سوار تھا ''پیاس، پیاس،'' پکار رہا تھا مگر اس کو اس کی بھی پروا نہ تھی۔ کبھی بچوں کو ڈانٹتا تھا، کبھی عورت کو سمجھاتا تھا اور برابر چلا جا رہا تھا۔ دن ڈھلنے کے قریب تھا کہ عصبہ ایک دفعہ پھر گر پڑی اور ساتھ ہی دونوں بچوں نے بری طرح رونا شروع کر دیا۔ بدو

نے عورت کو طرح طرح سے دھمکایا، ڈانٹا، مگر اس نے جواب نہ دیا۔ وہ بے ہوش تھی۔ آخر اس نے بچوں کو گود سے اتار پیٹھ پر سے گھما کر مشکیزہ سامنے کیا اور عورت کے پاس بیٹھ کر پہلے دونوں بچوں کو تھوڑا تھوڑا پانی پلایا، پھر بے ہوش عورت کے منھ میں تھوڑا پانی ٹپکایا۔ جب وہ ہوش میں آگئی تو اسے بھی پانی پلایا اور کہا، ''عصبہ، ہمارے واسطے موت سہل ہے، جینا مشکل ہے، لیکن ہماری موت تمام قبیلے کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔ دیکھ، عرب کی عورتوں نے کیسی کیسی بہادریاں دکھائی ہیں۔ تجھ کو اس قدر بزدلی ظاہر کرتے شرم نہیں آتی؟ آ بہادر عورت، قبیلہ منکاف کی نام لیوا عورت، چل، ہمت نہ ہار۔''

دونوں پھر چل پڑے۔ اس نہ ختم ہونے والے ریت کے سمندر میں چلے، اور چلے، یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا اور چاند کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ اب گرمی میں کمی آگئی تھی۔ خنکی بڑھتی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر نہ گذری ہوگی کہ کافی ٹھنڈک ہوگئی۔ نصف شب کے قریب پھر روتی ہوئی عورت زمین پر گر پڑی اور بولی، ''اچھا اے حامد کے باپ، تو اپنے خنجر سے میرا خاتمہ کردے اور تو میرے دونوں بچوں کو لے کر نکل جا۔ خدا تیری مدد کرے اور تم تینوں کو زندہ سلامت منزل تک پہنچائے۔''

بدو نے کہا، ''نہیں، اب تو آرام کرسکتی ہے۔ لے تھوڑا سا پانی بھی پی لے۔ میں بچوں کو بھی لٹائے دیتا ہوں۔ دونوں سو گئے ہیں۔ ایک ساعت باقی ہوگی جب ہم پھر چل دیں گے۔'' ریگستانوں میں جس طرح دن گرم ہوتے ہیں ویسے ہی راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ عصبہ نے جو کچھ اس کے پاس تھا بچوں کو اُڑھا دیا تھا۔

سردی اور پیروں کی تکلیف کی وجہ سے وہ جلد بیدار ہوگئی۔ اس کی پنڈلیاں پھٹی جارہی تھیں اور پیروں کے تلووں میں چھالے آگ کے انگاروں کی طرح بے چین کیے ہوئے تھے۔ ان تکالیف سے اس کی نیند تو ضرور اُچٹ گئی تھی لیکن اب وہ پریشان اور ہراساں نہ تھی۔ اس کو یقین کامل ہوگیا تھا کہ صبح ضرور اس کا شوہر کہیں نہ کہیں سے ایک اونٹ ڈھونڈھ لے گا یا کوئی قافلہ ہی مل جائے گا، کیوں کہ بہت ہی دور افق مشرق پر ایک نہایت ہلکی سی سرخ روشنی سی معلوم ہورہی تھی اور اس سمت میں یا تو کوئی بڑا قافلہ پڑاؤ ڈال ہوئے ہے یا کوئی بستی ہے۔ اب یہ اطمینان سے لیٹی ہوئی اپنی دکھتی ہوئی جانگھوں اور پنڈلیوں کو دبا رہی تھی۔ ہلکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی کیوں کہ چاند ڈوبنے کے قریب تھا۔ اس کو بار بار یہ خیال آرہا

تھا کہ کل شام تک، یا نہیں تو پرسوں صبح کو، وہ ضرور اپنے شوہر کے قبیلے سے جا ملے گی۔ سب خوش ہوں گے۔ تمام عورتیں اکٹھا ہوں گی۔ موسیٰ کی عورت اس سے اپنے تین درموں کا تقاضا کرے گی۔ اب کے وہ نہ مانے گی۔ حامد کے باپ سے اگر اس نے کہہ دیا تو بہت برا ہوگا۔ اور وہ کہے گی ضرور۔ پھر حامد کا باپ ظلم کرے گا۔ کیوں قرض لیے؟ کب لیے؟ مجھے کیوں نہ اطلاع دی؟ لیکن خیر، میری ساس مجھے بچا لے گی۔ خدا اس کو سلامت رکھے۔ یہ ان ہی خیالات میں تھی کہ حامد کا باپ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔ تاروں کو پہچانا اور بولا، ''عصبہ اٹھ، صبح ہونے میں اب دیر نہیں ہے۔ ہم کو روانہ ہونا چاہیے۔ بس اب اٹھ بیٹھ۔'' عصبہ نے کہا، ''میں جاگ رہی ہوں۔ تم آ کر میرے پیروں کے تلوے دیکھ لو۔''

ثامن: کیا مطلب؟ تو یہیں رہنا چاہتی ہے؟ اچھا تیری خوشی، میں اور بچے جاتے ہیں۔

عصبہ: تم میرے تلوے دیکھ تو لو۔ تم کو تمھاری آنکھوں کی قسم، دیکھو۔

ثامن: دیکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟

عصبہ: فائدہ یہ ہوگا کہ پھر تم مجھ کو پیدل چلنے کے واسطے مجبور نہ کرو گے۔

ثامن: سواری؟ سواری؟ یہاں؟

عصبہ: سنو سنو۔ ہاں اگر تم کوشش کرو تو یہاں سواری مل سکتی ہے۔ دیکھو، ادھر مشرق کی طرف آگ جل رہی ہے۔ یا تو بستی ہے یا قافلہ ٹھہرا ہے۔ جا کر دیکھو، اگر یہ لوگ دوست ہوں تو خوشی سے، ورنہ چرا کر اونٹ لے آؤ۔

ثامن بڑی دیر تک خاموشی سے اسی سمت میں دیکھتا رہا، پھر بغیر گھومے ہوئے عورت سے کہا، ''یہ روشنی! یہ روشنی عجیب ہے۔ کس چیز کی ہے؟ قافلہ ممکن ہے مگر روشنی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ بستی تو ہے نہیں۔

عصبہ: کیوں؟ کیا تعجب ہے کہ بستی ہی ہو۔

ثامن: بستی میں صبح دم روشنی نہیں ہوا کرتی۔ دوسرے یہاں کہیں کوئی بستی نہیں ہے۔ اگر یہ قافلہ ہے تو بہت بڑا قافلہ ہے۔ لشکر کا پڑاؤ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں عصبہ، تو تو اندازہ لگا، کتنا فاصلہ ہوگا۔

عصبہ: فاصلہ مجھے کم معلوم ہوتا ہے۔

ثامن: قسم ہے خدا کی، عصبہ، یہ روشنی عجیب ہے۔ روشنی کو دیکھتے ہوئے تو ان لوگوں کی آوازیں یہاں تک آنا چاہییں مگر بڑی خاموشی ہے۔ نہ کوئی اونٹ بولتا ہے، نہ کوئی ڈیروں کی میخیں اکھاڑتا ہے۔ اچھا تم سب کو خدا کی حفاظت میں دیا۔ میں جاتا ہوں۔ سواری جس طرح بھی ہوگا لے کر آؤں گا۔

یہ کہتا ہوا ثامن روشنی کی طرف نہایت تیز قدم چل دیا۔ عصبہ پھر اپنی جانگھوں کو دابنے اور خوش آئند خواب دیکھنے میں لگ گئی۔ سوچتے سوچتے قبیلے میں پہنچ گئی۔ وہاں کسی بات کا جشن منایا جا رہا تھا۔ ایک اونٹ ذبح ہوا تھا۔ عورتیں اس کے کباب لگا رہی تھیں۔ مرد ڈفلیاں بجا بجا کر ناچ رہے تھے۔ ایک عورت کھولتی ہوئی چربی اس کے پاس سے لیے جا رہی تھی۔ برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ جلتی ہوئی چربی اس کے تلووں پر گری۔ کلبلا کے عصبہ اٹھ بیٹھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ شوہر اس کا پیر مضبوطی سے پکڑے تلوے کے چھالے اپنے پیش قبض سے چیر رہا تھا۔

عصبہ: ہائے ہائے! میں مری! میرا پیر چھوڑ دو۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ ارے تم تو میرے واسطے سواری لینے گئے تھے۔ ارے میرا پیر! ارے چھوڑو۔ ارے سواری لاؤ۔ تم گئے نہیں؟

ثامن نے تلوے کا چھالا جو کہ بیچ پیر میں پنجوں تک تھا، نہایت اطمینان سے چیر کر اس کی مردہ کھال کاٹ ڈالی۔ اور پھر دوسرا پیر پکڑ کر چیختی چلاتی عورت پر وہی عمل جراحی کیا۔ جب اس سے فراغت کر چکا تو پیش قبض کمر میں باندھ کر روتی ہوئی عورت کو ہاتھ کے اشارے سے باری باری دو چاند دکھائے۔ اول مغرب کی طرف حسرت زدہ اصلی چاند جو کہ ڈوب رہا ہے، پھر مشرق کی طرف سرخ انگارہ، نیا منحوس چاند، اور بولا "اے میری وفادار عصبہ، پریشان نہ ہو۔ یہ کام ابلیس کا ہے۔ وہ ہم کو بہکانا چاہتا ہے۔ دیکھ، میں نہ کہتا تھا کہ یہ روشنی عجیب ہے۔ جسے کہ تو شہر یا قافلہ کی روشنی سمجھتی تھی اس ہی بدبخت ابلیس کی روشنی تھی۔ میں ایک گھنٹہ متواتر اس کی طرف چلا۔ جب میں نے اس کا کنارہ دیکھ لیا تو فوراً واپس لوٹا۔ اب یہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ لیکن صاحب ایمان مسلمان کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ دور ہی سے ڈرائے تو ڈرنے والا نہیں ہوں۔ میرے باپ حارث کو بھی ایک دفعہ دشت میں ابلیس گدھے کی صورت میں ملا تھا۔ کلمہ طیبہ اور آیت الکرسی کے آگے اس کی کچھ نہ چلی۔ عصبہ، بہادر عصبہ،

وفادار عصبہ! تیرے پیروں کے چھالے میں نے کاٹ ڈالے ہیں۔ تو اپنی عبا پھاڑ کر تلووں میں لپیٹ کر اٹھ کھڑی ہو۔ منزل دور ہے، بہت دور ہے۔ یہاں پڑے پڑے بغیر پانی کے سوکھ کر مرنے سے منزل کی طلب میں مرنا بہتر ہے۔ اٹھ عصبہ، اٹھ۔" لیکن جوں جوں نیا چاند اوپر کی طرف بلند ہو رہا تھا حارث کے دل کی حرکت مدھم پڑتی جا رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ جھکا اور پھر سجدے میں، اس پروردگار کے آگے آخری دم تک سجدہ کرتا رہا۔

نیم کی نمکولی

ہمارا قصہ سنہ ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کو آئندہ نسلیں برٹش گورنمنٹ کے انتہائی عروج کا زمانہ کہیں گی۔ گورنمنٹ کا ہندوستان پر مکمل تسلط ہوئے پچاس سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ لوگ امن اور سکون کی زندگی کے عادی ہو گئے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے شاہی دربار مٹ کر ہر اعلےٰ افسر انگریز کا بنگلہ بذاتِ خود ایک دربار ہو گیا ہے۔

یوں تو ہر طرف انصاف اور قانون کا دور دورہ ہے لیکن صاحب بہادران حاکم وقت ہیں، اس لیے تمام قوانین سے بالاتر ہیں۔ اگر ان کی ناراضگی عتاب کی پیشین گوئی ہے تو ان کی مسکراہٹ خوش نصیبی کا باعث ہے۔ اب ان ہی چھوٹے چھوٹے درباروں سے فیض کے چشمے جاری ہیں جہاں کہ حاجت مند مختلف ذرائع سے رسائی پیدا کرتے ہیں۔

۱۹۰۵ء کو منشی احتشام علی، تحصیلدار تحصیل بیل پور، ضلع پیلی بھیت، تمام تزک اور احتشام سے تحصیل کے برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ دو بڑی ڈالیاں مزدوروں کے سر پر زیر نگرانی منشی صاحب روانہ ہو چکی ہیں۔

ایک ٹم ٹم، جس میں سبز گھوڑا جتا ہوا ہے، سامنے کھڑی ہے۔ آٹھ بجے کا وقت ہے لیکن دائیں بائیں لال، ہرے اور سفید شیشوں سے مرصع دو لالٹینیں دو آنکھوں کی طرح چمک رہی ہیں (نئی موم بتیاں دونوں میں ہیں)۔ پائیدان میں گلابی پھولدار قالین کا ٹکڑا بچھا ہوا ہے۔ سیدھے ہاتھ پر پانچ

فٹ اونچا چابک نشان کے پھریرے کی طرح لہرا رہا ہے۔

منشی احتشام علی صاحب برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہاتھوں سے تسبیح کے دانوں کو اور زبان سے خانگی احکامات دے رہے ہیں۔

ایک ملازم صاحب ایک چھڑی اور ایک آبنوسی نقشین عصا دستی لیے برآمد ہوئے۔ ان کی سفید ڈاڑھی ہے، سفید پٹے نما بال، سفید کپڑے ہیں۔ آپ داروغہ ڈیوڑھی خاص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے عصا تحصیلدار صاحب کی آرام کرسی سے لگا کر رکھ دیا اور چھتری لے کر ٹم ٹم کی طرف بڑھے۔ آواز آئی:

''اجی میر صاحب قبلہ، آپ بھی بالکل وہی ہیں۔ اسے کھول کر تو دیکھیے۔''

میر صاحب نے چھتری کو دو تین جھٹکے دے کر کھولا۔ کچھ دھول اس میں تھی، اسے اڑا کر بند کرنے کو تھے کہ پھر حکم ملا، ''ڈنڈی بھی، ڈنڈی۔'' چنانچہ ڈنڈی بھی صاف کی گئی۔ چھتری رکھ کر جب میر صاحب واپس آئے تو پھر حکم ملا، ''دیکھیے کیا دیر ہے۔ کہیے جلدی آئیں۔''

میر صاحب آہستہ خرام بلکہ مخرام پر عمل درآمد کرتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف بڑھے۔

یہ مکان سرکاری تحصیل کا مکان ہے اور کافی بڑا ہے، جس کا آدھا حصہ تحصیل کا دفتر اور کچہری کا کام دیتا ہے اور آدھا تحصیلدار کی رہائش کے لیے ہے جس کی انگنائی بہت بڑی ہے۔ اس کے سامنے ایک سرے سے دوسرے تک ایک لمبی کھپریل کا برآمدہ ہے اور اس کے نیچے چھ کوٹھریاں ایک قطار میں ہیں۔ دو میں بھوسا، ایک میں لکڑی، ایک میں مرغیاں، ایک میں چار بکریاں، دو بکرے اور چھ بچے بند ہوتے ہیں۔ ان ہی دونوں کوٹھریوں کے سامنے دو بھینسیں بندھتی ہیں جن کے منہ کے نیچے بھوسے کی بھری ناندیں ہیں اور پیروں کے نیچے گوبر اور گندگی، پھر کچی زمین کی مٹی —— معجون مرکب ہے۔

برآمدے کے بیچ میں گھی بنانے کی ایک مکمل فیکٹری ہے، یعنی پیڑھی، دہی کی مٹکی، بڑا مٹکا، کھونٹا، رسیاں، سب کچھ ہے مگر آدمی وہاں کوئی نہیں، صرف کالا بلا مٹکی میں منہ ڈالے اوپر اوپر کی بلائی اس طرح منہ بنا کر کھا رہا ہے گویا کوئی نہایت بدمزہ دوا جبریہ نگل رہا ہے۔

بکرے بلی ان سے بھی زیادہ بیزار سی نظر آتی ہیں۔ پیڑھی پر منڈیا نہوڑے سو رہی ہیں۔ باقی

برآمدے میں مرغیوں کی گندگی ہے، مرغیاں ہیں، بطخوں کی ہر طرف گندگی، بکری کی مینگنیاں ہیں۔ ہے سب گڈمڈ۔ نہ مرغیوں میں بطخیں چنی جا سکتی ہیں نہ گندگی میں سے دانہ۔ رہی بے چاری کتیا بجلی، وہ الگ کونے میں اپنے چھوٹے سے گڈھے میں پانچوں بچوں کو لیے پڑی ہے جن کی آنکھیں ابھی نہیں کھلیں۔ نہ وہ کسی سے بولے اور نہ دوسرے کا بولنا گوارا کرے۔ بطخا جب اُدھر جاتا ہے بھوں کر کے بھگا دیتی ہے۔ انگنائی میں تین پلنگ پڑے ہیں جن پر بچوں کے کپڑے، ماں کے کپڑے، سوزنیاں، لحاف، توشک پڑے دھوپ کھا رہے ہیں۔ اور ہاں، ان سب پر دو بکری کے بچے اونچا نیچا ٹیلا کھیل رہے ہیں۔

سامنے کی طرف برآمدے میں عنایت حسین، بائیس برس کا ایک لڑکا، ترکی ٹوپی، کشمیرے کا ٹرکش کوٹ، سفید فلالین کی اونچی تنگ مہری کی پتلون، پیروں میں بادامی پتلی نوک کا فل بوٹ پہنے کھڑا ہے۔

ماں پائنچوں دار پاجامہ، ناف سے اونچا شلوکہ پہنے، اس کے برابر میں کھلا قرآن شریف ہاتھ میں لیے کھڑی کچھ پڑھ رہی ہیں۔ اردگرد نو بچے، چار عورتیں، تین مامائیں اور ہیں، اور سب ان دونوں کو خاموشی سے دیکھ رہے ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ آج منشی احتشام علی صاحب اپنے بڑے لڑکے کو کمشنر صاحب سے ملانے کے واسطے لے جا رہے ہیں۔ صاحب زادے ماشاءاللہ سے انٹرنس میں تین سال مسلسل فیل ہو کر فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ اب ان کی بھی نوکری کی فکر ہے۔ خدا کی رحمت، کمشنر صاحب بہت مہربان ہیں۔ پہلے سے تحصیلدار صاحب کو جانتے ہیں۔ آج کل دورے پر آئے ہوئے ہیں، بہت اچھا موقع ہے، اس لیے احتشام علی صاحب کمشنر صاحب کے دربار میں حاضری کے واسطے تیار بیٹھے ہیں۔ باہر سے برابر تقاضے آ رہے ہیں۔ ''چلیے، سرکار انتظار میں بیٹھے ہیں،'' لیکن میاں اسی طرح گھرے ہوئے ہیں۔ ماں جب سب دعائیں پڑھ چکیں تو قرآن شریف کی ہوا لڑکے کو دی۔ پھوپھی خالہ نے بڑھ کر بلائیں لیں۔ ایک بہن نے، جو ان سے چھوٹی تھی، آ کر چپکے سے ہاتھ میں کچھ دیا۔ ''میاں بھائی، راستے میں جو فقیر ملے اسے دیجیے گا۔ فرنگی حاکم سے خوب اطمینان سے باتیں کریے گا۔ مجھے خوب بڑی نوکری دیں، اور پھر میرے خاندان کو تو دیکھیے۔ میاں بھائی، ڈپٹی کی جگہ لیجیے گا۔'' وقار حسین نے ہنس کر محبت کے لہجے

میں کہا، ''جہاں آرا، تو تم بھی نہ ساتھ چلو۔ جہاں میں بھول جاؤں تم بتاتی جانا۔'' ''اوئی میاں بھائی، میں کہاں چلوں۔ ہاں، ہاں، میں مرد ہوتی تو میں خوب باتیں کرتی اور بڑی سی نوکری لے کر آتی۔'' ''میاں بھائی اللہ کرے جج ہوں۔ ڈپٹی ہو جائیں''، ان سے چھوٹی رفعت آرا بولیں۔ ''میرے مولا، میاں بھائی کو بڑی نوکری ملے تو میں تو میاں بھائی سے کہوں ویسے ہی بندے بنوا دیں جیسے نائب صاحب کی لڑکی پہنے تھی۔''

سب سے چھوٹی شوکت آرا بولیں، ''میاں بھائی تو میرے ہیں، مجھے لا کر اچھی اچھی چیزیں دیں گے۔'' ان سب سے چھوٹا ایک بھائی اور ہے، افتخار۔ اس کی نگاہ میں یہ وقت ایک بادشاہ کی تاج پوشی سے کم وقعت نہیں رکھتا۔ وہ بہنوں کی اس بیہودگی سے ناراض سا ہے۔ سب سے بڑا بھائی اس کے آگے شاہ زادہ ہے، بادشاہ ہے۔ سب کچھ اس میں ہے۔ تمام تر بڑائیاں اس میں ہیں۔ تمام تر حسن اس میں ہے۔ محبت اس کے واسطے۔ افتخار خاموش اپنے بڑے بھائی کی عظمت اور شان کو دیکھ رہا ہے۔ جدھر اس کا منہ پھرتا ہے ادھر خود بھی جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کبھی اس طرف کھڑا ہے کبھی اُس طرف کھڑا ہے۔ ماما کی لڑکی میاں بھائی کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔ ہاتھ پکڑا الگ گھسیٹ لیا۔ بھائی کے واسطے خالہ نے پان بنایا تھا، فوراً لیک کر پان میاں بھائی کو دیا۔ میاں بھائی رومال اندر تخت پر بھول آئے تھے۔ رومال نام سنتے ہی دوڑا۔ جب میاں بھائی گھر سے باہر چلے، دوڑ کر اس نے پہلے دروازے کھول دیے۔

ماں نے کہا، ''اللہ کی پناہ میں دیا۔ کہو قبول کیا۔''

میاں بھائی نے تو چپکے سے کہا، ''قبول کیا''، لیکن افتخار نے بڑی آواز میں، بہت متانت سے کہا، ''قبول کیا۔'' بیوہ پھوپھی نے کہا، ''میاں بیچ کے در سے جانا۔ کہو دہی مچھلی۔'' خالہ نے کہا، ''بسم اللہ کر کے برآمدے سے قدم نکالنا۔'' میاں اس طرح رخصت ہوئے۔ آگے آگے افتخار ہیں۔ ڈیوڑھی میں ان کے ہم عمر دو لڑکے کھڑے تھے۔ آفتاب الدین پھوپھی کا لڑکا، جو کہ نویں کلاس میں پڑھ رہا ہے، اور امانت عرف اچھی خالہ کا لڑکا، جو ہر تیسرے برس ایک درجہ پاس کرتے کرتے چھٹی کلاس میں آ کر تھک گیا تھا اور اب مختلف مشاغل میں مصروف رہتا ہے۔ زیادہ تر بازار کے پھیرے کرنے میں وقت کٹتا ہے۔ امانت نے کہا، ''لو بھائی، اب تم اللہ کے فضل سے تحصیلدار ہو گئے۔ ہمیں نہ بھول جانا۔ اب تاش

کیوں ہوں گے۔"

آفتاب بولا، "اس میں بھولنے کی کیا بات ہے۔ ارے بھائی آپس میں کبھی ایسا ہوتا ہے۔"
وقار حسین بولے، "ارے مجھے مل آنے دو۔ دیکھو تو کیا ہوتا ہے۔ ابھی سے سب اپنی اپنی اڑا رہے ہیں۔ اور تاش تو رات کو پھر ہوں گے۔ امانت، تم تو بالکل یوں ہی ہو۔"

منشی احتشام علی کی سالی کے آگے بڑی سینی میں دال چاول کھچڑی کے واسطے رکھے ہیں۔ یہ بیٹھی چن رہی ہیں اور باتیں کر رہی ہیں، "باجی، دیکھیے اپنے وعدے سے پھر نہ جایئے گا۔ اور بڑے پیر کی منت مانی ہے۔ خوب دھوم سے ہو۔ میں نے بھی تین روزے مانے ہیں اور وہ ہی تین روزے امانت کی نوکری کے واسطے بھی مانے ہیں۔ میرے لیے امانت اور وقار دونوں برابر ہیں۔ غریب آدمی ہوں، اور کیا کرتی۔ اللہ میرے امانت کو بھی نوکر رکھوا دے تو پھر ہاں البتہ میں اپنے دل کے ارمان نکالوں۔ یا اللہ، وقار کی شادی سے پہلے میرا امانت نوکر ہو جائے۔" جہاں آرا نے کہا، "خالہ اماں، میں نے مسجد میں چراغ جلانے کی منت مانی ہے۔ اللہ، آپ بتاتی جایئے گا کیسے جلاتے ہیں۔ ڈولی منگا لیں گے، مسجد چلیں گے۔"

"خالہ اماں، میں نے بڑے پیر کا روزہ مانا ہے۔" پھوپھی ترکاری صاف کر رہی تھیں، چونک کر بولیں، "اے اوئی حسن آرا، یہ کیسی منت؟ بڑے پیر کے روزے تو ہوتے نہیں، یا ہوتے ہوں گے۔ کیوں بہن، بولو۔" خالہ نے سینی سے سر اونچا کر کے کہا، "نہیں، میں نے بھی نہیں سنے۔" پھوپھی بولیں، "خیر کیا ہے۔ (حسن آرا سے) رکھ لینا۔" خالہ نے کہا، "واہ بہن، روزہ نماز میں ایسے ہی بے سوچے سمجھے کوئی بات تھوڑی کی جا سکتی ہے۔ اور پھر منت کی بات ہے۔ حسو بیٹی (حسن آرا کا عرف)، کل مولوی صاحب جب تم لوگوں کو پڑھانے آئیں تو پوچھ لینا۔ بھولنا نہیں، ضرور ضرور۔"

احتشام علی کی بیوی شوکت کی چوٹی گوندھ رہی تھی، بولیں،

"ارے بہن چن چکو، ایک پہر دن چڑھ گیا۔ کب کھچڑی چڑھے گی، کب پکے گی؟ تمھارے دولھا بھائی آتے ہوں گے۔"

’’ہاں بس ختم ہے۔ تھوڑی اور رہ گئی ہے۔ مجھے تو دال زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ نصیبن بوا، دال چاول تولے بھی تھے کہ یوں ہی انداز سے نکال لیے تھے؟‘‘

نصیبن پلنگ پر چڑھی بیٹھی پان پر پان کھا رہی تھیں۔ کبھی کتھا چاٹا کبھی چونا، اور پھر ٹکڑا پان کا منہ میں رکھ لیتی ہیں۔ بولیں، ’’ہاں ہاں، تول کر لی ہے۔ دو سیر چاول پونے دو سیر دال۔‘‘

احتشام علی کی بیوی نے اب ادھر دیکھا اور جھنجھلا کر بولیں، ’’ہاں، تم یہیں بیٹھی پاندان کا صفایا کرتی رہو۔ اور دھوپ چڑھ رہی ہے۔ دہی مٹکی سب پڑے بھنک رہے ہیں۔ چلو تو۔ واہ اور لو! اب خاک مکھن نکلے گا۔‘‘

شوکت کو جو ذرا مہلت ملی تو نکل گئیں، آدھا سر گندھا آدھا بے گندھا۔ رفعت آرا کے ساتھ گڑیوں میں لگ گئیں۔ ماں نے مڑ کر دیکھا۔ کنگھی پٹخ کر بولیں، ’’بھئی ہوگا،‘‘ اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

۲
قافلے کی پہلی منزلیں

نیم کی نمکولی پکی ساون کب آوے گا
جیوے میرا ایرن بھیا ڈولی بھیج بلاوے گا

دوپہر کا وقت ہے۔ انگنائی کے ایک کونے میں دو بلّیوں پر ایک جھولا پڑا ہے۔ کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ منجھلی لڑکی حسن آرا، ساس لیٹ کے پاجامے کے پائنچے لٹکائے، ناف سے ایک انگل اونچا شلوکہ پہنے، دوپٹہ گردن میں الجھائے اور پیچھے پیچھے اڑاتی ہوئی دونوں ٹانگیں پھیلائے ہلکے ہلکے پینگ لے رہی ہے۔ پاجامے کے پائنچے زمین کو جھاڑو دے رہے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ گا رہی ہے:

نیم کی نمکولی پکی ساون کب آوے گا

اتنے میں رفعت آرا بھی چپکے سے آ جاتی ہے۔ کچھ دیر کھڑی ہو کر بہن کو دیکھتی ہے، پھر اس کے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ آتی ہے اور اس کو برداشت سے چھپا کر وہ آہستہ آہستہ قریب جاتی ہے۔ جیسے ہی بہن

پینگ لیتی ہوئی پاس سے نکلتی ہے، منھ بڑھا کر کان میں کہتی ہے، ''باجی ابھی سے؟ پہلے چلی تو جاؤ۔''

اتنا کہہ کر بھاگنے کی کوشش کرتی ہے، مگر باجی جھولے سے کود جھپٹا مارتی ہیں اور ہاتھ لمبا کر کے، شانہ پکڑ کر گھسیٹ، کچ کچ کچ دو چٹکیاں شانے پر اور دو گورے گورے گالوں پر لیتی ہیں۔ رفعت دو نعرے ''اوئی! اوئی!'' کے لگا کر بھوں بھوں رونے لگتی ہے۔ سامنے شوکت ہاتھ میں جھاڑو کا تنکا لیے گڑیا کی آنکھ میں سرمہ لگا کر رہ جاتی ہے اور چلاّتی ہے، ''دیکھیے اماں، دیکھیے۔'' برآمدے کے دوسرے سرے سے خالہ کہتی ہیں، ''میں سب دیکھ رہی ہوں گا۔ اچھا حسن آرا، اچھا۔''

حسن آرا بھن بھن کرتی ہوئی پھر جھولے کی طرف لوٹتی ہے، مگر گرے ہوئے پائنچوں میں الجھ کر دھم سے گرتی ہے۔ آنسو بھرا چہرہ گھما کر رفعت کہتی ہے، ''اچھا ہوا!'' حسن آرا کھڑی ہو کر دونوں سیب کی طرح گال پھلا کر کہتی ہے، ''منھ سڑ جائے۔'' خالہ نے کہا، ''میں سب حرکتیں دیکھ رہی ہوں۔ باجی کو سو کر اٹھنے دو۔ کیا انداز ہیں! واہ خدا نہ کرے، نہ معلوم آج کل کی لڑکیوں کے کیسے ہوائی دیدے ہیں۔ ہوش میں آؤ، دوپٹہ سنبھالو۔'' حسن آرا کھس کھس روتی ہوئی ایک چارپائی پر جا بیٹھی اور رفعت دوسری پر۔

پھوپھی پان دھوتے سے اٹھ کر ہنستی ہوئی پاس آئیں اور باری باری دونوں سے بہتیرا پوچھا، کیا ہوا، کیوں لڑائی ہوئی، مگر نہ اِس نے جواب دیا نہ اُس نے۔ کنواری بالی لڑکیاں، بھلا کیسے بولتیں۔ نہ معلوم کیوں کر سیڑھی در سیڑھی چل کر نصیبن سے اللہ رکھی، اللہ رکھی سے کریمن اور کریمن سے ان لوگوں تک خبریں پہنچتی تھیں۔ جہاں آرا اور حسن آرا، دونوں کی بات ٹھہر رہی تھی۔

کچھ آنے والی زندگی کی امیدیں، کچھ میکے کے چھٹنے کا غم، پھر ان سب پر حاوی بھائی، میاں بھائی کی محبت اس گھنگھور گھٹا میں معصوم دل کو ہیجان میں ڈالے تھی اور کعبے کی دہلیزوں کی طرح پاک لبوں سے یہ گیت نکل رہا تھا جو ایک لڑکی اپنے میکے جانے کے انتظار میں کہتی ہے کہ ساون میں مجھے بلانے کا وعدہ تھا، برسات بھی آ گئی، نیم کی نمکولیاں بھی پک گئیں، مجھے لینے کو کوئی نہیں آیا۔ پھر آب حیاتِ زندگی یعنی امید ڈھارس دیتی ہے، بھائی پیارا بھائی نہیں، سب بھول جائیں مگر وہ نہ بھولے گا۔ ضرور آ کر مجھے لے جائے گا اور پھر اماں، گھر، اپنا گھر۔ یہ خیال تھا ان لفظوں میں۔

نیم کی نمکولی پکی ساون کب آوے گا

جیوے میرا بیرن بھیا ڈولی بھیج بلاوے گا

لیکن یہاں کچھ سے کچھ ہوگیا۔ ایک اِدھر بیٹھی بسور رہی ہے دوسری اُدھر۔ ڈیوڑھی سے پکارنے کی آواز آئی، ''کریمن!'' سب کے کان کھڑے ہوگئے۔

پھوپھی بولیں، ''جلدی جا کریمن۔'' کریمن کنڈے بنا رہی تھی ویسے ہی بھرے ہاتھوں سے دوڑی۔ حسن آرا نے ہنس کر کہا، ''میاں بھائی آگئے۔'' رفعت آرا بولیں، ''میرے میاں بھائی آگئے۔'' ایک ہاتھ میں تنکا، دوسرے میں گڑیا کا پیر، الٹی لٹکی ہوئی گڑیا کی چوٹی کی نوک زمین پر گھسٹتی ہوئی۔

مجھے اپنے بچپنے کا ایک واقعہ یاد ہے کہ ایک دفعہ کڑکی لگا کر چڑیا کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ آواز آئی، ''گنے لو گنے۔'' ''گنے والے'' پکارتا ہوا دوڑا۔ کڑکی سے ستلی میں الجھ کر اوندھے منہ گرا۔ متواتر رویا کیا۔ پہلے گر پڑنے پر اور بعد میں گنے والے کے نکل جانے پر۔ صرف اس وقت کے پانچ منٹ کے رونے کے واسطے آئندہ کی تمام زندگی بیچتا ہوں۔ ہے کوئی طریقہ کہ وہ وقت پھر واپس آجائے؟

ڈیوڑھی کی طرف دوڑیں۔ کریمن نے پھر ڈیوڑھی سے سر نکالا اور دونوں گوبر کے بھرے ہاتھ اونچے کر کے چلائی، ''ارے بوا ظہورن، اسے چھوڑ دو، چکی پھر چلانا۔ میرے ہاتھ بھرے ہیں۔''

خالہ نے کہا، ''کم بختو، بتاؤ، وقار میاں آئے؟''

میر صاحب نے خود ہی ڈیوڑھی میں سے مری ہوئی آواز میں کہا، ''سرکار ساڑھے چار بجے کی گاڑی سے آئیں گے۔'' افتخار حسین، منہ لال، پسینے میں شرابور، ڈیوڑھی میں سے یہ کہتے ہوئے وارد ہوئے، ''میاں بھائی آگئے۔ آم لائے ہیں۔ دو ٹوکرے لائے ہیں۔'' رفعت کی طرف غرور سے آنکھیں گھما گھما کر بولا، ''دیکھا، میرے میاں بھائی آم لائے۔'' خالہ بولیں، ''اوئی اترانا تو دیکھو۔''

ڈیوڑھی میں نصیبن نے ایک دفعہ ٹوکروں پر زور لگا کر کریمن کو دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا۔ ''نیک بخت، مجھ سے اکیلے اٹھیں گے! جا ہاتھ دھو۔'' کریمن جھولے کے پاس اکڑوں بیٹھ گئیں۔

دونوں ہاتھ ڈنڈوں کی طرح آگے بڑھا دیے، کوئی ہاتھ دھلا دے۔ تحصیلدارنی بھی آنکھیں ملتی آ گئیں۔ جہاں آرا بھی ہاتھ میں لیس لیے نکل آئی۔ آم کے دو بڑے چھابے آ گئے۔ شوکت اور افتخار نے ان کو کریدنا شروع کر دیا، کوئی اس لیے نہیں کہ آم کھائے نہ تھے۔ گھر میں اب بھی موجود ہیں۔ گٹھلیوں چھلکوں کے ڈھیر۔ ابھی مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ لیکن یہ تو میاں بھائی لائے ہیں۔ اماں نے کہا، "کم بختو، ٹھہرو، میرے بچے کو تو آ جانے دو۔" میر صاحب پھر ڈیوڑھی پر بلائے گئے۔ بیوی نے خود پکار کر کہا، "میر صاحب، آپ کیسے رہے؟ وقار میاں اچھے ہیں؟ ان کا سب طرح خیال رکھا؟ وقت پر کھانا کھلایا؟ بڑے بوڑھوں کا ساتھ رہنا اچھا ہوتا ہے اسی لیے تو آپ کو ساتھ کر دیا تھا۔ نوکری کا معاملہ، پہلے پہل کا جانا۔ اب خیر سے کب آئیں گے؟"

"جی سرکار، اچھا رہا۔ میاں میرے ہی ساتھ پیلی بھیت تک آئے تھے۔ وہاں ایک رئیس حاجی عبدالکریم صاحب ہیں ان کے پاس رک گئے ہیں۔ آم اور پھل بھی وہاں ہی سے لیے ہیں۔ شام کی گاڑی سے خود آئیں گے۔ سرکار، میں بڈھا آدمی ہوں۔ میاں کے واسطے کوئی نوجوان آدمی کام پر ہونا چاہیے۔ میری خدمت گذاری ان کے کب پسند آ سکتی ہے۔" یہاں بیگم صاحبہ ہنسیں۔ بہن اور نند کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولیں، "معلوم ہوتا ہے بنی نہیں۔" رفعت آرا نے بسور کر کہا، "اماں، مولوی صاحب آتے ہوں گے۔" خالہ نے کہا، "تو دم نکلا۔ ابھی رونے لگو۔" اور ان کا شانہ پکڑا۔ رفعت نے شانہ جھٹک کر کہا، "نہیں، بولیے اماں، میاں بھائی تو آ رہے ہیں اور ہم پڑھنے جائیں۔"

حسن آرا چپکے سے خالہ کے کولھے سے آ خر لگ بیٹھیں اور کان میں بولیں، "خالہ جان، اماں سے کہیے ہم کڑھائی چڑھائیں گے، گلگلے تلیں گے۔ میاں بھائی آتے ہوں گے۔" ماں کوئی دور تو نہیں ہیں، برابر کی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ بولیں، "ہاں ہاں، کیا حرج ہے۔ کریمن کو ساتھ لے لو۔ (بلند آواز سے) اللہ رکھی، دیکھو لڑکیوں کو گڑ اور تیل نکال دو۔" خالہ نے حسن آرا کے گول زانو پر چٹکی لے کر چپکے سے کہا، "اور تھوڑے دن ہیں چڑیل۔" حسن آرا اوئی کر کے اچھل پڑی۔ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس سے بڑی، جہاں آرا، لیس اور گولا لیے اندر کمرے میں چلی گئی۔ رفعت نے پھر رونا شروع کیا۔ "اماں، ہم تو نہیں پڑھنے جائیں گے۔ سب تو گلگلے تلیں اور ہم مولوی کے پاس بیٹھیں۔"

''اچھا نہ جانا۔ میں کہلوا دوں گی۔''

پھوپھی بولیں، ''ہاں بہن، پہلی بار بھائی نوکری سے آ رہا ہے۔ اللہ رکھے جاتے ہی لگ گئے۔ پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد آ رہے ہیں۔ خیر اچھا ہے، نوکری پر دل لگا۔ بھئی انتظار بھی تو بہت کیا۔ موئے فرنگی نے بڑی دیر لگائی۔ پورے ایک برس کے بعد نوکری ملی ہے۔ میرا آفتاب بھی آ جاتا تو اچھا ہوتا۔ دونوں بھائی ہوتے۔ بہن، اللہ رکھے ان سب کے دموں کو۔ لیکن اِدھر یہ نوکری پر چلے گئے، آفتاب بریلی میں، وہ ہی نگوڑے کیا کہتے ہیں، اے بولو (کسی نے کہا کالج) ہاں کالج میں پڑھنے چلا گیا۔ جیسے گھر سونا سونا ہو گیا اور اب یہاں،'' چپ ہو، آنکھیں گھما کر حسن آرا کی طرف، ''دیکھو بڑا دل گھبرایا کرے گا۔'' بھاوج لمبا سانس لے کر بولیں، ''پھر یہ تو ہونا ہی ہے۔ ہاں وقار کی دلہن آ جاتی۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے۔ لیکن اس نے انکار ہی کر دیا۔ ابھی وہ راضی ہی نہیں ہے۔ نہ معلوم آج کل کے لڑکوں کا کیا حال ہے۔'' نند بولیں، ''نہیں بھئی، ہمارے بچے لاکھوں سے اچھے ہیں۔ آج کل کے لڑکے... نہ معلوم کیا کیا ہو رہا ہے۔''

امانت بہت بڑا پوٹلا تھانوں کا لیے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ''لیجیے خالہ اماں، اب اور اس سے اچھے تھان بازار بھر میں نہیں ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ گلگلے اور پوریاں؟ اچھا اچھا۔'' ''میاں بھائی آ گئے؟'' ''آتے ہی ہوں گے۔'' ''امانت، میاں بھائی آ رہے ہیں۔'' ''بھیا، میاں آم لائے ہیں۔''

وقار حسین ڈیڑھ مہینے سے جہاں آباد کے تھانے میں افسر دوئم کا کام کر رہے تھے۔ اب صرف دو دن کی چھٹی لے کر گھر آ رہے تھے، وہ بھی اس لیے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک معاملے کے سلسلے میں جہاں آباد آنے والا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے، اس لیے ان دو چھابوں میں آم اور پھل وغیرہ ہیں۔ پیلی بھیت کے رئیس حاجی صاحب سے میز اور کرسیاں مانگی ہیں۔ ماشاء اللہ وقار دو برس علی گڈھ میں بھی پڑھ چکا ہے۔ اعلےٰ خیال نوجوان ہے۔ صاحب بہادر کو ٹی پارٹی دینے کا ارادہ ہے۔ افسر صاحب اتفاق سے مسلمان ہیں، لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ وہی پرانے خیال کے، ڈاڑھی والے نمازی آدمی ہیں۔ یہ بھی ڈر ہے کہ پارٹی میں کروں اور نام افسر اعلیٰ کا ہو۔ شامل نہ کروں تو پھر ان کے ساتھ گذارا کیسے ہو۔ مگر خیر، دیکھا جائے گا۔ سب کام اس تدبیر سے ہوگا کہ دونوں خوش رہیں۔ گھر آ

کر باپ سے سب حال بیان کیا۔ منشی احتشام علی نے بھی ہر طرح کی مدد کی۔ برتن، میز کے واسطے پلنگ کی چادریں، سب کچھ نکلوادیں۔ امانت کو بھی ساتھ کر دیا کہ مدد کرے گا۔ میر صاحب کو پھر ساتھ لے جانے کو زور دیا، مگر وقار نے ان کے لے جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ ''وہ تو بالکل ہی عقل سے خالی ہیں۔ میں نے ان کو چار سفید دستر خوان سلوا کر دیے تھے لیکن پھر بھی ایک دن ڈپٹی صاحب کی میں نے دعوت کی اور میر صاحب نے وہی اماں کے دیے ہوئے لال چھپے ہوئے دستر خوانوں میں سے ایک لاکر بچھا دیا۔ اب میں ہزار اشارہ کر رہا ہوں اور وہ گھگو سے کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ دن رات ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ جب پانی مانگا، ایک ہاتھ میں لوٹا اور دوسرے میں کٹورا لیے کھڑے ہیں۔ آخر میں نے عاجز ہو کر کٹورا اچھل ڈالا۔ میں نے ایک اور آدمی رکھ لیا ہے۔ آپ میر صاحب کو یہیں رکھیں۔ میں کل صبح چلا جاؤں گا۔''

منشی احتشام علی بولے، ''اچھی بات ہے۔ ان کی یہاں ضرورت تھی۔ جہیز کا سب ٹھیک کرنا ہے۔ لڑکے والوں کی طرف سے تقاضے ہو رہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تین مہینے کی چھٹی لے کر لکھنؤ چلا جاؤں۔ مکان کی بھی مرمت کروانا ہے۔ کھنڈر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ عرفان کو لکھا تھا کہ میں روپیہ بھیج دوں، تم مرمت کروا دو۔ لیکن انھوں نے لکھ دیا کہ بھائی، آپ ہی آکر مرمت کروائیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔''

وقار فوراً بات کاٹ کر بولا، ''چچا جان رہنے کے واسطے ہی ہیں۔ نہ روپیہ لگا سکتے ہیں، نہ مرمت ہی کرا سکتے ہیں۔'' منشی صاحب بولے، ''وہ بے چارہ نہ معلوم کس طرح اپنی ہی گذر کر لیتا ہے۔ وہ روپیہ کہاں سے لگا سکتا ہے۔ پھر میں بڑا ہوں، میرا فرض ہے۔ جیسے تمھاری نگاہ میں شوکت، رفیع اور افتخار ہیں، ویسے میرے آگے عرفان ہے۔ تمھارے یہ خیالات معلوم کر کے مجھے بہت صدمہ ہوا۔''

وقار نے بگڑ کر جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا، ''ابا، تو یہ بھی نہیں ہوتا کہ ایک اکیلے کے اوپر تمام خاندان کا بار پڑ جائے۔ آپ اکیلے کس کس کی مدد کر سکتے ہیں؟'' باپ کا جواب بھی نہ سنا اور کمرے میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد ٹم ٹم پر بیٹھ کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ امانت دونوں چھابے پھلوں کے اور بہت سامان لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔

دوپہر کو بھینسوں والی کھپریل کے نیچے بڈھی نصیبن اور گدرائی ہوئی کالی کریمن ٹانگوں میں ٹانگیں ڈالے، چکی کا کھونٹا پکڑے، دال دلتی جاتی تھیں اور باتیں کررہی تھیں۔

کریمن: دیکھو بوا، میاں داروگا ہوکر کیسے بدل گئے۔

نصیبن: کیسے ہوگئے؟

کریمن: اے ایسے ہی۔ گھمنڈ ہوگیا نا۔ اب باتیں ہی اور ہیں۔

نصیبن: ہاں، گھر میں آتے ہی تم کو گلے لگاتے۔

کریمن: تمھارے منہ میں جھلسنہ۔

نصیبن: اوئی اوئی، مرچیں لگ گئیں۔

کریمن: تم بات ہی ایسی کرتی ہو۔ میں کیا جھوٹ کہتی تھی؟ اب جو گھر آئے تو چار چار پلنگ پڑے ہیں، تخت بھی بچھا ہے۔ لیکن اِدھر دیکھ رہے ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ جب منجھلی نے اجلی جازم لاکر تخت پر بچھائی تو بیٹھے۔ افتخار میاں کو پیار بھی نہ کیا۔ اوئی نوج، اس موئے فرنگی کے ہی واسطے آم، کیلے اور پھل ٹوکری بھر لیے تھے۔ ایک ٹوکری اپنی بہنوں کے واسطے بھی لیتے آتے۔ جانے دو، ایک دونا مٹھائی کا ہی لاتے۔

نصیبن: ہاں ایک پتے میں رکھ کر دو جلیبیاں ڈیوڑھی میں بلاکر تم کو دیتے۔ تمھارے گال پر....

کریمن نے بڑھیا کا ہاتھ چکی کے کھونٹے سے جھٹک کر کہا، ''تم مرجاؤ اللہ کرے۔ نہ معلوم میرے پیچھے کیوں پڑی ہو۔''

کریمن وہاں سے چل دی۔ نصیبن نے مسکراتے ہوئے پکار کر کہا، ''کہاں چلیں؟ دال سمیٹو۔ میں بھی جاتی ہوں۔ میرا کیا ہے، بکریاں آکر سب کھالیں گی۔''

کریمن کی شادی بھی ایک یادگار رہے گی۔ وقار حسین کو نوکری پر گئے چھ مہینے ہوئے ہوں گے کہ جب تحصیلدار صاحب نے تین مہینے کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ ادھر دو مہینے سے امانت بھی

خیر سے نوکری پر تھے۔ پیلی بھیت میں کسی چنگی کی چوکی پر تھے۔ اتنے بڑے گھر کو سمیٹنا، اور کیسا۔ یہ تو تھا ہی نہیں کہ اسباب یہاں کہیں بند کرتے جائیں۔ اللہ رکھے لکھنؤ میں بیٹھ کے شادیاں رچانا تھیں۔ ادھر کریمن کی بھی بات ٹھہر چکی تھی تحصیل کے چپراسی کے لڑکے کلن کے ساتھ۔ درزی کی دکان کرتا تھا۔ لڑکا چال چلن کا اچھا تھا۔ اب اس کے باپ نے تقاضا شروع کیا۔ منشی احتشام علی نے بیوی سے کہا کہ لکھنؤ میں ہاتھ بٹانے والے، کام کرنے والے سیکڑوں مل جائیں گے۔ رخصت کرتی جاؤ۔ ان کی بیوی کی بھی سمجھ میں آ گیا۔ بہن اور نند دونوں کی رائے نہ تھی۔

''اے واہ بہن، اس چڑیل کا منھ کالا کرنے کی پہل کی کیا ضرورت ہے۔ خیر سے اپنی لڑکیوں کو رخصت ہو جانے دو، پھر واپس آ کر اسے بھی ڈھیل دیتیں۔'' لیکن نہیں، ان کے دل میں بھی آ گئی۔

''نہ معلوم بیوی، میں مری جی۔ کیا ہو، کیا نہ ہو۔ پھر یہاں آنا ہو کہ نہ ہو۔ میں اپنا فرض ادا کیے جاؤں۔ دو برس کی جان سے پالا ہے۔ مجھے تو اولاد کے برابر ہے۔'' آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ بڑا سا ایک لکڑی کا صندوق کھولا سامنے رکھا تھا۔ اس میں سے اپنے پرانے کپڑے نکال رہی تھیں۔ ''بہن، چن بن کر جیسا ہو سکے گا جہیز کیے دیتی ہوں۔ دیکھو، دس برتن تو ہو گئے، وہ تو تم کو معلوم ہی ہیں۔ یہ پاجامے میرے چالے پر اللہ بخشے بسنتی آپا کی ماں نے دیا تھا۔ اے تم کو تو وہ یاد بھی نہ ہوں گی۔ دیکھو، ایک یہ بھاری جوڑا کیے دیتی ہوں۔ شلوکہ اس کے ساتھ کے واسطے یہ نکالا ہے۔ اے ہے، مرگئی! دوڑو! دوڑنا! دوپٹہ بکری چبائے جاتی ہے۔'' بہن نے دوڑ کر بکری کو بھگایا اور چلائیں، ''اللہ رکھی! اوئی اللہ کی مار۔ سو دفعہ کہا کہ بکریاں باہر نکال آؤ مگر کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔'' ''اے بیوی، اللہ قسم، خدا کی قسم، اپنی جان کی قسم، صبح سے چار دفعہ نکال چکی ہوں۔ دروازے بند کر آتی ہوں، یہ موئی پھر گھس آتی ہیں۔ کوئی دروازہ کھول دیتا ہے۔'' دروازے سے میر صاحب کی آواز آئی، ''لالہ آئے ہیں۔''

غرض کہ اسباب بھی بند ہو رہا ہے اور کریمن کا زیور بھی بن رہا ہے۔ جہیز بھی ٹھیک ہو رہا ہے۔ سینے پرونے پر کس کا دل لگتا ہے، کچھ سلا کچھ بے سلا، ویسے ہی جو کچھ ہو سکا دے دیا۔ مانجھے کے واسطے لڑکیوں نے کریمن کو دو بار بٹھایا اور دو ہی بار بیوی نے پھر اٹھا لیا۔ گھر کا کام کون کرے، سب بکھرا پڑا ہے۔ کریمن ہاتھوں میں مہندی لگائے، پٹاپٹی کا پاجامہ پہنے، روتی کام کرتی پھر رہی ہیں۔ آخر وہ ہی ہوا

کہ پیر کے دن براتی آ کودے۔ جلدی جلدی دلہن بنایا گیا۔ براتی بیٹھیں کہاں، کھانا کہاں پکے۔ برتن بھی کم پڑے۔ پھر اسباب کھلا۔ وہ تو خدا کی شان سے موقعے پر امانت بے چارہ آ گیا۔ اِدھر دوڑا اُدھر دوڑا۔ سب کچھ اسی نے کیا۔ خدا خدا کر کے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ کھڑے ہیں۔ سب کہہ رہے ہیں، ہوں کرو۔ مگر کریمن زار و قطار رو رہی ہیں۔ نہ آج ہوں کرتی ہیں نہ کل۔ عورتوں میں سے کسی نے ہوں کر دی۔ منشی احتشام علی نے گھبرا کر پوچھا، "یہ کون ہے؟" رفعت جلدی سے بولیں، "ہماری پھوپھی۔" پھوپھی بولیں، "اے اک سان رو رہی تھی۔ میرا دل کڑھا۔ میں نے کہا لاؤ جلدی سے ختم ہو۔ میں نے ہوں کر دی۔" منشی نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا، "اچھا سزا ہے ان کی، بلاؤ کلن کو، لے جائے۔" آفتاب کی ماں کانوں پر ہاتھ دھرے بھاگیں۔

بہ مشکل تمام نکاح ہوا۔ رخصتی کے وقت کریمن کا رونا ایسا ویسا نہ تھا۔ آخر باجی نے انکار کر دیا۔ "نا بیوی، پرسوں رخصتی ہوگی۔ اِدھر میں ریل پر سوار ہوں گی، اُدھر دولھا کریمن کو لے جائیں۔ دو دن کی بات ہے، اور رہنے دیں۔" آخر یہی ہوا۔ جب بکریاں نائب صاحب کے یہاں بھجوا دیں، بھینسیں وقار حسین کے پاس جہاں آباد روانہ کر دی گئیں، مرغیاں اور بطخ پیش کار صاحب کے گھر بھیج دی گئیں، جب مال گاڑی کا ڈبا اسباب کا بھر کر روانہ ہو گیا، اور جب باقی صرف گیارہ عدد پلندے، سات عدد بقچے، پانچ عدد بقچیاں، آٹھ عدد چھابے، نو عدد بکس، تین عدد پاندان، چار عدد ناشتے دان، تین لوٹے، تین عدد صراحیاں رہ گئیں، جب ڈولیاں آ گئیں، بہلیاں اور رہلو آ کر کھڑے ہو گئے، تو اس وقت پہلے کریمن رخصت ہوئیں اور پھر سب آنسو پونچھتے اسٹیشن روانہ ہوئے۔ عورتوں کا سوار ہونا، دو گھنٹے پہلے سے سوار ہونے کے تقاضے تحصیلدار صاحب نے شروع کیے تو کہیں وقت پر اسٹیشن پہنچے۔ چھوٹا اسٹیشن، گاڑی کم ٹھہرتی تھی۔ پھر ماشاء اللہ اتنے عدد، اتنا اسباب، پردے کا اس قدر اہتمام۔ جازم چاندنیوں کے باقاعدہ راستے بنائے گئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے لال جھنڈی دکھا کر تین منٹ گاڑی روکی، جب جا کر سب سوار ہوئے۔ تیسرے درجے کا عورتوں کا ڈبا ویسے ہی چھوٹا، پھر اس میں پہلے سے اور عورتیں۔ اب سب کھڑکیاں بھی بند کر دی گئیں۔ اسی کھچ پچ میں نہ معلوم کس طرح گھس گھسا بجلی بھی آ موجود ہوئی۔ افتخار کے پیروں میں لیٹ گئی۔ یہ انھیں چمکار رہے تھے کہ جہاں آرا کی نگاہ پڑی۔ "اے ہے، یہ بھی آ گئیں!

نکالو، نکالو۔'' پھوپھی بولیں، ''کون کون؟'' ''جہاں آرا نے کہا،'' وہی موئی کتیا بجلی۔'' ''اے سچ تو ہے۔ اے ہے، ہم سب تو بھول ہی گئے تھے تو بچاری خود آ گئی۔ واہ، کیوں نکالو۔'' خالہ نے کہا،'' نگوڑی محبت کی ماری چلی ہی آئی۔ اس کا کسی نے خیال نہ کیا۔'' ریل سپاٹے بھرنے لگی۔ پیلی بھیت میں جب گاڑی بدلی گئی تو پھوپھی اور حسن آرا کے سر ہو جانے پر منشی احتشام علی نے اس کا بھی ٹکٹ لیا، ورنہ وہاں بھی اسٹیشن پر کئی ملنے والے تھے، کسی نہ کسی کے پاس چھوڑ جاتے۔ اس طرح بجلی بھی لکھنؤ پہنچ گئیں۔ صبح سات بجے گاڑی ڈالی گنج اسٹیشن پر پہنچی۔ رات بھر بچوں کو سودا لینے کو نہیں ملا۔ یہاں دو ایک سودے والے نظر آئے۔ ریل کے سفر میں بچوں کو سب سے زیادہ یہی خوشی ہوتی ہے کہ چیزیں مول لیں۔ اب کیا تھا، کھڑکیوں سے نکلے پڑتے ہیں۔ ادھر منشی جی نے آ کر کہا،'' ہوشیار رہو۔ اب کی آغا میر کی ڈیوڑھی آئے گا۔ سامان بٹورلو۔'' بچے ادھر دم دیے دیتے ہیں۔ خالہ کہتی ہیں،'' بھئی، میرا برقع دو، چادرہ رکھو۔'' منشی جی کی بیوی ایک ایک چیز سمیٹ رہی ہیں۔'' اے بھئی، تم پاندان ہی بند کر ڈالو، لوٹے میں گلاس رکھو۔ لاؤ، نیلی پتچی دو۔'' لیکن پھوپھی کب سنتی ہیں۔ بنچوں کے نیچے گھسی جاتی ہیں، جوتی ڈھونڈھ رہی ہیں۔ یہاں بچے'' اماں اماں گھٹیاں! اماں مونگ پھلیاں!'' بک رہے ہیں۔'' ارے یہی لے لو۔'' اتنے میں تحت اللفظ میں رسانیت سے ایک ایک لفظ ادا کرتی آواز آئی۔'' بچوں کے بولتے کھلونے۔'' اور ساتھ میں چوں چوں چوں چوں کی آواز آئی۔'' یہاں لاؤ۔ ادھر آؤ! ہم لیں گے!'' کی آوازیں۔ ایک بڑھیا، ٹوکرے میں روئی کے بھورے بال لگے، مٹی کے بوے اور دفتی کی منی سی دھونکنی پر چوں چوں کرتے چہرے لیے سامنے آ گئی۔ جلدی جلدی کسی نے دو اور کسی نے تین کھلونے لے لیے۔ گاڑی چل پڑی۔ پھوپھی اب بھی بنچوں میں سر ڈالے، جھک جھک کر جوتی ہی تلاش کر رہی تھیں۔ ایک دفعہ افتخار کے بوے پر بیٹھ گئیں۔ بوے کا کیا قصور، اچھل پڑیں۔ بوے کو غصے میں اٹھا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ افتخار نے رونا شروع کیا۔ اب منانے لگیں،'' اے میاں میری جوتی نہیں ملتی۔ ایک پیر تو ہے، الٹا نہیں ملتا۔ میں بوا اور منگا دوں گی۔'' افتخار جھلا کر'' جوتی میرے بوے نے کھودی جو اسے پھینک دیا؟ میں تو وہی لوں گا۔'' اس ہی تکرار میں آغا میر کی ڈیوڑھی کا اسٹیشن آ گیا۔ سب اتر گئے۔ پھوپھی باقی رہ گئیں۔ جوتی کی اب بھی تلاش جاری رہی۔ آخر ایک پیر میں جوتی پہنے پہنے اتریں۔ بھائی نے ہزار کہا،

''ارے، اسے بھی پھینک دو۔'' مگر یہ بگڑ بگڑ کر یہی کہتی رہیں، ''ہاں، ایک تو کھوگئی، دوسری بھی پھینک دوں۔'' ڈولیاں آئیں، پردے تنے۔ ریل سے سب اترے۔ دو شکرموں میں کھڑکیوں کی جھلملیاں چڑھا کر عورتیں اس میں بند کی گئیں۔ ایک کوچ بان کے ساتھ میر صاحب بیٹھے، دوسرے کے ساتھ امانت جو کہ نوکری کو شادیوں کی شرکت کے واسطے خیر باد کہہ کر ساتھ آگئے تھے۔ تیسری شکرم میں منشی جی اور منشی جی کے بھائی عرفان علی کے سالے راحت مرزا، چچازاد بھائی فدن صاحب۔ یہ لوگ اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ سب روانہ ہوگئے۔

نخاس پر کنکر والے کنویں کے پاس منشی احتشام علی صاحب تحصیلدار کا موروثی مکان تھا۔ اسی جگہ ملے جلے چار مکان اور تھے۔ یہ بھی سب انھیں کے رشتے داروں کے۔ ایک دوسرے میں کھڑکیوں یا زینوں سے راستہ تھا۔ دو چار رشتے دار تکا ڈولی کا راستہ۔ جو دور تھے جس وقت ان لوگوں کی بگھیاں کھڑکھڑاتی پہنچیں سب گھروں کی عورتیں احتشام علی کے مکان میں جمع تھیں۔ آٹھ برس کے بعد ان لوگوں کا آنا ہوا تھا۔ جوں ہی ڈولیوں پر ڈولیاں لگیں اور یہ لوگ اترے، سیکڑوں بلائیں لی گئیں، ہزاروں انگلیاں چٹخ گئیں۔ کوئی گلے لگ لگ کر رو رہا ہے، خوشی کے آنسو بہا رہا ہے، کوئی ہنس رہا ہے۔ ایک کہتی ہے، ''اے مجھ سے تو ملو''۔ دوسری کہتی ہے، ''ارے نگوڑیاں ننھی ننھی جانیں گئی تھیں، اب کیا پہچانیں۔ اے برسوں بعد ملنا ہوتا ہے، بیچاریاں کیا جانیں۔'' ''اے میری ایڑی دیکھو، یہ رفن ہے۔ اے جیو! تین برس کی جان تھی۔ اب ماشاء اللہ پہچانی نہیں جاتی۔'' ''اے لوان کو تو دیکھو۔ کیا نام شوکت۔ ہاں بہن، یہ دونوں نئی ہیں۔ اے اس سے چھوٹا ایک لڑکا ماشاء اللہ سے اور ہے۔ دونوں کی پیدائش پردیس کی ہے۔ اے وہ ہے۔'' ''میاں یہاں آؤ، یہاں آؤ۔ جیو جیو! جی ہم تمھاری نانی ہیں۔ یہ تمھاری خالہ ہیں۔''

غرضیکہ عجیب کھلبلی تھی۔ عجیب خوشیاں تھیں۔ گھنٹوں کیا بلکہ دنوں یہ ہی ہوتا رہا۔ تیسرے اور چوتھے دن تک ڈولیاں آتی رہیں۔ اسباب بکھرا پڑا ہے۔ بیویاں آرہی ہیں۔ جلدی جلدی تہہ خانہ کھولا گیا۔ پرانے تخت نکالے گئے کہ آئے گئے کے بیٹھنے کا سہارا ہو۔ ویسے مکان تو آٹھ دن کے بعد بھی ٹھیک نہ ہوا۔ اب مزدور لگ گئے۔ اِدھر چاندنیاں جازم تنی ہیں، اُدھر پردے پڑے ہیں، مزدور لگے

ہیں۔ خدا خدا کر کے بیس دن کے بعد راج مزدوروں کا زور کم ہوا۔ اتنے دنوں میں دو دفعہ پھوپھی چونے کے تغار میں گریں اور آخری مرتبہ تو مرنے سے بچیں۔ نہ معلوم سوئی تھی کہ پیسہ تھا، سیڑھی کے نیچے گھسی ڈھونڈ رہی تھیں اور ایک باران کے اوپر گری۔ بچ گئیں۔ اللہ نے جان رکھ لی۔ چوٹ پوری آئی۔ پنڈلی لہولہان ہوگئی۔ ان کی وجہ سے اور بھی جلدی جلدی کر کے مزدوروں کو نکال دیا۔ مکان سجایا گیا۔ مردانے کے دو کمرے اور بیٹھک میاں کے واسطے ٹھیک ہوئے۔ دریاں بچھیں۔ چاندنی اور قالین بچھائے گئے۔ گاؤ تکیے لگے۔ اگالدان رکھے گئے۔ دیوار گیریاں اور قندیلیں لگائی گئیں۔ گھر میں دالان دردالان، اندر باہر تختوں کا چوکا لگا۔ شہ نشینوں میں دریاں، قالین صحنچوں میں دو دو چوکیاں، ان پر فرش۔ سلچیاں، پاندان، اگالدان، بھرے، سر پوش، صابن دان، غریبوں کے یہاں تانبے کے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن عمدہ قلعی ہوگئی، جھلملانے لگے۔ یہی مانو، شریف آدمیوں کا گھر معلوم ہونے لگا۔ جب ذرا گھر سے چھٹی ہوئی، ہوش میں ہوش آئے، تو اب جہیز درست کرنے کا سلسلہ چلا۔ جمن آپا، بستی خالہ، گیتی آرا بیگم کو ڈولیاں بھیج بھیج کر بلایا۔ ''بہن، شادی کا معاملہ ہے۔ کل کو تم ہی لوگ کہتے اوئی شہر میں بیٹھی تھیں، کوئی ہم لوگ مر نہ گئے تھے، ہم سے رائے نہ لی۔ لو تو اب تم لوگ بیٹھو۔ تم بتاتی جاؤ میں کرتی جاؤں۔ دوسرے بیوی، میں پردیسوں پردیسوں رہی، مجھے خاک معلوم نہیں۔ قسمت سے نہ ماں زندہ ہیں نہ ساس۔ جو تم سب کہوگی وہ ہوگا۔'' چنانچہ دو ماہ پہلے سے پانچ سیر کی روٹی دونوں وقت تندور سے آنے لگی۔ کسی کسی دن یہ روٹی تندوری پراٹھوں کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور پھر جب پراٹھے ہوتے تھے تو کباب بلائی لازمی آتی تھی۔ لکھنؤ کے خرچ کچھ ایسے ویسے ہیں۔ دن بھر کے خوانچے والوں ہی کو جوڑا جائے تو کتنا ہوتا ہے۔ کھرنی، فالسے، گنڈیریاں، ککڑی، کھیرے، کسیرو، نمش، برف کی قلفی، اندرسے کی گولی، سہال، ایک چیز ہو۔ دن بھر سودے والوں کا تانتا لگا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ برسوں کے بعد بچے شہر میں آئے تھے، کیسے منع کیا جاتا، لیکن کوئی حد بھی تھی۔ جو جو سودے والے آئے وہ وہ بچے دیوانے ہوتے گئے۔ ایک دن برف کی قلفی اور چند چیزیں لے چکنے کے بعد پھر کسی آواز پر افتاں و خیزاں دوڑے۔ بڑھئی آواز لگا رہا تھا، ''کام بڑھئی''۔ اب اماں کے سر ہیں کہ ''ہم تو کام بڑھئی لیں گے۔'' اس پر پھوپھی نے اور غضب کر دیا۔ جلدی سے پیسے نکال کر بولیں، ''اے لو، مجھے بھی لا دو۔ کیسا ہوتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں کھایا۔'' اغن صاحب کی

یعنی عرفان علی کی بیوی انتخاب دلہن کوٹھے پر سے بولیں، ''اے بہن، وہ بچوں کو نہیں دیتا۔ تم خود جا کر اس سے کام بڑھئی لے لو۔ تم کو دے گا۔'' سب ہنسنے لگے اور وہ خود منھ بناتی بڑبڑاتی چل دیں، ''اے واہ! کیا بنتی ہے بڑھیا۔'' اصل بات یہ تھی کہ عرفان علی کی بیوی کو بھاوج اور نند کی کوئی ادا پھوٹی آنکھ نہ بھاتی تھی۔ پھر اب جب سے یہ لوگ آئے تھے تو ان کو مکان چھوڑ کر کوٹھے پر جانا پڑا تھا۔ کوٹھا بھی کچھ چھوٹا نہ تھا، ان لوگوں کے واسطے کافی تھا۔ دو ماں بیٹیاں، ایک لڑکا۔ میاں دن بھر جتنی دیر رہتے تھے بھائی کے پاس۔ دونوں میں انتہائی میل محبت۔ عرفان چھوٹے تھے، حیثیت بھی کم تھی، نخاس کے اسکول میں اردو ماسٹر تھے، لیکن آپس میں کوئی فرق نہ تھا۔ ابھی سال بھی پورا نہیں ہوا احتشام علی لکھنؤ آئے تھے۔ سب کے کپڑے بنوائے۔ چلتے وقت بھاوج کو چالیس روپے لڑکی کی چوڑیوں کے واسطے بھی دیے۔ ان کی نگاہ میں جیسے اپنے بچے ویسے ہی بھائی کے۔ لیکن عرفان علی کی بیوی انتخاب دلہن کا دل پھر بھی صاف نہ تھا۔ کوٹھے پر بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کی ایک ایک بات دیکھتیں اور اعتراض کرتیں۔ کھانا ان کو پسند نہ آتا۔ ناشتہ انھیں اچھا نہ لگتا۔ ایک دن جب یہ لوگ نئے نئے آئے ہوئے تھے، گھر ٹھیک ہوا تھا۔ جہاں آرا اور حسن آرا نے صبح کی چاے بنائی، سب کو دی اور ان ماں بیٹیوں کے واسطے دو پیالوں میں چاے، اس پر ایک ایک گاؤزبان شیرمال کوٹھے پر بھیج دی۔ ادھر دروازے پر بھانڈ غل مچائے ہوئے تھے: ''گھر آنا مبارک، شادیاں مبارک۔'' تو تو کے نعرے لگا رہے تھے، ادھر باپ کے پاس ملنے والوں کا سلسلہ، ادھر چاے اور پانوں کی طلبی ہو رہی تھی۔ گھر میں گوکھے کی بہو ڈالی لے کر آئی تھی۔ کنجر کی ذات، وہ شور مچایا تھا کہ بیان سے باہر۔ جلدی میں چچی کی چاے روانہ کر دی۔ نہ معلوم کیا ہوا، بالائی کم تھی کہ نمک زیادہ، انھوں نے دونوں بادیے واپس کر دیے۔ حسن آرا نے جا کر ماں سے کہا۔ ماں کوٹھے پر گئیں۔ گو بڑی تھیں لیکن معافی مانگی، گلے لگایا، منا کر نیچے لائیں۔ ''بھئی لڑکیاں ہیں، ناسمجھ ہیں، کوئی اللہ نہ کرے جان کے نہیں۔ وہی بچپنا، بے خیالی۔ الٹی سیدھی چاے بھیج دی۔ تم کو چاہیے تھا خود آ کر نگوڑیوں کو دو دو جھنجوڑیاں دیتیں، سو سو باتیں سناتیں۔ یہ تو جنگلوں جنگلوں پھرنے والے۔ اور بہن، خدا کی قسم، تمھاری جان کی قسم، کیا جانیں۔ ہمارے وہاں تو چاے بنتی ہی نہ تھی۔ صبح کو جس کے جی میں آیا مٹھے سے روٹی کھا لی، یا مکھن سے۔ تمھارے جیٹھ کے اور وقار کے واسطے دودھ گرم گرم چلا گیا، ایک ایک پیالہ پی لیا۔ ہم کیا

جانیں چاے۔ وہ تو اب دیس میں آئے تو شہر کے رواج کے موافق چلے۔ کئی دفعہ دل میں آیا کہ میں تم سے کہوں کہ صبح کو چاے کے واسطے تم ہی چلی آیا کرو، بنا دیا کرو۔ لیکن بیوی اس ڈر سے چپ ہو گئی کہ تم کہو گی کہ بندیا گیری کرواتی ہیں۔ اچھا اب تم ہی بنایا کرو، چلو یوں ہی سہی۔'' انتخاب دلہن بولیں، ''اے بھابی، چاے بھی بنانا کوئی مشکل ہے۔ پتی اوٹائی، جب گل گئی، اچھالا، ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے تو موئی چاے تیار ہو گئی۔ اور یوں تو کوئی بگاڑنا چاہے تو اس کا علاج ہی کیا۔'' منشی جی کی بیوی بولیں، ''اچھا بھئی، اگر دو ایک دن آ کر تم بتا جاؤ گی تو کوئی حرج ہے۔ جاؤ، جا کر اپنا گھر سمجھ کر خود بنا لو۔ خوب اچھی بنانا۔ ایک کٹوری مجھے بھی دینا۔ میں بھی پیوں گی۔ اس قصے میں میں نے بھی نہیں پی۔'' جب حسن آرا اور جہاں آرا کے ساتھ باورچی خانے چلی گئیں تو انھوں نے گھوم کر بستی خالہ اور جمن آپا سے کہا، ''اے دیکھتی ہو ان کی باتیں؟ اپنے آپ ہاتھوں سے اکڑی جاتی ہیں۔'' بستی خالہ نے کہا، ''بیٹی، ان کی تو ہمیشہ سے یہی باتیں ہیں۔ اور بھئی، اب تو تم کار کرنے کھڑی ہوئی ہو، سب کی اٹھانا پڑے گی۔ خیر بہن، چھوڑو اس کو۔ دیکھو، یہ بانکڑیاں اور لچکے آئے ہیں، تم بھی دیکھو۔ مجھے تو یہ بانکڑی پسند ہے۔ دیکھو اس کا گوکھرو چھوٹا ہے۔ لیکن امانت، تم کو اتنا سمجھایا پھر بھی نہ سمجھے۔ ادھر آؤ، میں بتاؤں کس طرح کی ہو۔''

امانت: پہلے ان کی (پھوپھی کی طرف اشارہ کر کے) تو سن لوں۔ دیکھیے (ایک پیر کی جوتی دکھا کر) یہ بھی ضروری کام ہے۔ شہر بھر چھان مارا، اس کے ساتھ کی دوسری ملتی ہی نہیں۔ ایک جگہ ایک ہے مگر وہ بھی اسی پیر کی۔ پھوپھی سے کہتا ہوں کہ وہ ہی لا دوں تو بگڑتی ہیں۔

سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ پھوپھی بہت خفا ہو گئیں۔ منشی جی کی ماں سمجھانے لگیں، ''اوئی باجی، تم کو کیا ہو گیا ہے؟ اب تو اللہ اس جوتی کو پھینک دو۔ اکیلا ایک پیر کہیں نہیں ملتا جو اس کے ساتھ کا ملے گا۔'' یہ ادھر نند کو سمجھا رہی تھیں، انتخاب دلہن بھناتی، دوپٹے کو جھٹکے دیتی، سب پھینک پھانک دھڑ دھڑ پھر کوٹھے پر چل دیں۔ سب حق دق رہ گئے۔ لو اب کیا ہوا؟ جہاں آرا تو منھ بنائے الگ آ کر بیٹھ گئیں۔ ماں نے کہا، ''کیا ہوا؟ تم نے کیا کیا؟ کیوں بگاڑ دیا؟'' بچاری بولی، ''اماں میں نے کیا کیا؟ یہاں جو سب لوگ ٹھٹھے مار کر ہنسے، وہ سمجھیں ان پر ہنس رہے ہیں۔ بس اٹھ کر چل دیں۔ اب بتائیے۔''

ماں کچھ دیر خاموش رہیں، پھر مظلوموں کی آواز میں بولیں، ''پھر جاتی ہوں، ہاتھ پیر پھر

جوڑوں گی۔'' بیچاری نے کوٹھے پر جا کر پھر منایا۔ اور انتخاب دلہن پر ہی کیا منحصر تھا، خاندان بھر میں روٹھن سوار تھی۔ کسی کو کوئی گلہ، کسی کو کوئی گلہ۔ پرانے قصے قضیے سب اسی دن کے واسطے رہ گئے تھے۔ ان کے چچیا سسر کی لڑکی نند سلطان جہاں پاٹے نالے پر رہتی تھیں۔ ان کو ہزار بلایا، ڈولیاں بھیجیں، وہ نہ آئیں۔ پھر پھوپھی اور خود ڈولی میں بیٹھ کر بلاوا دینے گئیں، قسمیں دیں۔ ''اے بہن، تم تو مہینہ بھر پہلے سے آئی ہو اور اب آئیں۔''

آخر جس دن لڑکیوں کو مانجھے بٹھایا جا رہا تھا، بے چاری پھر خود ڈولی پر سوار ہو کر گئیں۔ وہ خدا کی بندی اب بھی نہ آئی۔ صاف کہہ دیا کہ ''بھائی مجھے شکایت تم سے نہیں، شکایت ہے تو مجھ کو اپنے بھائی سے ہے۔ وہ آئیں۔'' اب بیچاری نے میاں کو بھیجا تو جب آئیں۔ اور آئیں بھی تو کس شان سے۔ ڈولی میں ہی سے گلے شکوے گاتی اتریں۔ قد تو نہایت چھوٹا لیکن اس پر آواز اللہ نے وہ دی تھی کہ چار دیوار پار جائے، اور زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ صورت دیکھو تو کیسی پیاری پیاری، گورا رنگ، آفتابی چہرہ، لیکن ہیں بالکل تتیا مرچ۔ گھر میں گھسیں تو زبان چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ ''اے میں تو ہرگز نہ آتی۔ جب مجھ کو سب نے چھوڑ دیا تو میں نے بھی سب کو چھوڑ دیا۔ اے میں ہرگز نہ آتی، لیکن کیا کروں، خون سے مجبور ہوگئی۔ پھر خون نے جوش مارا، منہ دیکھے مروت آگئی۔ بھائی خود نہ آتے تو میں بھلا آتی۔ اللہ کی خدا کی قسم، نہ آتی۔ اے واہ! چھمی کی شادی ہوئی جب نہ آئے۔ لو بیوی، وہ نگوڑی بیوہ ہوگئی جب نہ آکر جھانکا۔ اب سے دور، ساجد کے پیٹھ پر کالڑ کا مر گیا تو خبر نہ لی۔ پردیس پردیس، اوئی بھاڑ میں گیا پردیس۔ ہم کیا جانیں، ہمارا تو کوئی شریک نہ ہوا۔ ہاں ہم سب کے شریک ہیں۔ جس کی انگلی دکھی ہم کھڑے ہوگئے۔ شہر بھر میں جس کی اٹکتی ہے پھر ہمارے بغیر قرار بھی نہیں آتا۔ اے جب ہم برے ہیں تو ہم کو چھوڑو۔''

باہر مردانے میں منشی احتشام علی مع اپنے تمام اراکین کے برات کے کھانے وغیرہ کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ خمیرے کے حقے سلگ رہے ہیں، کشمیری چائے کے دور چل رہے ہیں اور سامان کی فہرست بن رہی ہے۔ رحمت رکاب دار، علا بندے باورچی، حاتم بہشتی، حشمت گر وغیرہ وغیرہ کھڑے

ہیں۔ خود منشی صاحب مسند کے ایک کونے پر بیٹھے ہیں۔ برابر میں فدن صاحب ہیں جو کہ برابر پان پر پان کھائے جاتے ہیں اور اگالدان کو بھرتے جاتے ہیں۔ مسند کے برابر میں ایک مونڈھے پر عرفان علی صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کے برابر آرام کرسی پر، ہاتھ میں قلم اور کاغذ لیے، چھٹن صاحب دراز ہیں۔ آپ منشی صاحب کے چچا کے سالے کے بھائی کے پوتے یعنی بھائی ایک تو اس طرح سے ہیں۔ اور دوسرا رشتہ یہ ہے کہ ایک زینہ اور دو کھڑکیوں میں سے ہو کر ان کا گھر ہے، چنانچہ بھائی ہیں۔ عمر کم ہے، صحت اچھی ہے، نہایت خوبصورت جوان ہیں۔ پھر اس پر بانک پن غضب کا ہے۔ چوڑی دار پاجامہ، ادھی کا انگرکھا، ریشمی کا مدار دوپلی ٹوپی، سر پر پٹے نما بال ان پر ہی سجتے ہیں۔ گھر کے نہ رئیس ہیں نہ غریب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے گھر کا راز آج تک کسی کو معلوم ہی نہ ہوا۔ ان کا خود شغل بلکہ پیشہ محلّے اور برادری کی خدمت ہے۔ کوئی بیاہ، کوئی شادی، کوئی مسلمانی، کوئی روزہ کشائی، آمین ان کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ کوئی مر جائے تو پھول، چالیسواں بغیر چھٹن صاحب کے کیسے ہو۔ کوئی پیدا ہو تو چھٹی چلّہ، عقیقہ، دودھ بڑھائی ان کے بغیر کیسے ہو۔ غرض کہ ان کے بغیر کسی کو چین نہیں۔ اب اس موقعے پر بھی انتظامات کی روحِ رواں یہ ہی ہیں۔ باورچی سے سامان اور جنس کے بارے میں مباحثے ہو رہے ہیں اور فہرست تیار کی جا رہی ہے۔

منشی احتشام: بھائی علا بندے، میں ان معاملات میں کچھ رائے نہیں رکھتا۔ میں نے تو ویسے ہی پوچھا۔ جو چھٹن صاحب کہیں وہی ٹھیک ہے۔ فی آدمی ایک چھٹانک میدے کی صرف ایک شیر مال۔ بڑی عجیب بات ہے۔

چھٹن صاحب: جی ہاں بھائی صاحب، دستر خوان پر وہی بالکل کافی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں گے، کس قدر بچ جائیں گی۔ پھنک کر جائیں گی۔ بھاری کھانے کے ساتھ زیادہ کوئی نہیں کھا سکتا۔ اب یہ ہی دیکھیں، مزعفر چوگنی کا، آدھ پاؤ بالائی، کیا کوئی طشتری بھر سے زیادہ کھا سکتا ہے؟

منشی صاحب: کیا دراصل چاولوں سے چوگنی شکر ڈالی جائے اور کھپ جائے گی؟

علا بندے: اے سرکار کھپنا کیسا۔ باسی تباسی چاول حضور ملاحظہ کریں تو ان پر بھی شکر نہ ملے گی۔ وہ تو سب پی لیں گے۔ حضور، تگنی شکر کا مزعفر تو قصائیوں اور نائی کنگھی والوں کے یہاں پکتا ہے۔

منشی احتشام: اچھا بھائی دیکھیں گے۔ ہمیں تو سب باتیں عجیب ہی معلوم ہو رہی ہیں۔

علا بندے: سرکار پہلا کار ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ ابھی تو پہلا کار ہے۔ اب واقف ہو جائیں گے۔

چھٹن صاحب: نہیں نہیں، بھائی شہر میں رہے کہاں۔ ہمیشہ پردیس پردیس، نوکری پر پھرتے رہے۔

علا بندے: گوشت کے واسطے کس کو کہا جائے؟

میاں: مخدومی کرلے گا۔

چھٹن صاحب: اماں واللہ۔ توبہ ہوئی توبہ۔ لڈن کی شادی میں اس نے دھوکا دیا ہے، خدا کی پناہ۔

علا بندے: تو میاں بقاتی کو کیوں نہ ٹھیکہ دیجیے۔ خدا کی قسم، نواب جہانگیر قدر کی نواسی کی روزہ کشائی میں ابھی مہینہ نہیں ہوا، ایسا گوشت دیا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ میاں، آپ دیکھتے تو پھڑک اٹھتے۔ اور سرکار، گوشت بنانے کا تو اسی کا حق ہے۔ خوب بناتا ہے۔

منشی احتشام: خصی عمدہ مل گئے ہوں گے۔

میاں چھٹن: بکرے اچھے تیار دیکھ کر لینا چاہیے۔ (چونک کر) خصی؟ لاحول ولا قوۃ۔ بھائی صاحب، دہقانی لوگ خصی کا پلاؤ پکواتے ہیں۔ ہم لکھنؤ والے تو اسے چھوتے بھی نہیں۔ ساہا ہونا چاہیے۔ آپ ساہا سمجھے بھی نہ ہوں گے۔ ایک برس سے کم کی بکری۔

اتنے میں ہمارے میر صاحب نے آکر مردہ آواز میں کہا، ''حکیم صاحب آرہے ہیں۔'' اور فوراً ہی ان کی پینس پھاٹک میں داخل ہوئی۔ فوراً ہی سب لوگ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔

منشی احتشام علی تخت سے اتر چار قدم آگے کھڑے ہو گئے۔ پینس میں سفید چادر، اس پر قالین، پیچھے گاؤ، آزو بازو گول تکنیاں لگائے، پھسکڑا مارے حکیم صاحب بیٹھے تھے۔ پینس رکھی گئی۔ حکیم صاحب نے چاندی کے اگال دان میں، جو پاس ہی رکھا تھا، پون پاؤ ڈلی کتھے چونے کی معجون اگل کر منھ صاف کیا۔

مخملی گھتیلا جوتا کہار نے اندر سے نکال کر رکھا جسے حکیم صاحب نہایت پھرتی سے پہن کر انگر کھے کے دامن برابر کیے اور ڈیڑھ خمے کھڑے ہو کر ۴۵ ڈگری زاویے میں گھوم گھوم کر ہاتھ کی سبک جنبش سے حاضرین موقع کو نیاز مندی کی ہوا بالکل اسی طرح دینی شروع کر دی جیسے ایک گھومنے والا بجلی کا پنکھا آج کل ہوا دیتا ہے۔

منشی احتشام علی تو لٹھ سے کھڑے رہے، لیکن چھٹن صاحب وغیرہ نے دست بستہ اتنی ہی زیادہ نیاز مندی حکیم صاحب کو واپس کر دی۔ حکیم صاحب منشی جی کے سمدھی ہیں۔ چند ضروری معاملات طے کرنے کے لیے آئے ہیں۔

۳
مسافر کی آخری منزلیں

حضرت گنج کے پاس لال باغ کی طرف چھوٹا سا چمکتے ہوئے پیتل کا ''دی نیسٹ'' سائن بورڈ ملے گا جس کی کہ دراصل کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کسی کو بھی محلہ یا روڈ بتا دی جائے اور کہہ دیا جائے کہ کوٹھی کا نام ''دی نیسٹ'' ہے تو سوائے اس کوٹھی کے کسی اور میں نہیں جا سکتا ہے۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ گھنی نیل کانٹے کی بیل ہے جو کہ دونوں طرف سے چل کر دونوں سمر ہاؤس میں آ ملتی ہے۔ اور دونوں سمر ہاؤس کے بیچ میں کوٹھی کا پھاٹک ہے۔ یہاں سے سیدھی سڑک جا کر کوٹھی کے چاروں طرف گھوم جاتی ہے۔ سیدھی سڑک کے دونوں طرف سرخ اور سفید گلاب کی بیلوں کی باڑھ تھوڑی تھوڑی دور پر کھڑی ہیں۔ ایک طرف لان اور دوسری طرف پکا سیمنٹ کا ٹینس کورٹ ہے۔ اگر ادھر کوئی بیٹھا ہو اور اس سڑک پر سے موٹر آئے تو دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوگا کہ موٹر ان گلاب کی بیلوں میں آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ کبھی چھپ جاتا ہے کبھی نکل آتا ہے۔ کوٹھی بالکل پرانے انگلش اسٹائل کی ہے جس میں کہ ہر حصہ بذات خود کوئی کسی کا ہم وزن جواب نہیں ہے۔

ایک کونے پر مکان کا سب سے اونچا حصہ ہے۔ ایک پر سرخ پھول کی انگریزی بیل، جسے

ہندوستان پر چیا بیل کہتے ہیں، پھیلتی ہوئی اوپر تک پہنچ کر پھر نیچے کوٹھی پر سہرے کی طرح لہرا رہی ہے۔

اسی کے برابر میں ایک ڈبل پورچ ہے جو کہ مختلف بیلوں اور لٹکتے ہوئے گملوں سے دلہن بنا ہوا ہے، اور اس کے اندر کتھئی رنگ کا ایک موٹر کچھوے کی طرح خاموش کھڑا ہوا ہے۔ آنے جانے والوں کو اپنی تکونی اور چوکوری چھ شیشے کی آنکھوں سے حقارت کی نظر سے دیکھتا رہتا ہے۔

کوٹھی کے باقی دو طرف مولسری اور گل مہر کی شاداب سبز شاخوں نے گہرا سایہ کر رکھا ہے۔ باہر سے یہ کوٹھی ایک بنی سنوری، روٹھی ہوئی، مغرور حسینہ معلوم ہوتی ہے۔

یہاں کبھی شور و غل تو کیا کوئی کریہہ آواز تک نہیں سنائی دیتی۔ اگر کوئی آدمی ایک ہفتہ دن رات اس کے پھاٹک کے باہر سڑک پر کھڑا رہے تب بھی وہ حلف اٹھا سکتا ہے کہ اس نے ان تین آوازوں کے علاوہ کبھی کوئی آواز نہ سنی ہوگی: موٹر کی ہلکی سرسراہٹ، پیانو کی مدھم پن پن پوں پیں یا پکڑی (جے بی کتیا) کی یو یو یو۔ باقی تمام باہر والے کے واسطے سحر ہے، جادو ہے، افسانہ زار ہے۔ سکوت ہے، غم ہے، حسرت ہے، ناز ہے، غرور ہے، یا جو بھی سمجھ میں آجائے، اور حسن ہے۔ اس کوٹھی کے پشت پر شاگرد پیشہ ہے۔ وہاں سے خاموش ملازم بغیر پیروں کی آہٹ کے آتے ہیں، اپنا اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔

حسن آرا کا اپنا کمرہ، غسل خانہ، باہر کے چھوٹے برآمدے سے ملا ہوا ہے۔ یہاں اس کی دونوں وقت کی چاے اور رات کا کھانا آجاتا ہے۔

صبح کو میز پر بیٹے اور بہو کے ساتھ کھانے کے کمرے میں کھانا کھاتی اور کبھی کبھی رات کے کھانے پر جب دو ایک مہمان بھی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اس کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے تو اسے اطلاع ملتی ہے کہ آج رات کو میز پر جانا ہوگا۔

چھ سات کے درمیان بہو آکر دو چار منٹ ساس سے باتیں کرتی ہیں اور اس طرح معاً ساس کے لباس پر بھی نظر پڑ جاتی ہے۔ نہایت محبت کے لہجے میں کہتی ہیں، ''اماں جان، سلک کے پاجامے کے واسطے ابھی موسم اتنا تو ٹھنڈا نہیں ہے۔ کیوں نہ آپ ہلکا پیازی ریشمی گون کا پاجامہ پہن لیں۔ اس پر سفید دوپٹہ بھی ٹھیک رہے گا اور اس میں سیاہ فیتہ بھی اچھا لگے گا۔''

اماں جان کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، جو کہو وہ پہن لیں۔ صرف ایک بار اماں جان نے ضد ضرور کی تھی جب اس نے ساڑھی پہننے کے واسطے اصرار کیا تھا۔ اس وقت میاں اور بیوی دونوں سر تھے، مگر حسن آرا نے نہ بہو کی مانی نہ مسعود ابنِ جلال کی پروا کی۔ صاف کہہ دیا، ''سنو میاں، اب میرا بڑھاپا ہے۔ میرا کیا ہے، کونے میں پڑی اللہ اللہ کرتی ہوں۔ ماشے اللہ بہو کو جو جی چاہے پہناؤ۔ میں بھی دیکھ کر خوش ہو جاؤں گی، دعائیں دوں گی۔ نہ مجھے اب کسی سے ملنا ہے نہ کہیں آنا جانا۔ تم کو پھولتے پھلتے دیکھتی ہوئی ایسے ہی مر جاؤں۔ تم پر سے صدقے۔ میرا کیا ہے، بچپنا اور جوانی تک تو بڑے پانچوں کے پاجامے پہنے، تو اب ادھر کل کی بات جب سے تم پیدا ہوئے تنگ پاجامے پہننے لگی۔ میرے لیے تو یہ ہی بڑا فی شن (فیشن) ہے۔'' آخر جب اماں کسی طرح ساڑھی پر راضی نہ ہوئیں تو ان کو واپسی کا حکم ملا، یعنی بڑے پانچوں کے پاجاموں کا۔ ''اماں، تنگ پاجامے کا بھی کوئی تک ہے؟ اگر پرانی وضع رکھنا ہے تو پھر بڑے پانچوں کا پاجامہ پہنیے۔''

''ہاں بیٹا، یہ مجھے منظور ہے۔''

اس وقت سے حسن آرا نے اپنے کو بالکل بہو اور بیٹے کی خوشی پر چھوڑ دیا تھا جیسے کہ ڈرائنگ روم کا کوئی گلدان۔ اُن میں پھول اور اِن پر کپڑے سب وقت موسم کے حساب سے آرائش کیے جاتے تھے۔ شروع شروع میں جب کوٹھی سجائی گئی ہے تو حسن آرا کو یاد ہے کہ ایک دن میاں بیوی دونوں گول کمرے میں مسئلہ طے کر رہے تھے۔ وہ یہ تھا کہ ایک بے ڈول لمبا مراد آبادی گلدان بیوی کو شادی کے موقعے پر کسی سہیلی نے دیا تھا، اس کے بارے میں یہ بات چیت تھی۔ بیگم نے کہا، نہیں، جب ہے تو اس کی بھی کوئی جگہ نکالنا چاہیے۔ پھر وہ گلدان جگہ پر رکھا گیا۔ طرح طرح سے اسے دیکھا گیا۔ آخر باہر برآمدے میں ہیٹ ریک کے برابر مور کے پر لگا اس کی نشست سمجھ میں آ گئی۔ حسن آرا پڑھی لکھی نہ تھی۔ ان سب باتوں کا اس پر اثر تھا۔ وہ لفظوں میں اپنی حالت نہ بیان کر سکتی تھی، لیکن بغیر لفظ دل میں دہرائے وہ جانتی تھی کہ وہ بھی ایک چیز ہے۔ سامان آرائش میں اسے بھی ایک جگہ دینا پڑتی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی ہستی اس مکان میں کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ تین برس کے پوتے کے واسطے بھی وہ قطعی بیکار تھی۔ آیا بچہ کے لیے تھی۔ کھلانا، پلانا، بہلانا، منھ دھلانا، دکھ درد، دوا کی مصرف کی وہ نہ تھی۔

متروک سکے کی طرح زمانہ اسے میلوں پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ پوتے کو پیار کرنے کو دل چاہے تو دور سے چٹکی بجائے، اس سے آگے بڑھنا مشکل تھا۔ اب رہا گھر، اس سے اس کو کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ ملازم اپنے کاموں پر مستعد۔ ان کے کام اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ چار برس سے باورچی خانے کا نام ہی نام سنا تھا، دیکھا نہ تھا۔ ایک دفعہ ڈرتے ڈرتے اس طرف گئی بھی تھی، لوگوں نے بتایا بھی تھا، لیکن اس بے چاری کو باورچی خانہ نہ نظر پڑا۔ کھانے کے بارے میں بھی اس کا دخل یا اس کی رائے کچھ نہ تھی۔ اور ہوتی بھی کیسے۔ جہاں کھانے والے بدل گئے وہاں کھانے بھی بدل چکے تھے۔ اس کی زندگی صرف اسی قدر رہ گئی تھی کہ چائے پی لی، کھانا کھالیا اور چوکی پر نمازیں پڑھتی رہی۔ جب شاندار یادگار، سلف کا نمونہ دکھانا ہو تو ماں کو بھی کھانے پر یا گول کمرے میں بلالو۔ غیر مردوں کے سامنے یہ البتہ کبھی نہ گئی۔ نوکروں کے سامنے جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ایک دن تین عورتیں (جن کو کہ حسن آرا زنخے ہی سمجھتی رہی) آئی ہوئی تھیں، ان میں اسے ایک گھنٹہ بیٹھنا پڑا۔ سوائے خاموش بیٹھے رہنے کے کیا کرتی۔

آخر میں ان میں سے ایک نے مسز نیڈو کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، ''آپ ان کو جانتی ہیں؟'' حسینہ نے بغیر مسکرائے ہوئے کہا، ''ہاں یہ میری بہن ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ یہ چوکھٹے میں ہیں اور میں باہر ہوں۔'' سب کی سب بڑی دیر تک ہنستی رہیں، اور حسینہ ان کے ہنسنے پر ہنستی رہی۔ حسینہ ماں تھی۔ ماں کی ممتا ابھی اسی طرح تھی۔ مسعود ابنِ جلال کی ہر خوشی سر آنکھوں پر تھی۔ اس کی ہر برائی ایک بڑائی تھی۔ اس کی بڑائی اس کے لیے ایک غرور تھا۔ مگر دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔

بیٹے سے گلہ نہ تھا، وہ پھلے پھولے، مگر زمانہ تو بڑی جلدی ختم ہو گیا۔ میاں بھائی پر جان فدا تھی، جئیں وہ ہزار برس، لیکن اب وہ میاں بھائی ہی نہیں۔ ان کی شادی کا ہونا، ایک کے بعد ایک بچہ ہونا، اپنا بیوہ ہونا۔ آفتاب بھی سگے بھائی کے برابر تھا۔ جب سے اس کے بھی بال بچے ہوئے، اس نے بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دیا۔ ہاں آخری وقت ہے، کیا کیا جائے، ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ مسعود تو پھلے پھولے، آباد رہے۔ حسینہ کے خیالات بے ترتیب تھے۔ وہ جاہل تھی، اظہار نہ کر سکتی تھی، مگر کچھ ایسا اسے معلوم ہوتا تھا کہ پیارے بیٹے نے ماں کے پاس بیٹھ کر پورے اہتمام سے عمدہ کفن سلوا کر دے دیا، صاف ستھری پکی قبر

بنوادی۔ دم ولاسا دے دیا۔ ''اماں، سب سامان تیار ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔ جب آخری نیند آنے لگے، پکار لینا۔ میں آجاؤں گا۔ آکر تم کو آرام سے لٹادوں گا۔ گول کمرے میں ہوں۔ ریڈیو پر بے حد عمدہ گانا آرہا ہے۔ لو، میں جاتا ہوں۔ اچھی اماں! پیاری اماں! سب سامان ٹھیک ہے۔ گھبراؤ نہیں۔'' لیکن ماں تھی، اس کی بھی خوشی تھی کہ آئے، جلدی نیند آئے۔ اس چھوٹے برآمدے میں جانماز پر بیٹھی اس آخری کوچ کا انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن سردی سے گرمی، گرمی سے برساتیں آتی تھیں، اور نہیں آتی تھی تو وہ نیند کہ جو سب دردوں کا ایک علاج ہے۔ اور جب نیند نہ آتی تو وہ مٹھی بھر گوشت کا ظالم ٹکڑا، جس کو دل کہتے ہیں، تڑپتا تھا اور خیالات محدود دماغ کو چکرا دیتے تھے۔

آج برسات کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی گڑگڑاہٹ ہوتی ہے۔ ظہر کی نماز میں خیالات خلل ڈالے دے رہے ہیں۔ دفعتاً کان میں آواز آتی ہے۔ معصوم سریلے سر ہیں۔

نیم کی نمکولی پکی، ساون کب آوے گا

جیوے میرا بیرن بھیا، ڈولی بھیج بلاوے گا

تیسری رکعت دوسرے سجدے میں ہچکیوں سے سسکیاں ہوگئیں۔ نماز جاتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد جب آنسو پونچھنے کے قابل ہوگئے، تولیہ اور پانی کے چھینٹوں کی مدد کے بعد برآمدے میں جا کر کوٹھی کے قاعدے کے مطابق دبی آواز میں کہا:

''جا، تو یہاں سے جا!'' دھوبی کی لڑکی مولسری کے نیچے سے بھاگ گئی۔ پھر وضو کیا۔ پھر نماز ہونے لگی۔

فسانۂ اکبر

۱

خدایا، سب سے پہلے میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ اس آپ بیتی کے تحریر کرنے میں میری مدد کر۔ تجھ میں بڑی قدرت ہے، مجھ ایسے جاہل کے قلم میں روانی پیدا کردے۔ بیانات میں سادگی دے تا کہ ہمت اور صداقت سے، بلا تعصب، صحیح صحیح وہی حالات بیان کرسکوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اس سے آگے مجھے کچھ درکار نہیں۔ پڑھنے والے سچ سمجھیں یا نہ سمجھیں، مجھے مطلق پروا نہیں، بلکہ اصلیت تو یہ ہے کہ میں خود بھی آپ بیتی کے ایک ایک دن اور ایک ایک گھڑی کو یاد کرتا ہوں اور پھر مشکوک ہو جاتا ہوں۔ اس ماجرے کی اصلیت کو تو بس خدا ہی جانتا ہے۔ کم سے کم میری عقل تو کام نہیں کرتی۔ ممکن ہے کہ اس افسانے کے پڑھنے والوں میں سے کوئی تہہ کو پہنچ سکے۔ اگر ایسا ہو تو سبحان اللہ۔

گمان غالب ہے کہ اس سے کسی زبردست رازِ قدرت کا انکشاف ہو ہی جائے۔ اس ہی خیال کو مدنظر رکھتے ہوے اس افسانے کو کتابی صورت میں لانے کے واسطے قلم اٹھایا۔ دوسرے اس تحریر سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ رشتہ دار، دوستوں اور افسرانِ گورنمنٹ، سب کو ایک ساتھ اب پورا پورا ماجرا صاف سنا دوں گا۔ ابھی تک میں ان سب کو طرح طرح ٹالتا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدگمانیاں بڑھتی گئیں اور ہر ایک نے اپنی اپنی طرف شبہات پیدا کر لیے۔ گورنمنٹ میں باغی یا جاسوس سمجھا جانے لگا، رشتہ داروں نے بدچلنی کے الزامات کھڑے کر لیے، احباب سے جعلسازی کی تہمتیں اٹھائیں۔ اب میں کسی سے کچھ

نہیں چھپاتا، بلکہ جو کچھ گذشتہ ایک سال میں مجھ پر گذرا ہے، پبلک کے آگے پیش کیے دیتا ہوں۔

۳ر جون ۱۹۴۲ء سے یکم جولائی ۱۹۴۳ء تک میں لاپتا رہا تھا۔ اس عرصے میں جہاں میں رہا اور جو کچھ مجھ پر گذرا ہے اس افسانے میں تحریر ہے، اور چوں کہ اب سرگزشت پبلک کے آگے بھی پیش کی جا رہی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنا تعارف پبلک سے کرا دوں۔

میرا وطن لکھنؤ ہے اور ۱۸۹۴ء کی میری پیدائش۔ شاید میری عمر سات یا آٹھ برس کی تھی جب میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس زمانے میں والد صاحب مرحوم، جناب خان بہادر سید جعفر حسین صاحب، گوالیار میں اسٹیٹ انجینئر تھے۔ یوپی گورنمنٹ سے عارضی طور پر ریاست گئے ہوے تھے۔ والدہ کے انتقال کے بعد ہم سب، یعنی مجھ سے ایک برس بڑی بہن، میں، اور مجھ سے ایک برس چھوٹی بہن، ایک عرصے تک رشتہ داروں کی چھین جھپٹ کے واسطے کھلونا بنے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کامل چار برس الف بے ہی یاد کرتے گذر گئے اور یہ یاد نہ ہوئی۔ خدا پھوپھی اماں کو غریق رحمت کرے، ایک دفعہ ان کا بھی داؤں چل گیا۔ ہم سب کو دبوچ لکھنؤ میں لے بیٹھیں۔ صبح سات بجے تک اور پھر ایک بجے سے شام کو چراغ جلے تک رحل پر نچا کھچا (نہ معلوم اس زمانے کی کتابوں کو کیا ضد تھی کہ تیسرے ہی دن پارہ پارہ ہو جاتی تھیں) بغدادی قاعدہ رکھا ہے، کھری کھٹیا پر بیٹھے بل رہے ہیں اور آ این نم، با بین نم چلا رہے ہیں۔ لمبے برآمدے کے ایک سرے پر ہم ہیں، دوسرے سرے پر ستر برس کی مفلوج دادی اماں کا کھٹولا ہے جس پر وہ ایک گٹھری کی طرح پڑی ہیں اور پانچ پانچ منٹ کے بعد برابر یہ ہی کہتی ہیں، ''اری بقیتہ، کچھ دے گی؟ ڈلی تمبا کو۔''

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد چھوکری بقاتن آکر مٹھی بھر ڈلی کا چورا اور تمبا کو ان کے منھ میں بھر جاتی تھی۔ دو منٹ نہ گذرتے تھے کہ پھر اس چوگے کو تھوک تھاک وہ اپنا سبق شروع کر دیتی تھیں۔ تو اس طرح اس برآمدے میں ہم ہی دو تھے۔ دن بھر اپنی جپنی جپا کرتے تھے۔ مجھ سے ایک برس بڑی اور دوسرے مجھ سے ایک برس چھوٹی بہنیں بھی صبح شام یہاں پڑھتی تھیں، لیکن ان کے کاروبار شاہانہ تھے۔ ایک قرآن دہرا رہی تھیں، دوسری ختم کر رہی تھیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑھا اور آواز دی، ''پھوپھی اماں، سن لیجیے۔'' انھوں نے کمرے میں سے پان دھوتے ہوے جواب دیا، ''سناؤ۔'' چوں کہ خود حافظِ قرآن تھیں، ایک

آدھ جگہ ٹوکا اور کہا، ''ایک بار دہرالو اور چھٹی کرو۔'' تھوڑی دیر میں یہ دونوں چل دیں۔ ہم رہ گئے اور دادی اماں۔ وہ آہستہ آہستہ پڑھتی تھیں۔

''اری بفیتہ، کچھ دے گی؟ ڈلی تمبا کو۔'' اور ہم ازار بند کے سروں سے تو کھیل رہے ہیں اور زبان سے جھپا جھپ کہہ رہے ہیں، ''تا تن نکم با بن نکم۔'' کیا مجال کہ ہماری یا دادی اماں کی زبان بند تو ہو جائے۔ اگر وہ سوتی بھی تھیں تو پھوپھی اماں چونک پڑتی تھیں۔

''کیوں بھئی لگ گئے کھیل میں؟'' یا اگر مفلوج دادی اماں کی آواز بند ہوئی (کبھی کبھی وہ سو بھی جاتی تھیں) تو فوراً چلاتی تھیں، ''اری بفاتن، دوڑ، دیکھ اماں کا کیا حال ہے۔'' بفاتن فوراً آ کر انھیں جھنجھوڑتی تھی۔ ''اے بیوی، اچھی خاصی ہیں، سو گئی تھیں۔''

آخر اللہ نے ہم دونوں کو ایک دن اس مکتب سے نجات دی۔ ایک رات دادی اماں جو خاموش ہوئیں تو پھر نہ بولیں۔ ان کا کفن دفن ہونے لگا۔ ہم کو چھٹی مل گئی۔ کیا مسرت کا دن تھا! دوسرے دن اور بھی خوشی کا دن آیا۔ ہمارے ابا آ گئے اور معلوم ہوا کہ ہم سب کو بھی لے چلیں گے۔

خوشی خوشی ہم سب جھانسی گئے۔ یہاں سول لائن میں ایک بہت بڑا بنگلہ تھا۔ ابا نے اسے خوب سجایا اور بنایا تھا۔ خاندان کی کئی ایک سن رسیدہ عورتوں کو لے آئے تھے۔ کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، حتیٰ کہ ایک اماں بھی ہمارے واسطے لائے تھے۔ یہ ہماری منجھلی اماں صاحبہ مرحوم تھیں۔ نوکروں، ماماؤں اور چھوکریوں کی ایک فوج سی تھی۔ ہائے، کیسی چہل پہل اور رونق رہتی تھی۔ ہمارے واسطے دو دو ماسٹر مقرر ہوئے، ایک انگریزی کے، دوسرے اردو کے۔ اردو پڑھانے والے ماسٹر ہم سے بہت ڈرتے تھے، اور انگریزی والے سے ہم ڈرتے تھے، اتنا کہ ان کے آگے زبان ہی نہ ہلتی تھی۔ گھنٹہ بھر ماسٹر صاحب خود ہی ایک ایک لفظ بہ آواز بلند یاد کیا کرتے تھے اور ہم سنتے رہتے تھے۔ کوئی دو برس اور گذر گئے۔ اس دو برس میں ہماری علیست نے کافی ترقی کی۔ بکروں کی سواری کرنا، گائے کے بچھڑے کی دم میں کنستر باندھ کر بھگانا، جھاڑیوں میں گھونسلے تلاش کرنا، درختوں پر چڑھنا، برابر کے بنگلوں کے یورپین اور اینگلو انڈین لونڈوں کے مقابلے میں ڈھیلے چلانا — بہت کچھ سیکھ گئے۔ تین تین اور چار چار میل دور تک تمام پہاڑیوں کے مکمل جغرافیہ سے واقف ہو گئے۔ ہر کھڈ، ہر درخت، ہر جھاڑی اور ہر چٹان سے واقفیت حاصل کی۔

اس علمیت کے میدان میں بڑی تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے بورڈنگ میں داخل کر دیے گئے۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ اس طویل کسمپرسی کے دور میں کوئی بھی میرا اتالیق اور چاہنے والا نہ تھا۔ نہیں، یہ غلط ہے اور بالکل غلط۔ ماں کے مرتے ہی اللہ نے مجھے انتہا سے زیادہ چاہنے والی ماں دی۔ وہی میری اتالیق تھی۔ اس کی تعلیم کا اثر آج اب بھی میری رگ رگ میں موجود ہے۔ یہ مجھ سے ایک برس بڑی اشفاق جہاں اچھو باجی ہیں۔ (خدا ان کی عمر دراز کرے۔) خود کیا تھیں اور ان کی ہستی ہی کیا تھی۔ میں ان سے قد میں بڑا اور تندرست تھا۔ غصہ آتا تو ڈھکیل دیتا تھا، کاٹ کھاتا تھا، چٹکیاں لیتا تھا، مگر یہ ہنستی رہتی تھیں۔ رات کو ان کی سفید باہوں پر اپنی چٹکیوں کے نیلے نیلے نشان دیکھ کر پھر میں شرمندہ ہوتا تھا اور روتا تھا۔ یہ جب بھی ہنستی رہتیں اور مجھے بچے کی طرح تھپک تھپک کر کہتیں کہ ہمارا رفن بڑا ہو کر باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔ طرح طرح کی عظیم باتیں کرتی تھیں اور نہ معلوم کہاں کہاں کے قصے سناتی تھیں۔ انھوں نے بوڑھی یا بزرگ بن کر کبھی بھی کوئی نصیحت نہ کی، بلکہ کبھی کسی بات کے واسطے منع تک نہیں کیا۔ اس چھوٹی سی لڑکی نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ میرے دل پر اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے خاندان کی عظمت کا بڑا گہرا احساس پیدا کر دیا۔ ان کی تعلیم سے اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا رذیلوں سے بھری پڑی ہے، اور خال خال اِدھر اُدھر شرفا ان کے بیچ میں آباد ہیں، اور ان شریفوں بھر میں سب سے بڑے خاندانی شریف ہم لوگ ہیں۔ اچھو باجی نے نہ معلوم کیوں اور کس علمیت کی بنا پر مجھے یہ بتایا تھا کہ ہم لوگ اصل عرب ہیں؛ ہمارے باپ دادا بڑے بڑے بادشاہ ہوے ہیں۔ اب بادشاہت ہمارے خاندان میں سے نکل گئی، مفلسی کے دن آ گئے، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، ہم ہیں تو بہت بڑے خاندانی شریف زادے۔ بس یہی ایک تعلیم تھی جو میرے دماغ میں نقش ہوئی۔ باقی ہر طرح سے دماغ کورا ہی رہا۔ اللہ رکھے ۱۳ برس کی عمر تک نہ بتا سکتے تھے انگریزی اے بی سی ڈی۔ نہ معلوم کیوں کر اور کس وجہ سے یاد ہی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ میں پہچان بھی لیتا تھا، انگریزی کے بہت سے لفظ بھی یاد تھے۔ اردو کے گو لفظ نہ پہچانتے تھے لیکن دو کتابیں حفظ تھیں۔ یہ استعداد تھی۔ تیرہ برس کی عمر تھی، قد سولہ برس کے لڑکے کے برابر ہو گا کہ جب ہم اٹاوہ پہنچے۔ بورڈنگ کی کسمپرسی، عقل کی کمی، کتابوں کا ڈر دل پر غالب، خاندانی غرور سے سرشار۔ حالت قابلِ رحم نہیں قابلِ عبرت ہو گئی۔

پہلے سال کے ختم پر گھر آئے تو نہ صندوق نہ کپڑے نہ کتابیں نہ بستر۔ بال بڑھے ہوئے، میلے چیکٹ کپڑے پہنے، منہ پر ہوائیاں، چلے آرہے ہیں۔ ہفتوں گھر بھر نے مجھ پر لعنت ملامت کی اور ہفتوں راتوں کو مجھے گلے لگا لگا کر اچھو باجی چپکے چپکے رویا کیں اور ہر صبح کو ہمارا منہ جھانوے سے رگڑ رگڑ کر دھلاتی رہیں۔ ''ہائے ہائے، میرا بھائی کالا ہوگیا۔'' سرخ سفید رنگ تھا۔ اس پر جھانوے کی رگڑ پڑتی تھی، منہ چقندر ہو جاتا تھا۔ اچھو باجی کو جب بھی تسکین نہ ہوتی تھی۔ آخر پھر ہم نے وہی حرکتیں شروع کر دیں۔ ڈھکیل دیا، چٹکیاں نوچنے لگے۔

دو برس اٹاوہ پڑھے۔ پھر گھر بھر علی گڑھ چلا گیا۔ ادھ بی جعفر منزل میں کچھ دن رہے۔ پھر ایک دفعہ سب چل دیے۔ اب کی ہم علی گڑھ میں ظہور وارڈ میں داخل کیے گئے۔ نہ معلوم کیوں کر چوتھے کلاس میں ہو گئے تھے۔ اب ہم کو دراصل پڑھنے کی طرف توجہ ہوئی۔ تین برس خوب پڑھا۔ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ ہر طرح یہاں دل لگا۔ تیسرے برس بورڈنگ کے ہیڈ مانیٹر کر دیے گئے۔ اس زمانے میں ہیڈ مانیٹر ایک خود مختار بادشاہ کی طرح ہوتا تھا۔ کم سے کم ہمارا یہی حال تھا۔ چار چھوٹے مانیٹر ہمارے وزرا تھے اور ہم خود مختار بادشاہ تھے۔ سیاہ سفید کے مالک تھے۔ آج حکم ہے کہ قورمے کے سالن میں سے گودے کی تمام ہڈیاں ہمارے واسطے رہیں گی۔ کل حکم ہے کہ ہر لڑکا فیلڈ میں ننگے پیر آئے، آج کبڈی ہوگی۔ غرضیکہ ہماری خوشی قانونی حکم تھا۔ حکم سے کسی کو انکار کی تاب نہ تھی۔ سال بھر تک فرعونیت کی، یہاں تک کہ وقت ختم ہو گیا۔ اپنا اور اپنے وزرا کے جانشین چن کر سلطنت ان کے سپرد کی اور خود ظہور وارڈ کو حسرت سے دیکھتے ہوئے میکڈونلڈ ہاؤس چل دیے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچوں میں ہم دیو تھے، وہاں اب بڑے بڑوں میں بھنگا ہو گئے۔ دل پر صدمۂ عظیم گذرا۔ پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔ پارٹیاں بنا بنا کر پالیٹکس اور خانہ جنگیوں میں مصروف ہوئے۔ مگر کچھ کسی طرح سے نہ چلی۔ نتیجہ صرف اتنا ہی نکلا کہ ساتویں کلاس میں فیل ہو گئے۔ اس عرصے میں والد صاحب پنشن لے چکے تھے۔ بھوپال میں اسسٹنٹ انجینئری پر ملازم ہو گئے۔ اچھو باجی کی شادی ہو گئی۔ میں، مجھ سے چھوٹی بہن، منجھلی اماں صاحبہ کے ساتھ بھوپال بلا لیے گئے۔ یہاں ہم آٹھویں کلاس میں داخل ہو گئے۔ یہاں دو برس رہے اور آٹھویں اور نویں دونوں کلاسیں ماسٹروں کو ڈرا دھمکا کے پاس کر لیں۔ بھوپال میں ایک خاص شخص سے واسطہ پڑا

جس نے پھر میرے دماغ اور کیرکٹر پر گہرا اثر ڈالا۔ ہمارے بھتیجے (ہم سب چار بہن اور دو بھائی تھے۔ سب کا ذکر نہیں کیا۔ یہ سب ہم سے بہت بڑے ہیں۔ سب سے بڑے بھائی صاحب مجھ سے ۱۸ برس بڑے ہیں۔ آج تک ہم دونوں ایک دوسرے سے کوسوں دور رہتے ہیں۔) فاروق کے پڑھانے کے واسطے ایک ماسٹر رکھے گئے۔ ان کا نام حضور احمد تھا۔ جب دیکھا کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں یا منمنا منمنا کے باتیں کر رہے ہیں۔ ہنسی ہر وقت چہرے پر رہتی تھی، حتیٰ کہ کتابیں پڑھتے میں بھی مسکراتے ہی رہتے تھے۔ زندگی کی ہر چیز میں، ہر بات میں ان کو تمسخر کے پہلو نظر آتے تھے۔ عمران کی تیس برس کے قریب ہوگی۔ شروع شروع آتے جاتے ان کو دیکھتا تو سخت نفرت پیدا ہوتی۔ چھ ماہ تک ان سے بات ہی نہ کی۔ مجبوراً کچھ بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا۔ پھر کچھ اور۔ اتفاقیہ یہ معلوم ہوا کہ مقناطیس تھا جس نے مجھے کھینچ لیا۔ انگریزی ان کو خاک نہ آتی تھی، عربی بھی شاید کام نکالنے بھر کی، یعنی کتابیں پڑھنے بھر کی آتی تھی۔ فارسی اور اردو کا کیا کہنا، ایک زندہ کتب خانہ تھے۔ تواریخ سے شوق بہت بڑھا ہوا تھا۔ لٹریچر کا ذوق سلیم تھا۔ شاعر تھے، حضور تخلص تھا، لیکن کہتے بہت کم تھے اور جو کچھ کہتے تھے ضائع کر دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ چالیس برس کی عمر پر پہنچ کر کہوں گا، فی الحال زمانہ طالب علمی ہے۔ حضور احمد نے میرے آگے ایک نئی دنیا روشن کر دی۔ اب مجھے علم کا میدان ایک اصلی چیز نظر آنے لگا۔ خود اس وقت تک قطعی جاہل تھا۔ عمر کافی گذر چکی تھی۔ کیا کر سکتا تھا۔ حافظہ خدا نے یا تو مطلق دیا ہی نہ تھا یا عہدِ طفلی کی آئین نکم یا این نکم کی، رشتے داروں کی چھین جھپٹ کی نذر ہو چکا تھا۔ اردو میں رسالہ ''مخزن'' بڑی آب تاب سے اس زمانے میں شائع ہوتا تھا۔ ہر چند پڑھنا چاہا مگر گھنٹہ بھر میں الجھ الجھ کر ایک صفحہ پڑھا تو دماغ پراگندہ ہوگیا۔ لطف کیا خاک آتا۔ آخر حضور احمد کا ہی دماغ چاٹنا جاری رکھا۔ دن دن رات رات بھر ان کا دماغ چاٹتا تھا۔ نہ میری سیری ہوتی تھی نہ وہ تھکتے تھے۔ موتیا تالاب کے کنارے کسی چٹان پر بیٹھے ہیں اور یک رخی باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ بول رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں۔ ''دیکھیے رفیق میاں، اب اسی خیال کو حافظ کس سادگی سے ادا کرتے ہیں۔'' فارسی کا شعر پڑھا۔ لفظ لفظ کے معنی بتائے، پھر شعر کے معنی بتائے، ہر ہر باریکی پر رائے زنی کی۔ حضور احمد اکثر اور بہت بگڑ بگڑ کر کہا کرتے تھے کہ ''رفیق میاں، فارسی تو آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ اس کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو لکھنؤ والوں کے گھروں میں روزمرہ

کی بول چال میں استعمال نہ ہوتا ہو۔ یہ یوں ہے، یہ یوں ہے۔ یہ لیجیے، کوئی شعر لے لیجیے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روے گل سیر نہ دیدیم بہار آخر شد

کیا ہے؟ کچھ نہیں۔ حیف؟ حیف ہے مجھ پر کہ طوطا چشمی کروں اور نتیجے پر زدوکوب ہو میری۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ایک سال نہ گذرا تھا کہ میں فارسی سمجھنے اور بولنے لگا (پڑھنا تو کجا، آج تک اردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی) اوران کی ہر وقت کی دلی مسرت کی تہہ کو پہنچ گیا۔ ان کے خیال میں ظاہر شے بیکار ہے، اصل باطن ہی ہے، وہ ہی ہونا چاہیے۔ انسان کسی بھی چیز کا ماہر اور کامل ہو گیا تو وہ ہی سب سے بڑی سلطنت ہے۔

جس طرح میلی پھتوئی پہنے دکان پر بیٹھا بنیا کھڑے ہو کر دس تسلیمیں کیوں نہ کرے، لیکن ڈپٹی کلکٹر صاحب کو حقارت سے ہی دیکھتا ہے، ویسے ہی علم کا مہاجن دنیا بھر کو دیکھتا ہے۔

افسوس کہ حضور احمد کی صحبت جلد ختم ہو گئی۔ دو برس کے بعد بھوپال سے بھی ہمارا آب ودانہ اٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر مارے کھدیڑے پھر کر ہم اٹاوہ پہنچے۔ اب والد صاحب نے اٹاوہ کی بود و باش اختیار کی۔ ۱۹۱۸ء میں حضور احمد دل کے ارمان دل ہی میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مجھ پر حضور احمد کا اثر پڑ چکا تھا۔ چاہتے تھے کہ ٹھوس علمیت حاصل کریں، مگر کیا پڑھیں، کیوں کر پڑھیں۔ اسکول کے ہر مضمون سے انتہائی نفرت — نہ اردو جانیں، نہ فارسی۔ انگریزی، وہ بھی نہ آتی تھی۔ جغرافیہ اور تاریخ، گدھوں کی ایجاد، گدھوں کے واسطے تھے۔ غرضیکہ ریاضی سے کچھ دلچسپی معلوم ہوئی۔ ارتھمیٹک لے کر بیٹھے۔ اب جو دلی شوق کے ساتھ اسے دیکھا تو گل کھلنے لگے، مزہ ہی آ گیا۔ ایک ہفتے میں چکرورتی کی ارتھمیٹک ختم کر دی۔ دوڑے دوڑے ماسٹروں کے پاس گئے۔ یہاں تک کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی التجا کی کہ اس سے اوپر کی اور کتاب دیں لیکن سب نے انکار کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ علم بس یہاں ہی تک ہے، ختم ہو گیا۔ بڑا رنج ہوا۔ اب جامیٹری اٹھائی۔ ناول کی طرح سب جلدیں چاٹ گئے۔ وہ بھی ختم ہو گئی۔ الجبرا پکڑا۔ ایک ماہ میں نہ صرف کتاب ہی ختم کر دی بلکہ انگریزی بھی آ گئی۔ ہم یہاں کل دس ماہ رہے۔ ہمارے

دوست عظیم بیگ چغتائی کلاس فیلو تھے اور ہم چار بڑے گہرے دوست تھے — میں، عظیم بیگ، ادھم عثمان، ایک لڑکے کا نام بھول گیا، کھرپا چرم اس کا لقب تھا۔ میں کہلاتا تھا موگلی۔ (کپلنگ کی ''جنگل بک'' کا بھیڑیوں میں پلا ہوا انسان ہے۔) ہم بھی کچھ کم وحشی نہ تھے۔ انتہا یہ کہ ایک دن گھر سے بھاگ گئے۔ ایک پلندہ (افسوس، مانگی ہوئی) ریاضی کی کتابیں، صرف دو جوڑے کپڑے۔ بمبئی پہنچے۔ انجینئری کا شوق سوار تھا۔ پندرہ بیس دن بڑی خاک چھانی، کسی کارخانے میں کسی طرح نہ گھس سکے۔ آخر ایک نیپئر فاؤنڈری اینڈ انجینئرنگ ورکس میں قلیوں میں لے لیے گئے۔ اس زمانے میں مزدوروں سے خالص بارہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا۔ صبح چھ سے بارہ تک اور ایک سے شام کے سات بجے تک لوہے ڈھوتے تھے۔

کالے بھجنگے، بغیر ہاتھ دھوئے (کیوں کہ وقت خراب ہوتا تھا) بھٹیارے کے یہاں کھانا کھایا، جلدی سے سو گئے۔ رات کے دو بجے سے صبح پانچ بجے تک پڑھتے تھے۔ وی آئی ٹی انسٹی ٹیوٹ کے داخلے کے مقابلہ امتحان کی تیاری تھی۔ معمولی لیاقت انگریزی اور حساب کی چاہیے تھی۔ تھوڑی کیمسٹری اور فزکس کی بھی ضرورت تھی۔ یہ دونوں چیزیں نئی تھیں۔ انگریزی کا بھی بہت ڈر تھا۔ نہ معلوم کیا کیا پڑھ ڈالا۔ ادھر کارخانے میں بھی ترقی ہوگئی تھی، مزدور سے کھرادی ہو گئے تھے۔ سوا روپیہ روز ملنے لگا تھا، خرچ کچھ تھا ہی نہیں۔ چور بازار کی پچیس تیس کتابیں پڑھ گئے۔ چھ ماہ یہی حال رہا۔ امتحان دیا، پاس ہو گئے، انسٹی ٹیوٹ میں لے لیے گئے۔ اب گھر بھی اطلاع کی۔ سب سے پہلے اچھو باجی کا تار، پھر منی آرڈر ملا، پھر خط۔ چلو پھر انسانوں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ آدمیوں کی طرح رہنے لگے۔ کالج کے طالب علم ہو گئے۔ مگر افسوس، اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔ دماغ کی تیزی نے اور مزاج کے تلون نے برباد کر دیا تھا۔ انجینئرنگ کے شعبوں کی کتابیں ہر طرف نظر آتی تھیں۔ شوق سے دل معمور تھا۔ اللہ نے دماغ تیز دیا تھا (گو حافظہ غائب)۔ پہلے اپنی کلاس کی سب کتابیں پڑھ گئے، پھر دوسرے تیسرے اور چوتھے سال تک کی کتابیں پڑھ ڈالیں (ان میں بی ایس سی کی ریاضی تک شامل ہے)۔ اب کیا پڑھیں، کچھ پڑھنا ہی نہیں۔ انجینئری کی پڑھائی ہمیشہ کے واسطے ختم کر دی۔ باقی تین برس ایک لفظ نہ پڑھا، ایک کتاب نہ خریدی۔ غرور ایسا کہ پروفیسروں کو ٹوک دیں، مقابلے کے دعوے کریں۔ کالج اور

کلاس سے غیر حاضر، بیکار کی گپوں میں وقت ضائع کرتے رہے۔ لٹریچر میں کوئی بتانے والا ہی نہ تھا کہ کیا پڑھو۔ چور بازار کی پرانی کتابیں لالا کر پڑھتے رہتے تھے۔ نہ معلوم کیا کیا خاک دھول ناولیں پڑھ ڈالیں۔ لکھنؤ چھٹیوں میں آئے ہوئے تھے کہ نخاس میں ایک کتاب نظر آئی، خرید لی۔ اس کا نام تھا ''مارٹرڈم آف مین'' (افسوس، کھوگئی اور پھر نہ ملی)۔ چارلس گرے وائس کے بھتیجے ایڈورڈ چارلس کی لکھی ہوئی تھی۔ پانچ سو صفحے کی کتاب تھی۔ کم از کم بارہ دفعہ پڑھی۔ اصل میں دنیا کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن ارتقاے دماغ سے لے کر انسانی دماغ کے آخری عروج تک تاریخ ہوگئی ہے۔ اس کتاب نے پھر مجھ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ لوگ سمجھتے ہیں دہریہ بنا دیا۔ خیر جو کچھ بھی ہو، بس ایک کتاب ان تین برسوں میں پڑھی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں آخری سال کا امتحان دیا۔ ہفتے کو امتحان ختم ہوا اور پیر کے دن پچھتر روپے مہینہ پر ایک انجینیرنگ کے دفتر میں کام کرنے لگے۔ دو مہینے کام کیا۔ گھر بھاگ گئے۔ ۱۹۱۷ء میں شادی ہو چکی تھی۔ گھر پر بیکار کیسے بیٹھتے۔ اب ملازمت تلاش کی تو ملی نہیں۔ جھانسی کے ریلوے ورکشاپ میں گھس گئے۔ چھ مہینے کام کیا اور پھر چھوڑ بیٹھے۔ ساردا نہر کی تعمیر شروع ہو رہی تھی، اسی میں بن بسا کے جنگل میں جگہ مل گئی۔ نو ماہ کام کیا اور چھوڑ چھاڑ گھر آ بیٹھے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں پھر بلائے گئے۔ شاہ گڑھ میں تقرری ہوئی۔ کچھ عرصہ افسران اعلیٰ مسٹر شیلی اور روچ سے لڑتے بھڑتے رہے۔ استعفے کی بندوق بغل میں دبائے ان کو دھمکایا کریں، کہ ان کا تبادلہ ہوگیا اور بقیہ زندگی کی تباہی کے مکمل سامان ہوگئے، یعنی چھوٹے سے قد کے گول مٹول رائے صاحب لالہ رام نرائن صاحب اسسٹنٹ انجینیر اور آنند پرکاش وائل صاحب ایگزیکٹیو انجینیر کی جگہ پر آگئے۔ کچھ عرصہ جھپٹیں ہوا کیں۔ کام کے قدرداں دونوں ہی تھے۔ کچھ دنوں کے بعد معاملہ ہی دگرگوں ہوگیا۔ ایک اماں بن گئے دوسرے ابا۔ لاڈلے بیٹے کو اشارہ کر دیا — تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر۔ چھ برس دن عید اور رات شب برات کے گذرے — شکار اور تاش، تاش اور شکار، بے عنوانیاں، بے قاعدیاں کیں، مگر اپنے کام سے دلی محبت تھی۔ جب آن پڑا جان لڑا دی۔ کام پر حاوی رہے۔ جتنا کرنا تھا اس سے دگنا اور تگنا کیا۔ مگر وہی، نہ وقت کی پابندی نہ قانون کی پابندی، نہ کسی کی ماتحتی نہ افسری۔ طبیعت کا جنگلی پن سوایا ہوا، غرور چوگنا۔ عیش پسندی ایک نئی چیز پیدا ہوئی۔ اس عرصے میں گنتی کی ایک کتاب بھی نہ پڑھی۔ لہو ولعب میں یہ زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ بدلیاں ہونے

لگیں۔ وائل اور رام نرائن کو چھوڑ کر دوسرے کی ماتحتی، یہ خیال بھی ہم کو گوارا نہ تھا۔ استعفیٰ دے دیا، منظور نہ ہوا۔ روپوش ہو کر بھاگے۔ اب ایک سرگردانی کی طویل داستان ہے کہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ جب سے آج تک چودہ ملازمتیں کر چکا ہوں۔ ہر جگہ کام سے سب خوش رہے۔ سگولی کو چار دفعہ چھوڑا، کریا کو تین دفعہ اور پھر چلے گئے۔ منیجر اور جنرل منیجر نے ہمارے گھر بھیج بھیج کر ہم کو بلوایا، سب ہی طرح ہماری خوشامد اور دل جوئی کی، مگر آہ! وائل صاحب اور رام نرائن صاحب کی ناز برداریوں کے شکار ہو چکے ہیں۔ نہ ویسے قدرداں ہوں گے نہ ہم کہیں لگ کر رہیں گے۔ آج کل گورنمنٹ سنٹرل ورکشاپ کان پور میں پلاننگ سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ کئی بار استعفیٰ پے درپے دے چکا ہوں، منظور نہیں ہوتا۔ اگر ویسے ہی چھوڑ کر بیٹھ جاؤں تو آرڈیننس ایکٹ میں گرفتار ہو کر باندھا اور گھسیٹا جاؤں۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ یہاں پڑا ہوں اور قسمت کو روتا ہوں۔

یہ ہے میری مختصر زندگی کی طولانی داستان۔

جھوٹا ہوں، سچا ہوں، دیوانہ یا سنکی، جو کچھ بھی ہوں آپ کے آگے حاضر ہوں۔

۲

جون کا مہینہ تھا۔ خس کے پردوں، بجلی کے پنکھوں میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ دفعتاً حکم ملا کہ آگرہ جاؤں اور چند مشینوں کے نقشے مکمل کر کے لاؤں۔ آگرے کی گرمی کے خیال سے دل کانپ گیا۔ ورک منیجر سے ایک دو بہانے بھی کیے کہ وہ کام اور وہ کام میرے ہاتھ میں ہے، ادھورا رہ جائے گا، کسی اور کو بھیج دیں، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہاں میرے علاوہ اور کوئی ایسا بھی نہیں جو جاتا اور کام کر لاتا۔ مجبوراً ایک سوٹ کیس میں چند کپڑے، شیو کا سامان اور ضروری کاغذات رکھ، مختصر بستر اور تھرماس لے، پانچ بجے صبح کی گاڑی سے روانہ ہوا۔ آگرہ پہنچ کر ہوٹل میں قیام کیا۔ ایوروڈرم میں اپنے آنے کی اطلاع کر دی اور کام شروع کر دیا۔ دو دن بعد معلوم ہوا کہ کچھ نقشے وہاں بھی نہیں ہیں۔ دہلی تار دیا جا رہا ہے، تین چار دن میں آئیں گے۔ اس عرصے میں کوئی کام نہ تھا۔ میں نے اطلاع کر دی کہ اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں، اگر میری ضرورت ہو تو ٹیلی فون نمبر ۱۰۱۴ پر مجھے اطلاع کر دیں، ورنہ پیر کو آؤں گا۔ تین دن میں

آگرہ کی ہی سیر کرلوں۔ جمعے کو تاج محل گیا، ہفتے کو قلعہ دیکھنے گیا۔ یہاں ایک بڈھے گائیڈ ننھے خاں ایسے ملے اور اس اس طرح انھوں نے ایک ایک جگہ کے حال بتائے کہ آنکھوں کے آگے نقشے کھنچ کھنچ گئے۔ دو ڈھائی گھنٹے ننھے خاں گائیڈ ساتھ رہے، پھر انعام لے کر سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ مگر میں باوجود گرمی اور پیاس کے وہیں پھرتا رہا۔ کبھی جودھا بائی کے محل میں، کبھی دیوان خانۂ عام میں۔ گھنٹوں ایک ایک جگہ کھڑا عہد ماضی کا تصور باندھتا رہا، یہاں تک کہ سگریٹ ختم ہو گئے اور بھوک سے بے حال ہو گیا تو باہر نکلا۔ ڈھائی بجے دن کا وقت، آگرہ کی گرمی۔ تانگہ ملا وہ بھی مریل۔ خدا خدا کر کے ہوٹل پہنچا۔ پہلے دو پیالی چائے پی۔ پھر نہایا، پھر کھانا کھایا۔ شام کو چھ ساڑھے چھ بجے ٹہلنے سڑک پر نکلا تو اب بھی دماغ ان ہی خیالات میں مبتلا تھا۔ ہوٹل کے پاس ہی ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ بڑی چہل پہل رونق تھی مگر میرے خیالات ہر پھر کے ادھر ہی جا رہے تھے۔

یہی وہ آگرہ ہے جو کبھی مغلیہ بادشاہوں کا دارالخلافہ تھا۔ انھی سڑکوں پر نہ معلوم کیسے کیسے لوگ پھرتے ہوں گے۔ یہ دیکھو، نئی روشنی کے لالہ جی جا رہے ہیں۔ دھوتی کے اوپر پتلون، ہیٹ لگائے، کوٹ پہنے، اکڑے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے دادا پر دادا نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ ایک دن ان کی اولاد یہ شان اختیار کرے گی۔ مغلیہ سلاطین کے زمانے میں ان کے باپ داداؤں نے ضرور اسی طرح مسلمانوں کا لباس فخریہ پہنا ہوگا۔ نہ معلوم اس زمانے کے مسلمان کا کیا لباس ہوتا ہوگا۔

دیکھو، قبلہ تانگہ ہانکتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کے بزرگ ملکوں اور قوموں کو اسی طرح ہانکتے ہوں گے۔ اچھا، کیا تعجب ہے کہ ٹھیک اسی شخص کے بزرگوں میں کوئی بہت بڑا وزیر یا بادشاہ گذرا ہو۔ آہاہا! پٹے کٹی میم صاحب موٹر لیے اڑی چلی جا رہی ہیں۔ ارے لومڑی، یہاں ہاتھیوں کے پرے جھوما کرتے تھے۔ ارے اس زمین پر کوا پر نہ مار سکتا تھا اور تمھارے بزرگ جب نیم وحشی تھے۔

کایا پلٹ ہو گئی۔ ارے یہ سائیکل! خدا کی قسم، شاہ جہاں سے اگر کوئی نجومی کہتا کہ ایک دن تمھارے آگرہ میں ایک بابو کا لڑکا — بابو؟ اچھا محرر یا منشی کا لڑکا — ایسی ایک چیز پر اڑا پھرے گا تو کیا ہوتا؟ شاہ جہاں ضرور اسے پاگل خانے میں بند کروا دیتا۔ پاگل خانہ؟ کیوں نہیں، اس زمانے میں ہوں گے ضرور۔ اسی طرح کے خیالات میں محو بڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ کافی رات ہو گئی۔ ہوٹل میں

گیا، کپڑے اتارے، کھانا کھایا اور سو گیا۔ لیکن رات بھر ایسے ہی خواب دیکھتا رہا۔ صبح اٹھا تو از خود دل رنجیدہ تھا۔ چائے منگائی، تین پیالی چائے پی۔ اور پھر چائے دان بھروایا۔ نہ معلوم کتنی پیالیاں پی گیا۔ اس عرصے میں عقل سلیم کہتی تھی کہ بس ہو چکا، قلعے کی سیر کرلی، اب دوبارہ جانا کیسا۔ اور دل کہتا تھا نہیں چلو، ایک دفعہ پھر چلو، اور اب کی تیار ہو کر چلو، خوب دل بھر کر سیر کرو، دن بھر رہو۔ آخر دل کا کہنا کیا۔ اٹھا، پاجامہ اتار نکر پہنی، کوٹ پہنا، سفید چھوٹے موزے اور جوتا پہنا۔ گھنٹی بجائی۔ ہوٹل کا ملازم آیا۔ اس سے کہا، ایک تانگہ بلالو، کچھ سینڈوچز بنوالو، اور اس تھرماس کو برف سے خوب بھر دو۔

جب یہ سامان آگیا تو بھرا ہوا ڈبا سگریٹ کا ایک جیب میں رکھا، دوسری جیب میں سینڈوچز کے پیکٹ، اور تھرماس ہاتھ میں لٹکا تانگے میں جا بیٹھا۔ قلعہ پہنچ کر تانگے والے کو رخصت کرنا مشکل ہو گیا۔ گائیڈوں نے آ کر گھیر لیا۔ کسی طرح مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھوٹا۔ آج میں تنہا ہی پھرتا رہا۔ ایک طاق کے پاس کھڑا ہو جاؤں تو وہیں کھڑا رہوں۔ نہ معلوم کیا ہو گیا تھا۔ کل شام تک تو تخیل کی جولانیاں اڑائے پھر رہی تھیں لیکن آج دماغ بے حس سا تھا، اور دل افسردہ ہوا چلا جا رہا تھا۔ کئی دفعہ چاہا کہ ہوٹل کو واپس چلا جاؤں، لیکن یہ بھی نہ ہوتا تھا۔ ناشتے کے واسطے سینڈوچز ساتھ، مگر بھوک ہی نہ لگی۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک تو اِدھر اُدھر آدمی نظر آتے رہے، پھر گرمی اور لو کی وجہ سے قلعہ بالکل سنسان ہو گیا۔ ایک بجا تو اور ہو کا عالم ہو گیا۔ اب گرمی سے میرا دماغ چکرانے لگا۔ شاید سگریٹوں کا دھواں دماغ پر چڑھا۔ یہ جی چاہا کہ منہ ہاتھ دھوؤں، کسی ٹھنڈی جگہ بیٹھ کر سینڈوچز کھاؤں، ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیوں۔

محل کے باہر سڑک کے کنارے جو باؤلی ہے اس میں اتر گیا۔ سایہ اور تری، لُو کا اتنی گہرائی میں گذر نہ تھا۔ کافی امن تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ کوٹ اور قمیص تک اتار ڈالی۔ تلوے بھی آگ کی طرح جل رہے تھے۔ جوتا اور موزے بھی اتار دیے۔ رسٹ واچ بھی کھول کر پتھر پر رکھ دی۔ پانی میں پیر لٹکا کر موتی ایسے شفاف اور ٹھنڈے پانی سے ہاتھ پیر اور منہ دھونے لگا۔ کرسی کی طرح ایک سیڑھی پر بیٹھا تھا۔ نیچے والی سیڑھی جو کہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی، اس پر دونوں پیر پانی کے اندر تھے۔ جھکا ہوا دونوں چلوؤں میں پانی لے لے کر منہ پر ڈال رہا تھا کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ پانی پر کچھ عجیب

وغریب انسانوں کے عکس پڑ رہے ہیں۔ جلدی سے گھوم کر اپنے پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ سیڑھیوں کے قدمچے سنسان اوپر تک چلے گئے تھے۔ ایک جنگلی کبوتر ایک سیڑھی پر بیٹھا تھا۔ برابر میں دیوار پر ایک چھپکلی ساکت چپکی ہوئی تھی۔ میں پھر پانی پر جھکا، وہاں کچھ نہ تھا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا۔ ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوئیں اور ان میں پھر عجیب اور نرالے انسانوں کے عکس نظر آنے لگے۔ ایسے ہی جھکے جھکے میں بغور دیکھنے لگا۔ یہ عکس پانی کی سطح سے پانی کی تہہ کی طرف ہٹتے گئے۔ اب یہ معلوم ہوا کہ باؤلی کے پانی کے نیچے کچھ آدمیوں اور ایک آدھ عورتوں کے سے عکس ہیں اور ہل جل رہے ہیں۔ ان کو پوری طرح دیکھنے کے لیے جھکتا چلا گیا، یہاں تک کہ پانی میں اوندھا ہو گیا۔ گھبرا کے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے۔ دم گھٹنے لگا تھا۔ پانی نے اچھال دیا اور پھر سطح آب پر آیا۔ جلدی جلدی پھر ہاتھ چلائے۔ کسی نے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ حواس باختہ۔ پھیپھڑوں میں پانی چلا گیا تھا۔

سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ میری اپنی طرف کی اور سامنے کی، دونوں طرف کی سیڑھیوں پر بہت آدمی موجود تھے اور عجیب زبان میں ہر ایک کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر ان کی طرف دھیان نہ دیا۔ ہوں گے کسی دیس کے لوگ، سیر کو آ گئے ہوں گے۔ موقعے سے آ گئے، میری جان تو بچی۔

ارے میرا سامان، رسٹ واچ؟ یہ خیال آتے ہی میں نے سر اٹھائے بغیر ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ٹٹولا۔ اکڑوں بیٹھ کر سر گھٹنوں میں رکھے بیٹھا تھا۔ جب کوٹ، تھرماس یا جوتے کچھ نہ ملا تو سر اٹھا کر ان لوگوں کو دیکھا۔ حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ لوگ ایسے کپڑے پہنے تھے جو کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔ ہر ایک کی کمر میں یا تو تلوار لٹکی ہوئی تھی یا چھرے گھسے ہوئے تھے۔ بولیاں بھی بالکل نرالی تھیں۔ سب کے سب میری طرف مخاطب تھے۔ خیر، اب مجھے ایسا کوئی تعجب نہ ہوا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا سامان کہاں ہے؟ یہ لوگ بوکھلا کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے اشارہ کیا، کوٹ، رسٹ واچ اور جوتوں کا۔ اب بھی کوئی کچھ نہ سمجھا۔ اب میں نے باؤلی کے اوپر والی سیڑھیوں میں بغور دیکھا کہ کوئی گائیڈ ہی نظر آئے۔ وہاں گائیڈ کوئی نہ تھا اور یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ بہت سے کہیں سے آ گئے ہیں۔ کچھ تیزی سے اوپر چڑھ رہے تھے، کچھ جلدی جلدی نیچے آ رہے تھے۔ جو آتا تھا مجھ کو ایک عجوبہ جانور کی طرح دیکھتا تھا۔ میں نے اب انگریزی میں بات کی مگر یہ بھی کوئی نہ سمجھا۔ میں نے سوچا، شاید یہ سپاہیوں کا قافلہ وسطِ ایشیا کے کسی مقام

سے آگیا ہے۔ ہیں سب بدمعاش، ان سے اپنا سامان یوں نہ ملے گا۔ ابھی دیر نہیں ہوئی ہے، چلو اوپر چل کر قلعے کے دروازے پر کسی سپاہی کو اطلاع کروں۔ اول تو رسٹ واچ قیمتی تھی، پھر کوٹ کی جیب میں منی بیگ تھا، سب کچھ اسی میں تھا۔ ریٹرن ٹکٹ بڑی مشکل سے ملا، وہ بھی اسی میں تھا۔ بدن پر پانی ٹپکتی بنیان اور نکر کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اٹھا اور سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ ان لوگوں میں ہل چل سی ہوئی۔ کوئی آٹھ سیڑھی باقی ہوں گی کہ دو آدمیوں نے لپک کر دونوں طرف سے بازو پکڑ لیے۔ ہوش اڑ گئے۔ میں ڈرا کہ یہ وحشی کہیں مجھے اس مختصر سامان کے واسطے اسی باؤلی میں ڈبو نہ دیں۔ یہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اوپر پہنچ جاؤں اور پولیس کو اطلاع ہو جائے تو پھر ان کو معلوم ہو کہ یہ برٹش راج ہے۔ دو منٹ نہ گذرے تھے کہ تھپ تھپ کرتے چھ حبشی، سروں پر رومال باندھے، چوڑی اور آدھی آستین کے لمبے کرتے پہنے، ننگی تلواریں لیے، عجیب طرح کے سینڈل پیروں میں پہنے، سیڑھیوں سے نیچے آئے۔ میری مشکیں چمڑے کی رسی سے باندھ کر مجھے اوپر لے چلے۔ اوپر پہنچ کر میں چکرا سا گیا۔ ارے یہ کیا ماجرا؟ میں ہوں کہاں؟ وہ سنسان قلعہ کہاں گیا؟ بہت کچھ اس اجاڑ قلعے سے ملتے جلتے مکان ضرور تھے مگر پھر بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ہی سڑک جس کے کنارے باؤلی تھی موجود ضرور تھی مگر یہاں آدمی ہی آدمی بھرے تھے۔

نقش و نگار سے آراستہ مٹکیاں سروں پر رکھے عورتیں بھی باؤلی کے گرد کھڑی تھیں۔ کئی ہاتھی محل کی دیوار کے نیچے چاندی کے ہودوں سے آراستہ کھڑے جھوم رہے تھے۔ کچھ خوشنما گھوڑے مخملی اور رنگین زینوں اور خدا معلوم کیا کیا بھڑ کیلے لوازمات سے آراستہ سائیس لیے کھڑے تھے۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار آجا رہے تھے۔ ایک برات کا سا عالم تھا، لیکن نہایت عجیب۔ کیا بتاؤں۔ کچھ تھیٹر کے سے لباس اور تھیٹر کے سے مکانات تھے۔ یہ حبشی مجھے لے کر ایک کمرے کی طرف گئے۔ وہاں کچھ اور حبشی اسی طرح میری آمد کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ایک خلقت ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ ان میں اب کسی کے فارسی بولنے کی آواز میرے کان میں آئی۔ میں کچھ ٹھٹکا لیکن فوراً آگے کھینچا گیا۔ اس کمرے پر ہم پہنچے۔ اس کا بڑا سا دروازہ کھلا تھا۔ اندر چاندنی اور قالین کا فرش تھا۔ دروازے کے پاس ایک بزرگ، سفید ڈاڑھی، مولویانہ سی پوشاک پہنے، گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ ایک حبشی ان کے پیچھے کھڑا مور

کے پروں کا پنکھا جھل رہا تھا۔ ان بزرگ نے کسی زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں خاموش۔ میری عقل خبط تھی، جواب کیا دیتا۔ اب انھوں نے عربی میں کچھ کہا، پھر فارسی میں پوچھا۔

بڈھا: فارسی زبان سمجھتا ہے؟

میں: ہاں۔

بڈھا: پھر تو کہاں سے آیا؟ کس ملک کا رہنے والا ہے؟ یہاں کیوں کر آیا؟ سچ بتا۔

میں: تم کون ہو؟ کیسے آئے؟ کب آئے؟ تمھیں مجھے اس طرح گرفتار کرنے کا کیا حق ہے؟

بڈھا: (ایک حبشی کو مخاطب کرکے) درّہ لے آؤ۔

فوراً درّہ آ گیا۔ خدا کی پناہ۔ نہایت خوف ناک چمڑے کا ہنٹر تھا۔

بڈھا: (میری طرف دیکھ کر) اگر جواب نہ دو گے مارے درّوں کے کھال اتار دی جائے گی۔ اب بتاؤ کہاں سے آئے ہو، بولو۔

میں: کان پور سے آیا ہوں۔

بڈھا: کان پور کس ولایت میں ہے؟

میں: ولایت نہیں، یہاں یو پی میں ہے۔ میل ٹرین سے سات گھنٹے کا راستہ ہے۔

بڈھا: کیا بکتا ہے؟ تیری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ تو ہے کون؟

میں: سرکاری ملازم انجینئر ہوں۔ یہاں بکار سرکار آگرہ آیا تھا۔ سیر کے واسطے قلعے میں آ گیا تھا۔

بڈھا: معموں میں بات کرو گے سزا دی جائے گی۔ زبان کو تھام کر جواب دو۔ کس سرکار کے ملازم ہو؟

میں: آخر ان سب باتوں سے مطلب کیا ہے؟ برٹش گورنمنٹ کا ملازم ہوں، اور کس کا ہوتا؟

بڈھا غصے سے کانپتا ہوا اٹھ بیٹھا اور نہایت غصے میں فارسی ہی میں کہا، ''لے جاؤ اسے اور مرمت کرکے اس کا دماغ صحیح کرو۔ جب یہ راہِ راست پر آ جائے تو پھر حاضر کرو۔'' اب تو میرے ہوش اڑ گئے۔ ادھر حبشی کھینچ رہے ہیں، ادھر میں ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔

میں نے کہا، ''خدا گواہ ہے۔ سب صحیح صحیح بتایا ہے۔''

بڈھا: ممکن ہے کہ تو نے سب سچ کہا ہو، لیکن باتیں معمے بنا کر کہی ہیں۔ کیا نام ہے؟

میں: سید رفیق حسین اصلی نام ہے۔ انجینئرنگ کے میدان میں جعفری مشہور ہوں۔

بڈھا: انجی جنگ کیا شے ہے؟

میں کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں!

بڈھا: تو کس ولایت سے آیا ہے؟

میں: خدا کی قسم، ولایت آج تک نہیں گیا۔ یہیں کا رہنے والا ہوں۔

بڈھا: (بگڑ کر) پھر وہی باتیں! خیر، تو یہاں کیسے آیا؟

میں: (بہ عجز) قبلۂ من، کیا مطلب ہے؟ جس طرح آپ آئے ایسے میں آیا۔ کانپور سے آگرہ ریل میں آیا۔ ہوٹل سے قلعے تانگے میں۔

بڈھا: ناشائستہ، بدشعور! تو اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے گا۔ لے جاؤ اسے۔

میں: واسطہ خدا کا رہنے دو۔ رہنے دو۔ اے بزرگ، اے قبلہ و کعبہ، میں سب کچھ بتا دوں گا۔ بتانا چاہتا ہوں، آپ ہی نہیں سمجھتے۔ اچھا بہتر یہ ہوگا کہ پہلے مجھے آپ بتا دیں کہ میں ہوں کہاں؟ آپ اور یہ سب لوگ کون ہیں؟

بڈھا: تم شہنشاہ جہاں پناہ، قبلۂ دوراں جلال الدین محمد اکبر کے ایک حقیر ناچیز داروغہ کے سامنے ہو۔ تم کو سچ بولنا پڑے گا۔

میں: کیا یہ اکبر کا زمانہ ہے؟

بڈھا: ہاں ہاں ہاں! کیا تجاہل عارفانہ ہے!

اس سے آگے میں نہ سن سکا۔ دماغ چکرایا، بے ہوش ہو کر گرا۔

۳

تھوڑی دیر میں آنکھ کھلی تو دیکھا بھیڑ اور بڑھ گئی۔ کچھ لوگ جھک جھک کر میرے نکر کے کپڑے بنیان کو بغور دیکھتے تھے۔

اب داروغہ کے پاس ایک اور آدمی بھی پگڑی سر پر رکھے بیٹھا، کلک کا قلم ہاتھ میں لیے، ایک سلیتے پر کچھ لکھ رہا تھا۔لوگ باری باری بلائے جاتے تھے۔وہ بیان کرتے تھے، یہ لکھتا تھا۔دو ایک نے فارسی زبان میں بھی بیان دیے۔معلوم یہ ہوا کہ جو لوگ میری آمد کے وقت باؤلی میں موجود تھے، ان کے بیان تحریر کیے جا رہے تھے۔ایک آدمی نے، جو لمبی چوگوشیہ پوستین کی ٹوپی پہنے تھا، یہ بیان دیا:

''خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں ایک گھڑی پیشتر سے لب آب و بروم چاہوئش کا منتظر بیٹھا تھا۔حاشا وکلا میں نے اس آدمی کو آتے نہیں دیکھا۔اور دیکھا تو صرف اتنا کہ پہلے سطح آب پر کچھ عقل حیران کر دینے والے نقوش نمودار ہوئے جس سے کہ دونوں جانب کے بہت سے لوگ ادھر متوجہ ہو گئے۔پھر پانی میں از خود ہیجان شروع ہوا۔یہ آدمی دفعتاً نمودار ہوا۔چوں کہ ڈوبتا سا معلوم ہوتا تھا، ہم لوگوں نے اسے نکال لیا۔جب سے یہ شخص ایسی ہی دیوانی باتیں کر رہا ہے۔میرے خیال میں بہت لمبی سرنگ لگا کر اندر ہی اندر کہیں سے آیا ہے۔ضرور غوطہ خور اس سرنگ کا دہانہ ڈھونڈھ لیں گے۔'' وہ ابھی یہی کہہ رہا تھا اور اس کا بیان تحریر ہو رہا تھا کہ چار آدمی لنگوٹے کسے، کیچڑ میں سنے، خول کو ہٹاتے اس دائرے میں داخل ہوئے۔ٹوٹی پھوٹی فارسی میں ان میں سے ایک نے کہا، ''ہم نے ہر طرح ڈھونڈا، وہاں سرنگ تو الگ رہی چوہے کا بل بھی نہیں ہے۔'' بڈھے نے پوچھا، ''اچھی طرح دیکھ لیا ہے نا؟ جاؤ پھر اطمینان سے ڈھونڈو۔''

اس آدمی نے کہا، ''واہ! ہم بھی کوئی بچے ہیں۔پھر ہتھیلی بھر کی تو باؤلی ہے۔پانی کی گہرائی بھی کچھ نہیں۔چلو بھر پانی نہ ہوا طلسمات ہو گیا۔اگر کوئی دوسرا وہاں چوہے کا بل بھی نکال دے تو ہمارے سر قلم کر دیے جائیں۔'' ہماری پشت پر لوگوں میں ہل چل سی مچی۔بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہوئیں۔کسی نے بڑھ کر بڈھے سے کہا، ''عرض بیگی ہے۔''

''آستانہ خاص می آیند،'' بڈھا مودب کھڑا ہو گیا۔سامنے کی بھیڑ کائی کی طرح چھٹی اور ایک سرخ سفید، سیاہ گھنی ڈاڑھی والا نوجوان زرق برق لباس پہنے مع دس بارہ آدمیوں کے نمودار ہوا۔بڈھے نے جھک کے تسلیم کی اور اپنی مسند پر اسے بٹھایا۔خود اور محرر باادب پاس کھڑے ہو گئے۔اس نوجوان نے مسکرا مسکرا کر اور ہنس ہنس کر سب کا حال پوچھا اور سنا۔مجھ کو نزدیک منگوایا۔اب میری حالت بالکل

ایسی تھی جیسی کہ جنگل سے تازہ پکڑے ہوئے بن مانس کی۔

اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ ان لوگوں میں سے چند سے باتیں کیں جو میری شانِ نزول کے گواہ تھے۔ یہ آدمی تین چار زبانیں بول سکتا تھا۔ مجھ سے فارسی میں صرف اتنا پوچھا، ''یہ کیا سوانگ بھرا ہے؟'' اتنا کہا اور کھڑا ہو گیا اور چلتے چلتے داروغہ کو حکم دیا کہ اسے کسی حفاظت کی جگہ بند کر دو اور پہرے سے باخبر رہو۔

اسی کمرے سے کچھ دور مجھ کو ایک کوٹھری میں بٹھا دیا گیا اور دو حبشی ننگی تلواریں لے کر دروازے میں پہرا دینے لگے۔ یہ لوگ مجھے کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر آپس میں رک رک کر شاید عربی میں باتیں کرتے رہے۔ غالباً دونوں مجھ سے بھوت پریت کی طرح ڈر بھی رہے تھے، کیوں کہ ان میں سے ایک نے منھ ہی منھ میں کچھ پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا۔

سوا گھنٹے کے قریب میں یہاں بیٹھا رہا۔ پھر دو حبشی تیزی سے آئے، کچھ کہا۔ یہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔ مجھے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور لے کر چلے۔ پہرا در پہرا، پھاٹک کے بعد پھاٹک پار کیے۔ عجیب دنیا تھی۔ ہر جگہ سجاوٹ عجیب تھی۔ جا بجا بڑے بڑے سنگ مرمر کے بڑے بڑے پیالوں میں لوبان سے جل رہے تھے، مگر ان کی خوشبو لوبان سے بہتر تھی۔ سجاوٹ کی کوشش بہت تھی مگر بھدی۔ قالین اور شال ہر طرف نظر آتے تھے اور ان کی آڑ اور کونوں میں کوڑا چھپا ہوا تھا۔ ایک بڑے سے دروازے پر جب ہم پہنچے تو یہ حبشی وہاں رک گئے اور ان کی جگہ بیس اور آدمیوں نے لے لی۔ سب کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ یہ لوگ نیلے چوغے پہنے تھے، کمر پر سرخ ریشم کے پٹکے بندھے تھے، سر پر فولادی خود تھے، پیروں میں گھٹنوں تک عجیب طرح کے موزے یا خول چڑھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ خاموشی سے مجھے لے کر اندر داخل ہوئے۔ اندر آتے ہی سب سامنے کی طرف رکوع کی حالت میں جھک کر کھڑے ہو گئے۔ میں حواس باختہ یوں ہی کھڑا تھا کہ ان میں سے ایک نے جلدی سے سیدھا ہو، میری گردن پکڑ، مجھے بھی دوہرا کر دیا۔ میں بھی ایسے ہی کھڑا ہو گیا۔ آواز آئی، ''اسے آگے لاؤ۔'' دو آدمی مجھے لے کر آگے بڑھے۔ چاندی سونے کا پانچ فٹ اونچا ایک اسٹیج سا تھا جس کے چاروں طرف نیچا جالی دار کٹہرا تھا۔ اس پر ایک آدمی، بالکل ہسٹری میں جو اکبر کی تصویر ہے اسی سے ملتا جلتا، گاؤ تکیہ پر سہارا لیے

بیٹھا تھا۔

دو آدمی اِدھر اُدھر کھڑے مورچھل جھل رہے تھے۔ تخت کے سامنے دونوں طرف بہت سے آدمی زرق برق پوشاکیں پہنے کھڑے تھے۔ میرے آزو بازو کے دونوں سپاہی خود بھی زمین کی طرف جھکے اور مجھے بھی بڑی خوبصورتی سے اپنے ساتھ جھکا لے گئے۔ ہم سب نے زمین پر ماتھے ٹیکے اور پھر سیدھے ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ان امیروں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھ سے پوچھا، ''تم کون ہو؟''

میں: میں ایک بدنصیب انسان ہوں یا کسی سحر یا جادو میں پڑ گیا ہوں۔ میں کون ہو سکتا ہوں؟ وہی ہوں جو ہوں۔ ایک معمولی انجینئر، گورنمنٹ کا ملازم، لکھنؤ کا رہنے والا۔ کان پور سے آیا تھا۔ یہاں مغلیہ سلطنت کے آثار دیرینہ دیکھے۔ دل تڑپ گیا۔ آنسو بہاتا تھا۔ اس قلعے کی سیر کرتا پھر رہا تھا کہ اس جادو میں پھنس گیا۔ اب خدا کے واسطے معاف کرو۔ اس جادو سے نکال دو۔

امیر نے تخت کی طرف منہ کر کے کہا، ''جہاں پناہ، اس شخص کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔''

ایک اور امیر آگے بڑھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کے پہلے جھکا اور پھر سیدھا ہو کر کہا، ''میں نہیں کہتا کہ اس کا دماغ خراب ہے یا نہیں، لیکن قابلِ غور ضرور ہے۔ اول اس کا خلاف فطرت ظہور میں آنا، دوئم اس کی پوشاک۔ بندگان عالی وقار ملاحظہ تو کریں کہ کس طلسمات کے پارچے اس کے بدن پر ہیں۔ اول یہ (میری نکر چھوتے ہوے) اس قدر تو دباغت ہے اور تار اتنے باریک ہیں کہ نگاہ کی گرفت سے باہر۔ (بنیان کے دامن کو کھینچتے ہوے) پھر اسے دیکھیے تو عجیب ہی کیچلی ہے۔ جدھر چاہو کھنچ جاتی ہے۔ یہ چیزیں کسی دور دراز کی ولایت کی ہیں۔ آدمی دیوانہ نہیں، گھبرایا ہوا ضرور ہے۔ گناہ عظیم سرزد ہو گیا ہے کہ اس طرح چھپ کر قلعۂ معلیٰ میں داخل ہوا۔ اگر جان کی امان ملے، خطا معاف ہو، تو اکرام ہاے خسروانہ سے سرخرو ہو کر سب کچھ صاف صاف بتا دے۔

اکبر نے ہاتھ کا اشارہ کیا جیسے کسی کے سر پر ہاتھ رکھتا ہو۔

اس امیر نے فوراً میری طرف بڑھ کر مجھے ڈھکیلا اور کہا، ''سجدہ بہ کن! سجدہ بہ کن! شکر بجا آر کہ از دریاے کرم پایاب شدی۔'' مجھے سجدے میں پھر ڈھکیل دیا۔ جب میں اٹھا تو بہت محبت سے بولا،

''اب تم بلا تکلف ہماری باتوں کا جواب دو۔ تم کو اب کچھ نہ ڈرنا چاہیے۔''

امیر: تمھارا نام کیا ہے؟

میں: رفیق حسین۔

امیر: نام بہت اچھا۔ ماشاء اللہ۔ اور تمھارے والد بزرگوار کا نام؟

میں: خان بہادر سید جعفر حسین مرحوم۔

امیر: الحمدللہ! شریف گھرانے کے ہو اور سیّد ہو۔ فبہا۔ اور یہ تو بتاؤ، دیکھو چھپانے کی اب مطلقاً ضرورت نہیں۔ معافی مل چکی ہے۔ یہ بتاؤ، آئے کہاں سے ہو؟

میں: کان پور سے۔

امیر: ضرور ایسا ہی ہوگا۔ کان پور کس مملکت میں ہے؟

میں: کان پور۔ ہائے افسوس، کیسے بتاؤں، اسی ہندوستان میں ہے۔ بہت قریب۔ سات گھنٹے کا راستہ ہے۔

اس امیر نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر میری طرف گھورا، خوف ناک صورت بنا کر تخت کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

امیر: یہاں کس طرح سے آئے؟

میں: ریل پر اور پھر تانگے میں۔

امیر: ریل کیا ہوتی ہے؟ تانگہ کیا چیز ہے؟

مجھے ایک دم خیال آیا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ ارے یہ سب خواب ہے! میں نے جلدی جلدی اپنے دونوں ہاتھ منھ پر پھیرے۔ پھر آنکھیں ملیں، اور زور لگا لگا کر آنکھوں کو خوب چیرا اور پھر چاروں طرف دیکھا، مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہی دربار وہی محل تھا۔ میں نے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر چٹکی لی۔ تکلیف ہوئی۔ ارے، یہ کیسا خواب ہے؟ میں نے پیر زمین پر زور سے پٹخا۔ اصلی سخت زمین تھی۔ اس امیر نے مجھ سے کہا، ''دیکھو ان معمہ گوئیوں کو چھوڑو، ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر جان کی امان درکار ہے تو ٹھیک سے بتاؤ کہ اس کنویں کی تہہ سے کیسے نمودار ہوئے؟ کون ہو؟ کہاں سے آئے

ہو؟"—— وہ یہ کہہ رہا تھا اور میں یہ کہہ رہا تھا:

یا اللہ، اب میں اس خواب سے جاگ جاؤں۔ یا اللہ، ہوشیار کر دے۔ اللہ میاں، سوتے میں جگا دے۔ اور چوں کہ خواب ہی سمجھا تھا اس لیے یہ سب اردو میں ہی کہہ رہا تھا، کہ ایک سفید لمبی ڈاڑھی والے مولوی نے بڑھ کر پہلے استغفر اللہ پڑھا، پھر قرآن شریف کی ایک چھوٹی آیت پڑھی اور اس کے بعد بولا، "بس بس، اسے جلد سے جلد جلادوں کے سپرد کر دینا ٹھیک ہے۔ یہ ساحر ہے۔ سحر پڑھ رہا ہے۔"

بڑی منت سے فارسی میں کہا، "خدائے بالا و برتر خوب می داند کہ سحر نمی کشم بلکہ خود گرفتار طلسم شدہ ام۔ در بارگاہِ خالق خود التجا می کنم کہ مرا ازایں خواب پریشان بیدار بہ کند۔"

اس وقت سب درباری اپنی اپنی جگہ ناراض معلوم ہونے لگے اور کئی غصے میں کچھ کچھ کہنے لگے۔ بادشاہ نے آہستہ سے ہاتھ اٹھایا۔ فوراً سب دم بخود خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے کہا، "مابدولت اپنی زبان سے آپ اس کی جان کو امان بخشنے کا اعلان کرتے ہیں اور اب ہم خود اس سے سوال کریں گے۔ اے اجنبی شخص، کس کا بھیجا ہوا مخبر ہے اور کس مملکت یا ولایت سے آیا ہے؟"

میں: گم شدہ سلطنت مغلیہ کا آفتاب اور اس کا دیدار! شہنشاہ اکبر اور مجھ سے بات کرے۔ میرا مقدر ایسا کہاں! افسوس، افسوس، کہ یہ خواب ہے۔ اصلیت اس کی کچھ بھی نہیں۔

اتنی بات کا میرے منھ سے نکلنا تھا کہ راجپوت سردار غصے سے جھنجھلایا ہوا میری طرف لپکا۔ چھری کی نوک میرے شانے میں بھونک کر بولا، "اپنی چٹکیوں سے یقین نہ آیا تو یہ لے۔ اب تو یقین آیا کہ یہ خواب نہیں ہے؟"

میرے شانے سے خون کی بوندیں ٹپا ٹپ فرش پر کرنے لگیں۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے شانہ دبا کر پکڑ لیا۔

اکبر نے کہا، "نہیں نہیں۔ اذیت دینے سے کیا فائدہ۔"

راجپوت: مہابلی سوال کریں اور یہ چوہا جواب سے یوں گریز کرے۔

اکبر: (مسکراتے ہوئے) صبر سے کام لو۔ (میری طرف دیکھ کر) اچھا یوں ہی سہی۔ مابدولت

اور یہ سب امرا خواب کی ہی پتلیاں سہی۔ (مسکرا دیے۔) کیا تم خواب کی پتلیوں کو یہ نہ بتاؤ گے کہ سونے سے پہلے تم کہاں تھے؟

میں: بے شک خواب میں بھی اکبر اعظم کی حکم عدولی نہ کروں گا۔ بتاؤں گا اور ضرور بتاؤں گا۔ لیکن داستان لمبی اور پیچیدہ ہے، کہ چار سو برس کا وقفہ کہنے والے اور سننے والوں کے درمیان حائل ہے۔ مجھ کو چند لمحے کی مہلت دی جائے کہ دماغ پراگندہ کو درست کروں، اور وہ طرزِ بیان سوچوں کہ جس سے میرا کہا نازِ مسلمانانِ جہاں، شہنشاہِ ہند اکبر اعظم کی سمجھ میں آئے۔ اگر اس وقت کرم شاہانہ فرما کر ایک پیالی چائے کی پلوا دیں تو ہوش حواس درست ہو جائیں۔ صبح چائے پی کر چلا، اب شام ہونے والی ہے۔

اکبر: چائے کیا چیز ہے؟

میں: فارسی کی تعلیم نہیں ہے۔ ایسے ہی زبردستی سیکھ گیا ہوں۔ خدا حضور احمد کو غریق... خیر خیر، چائے کا فارسی نام نہیں آتا۔ سیاہی مائل سرخ ہوتی ہے۔

اکبر نے ایک خدمت گار کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً سونے کے بادیے میں کچھ لایا۔ لیکن جوں ہی اس نے اسے میری طرف بڑھایا، شراب کی ناگوار بو آئی۔ میں متعجب ہو کر پیچھے جھکا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی، "بندہ مسلمان ہے۔ غلام نے تو چائے طلب کی تھی۔" ان ہی مولوی صاحب نے گو آہستہ سے کہا لیکن میں نے ان کو "الحمد اللہ، مرحبا!" کہتے سنا۔ اکبر نے پھر اسی آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ پھرتی سے ایک طرف غائب ہو گیا۔ کوئی پانچ منٹ تک ہم سب انتظار میں رہے۔ اب کی وہ چھوٹی سی پیالی لے آیا۔ کالا کالا پانی اس میں تھا۔ جوں ہی میں ناک پاس لے گیا، افیون کی بو آئی۔ ناک چڑھا کر اسے بھی واپس کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا، "تم چائے کے مرکبات بتاؤ۔"

میں: یہ ایک پتی ہے۔ اسے خشک کر کے رکھ لیتے ہیں پھر گرم جوش پانی میں ڈال کر استعمال کرتے ہیں۔ اس میں نشہ نہیں ہوتا۔

بادشاہ: (بڑے غور کے بعد سر ہلایا۔) ہماری مملکت میں ایسی کوئی چیز استعمال نہیں ہوتی۔

میں: اچھا تو پھر کرم فرما کر اجازت ہو جائے کہ کسی آڑ میں جا کر حقے یا سگریٹ کے ہی دو کش لے لوں۔

بادشاہ: یہ کیا چیزیں ہیں؟

میں: (جلدی سے) تمبا کو، تمبا کو، تمبول، کسی بھی صورت میں ہو۔

بادشاہ: ہم تمبول کو نہیں جانتے یہ کیا ہوتی ہے۔ کس چیز سے بنتی ہے۔''

میں: یہ بھی ایک قسم کی پتی ہے۔ اسے جلا کر اس کا دھواں پھیپھڑوں میں لیتے ہیں۔

بادشاہ: تو یہ بھی ہماری اقلیم میں نہیں ہے۔ ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ اس لیے انھیں چھوڑو، تم اپنا حال بیان کرو۔

میں: اب کیا ہوگا؟ تمبا کو اور چائے دونوں ابھی تک دنیا میں دریافت نہیں ہوئی ہیں۔ خیر، بہتر ہے، سنیے۔ حالانکہ وقت کے دریا میں تمام عالم ابد کی طرف بہتا چلا جارہا ہے لیکن نہ معلوم کیوں مجھ بدنصیب کی گنگا الٹی بہہ پڑی اور چار سو برس بہاؤ سے اوپر کھینچ لائی۔ یعنی ۱۹۴۲ء کا انسان ہوں، غوطہ کھا کر جو نکلتا ہوں تو اپنے کو چار سو برس پہلے کی اس دنیا میں واپس پاتا ہوں۔

اس فقرے کے منہ سے نکلتے ہی بہت سے درباری کھل کھلا کر ہنس پڑے یا کچھ حیرت کا پتلا بن گئے، لیکن اکبر کی متانت میں مطلق فرق نہ آیا۔ نہ ہنسا نہ حیرت ظاہر کی۔ بولا، ''تو پھر ایک ہزار برس کہو۔ اب ہجری ۹۷۷ ہے اور تم نے ڈبکی ۱۹۴۲ میں لگائی تھی۔''

میں: ہجری نہیں۔ میں سنہ عیسوی بتا رہا ہوں۔

اکبر: سنہ عیسوی سے کیا مطلب؟ یہ کیا سنہ ہے؟

میں: یہ سنہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔

اکبر: ایسا ہی ہوگا لیکن ہم کو سنہ ہجری بتاؤ۔ کس ہجری کی بات کر رہے ہو؟

میں: افسوس مجھے ہجری معلوم نہیں۔

اکبر: کیا تم نے ابھی نہیں کہا تھا کہ تم مسلمان ہو؟ پھر یہ کیا بات ہے کہ تم کو اپنے سنہ ہجری کا پتا تک نہیں اور سنہ عیسوی سے حساب رکھتے ہو؟

میں: ہائے ہماری بداعمالیاں آپ نے ابھی سنیں کہاں۔ ہم سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ ہماری ایمان فروشیوں کی داستانیں ابھی آپ کو کیا معلوم کیا ہیں۔ ایسے نہ ہوتے تو آج ہندوستان پر عیسائیوں

کا راج ہوتا؟

اکبر: کیا کہا؟ کیا تمھارا مطلب ہے کہ اب سے چار سو برس کے بعد ہماری رعایا مذہب عیسوی اختیار کر لے گی؟

میں: جی نہیں جہاں پناہ! یہ نہیں، بلکہ سات سمندر پار، آٹھ ہزار میل کے ملک فرنگ کے آدمیوں کا یہاں قبضہ ہے۔ وہی اس ملک کے حکمران ہیں۔ ان کا انگلستان میں یعنی فرنگستان میں بیٹھا ہوا بادشاہ یہاں کا شہنشاہ ہے۔

اکبر: اور تیموری خاندان؟

میں: جس طرح بہار میں پھول کھلتے ہیں اور جب خزاں آتی ہے غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح حیف صد حیف، اب خزاں کا دور دورہ ہے۔

اکبر: یعنی کیا کل چار سو برس کے بعد ان کا نشان تک باقی نہ رہے گا؟

میں: شب کی محفل کی یادگار جلی بجھی شمعیں صبح کو باقی رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ قلعہ اور چند اور عمارتیں ہم بدنصیبوں کو خون کے آنسو رلانے کے واسطے باقی ہیں۔ ہم سیاہ بخت ان کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں۔ میں بھی اس میں اسی لیے آیا تھا کہ سلطنت تیموریہ کے آثار قدیمہ دیکھوں اور خوب دل کھول کر رولوں۔

اکبر: صرف چار سو برس کا عرصہ ہوگا اور یہ تغیر عظیم وجود میں آئے گا؟ تم کس سنہ ہجری کی بات کر رہے ہو؟

میں: گنہگار تو عرض کر چکا ہے کہ سنہ عیسوی ۱۹۴۲ کا ہے۔ ہجری سے ناواقف ہوں۔

اکبر: آج کل عیسوی کیا ہے؟

میں: افسوس، تواریخ سے مجھے ہمیشہ سے نفرت رہی۔ تاریخیں کبھی یاد نہ رہیں۔ اندازاً بتا سکتا ہوں کہ آپ کا زمانہ سنہ عیسوی چودہ سو اور پندرہ سو کے درمیان ہے۔

اکبر: (درباریوں میں دیکھ کر) کوئی بتا سکتا ہے آج کل سنہ عیسوی کیا ہے۔

ایک عجیب مسخرا سا، کوچی ڈاڑھی، سر پر کچھ پھولے پھولے رنگین کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ کسی

نے اسے بھی ایک عجیب زبان میں اکبر کا فرمان سمجھایا۔ اس نے سر ہلا کر کچھ کہا۔ برابر والے نے
مودب آگے بڑھ کر کہا، ''یہ سیاح ولایت پرتغال کا کہتا ہے کہ آج کل بموجب سنہ عیسوی ۱۵۷۰ کا
ہے۔''

اکبر: اس سے کہو کہ حساب لگا کر بتائے کہ ۱۹۴۲ء میں کون سا سنہ ہجری ہوگا۔

اس نے کچھ دیر انگلیوں پر حساب کیا اور پھر اپنے برابر والے کو بتایا۔ اس نے بہ آواز بلند کہا،
''جب ۱۳۶۲ یا ۱۳۶۳ ہجری ہوگی۔''

اکبر: ۱۳۶۳ اور ۹۷۷ یعنی آج سے کل ۳۸۶ برس کے بعد اور ایسا انقلاب؟ کیا بتا سکتے ہو
کہ کن کن ممالک میں عیسائی بادشاہ کا خطبہ پڑھا جائے گا؟

میں: انقلاب نہیں انقلاباتِ عظیم! نہ خطبہ پڑھنے والے ہوں گے نہ خطبہ سننے والے ہوں
گے۔ جن کو شہنشاہ ممالک کہتے ہیں وہ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔ ہندوستان خود ایک
برّاعظم کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ براعظم کے براعظم ان سفید قوموں کے قبضے میں ہیں۔

درباریوں میں ہلچل سی مچی۔ ایک نے بڑھ کر کہا، ''اس نابکار کی زبان تالو سے کھینچ ڈالنی
چاہیے۔'' ایک نے کہا، ''جہاں پناہ یہ شخص دیوانہ ہے۔ دیوانے کی بات کا کیا اعتبار۔'' کوئی بولا،
''حد درجہ مکار ہے۔ گستاخی اور دلیری۔ سزائے عظیم کا مستحق ہے۔''

اکبر کے بشرے پر اب بھی کوئی تغیر نہ آیا۔ پھر ہاتھ اٹھایا، سب خاموش ہو گئے۔ اب میرے بھی
دل سے تمام ڈر غائب ہو گیا تھا۔ دل سے یہ نکلتا ہی نہ تھا کہ یہ خواب ہے۔ جس طرح خواب میں اکثر
میں نے دیکھا کہ ہاتھی میرے پیچھے پیچھے دوڑا ہے، جان انتہائی خطرے میں ہے، اسی طرح یہ ہے۔ کچھ
بھی ہو، جب مرنے کا وقت آئے گا، آنکھ کھل جائے گی۔ اس لیے نہایت اطمینان سے جواب دینے لگا۔

''گنتی کے دو چار ملک چھوڑ کر باقی روئے زمین پر اسی کی حکم رانی ہوگی۔ کیا خشکی کیا تری، ہوا پر
بھی اسی کا قبضہ ہوگا۔ ہندوستان سے بیس بیس گنے بڑے تین تین براعظموں کی اصلی کالے آدمیوں کی
پوری آبادی کو ختم کر کے اپنی نسل کے سفید انسانوں سے آباد کر دیں گے۔

''مسلمان جس ملک میں گئے، کیا چین کیا ہند، کیا ایران کیا افریقہ، کیا ہسپانیہ، سب کچھ اس

ملک پر قربان کر دیا۔ اپنے خون سے اس ملک کی کھیتی کو سینچ کر سر سبز کیا۔ اپنے وطن، اپنے تمدن اور اپنی معاشرت کو اس ملک پر سے قربان کر دیا۔ برخلاف اس کے، تہذیب کی علم بردار یہ سفید قومیں جہاں گئیں اس ملک کو اس قدر لوٹا، اتنا برباد کیا کہ آبادیاں کی آبادیاں ختم کر کے وہاں سفید قوم کی بستیاں بسائیں۔ ان کو کالونی کہہ کر اپنی وحشیانہ حرکت کو تہذیب کا جامہ پہنایا۔ اے شہنشاہ عالی وقار، کیا پوچھتے ہیں۔ آج دنیا سے اسلام کی تاجداری ختم ہو چکی ہے۔"

بادشاہ: (میری بات کاٹ کر) اور یہ ہمارے بہادر راجپوت، ان کا کیا حال ہوگا؟

میں: کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ مٹھی بھر آدمی، یہ ہیں کس گنتی میں! وحشی ہندوستان کے ایک چھوٹے ٹکڑے میں یہ لوگ آباد ہیں۔ یہاں معاملہ ہندوستان ایسے سو ملکوں کا ہے۔

اکبر: (پھر بات کاٹ کر) دیکھو، تمھارا یہ دعویٰ ہے کہ تم آج سے ۳۸۶ برس کے بعد جو زمانہ آئے گا اس کے آدمی ہو، کسی طرح سے اس زمانے میں آ گئے ہو۔ ہم تم کو چار دن کی مہلت دیتے ہیں۔ چار دن کے اندر تمھیں کوئی نہ کوئی ایسا ثبوت دینا ہوگا جس سے تمھارا یہ دعویٰ مان لیا جائے۔ اور اگر تم ثبوت نہ دے سکے تو پھر تم کو جلاّد کے سپرد کر دیا جائے گا۔ (سپاہیوں سے مخاطب ہو کر) اچھا اسے لے جاؤ، ہر طرح آرام سے رکھو، لیکن نگرانی پوری رہے اور عوام کو اس سے ملنے نہ دو۔

اکبر کا یہ حکم سن کر میں مسکرا دیا، کیوں کہ اب بھی میں یہی سمجھ رہا تھا یہ خواب ہی ہے اور شانے میں چھرے کی نوک کے بھکنے کی جو تکلیف ہے وہ بھی خواب ہی کی ہے۔ کچھ دیر میں آنکھ کھل جائے گی تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔

ایسے میں دو سپاہیوں نے دونوں طرف آ کر مجھے پکڑا (کچھ دیر سے میں تنہا تھا)۔ جب میں چلنے کو ہوا تو خیال آیا کہ لو اب تم چلے۔ کچھ دیر میں یہ خواب ختم ہے، پھر دوبارہ کیا آ سکتے ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

"شہنشاہوں کے شہنشاہ، اے اکبر اعظم! تاریخ میں آپ کا نام آفتاب کی طرح چمکے گا۔ آنے والی نسلیں اور قومیں آپ کو اعظم کا خطاب دیں گی۔ آپ کی اور آپ کے دربار کی زیارت ہونا، گو خواب میں ہی کیوں نہ ہو، ایک بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ افسوس، اب میں یہاں سے جاتا ہوں۔ تھوڑی

دیر میں آنکھ کھل جائے گی، پھر یہ زیارت نہ نصیب ہوگی۔ ایک حسرت رہ جائے گی کہ آپ کے دربار کے چاندوں کو ٹھیک سے نہ دیکھ سکا۔ اس لیے ان میں سے (درباریوں کی طرف اشارہ کر کے) کون کون ہے یہ بھی بتادیا جائے۔ چار سو برس کے بعد بھی ان میں سے بہت سوں کے نام بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ مجھے بتایا جائے کہ ملک الشعرا فیضی کون سے ہیں، اور ابوالفضل کون سے ہیں۔ راجہ مان سنگھ، راجہ ٹوڈرمل اور بیربل کون کون ہیں۔ سلطنت کا بانی سپہ سالار بیرم خان، اور خان خاناں عبدالرحیم خانخاناں کون سے ہیں۔ وہ شیر دل خان زماں علی قلی خان کون ہے؟''

ابھی تک تو یہ سب میری باتوں پر ہنس رہے تھے یا اب یہ معلوم ہوا کہ سانپ سونگھ گیا۔ سارا دربار سکتے کے عالم میں آگیا۔ میں حیران ہوا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے، یا شاید اس التجا میں کوئی پہلو گستاخی کا نکل آیا ہے۔ اس خیال سے خوشامد کے واسطے میں یہ ترکیب کی کہ درباریوں میں ایک طرف ایک تیرہ چودہ برس کا لڑکا زرق برق کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ میں دل میں سمجھ رہا تھا کہ یہی شاہزادہ سلیم ہے جو بڑا ہو کر شرابی کبابی، نور جہاں کا عاشق ہوگا۔ گو دل نہ چاہتا تھا لیکن فوراً جھک کر چار تسلیمیں کیں اور عرض کی، ''غالباً حضور ہی ولی عہد سلطنت شاہزادہ سلیم ہیں۔''

ہائے، میرا اتنا کہنا تھا کہ یہ لڑکا بید کی طرح کانپنے لگا۔ آہستہ آہستہ بادشاہ کے تخت کی طرف بڑھا، دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکا کے کہنے لگا۔

''شہنشاہ جہاں پناہ، حاشا وکلا میں اس شخص سے واقف نہیں ہوں۔ یہ مکار ہے۔ مکاری کے پردے میں میرے واسطے دشمنی کے جال پھیلاتا ہے۔''

میں اس کے آگے نہ سن سکا۔ سپاہی مجھے کھینچتے لے گئے۔

۴

چار سپاہی میرے آگے ہوئے چار میرے پیچھے۔ شاہی محلوں کے باہر بڑی سڑک کے دوسرے پار والے مکانوں میں سے ایک میں لے گئے۔ یہاں کئی گلیوں، ڈیوڑھیوں کو پار کر کے ایک بہت بڑے صحن میں سے ہو کر ایک کوٹھے پر آئے۔ یہاں چھوٹا سا ایک صحن تھا جس کے چاروں طرف اونچی اونچی

دیواریں تھیں۔ ایک طرف دالان دردالان آزو باز و دو صحنچیاں تھیں۔ صحن کی ایک دیوار کے برابر میں ایک طرف چھ کوٹھریوں کے چھوٹے چھوٹے دروازے مقفل تھے۔ صحن کے بیچوں بیچ بالشت بھر اونچا اور قریب دو گز مربع چوکور چبوترہ تھا۔ شام ہونے کے قریب تھی۔ چراغ جلنے کا وقت ہوا۔ سخت گرمی کی شدت۔ بھوک سے بے حال۔ نہ چاے نہ سگریٹ۔ حالت یہ کہ بدن پر قمیص نہیں، پیر میں جوتا نہیں۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ دن بھر کا تپا ہوا، آگ کی طرح جل رہا تھا۔ میں فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ ان سپاہیوں میں سے ایک نے کہا، ''تپا ہوگا۔ آپ توقف کریں۔ فراش اور متصدی جلد ہی آتے ہیں۔''

میں یہ تو سمجھا نہیں کہ مطلب کیا ہے لیکن میں نے کہا، ''پیاسا ہوں، پانی پلا دو۔''

اس نے پھر کہا، ''صبر کرو۔'' میرا اب پیاس کے مارے دم نکلا جاتا تھا اور وہ سب بڑے اطمینان سے کھڑے تھے۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ دیکھیے اب کیا افتاد آنے والی ہے، اس لیے خاموش کھڑا رہا۔ قریب قریب آدھ گھنٹہ گذرنے پر جب اندھیرا کافی ہو گیا تو چھ آدمی اور آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک عجیب طرح کی لالٹین یا قندیل تھی۔ ایک صاحب، موٹے، گولا مولا جسم، سر پر کچھ عربوں کا سا پہناوا، ایک ہاتھ میں پیتل اور لوہے کے کچھ اوزاروں کا گچھا سا لٹکائے، انھیں چھن چھناتے، دوسرے ہاتھ میں پیتل کی دوات، اس میں پر کا قلم، بغل میں بہی کھاتا، آگے آئے، مجھے سلام علیک کیا، اور کہا، ''احکام ملنے میں دیر ہوئی۔ بندہ قصوروار نہیں۔ تکلیف ہوئی ہوگی، مگر تقصیر معاف۔'' میں نے کہا، ''کیا مجھے پانی پینے کو مل سکتا ہے؟ پیاس سے بے حال ہوں۔'' مولوی صاحب نے تیزی اور پریشانی میں اپنی جگہ پر کھڑے ہی کھڑے دو چکر کھائے اور پھر ایک آدمی سے کہا، ''ہنزال، تو جا، دیکھ ساقی نے کہاں دیر کی۔ جلدی جا، جلدی آ۔ اپنے ساتھ لا۔'' زینے پر پھر کچھ آہٹ ہوئی۔ پستہ قد موٹے مولوی صاحب نے پھر اپنی شان کے بالکل برخلاف دو چکر کھائے، جھنجھناتے اوزار اور لوازماتِ دفتر کو ایک طرف کے ہاتھ سے دوسری طرف کے ہاتھ میں تبدیل کر کے بولے، ''وہ آتے ہیں۔ سب آتے ہیں۔ اب ذری دیر ہے، بندہ بھی چلا۔'' یہ کہا اور بجلی کی طرح کوٹھریوں کی طرف لپکے۔ لیکن دو ہی قدم بڑھا کر، ایک چکر کھایا اور واپس آ گئے۔ پنجوں کے بل اونچے

ہوے۔ایک آنکھ بند کر کے آہستہ سے پوچھا، ''مہم پیش نظر، مہم پیش نظر؟ بنگالہ کے واسطے آئے ہیں؟''
میرے حواس درست نہ تھے۔ نہ معلوم کیا بکتا تھا۔ میں نے بھی سر ہلا دیا۔ مولوی صاحب نے مع اپنے
تن وتوش کے ایک چکر گھمی پھر اپنی جگہ پر کھالی۔ ایک آنکھ بند کر کے کچھ اشارہ کیا۔ قدم بھر پھر
کوٹھریوں کی طرف گئے، چکر کھایا اور پھر لوٹ آئے۔ بولے، ''بندہ بھی صاحب سیف ہے اور
صاحب قلم بھی۔'' سیف پر وہ کچھ اونچا کر کے دکھایا جو کہ دراصل کنجیوں کا گچھا تھا، قلم پر دوات اونچی
کی۔ میری پشت پر سے اب دو تین آدمیوں کے کسی نامعلوم زبان میں بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔
گھوم کر دیکھا تو بہت سے آدمی آگئے تھے۔ دو ایک مشعلیں بھی لیے تھے۔ کئی ایک کے سروں پر بڑے
بڑے خوان تھے۔ ان میں سے دو ایک بگڑ بگڑ کر کچھ کہنے لگے۔ موٹے مولوی نے مجھے تو چھوڑا، اور پھر
کی کی طرح گھوم گھوم کر اور اچھل اچھل کر ان سے دو بدو ہوے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے سے
بحث کر رہے ہیں اور بگڑ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں قریب قریب ہر آدمی بولنے لگا۔ گھر کنجر خانہ ہوگیا۔
ایک کے پیچھے ایک چار چھ بہشتی بھی مشکیں لیے آگئے۔ کچھ دیر وہ بھی اس جنگ میں شامل رہے۔ ان
میں سے ایک نے بڑھ کر آؤ دیکھا نہ تاؤ، پانی چھڑکنا شروع کر دیا۔ لوگ ادھر ادھر ہو رہے۔ مولوی
صاحب بھی کوٹھریوں کی طرف کھسکے اور، گو زبانی لڑائی کو جاری رکھا، کوٹھریاں کھولنے میں لگ گئے۔
منٹوں منٹوں گھر کی حالت بدلنے لگی۔ کوئی آدھ گھنٹہ نہ لگا تھا کہ گھر بھر میں جھاڑو ہوگئی۔ آنگن بھر
چھڑک دیا۔ بیچ کے چھوٹے چبوترے پر قالین اور گاؤ تکیہ لگ گیا۔ صحن کے چاروں کونوں میں چار
دھویں دار بھائیں بھائیں جلتے چراغ، یا مشعلیں، بالشت برابر بڑی لو سے جلنے لگے۔ قالین پر
بھی ایک شمع دان رکھ دیا گیا۔ ایک طرف چوکی پر جھلملاتے نقشین لوٹے، مٹکیاں وغیرہ سجا دیے گئے۔
اگر جا بجا جلنے لگا۔ ایک آدمی نے بڑھ کر سلپچی آگے رکھ کر میرا ہاتھ منھ دھلایا۔ چاندی کی ایک تھالی میں
تین چار بتیاں اور کچھ اور چیزیں، سب چاندی کی، رکھی تھیں۔ یہ آدمی بار بار ان کی طرف اشارہ کرتا
تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے ان میں سے ایک کو کھولا۔ خوشبودار دوا سی تھی۔ دوسری کو کھولا۔ نہ معلوم
اس میں کیا تھا، کچھ کچھ لیس دار چیز تھی۔ ایک میں تیل تھا۔ میں نے ان کو چھوڑا۔ پوچھا، ''صابن
ہے؟'' اس آدمی نے اپنے برابر والے سے پوچھا، ''کیا مانگتے ہیں؟'' دوسرا خاموش رہا۔ مجھے کچھ

جواب نہ ملا۔ خیر ہاتھ پیر دھو کر میں پھر اسی چبوترے کے کونے پر بیٹھ گیا۔ ایک طرف ایک مسہری پر بچھونا بھی لگ گیا تھا۔ اس پر سرخ گول گول ڈھولکیوں کی صورت کے دو تکیے تھے۔ سفید چادر کے بجائے رنگا رنگ کی سیدھی اور ٹیڑھی دھاریوں سے چوخانہ بنا ہوا تھا۔ موٹے ملّا اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لیے لکھ پڑھ رہے تھے اور سامان بھی نکلوا رہے تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھے یوں بیٹھے دیکھا۔ لپک کر آئے۔ ایک ہاتھ میں قلم دوسرے میں کھاتا۔ یہ معلوم ہوا کہ گلے لگا لیں گے۔ ''آؤ آؤ، پارچہ بدل لو۔ جامے حاضر ہیں۔'' اندر کے دالان میں لے گئے۔ لاکھی کے رنگین لکڑی کے ایک تھال میں کچھ کپڑے رکھے تھے۔ کہا، ''زیب تن کیجیے۔'' میں نے ایک کو اٹھا کر دیکھا۔ وہی رنگ برنگے مسخروں کے سے کپڑے تھے۔ ایک گھٹنا، ایک کرتا، ایک چوغہ تھا۔ میں نے دیکھ کر رکھ دیے کہ میں نہیں پہنتا۔ موٹے مولوی صاحب کی سب پھرتی غائب ہوگئی۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر پوچھا، ''مجھ سے کچھ خطا سرزد ہوئی؟ یا کپڑے ناپسند ہیں؟ یہاں کے توشہ خانے میں یہی ہیں۔'' میں نے کہا، ''نہیں نہیں، میں ان کا عادی نہیں ہوں۔ مجھ سے یہ نہ پہنے جائیں گے۔'' مولوی بولے، ''ایسا نہ ہو کہ آقا کی باعث ناراضگی ہو۔'' میں نے پوچھا، ''آقا کون؟ بادشاہ اکبر؟'' مولوی صاحب پھر ناچ سے گئے۔ بولے، ''نہیں، ہمارے آقا، ملک الشعرا۔'' میں نے کہا، ''فیضی؟'' اس نے کہا، ''زاد اقبالہ۔''

اب میں پھر باہر آیا۔ اندر گرمی سے پسینے پسینے ہوا جاتا تھا۔ یہاں جو آیا، دسترخوان بچھا تھا۔ دو لڑکے پنکھے لیے کھڑے اور دو ملازم باادب کھڑے تھے۔ مجھے اشارہ کیا کہ کھانا موجود ہے۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ اتنا کھانا مجھ اکیلے کے واسطے ہے یا اور کوئی بھی آئے گا۔ پھر میں نے کہا، ''مولانا آئیے، کھانا تیار ہے۔'' مولانا بولے، ''ایسی گستاخی نہ ہوگی، آپ کھائیں۔'' میں نے کہا، ''تو اور کون کون کھائے گا؟ اتنا کھانا ہے۔'' معلوم ہوا صرف میرے ہی واسطے تھا۔ خیر میں بیٹھا اور پہلے میں نے پانی مانگا۔ لیکن سب نے اصرار کیا کہ پہلے کچھ کھا لوں۔ کھانے کو اب کیا بیان کروں، نہ معلوم کیا کیا تھا۔ چھ طرح کے چاول تھے، پانچ طرح کی روٹیاں تھیں، نہ معلوم کس کس طرح کے گوشت اور کباب تھے۔ پھر مربے، چٹنیاں، اچار، سب عرق نانہ یا سرکے کے تھے۔ سالن سب گوشت کے بلا ترکاری کے، اور مرچ کسی میں نہ تھی، اس لیے سب پھیکے سے تھے۔ پانی ٹھنڈا، مگر دل برف کے واسطے

بے قرار رہا۔ پانی کے علاوہ شربت اور سکنجبین بھی تھی، لیکن کھانے کے ساتھ اس کا تک سمجھ میں نہ آیا۔ کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ ان دولڑکوں میں سے ایک پنکھا جھل رہا تھا۔ میں تو سمجھا کہ تھوڑی دیر میں چلا جائے گا اور پھر اس قفس میں رات کاٹنا مشکل ہو جائے گی لیکن رات بھر باری باری یہ دونوں جھلتے رہے۔ رات ایک دفعہ، شاید تین بجے کا وقت ہوگا، جب آنکھ کھلی، میں نے پانی مانگا۔ لڑکے نے فوراً صراحی میں سے چاندی کے پیالے میں پانی دیا۔ میں پی کر لیٹا اور سو گیا۔

صبح کو اٹھا تو مجھ سے پوچھا گیا کہ غسل گرم پانی سے کروں گا یا ٹھنڈے سے۔ (دو ملازم نئے موجود تھے۔) میں نے کہا، ٹھنڈے پانی سے۔ معلوم ہوا سب تیار ہے۔ ان ہی کوٹھریوں میں سے ایک غسل خانہ تھا۔ تانبے کے بڑے سے گول مٹکے میں پانی تھا۔ اس کے برابر میں تانبے کا سماوار تھا۔ بیسن دانیوں اور تیل وغیرہ کے برتنوں سے بھری تھالی رکھی تھی۔ بیچ میں ایک چوکی نہانے کی تھی۔

ایک ملازم نے پوچھا، ''تیل مالش ہوگا؟'' میں نے کہا، ''نہیں۔'' وہ چلا گیا۔ صابن دان نہ تھا۔ ایک بادیہ میں ریٹھے بھیگے رکھے تھے۔ میں انھیں پہچان گیا۔ ان ہی سے سر دھویا۔ نہا کر سرخ رنگ کے چوخانہ دار ایک کپڑے سے بدن پونچھا۔ اب کپڑے کیا پہنوں، وہی بنیان اور وہی نکر تھی، اور تھا بھی کیا۔ میں نے ان دونوں کو خوب ریٹھوں سے دھویا اور اسی چوخانہ دار سرخ کپڑے کو پیروں میں لپیٹ کر دروازہ کھولا۔ ملازم نے جو یہ دیکھا، بڑا گھبرایا کہا، ''میں کس واسطے تھا؟ مجھے حکم دیا ہوتا، میں دھو دیتا۔ اور پھر آپ کا جوڑا تو اندر رکھا ہے۔'' ایک جوتا میری چوکی کے نیچے رکھ دیا۔ زرد رنگ لمبی چونچوں کا پنجابی جوتا تھا۔ باہر آیا تو ایک آدمی نے بہت اصرار کیا۔ اب مجھے بھی اپنی حالت پر شرم سی آئی۔ آخر وہی کرتا اور پاجامہ پہنا۔ اس عرصے میں مسہری ان لوگوں نے اندر کے دالان میں بچھاوی تھی۔ باہر کے دالان میں پھر دستر خوان چنا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا، ''یہ کیا؟'' معلوم ہوا ناشتہ۔ افسوس، چائے نہ تھی۔ حلوے، مربے، کباب، شیرمالیں، نہ معلوم کیا کیا تھا۔ شاید دس آدمی پیٹ بھر کر کھا سکتے تھے، اتنا سامان تھا۔

میں نے کچھ ناشتہ کیا۔ اس کے بعد اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ دھو کر گاؤ تکیے کا سہارا لگا قالین پر بیٹھ گیا۔ اس وقت سگریٹ کے لیے اس قدر دل بے چین تھا کہ پھر میں نے ان دونوں آدمیوں سے طرح طرح پوچھا کہ یہاں کوئی حقہ یا چلم پیتا ہے۔

معلوم ہوا نہیں۔ میں نے ان سے یہاں تک پوچھا کہ اچھا دیہاتوں میں کوئی حقہ یا چلم پیتا ہے۔ معلوم ہوا نہیں۔ گاؤں میں لوگ چلم پیتے ہیں، ایسی ہوتی ہے، یوں پیتے ہیں، مگر سب بے سود۔ آخر خاموش بیٹھ گیا۔ اپنی حالت اور اس ماجرے، جادو یا خواب پر غور کرنے لگا۔

اب یہ تو یقین ہو ہی چلا تھا کہ یہ خواب نہیں۔ لیکن پھر سوچتا تھا کہ اچھا، اگر یہ خواب نہیں ہے تو پھر کیا جادو یا سحر ہے؟ تو کس نے کیا؟ کیوں کیا؟ میرے زمانے میں جادو اور سحر دنیا سے ختم ہو چکے تھے۔ اگر اکبر کے زمانے میں کسی آدمی نے سحر پھونکا ہے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جو آج باتیں کرتے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں میرے زمانے میں ان کی ہڈیاں تک خاک ہو چکی تھیں۔ جادو اول تو کوئی چیز ہے ہی نہیں، دوسرے یہ جادو نہیں ہے، ضرور کچھ اور ہے۔ شاید میں اس باؤلی میں ڈوب کر مر گیا۔

اور شاید مرنے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ کچھ عرصے کے واسطے ماضی بعید کی طرف ڈھکیل دیے جاتے ہیں اور پھر تکمیل مستقبل میں کھینچ لیے جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہائے، میں مر گیا۔ افسوس، اسٹیل فرنس جو میں نے ایجاد کی تھی نامکمل ہی رہ گئی۔ ہائے، اس جنگ عظیم کا خاتمہ نہ دیکھ سکا۔

بیوی بچے کا رو رو کے برا حال ہوگا۔ اب ان کی گذر کیسے ہوگی؟ افسوس کہ گورنمنٹ سنٹرل ورکشاپ کے ہندوؤں کی دلی مرادیں بر آئیں۔ ایک میں ہی کانٹا سا ان کی آنکھوں میں چبھتا تھا۔ اب میری جگہ کے واسطے مسلمان کوئی ملنے ہی کیوں لگا اور پھر دفتر والے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ہندو ہی رکھیں گے۔ دو چار مسلمان چھوٹی چھوٹی جگہوں پر ہیں، چلو اب ان کی بھی خیر نہیں۔

بڑے بے موقع مرا۔ گھر والوں کو بھی بڑی مصیبتوں کا سامنا پڑ جائے گا۔ نہ معلوم جان کے بیمے کا روپیہ بھی ان کو ملے گا یا نہیں۔ ہائے کیسے بلک بلک کر یہ بے چارے روتے ہوں گے۔ لیکن اب اس دل توڑنے سے فائدہ کیا۔ مرنا جینا تو دنیا کا دستور چلا ہی آرہا ہے۔ لیکن مرنے میں تکلیف کچھ بھی نہ ہوئی۔ لو میں تو مزے سے یہاں آگیا۔ اب بھی کیا تکلیف ہے؟ چائے اور سگریٹ کی تکلیف ضرور ہے۔ خیر، مجبوری۔ اچھا اب یہاں سے کہاں جانا ہوگا؟ دوزخ، دوزخ۔ اونہوں، اونہوں، جنت۔ بہت ممکن ہے، مگر کیوں؟ اب یہ سب تو اس پر منحصر ہے کہ دیکھیے دراصل خدا، اللہ، گاڈ یا رام کن صفات کا مجموعہ ہے۔ مذہب نے تو اس میں تمام تر انسانی صفات لگائی ہیں۔ بہت بڑے، بہت ہی قوی، مگر

ہر پھر کے انسانی صفات کا ایک انسان سا خدا کو بیان کیا ہے۔ بادشاہ ہے، حاکم ہے، تخت پر بیٹھا ہے، محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے۔ انعام واکرام بھی دیتا ہے، جرموں کی سزائیں بھی دیتا ہے۔ دیکھتا ہے، سنتا ہے، انصاف بھی کرتا ہے، خطائیں معاف بھی کر دیتا ہے۔ ہر پھر کے خوشامد ہی چاہتا ہے۔ کہتا ہے، جو میں کہوں کرو، جو میں منع کروں نہ کرو۔ سب کچھ اچھا برا خود ہی بنایا ہے۔ بلاوجہ محبت، بلاوجہ نفرت۔ خوش ہو گئے، سب خطائیں معاف، انعام ہی انعام۔ خوشامد ہی سے خوش، خوشامد نہ کی تو مجرم۔ جو دل میں آیا سو کر دیا۔ کوئی کام کہہ دیا اچھا ہے، کسی کام کو کہہ دیا برا ہے۔ اگر دراصل خدا ایسا ہی ہے تو اب دوزخ میں ڈھکیلے جانے میں کیا دیر ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ نفرت اور محبت کرنا، غصہ ہونا اور خوش ہو جانا، نماز و سجدوں اور فاقوں اور دعاؤں میں خوشامد ہی خوشامد ہے۔ یہ خوشامد پسندی کیسی؟ کوتاہ نظر، کم عقل، دیوانہ، یا دانا جیسا چاہا بنایا، مولوی یا چور، عالم یا جاہل، بادشاہ یا فقیر۔ جس گھر میں چاہا پیدا کیا۔ بعد میں ویسے ہی گن ہوئے۔ ان پر سزائیں اور انعام۔ خدا کی شان، خدا کی بڑائی میں یہ صفات بٹا لگاتی ہیں۔ وہ ضرور ان سب انسانی چیزوں سے بالاتر ہے۔ نفرت اور محبت سے بالاتر ہے۔ سزا اور جزا ایسے انسانی خیالوں سے اعلیٰ تر ہے۔ خوشامد سے بھولے بھالے انسان کی طرح خوش ہو جائے یا گالیوں سے مغرور کی طرح غیظ وغضب میں آجائے۔ توبہ توبہ! وہ ایک ہستی عمیق ہے۔ انسان اور حیوان صرف اس ہی ایک دنیا کے نہیں، کروڑوں کروڑوں دنیاؤں میں پیدا کر دیے۔ جیسے چاہا ویسے بنا دیے۔ جیسے بنا دیے ویسے وہ ہیں۔ موری کا کیڑا بنایا، کیچڑ میں لت پت موری میں ہے۔ ڈالی پر بلبل کو بٹھایا، وہ وہیں چہکتی ہے۔ عالم بنائے، وہ عالم ہیں۔ زاہد بنائے، وہ زاہد ہیں۔ جاہل جاہل ہیں اور چور چور ہیں۔ کسی جنگل میں جاؤ، شیر ہیں، چیتے ہیں، ہرن ہیں، سؤر ہیں، مور ہیں، الّو ہیں۔ سب کچھ اسی کے پیدا کیے ہیں۔ جو جیسا بنایا ویسا ہے۔ انسانی عقل ایک پیمانے کا سب کو نپا تلا ایک سا دیا ہی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک حد تک جزا، سزا اور انصاف جائز ہوتا۔ یہاں انسانی دماغ کا یہ حال ہے کہ ایک ہی مسئلے پر دس کی رائے لو، دس جواب الگ الگ ہوں گے۔ پھر عقل خود تابع اور مطیع ہے ماحول کی۔ ماحول بنتا ہے زنجیر حوادث کی کڑیوں سے۔ میرے اگر ایسے آزاد خیال ہیں تو کیوں؟ اول، بچپنے میں ماں کے مر جانے سے، دوم، قاعدۂ عربی کے یاد نہ ہونے اور اس لیے قرآن اور مذہبی کتابوں کے نہ پڑھنے سے، سوم،

کتاب "مارٹرڈم آف مین" کے پڑھنے سے۔ وجہ اول اور دوم میں گناہ سے بری ہوں۔

کان میں آواز آئی، "السلام علیکم۔" میں چونک پڑا۔ گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ ایک بزرگ مولانا سامنے کھڑے تھے:

۵

ان کو میں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلام کا جواب دے کر میں نے پوچھا، "فرمائیے، بندے کے واسطے کیا حکم ہے؟" معلوم ہوا کہ ملک الشعرا فیضی نے ان کو میرے پاس بھیجا ہے۔ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور بلایا ہے۔ مجھے ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میں مہمان کے بجائے ایک قیدی کی حیثیت سے ہوں، اور فیضی کی ہی قید میں سپرد کیا گیا ہوں۔ میں نے کہا، "یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ ایسے صاحب کمال انسان کے سپرد کیا گیا ہوں۔" فوراً چلنے کو تیار ہو گیا۔ ان بزرگ نے یہ بھی کہا کہ اس ملاقات کا ذکر میں کسی سے نہ کروں، اور ساتھ لے کر چل دیے۔ اسی زینے کے اوپر جس سے میں اس گھر میں آیا تھا، ایک اور دروازہ تھا۔ ہم دونوں اس میں گئے۔ وہاں سے کوٹھے کے اوپر ہی دو دیواروں کے بیچ ایک پتلے سے راستے پر چلے۔ پھر دروازہ آیا۔ اس کے اندر جا کر ایک کمرہ تھا۔ جھاڑ فانوس، قالین، پردوں سے سجا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ عرصے سے یہ بھی بند ہے۔ ہر چیز پر گرد تھی۔ صفائی نہیں ہوئی تھی۔ کمرے کے دوسری جانب کا دروازہ کھول کر یہ آدمی مجھے ایک چھوٹے سے صحن میں لایا۔ اس کے دوسری طرف آگے دالان، پیچھے کمرہ تھا۔ دالان میں ناندوں میں لگے کچھ سبز شاداب پودے تھے۔ دو تین بانس کے پنجروں میں طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں تھیں۔ ان کے پنجرے لکڑی کی اونچی چوکیوں پر رکھے تھے۔ ایک جانب تختوں کا چوکا، اس پر قالین۔ دوسری طرف بہت سی الماریاں ایک قطار سے دیواروں کے کنارے کنارے لگی ہوئی تھیں۔ میرے ساتھ والے نے آہستہ سے مجھے بتایا کہ یہ کتب خانہ ہے۔ کمرے میں فیضی ہیں۔ میں نے کمرے کے دروازے پر جوتے اتار دیے۔ اندر داخل ہوا۔ وہاں اور بھی بہت سی الماریاں تھیں۔ دو تین چھوٹی چھوٹی چوکیاں اِدھر اُدھر قالینوں پر رکھی تھیں۔ ایک الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور کئی کتابیں اس کے سامنے زمین پر پڑی تھیں۔ کمرے میں کسی طرح کی

سجاوٹ نہ تھی، البتہ چھت میں دو جھاڑ لٹکے تھے۔ کمرے کے دونوں سروں پر دو فانوس تھے اور متعدد شمع دان اِدھر اُدھر رکھے تھے۔

ایک طرف چھوٹے چھوٹے دو تختوں کا مختصر چوکا تھا۔ اس ہی پر ہلکے چیچک کے داغ، سیاہ رنگ، چوکور مگر مختصر ڈاڑھی، شگفتہ صورت، تیس بتیس کی عمر کا ایک آدمی۔ سیاہ چوغہ، گہرا نیلا ریشمی کرتا پہنے، منہ پر مسکراہٹ، ایک کتاب ہاتھ میں لیے پڑھ رہے تھے۔ تخت کے نیچے ایک کم عمر خوبصورت لڑکی کھڑی خاموشی سے پنکھا جھل رہی تھی۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا، فیضی نے فوراً کتاب کے صفحوں میں ہاتھی دانت کی نشانی رکھ کر اسے احتیاط سے بند کر کے رکھا اور آدھے کھڑے ہو کے میری مزاج پرسی کی اور مصافحہ کیا۔ پھر مجھ سے کہا، بیٹھ جاؤ۔

میں اسی تخت کے کونے پر پیر لٹکائے ٹیڑھا بیٹھ گیا۔ فیضی کچھ جزبز سے معلوم ہوے۔ شاید مجھے ان کے برابر تخت پر نہ بیٹھنا تھا، بلکہ نیچے قالین کے فرش پر بیٹھنا چاہیے تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کہا، ''یہ کون سی نشست ہے؟'' میں نے فوراً کہا، ''زمانے کے ساتھ ہر چیز بدلتی ہے۔ میں آپ کے زمانے کے آداب سے ناواقف ہوں۔'' اور کھڑا ہو گیا۔

فیضی: (جلدی سے مسکرا کر) بیٹھو بیٹھو، یہیں بیٹھو۔ لیکن پیر اوپر اٹھا کے اطمینان سے بیٹھو۔

میں پھر بیٹھ گیا۔ اب کی پیر اوپر کر کے پھسکڑا مار کر بیٹھا۔

فیضی: (بات کاٹ کر) کیا تمھارے زمانے والے مجھ خاکسار کے نام سے واقف ہیں؟

میں: بچہ بچہ۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ فارسی ہندوستان سے ختم ہو گئی ہے۔ نہ گھروں میں بولی جاتی ہے نہ دفاتر میں لکھی جاتی ہے، نہ کوئی پڑھ سکتا نہ بول سکتا ہے، لیکن آپ کا نام روشن ہے کہ اکبر اعظم کے دربار کا ملک الشعرا فیضی سب سے بڑا شاعر تھا۔

فیضی: تو میرے قصیدے اور نظمیں تلف ہو جائیں گی؟

میں: نہیں نہیں۔ میرے زمانے میں تو آپ کے کلام کی لاکھوں لاکھوں جلدیں دنیا بھر میں ہوں گی۔ ایک ہو گی، لاکھوں لاکھوں ایجادوں میں سے ایک ایجاد، چھاپہ خانہ۔ کلوں کے ذریعے ایک لکھت کی ہزاروں نقلیں دن بھر میں تیار ہو جایا کریں گی۔ جب کتابیں ہاتھ کی لکھی نہ ہوں گی بلکہ چھپی

ہوئی ہوں گی۔ البتہ فارسی زبان ہندوستان کی ایک علمی زبان کی طرح رہ جائے گی۔ بہت تھوڑے عربی اور فارسی کے شوقین ہوں گے۔ وہ ان زبانوں کو پڑھ کر حاصل کریں گے۔

فیضی: فارسی تو تم نے بھی پڑھی ہے۔

میں: پڑھی نہیں، سیکھ گیا ہوں۔

فیضی: (بات کاٹ کے) بہرحال، تم نے میرا کلام بھی سنا ہوگا۔ میرا کون سا قصیدہ سب سے زیادہ مشہور ہوگا؟

میں: افسوس، میرے زمانے تک دنیا کا اور ہی کچھ رنگ ہوگیا ہے۔ علوم کی بھی سیکڑوں شاخیں ہوگئی ہیں۔ جو جس زمرے میں ہے زیادہ تر واقفیت اس کی اسی سے ہے۔ میں علم ریاضی و علم جرثقیل کا ماہر ہوں۔ ادب سے میری واقفیت کم ہے، اور جو ہے تو بیرونی واقفیت ہے۔ پھر بھی آپ کے ایک قصیدے کے چند شعر میں نے ایک رسالے میں دیکھے تھے، ان میں سے کچھ یاد ہیں۔

فیضی: (خوش ہوکر) سناؤ۔ سناؤ۔

میں:

نسیم صبح مشک افشاں ز گردِ راہ می آید
مگر از مرکب اقبال اکبر شاہ می آید
شبستانِ سعادت را زنُقل و مے لبالب کن
کہ شہ در بوستان و شمع در خرگاہ می آید
مغنی حجلہ ہائے ارغواں را قفل بر در نہ
کہ در گوشہ صدائے کوسِ اکبر شاہ می آید

اور شعر یاد نہیں رہے۔ بہت عرصہ ہوا دیکھے تھے۔

فیضی: (متعجب ہوکر) کلام دل پسند ضرور ہے مگر یہ شعر میرے نہیں ہیں۔

میں: (گھبرا کر) نہیں صاحب، ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں اتنی بڑی غلطی نہیں کرسکتا۔ یہ شعر آپ کے ہی ہیں۔

فیضی: (مسکراتے ہوے) میں جو کہتا ہوں میں نے یہ شعر نہیں کہے۔

میں: (کچھ سوچ کر) دیکھیے دیکھیے، صبر کیجیے۔ ہاں یاد آ گیا۔ مقطع بھی یاد آ گیا۔

دم صبح سعادت می دہی غافل مشو فیضی

کہ فیض صبح گاہی بر دلِ آگاہ می آید

لیجیے، اور یہ بھی یاد آ گیا کہ دکن میں کسی جگہ کی فتح پر بادشاہ اکبر جب گئے تو اس وقت آپ نے یہ غزل یا نظم کہی تھی۔ یاد کیجیے آپ ہی کی ہے۔

فیضی: عجیب طلسم ہے، لیکن اس میں کم از کم مجھے شک نہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ ۱۳۶۳ھ کے دور کے آدمی ہو، یہ صحیح ہے۔ سنو، شہنشاہ کا خیال ضرور ہے لیکن ابھی دکن کی فتوحات شروع نہیں ہوئی ہیں۔ تم نے ان کی فتوحات کا مژدہ ابھی سے سنا دیا۔ اچھا، پھر یہ شعر مجھے لکھا دو۔ انشاء اللہ جب وقت آئے گا تو نظم مکمل کروں گا۔

یہ شعر میں نے لکھا دیے اور بولا، ''میری علمیت اتنی جزوی نہیں ہے۔ یہ شعر آپ کے ہی ہیں، آپ ہی پوری نظم کہیں گے، لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ صدیوں کی گذری ہوئی بات اور اب پھر مستقبل میں نظر آ رہی ہے۔

فیضی: برادر من، یہ تو کچھ بھی نہیں، کل تو تم نے غضب ہی کر دیا۔

میں: ہاں ہاں، آخر میں جب میں نے چاہا کہ لوگوں کو پہچانوں اور تعارف کی التجا کی تو یہ سب دم بخود کیوں ہو گئے؟

فیضی: خان خاناں بیرم خان کو مدت ہوئی کہ عتاب میں مبتلا ہو کر شہید ہوا اور اسی طرح سے خان زماں اور اس کا بھائی بہادر خاں بھی باغی ہو کر عتاب میں آئے، گرفتار ہوے اور مارے گئے۔ اس واقعے کو بھی تین سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اب ان کا نام سرِ دربار کوئی زبان پر نہیں لا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا کوئی کرے تو سخت سزا کا مستحق ہے۔

میں: تو اب مجھے بھی سزا ضرور ملے گی۔

فیضی: ضرور ایسا ہی ہوتا، لیکن تم نے ساتھ ساتھ ایک مژدۂ جاں فزا ایسا سنایا کہ جہاں پناہ کا

دل باغ باغ ہو گیا۔ اور اس کی وجہ سے بعد میں سب ناراضگی دور ہو گئی۔ تم کو کچھ کچھ حالات اس دور کے معلوم ضرور ہیں، لیکن تاریخی حساب سے سب خلط ملط ہیں۔ بہت سی باتیں ابھی وقوع میں بھی نہیں آئی ہیں اور تم سمجھتے ہو کہ ہو گئی ہیں۔ شہنشاہ کے کوئی اولاد نہیں ہے اور اس کی سخت تمنا ان کو ہے۔ ولی عہد سلطنت شاہ زادہ... شاہ زادہ... کیا نام تھا؟

میں: سلیم، جو کہ بعد میں بادشاہ جہانگیر ہو گا۔

فیضی: الحمدللہ! خدا تمھاری زبان مبارک کرے۔ ہاں تو شاہزادہ سلیم کی آمد کا مژدۂ بے ساختہ سن کر پہلے تو جہاں پناہ دنگ سے ہو گئے۔ پھر بہت خوش ہوئے۔ ادھر میں نے بھی تمھاری طرف داری کی، کیوں کہ تم نے ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی ایک خوشخبری سنائی تھی۔

میں: ارے ارے، وہ کیا؟

فیضی: تم نے پوچھا تھا کہ علامہ ابوالفضل کون ہیں؟

میں: ہاں ہاں، تو اس میں کیا شک ہے۔ آپ کے بھائی کہاں ہیں؟

فیضی: الحمدللہ، وہ بخیریت گھر پر ہیں، مگر ابھی علامہ نہیں ہیں۔ بلکہ ابھی تک شہنشاہ کا سامنا بھی نہیں ہوا ہے۔ کل خلوت میں جہاں پناہ نے مجھ سے یہ بھی پوچھا تھا کہ ابوالفضل کون آدمی ہے؟ یہ دیوانہ کسے پوچھتا تھا؟ میں نے عرض کی کہ قبلۂ جہاں، مجھے اور تو کچھ معلوم نہیں، ہاں، میرا ایک چھوٹا بھائی ضرور ہے جس کا نام یہ ہی ہے۔ پوچھا، وہ بھی تمھاری طرح عالم ہے؟ میں نے عرض کہ یہ تو حضور کی بندہ پروری ہے ورنہ خاکسار تو ابوالفضل کے سامنے جاہل ہے۔ اس پر بادشاہ کا ارشاد ہوا کہ اب کی جمعے میں اسے ہمارے پاس لے کر حاضر ہو۔ تو برادرم مکرم، آپ نے دیکھا کہ ابوالفضل تو پرسوں پہلی دفعہ شہنشاہ کے آگے جائیں گے، اور آپ کے وسیلے سے۔

میں: واہ! کیا کہنا! میرا اس میں کیا دخل اور احسان؟ میں نہ بھی آتا تو کیا ہوتا۔ برسہا برس اکبر کے عہد میں وزیر اعظم کا کام کرنے کی کسی اور میں لیاقت کہاں تھی؟

یہ سنتے ہی فیضی میری طرف لپکے اور جوش محبت میں میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر، دونوں ہاتھوں کو چوم کر بولے، ”خدا آپ کی زبان مبارک کردے۔ میں آپ کا حد درجہ ممنون

ہوں۔ کیا دراصل ایسا ہی ہوگا؟

میں: میرے ممنون ہونے کی ہرگز ہرگز کوئی وجہ نہیں ہے۔ (بات بدلنے کے واسطے) ہاں یہ تو بتایئے کہ وہ صاحب زادہ، بادشاہ زادہ، جسے میں نے دربار میں سلیم سمجھا تھا تو آخر وہ کون تھا؟

فیضی: کیا خدا کی شان ہے، آپ کی آمد کس طلسمات کی ہے! وہ لڑکا وہی بدنصیب بیرم خان کا لڑکا۔ تین برس کا تھا جب باپ سفر مکہ کے راستے میں شہید ہوا۔ خان خاناں بیرم خاں کے اہل وعیال پریشاں، سرگرداں، کچھ عرصہ ادھر ادھر پھرے۔ پھر انھوں نے دربار میں عرضیاں لکھیں، خطاؤں کی معافی چاہی۔ جاں نثار چار برس کے لڑکے کو لے کر دربار میں حاضر ہوئے۔ تیموری دریائے فیض وکرم جوش میں آیا۔ حضور نے بچے کو گود میں لیا۔ باپ کو یاد کر کے روئے۔ اب بیٹوں کی طرح اسے رکھتے ہیں۔ انتہا سے زیادہ شفقت ہے۔ ایک دن کے واسطے نظروں سے جدا نہیں کرتے۔ لڑکا ہونہار ہے۔ ابھی سے مزاج شناس زمانہ ہے۔ ہر اونچ نیچ کو سمجھتا ہے۔ ہر علم کے شوق سے دل معمور ہے۔ تم نے یہ خبر بھی خوب سنائی کہ خدا ایک دن اسے اپنے باپ کے رتبے پر پہنچائے گا۔

میں: اب مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں، برسوں ہوئے طالب علمی کے زمانے میں تواریخ پڑھی تھی۔ شاید یہی خان خاناں، اکبر، جہانگیر اور شاید شاہ جہاں کے وقت تک رہیں گے۔

فیضی: جہاں گیر، شاہ جہاں، یہ کون نسل تیموری کے بادشاہ؟ بہت خوشی کی بات ہے۔ خدایا ایسا ہی ہو۔ آمین، آمین۔ ہاں بھائی آپ نے ایک آدمی کو اور مژدہ جاں فزا سنایا ہے۔

میں: ارے ارے، عجیب تماشا ہو گیا۔ اچھا وہ کون ہیں؟

فیضی: وہ راجہ بھگوان داس۔ ان کا لڑکا مان سنگھ بھی ابھی کم عمر ہے اور شہنشاہ کے آگے ابھی پیش نہیں ہوا ہے۔ تمھارے منھ سے جب ابوالفضل کا نام سنا اور مجھ سے خلوت میں باتیں ہوئیں تو مان سنگھ کے واسطے بھی دریافت کیا تھا۔ میں نے کہا، ہو نہ ہو بھگوان داس کا فرزند ہوگا۔ مجھ سے پوچھا کہ میں اسے جانتا ہوں، تو میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ حکم ہوا کہ اچھا راجہ سے دریافت کرنا اور اگر اس کا کوئی لڑکا اس نام کا ہو تو وہ بھی اسی جمعے کے دن لے کر آئے۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک عورت سر پر گنگا جمنی سینی لیے آئی اور اتار کر ہم دونوں کے بیچ

میں رکھ دی۔ اس میں طرح طرح کے پیالے اور صراحی چاندی کی تھیں۔ عجیب عجیب ظروف تھے۔ میں ان کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

فیضی: شوق کیجیے۔ بسم اللہ۔ شربت پیجیے۔

میں: افسوس کہ ان سب ظروف سے ناواقف ہوں۔ پیاسا ضرور ہوں مگر آپ ہی بندہ نوازی فرمائیں۔

فیضی نے کچھ اس میں سے کچھ اس میں سے ملا ملا کر دو پیالے بنائے، نہایت خوشبودار اور خوش رنگ شربت تیار کیا۔ ایک مجھے دیا، دوسرا آپ لیا۔ میں نے جو اسے ہاتھ میں لیا، اتنا ٹھنڈا کہ چھوا نہ جائے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس زمانے میں برف کیسے بناتے ہیں۔ آخر میں نے پوچھا، ''صاحب، یہ اس قدر سرد کیسے ہے؟'' فیضی نے بڑے اطمینان سے کہہ دیا، ''یخ بستہ ہے۔'' چوں کہ مجھے اور بہت سی باتیں کرنا تھیں، میں نے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ جب ہم دونوں شربت پی چکے تو پھر فیضی کچھ سنبھل کر بیٹھے اور مجھ سے یوں مخاطب ہوے۔

فیضی: آپ نے کچھ سوچا؟ کچھ سبیل نکالی؟

میں: کس معاملے میں؟

فیضی: (تعجب سے) میں دیکھتا ہوں آپ کو بڑا اطمینان ہے۔ کل آپ کو حکم ملا تھا کہ آپ اپنے اس دعوے کا کہ ۱۳۶۳ھ کے زمانے سے آپ آئے ہیں، کوئی صحیح ثبوت تین دن کے اندر پیش کریں۔ (مسکرا کر) معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی پکا ثبوت ہے جو اس قدر اطمینان ہے۔

میں: مکرم من، میرے پاس کوئی بھی ثبوت نہیں ہے، نہ میں نے کسی ثبوت کے پیش کرنے کے بارے میں کچھ سوچا ہی ہے۔

فیضی: نہیں تو پھر یہ آپ کی غلطی ہے۔ اس واسطے کہ جہاں پناہ کا مزاج اس طرح کا ہے کہ جو حکم صادر ہو گیا وہ مشکل ہی سے پھر منسوخ ہوتا ہے۔ بعد میں چاہے اس بارے میں رعایتیں ہزاروں ہی کیوں نہ کر دی جائیں، لیکن تعمیل حکم کی خانہ پری لازمی ہے۔ آپ کچھ بھی ٹوٹا پھوٹا ثبوت سوچ کر سمجھ کر پیش کریں، اس کے بعد جہاں تک ہو سکے گا میں اور راجہ بھگوان داس معاملے کو سنبھال لیں گے۔

میں: اچھا مجھے ایک بات بتا دیجیے۔ یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، چھو رہا ہوں (ادھر ادھر چیزیں چھوکر) اور سن رہا ہوں، کیا دراصل ان کی کوئی حقیقت بھی ہے؟ فخر ہند ملک الشعرا فیضی ایسی باکمال ہستی کا مہمان ہوں، اس سے باتیں کر رہا ہوں، خوش ہو رہا ہوں۔ لیکن کیا یہ سب خواب نہیں ہے؟ کہیں کچھ کھٹ سے ہوگا، یہ محلات یہ ساز یہ سامان اور یہ سب جلیل القدر ہستیاں دھویں کی لہریں بن کر ہوا میں غائب ہو جائیں گی۔ پھر وہی ہم ہیں وہی ریلیں، موٹریں، وہی بھوکی ننگی، بھاگتی دوڑتی، مفلس پریشان دنیا ہوگی۔

فیضی: محبّ من، اس میں کیا کلام ہے، آپ کا دماغ اس حادثۂ عظیم سے پریشان ہونا ہی چاہیے۔ نہ معلوم آپ کس دنیا میں، کن کن مشاغل میں مصروف، نہ معلوم کن کن احباب سے دل بستہ اپنے خیالوں میں ہوں گے کہ دفعتاً مشیت ایزدی سے ایک اور ہی دنیا میں بھیج دیے گئے۔ اس وقت میرے سوائے کوئی دوسرا اس واقعے کی صداقت کو ماننے کے واسطے تیار نہیں ہے، جتنا کہ آپ خود بھی مشکوک ہیں۔ لیکن قادرِ مطلق کے آگے ہر بات ایک کھیل ہے۔ کم از کم میں آپ کو صادق جانتا ہوں اور آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اب آپ خاطر جمع سے، مردانگی اور دانش مندی سے حالات کا مقابلہ کریں۔ ہر بات سوچ سمجھ کر کہیں اور ہر کام اطمینان سے کریں۔ سب سے پہلے آپ کو کوئی ثبوت شہنشاہ کے آگے پیش کرنا ہے، اس کے بارے میں کچھ سوچیے۔

میں: کیا ثبوت دے سکتا ہوں؟ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔

فیضی: خیال کیجیے، غور کیجیے۔ ہاں وہ جو کپڑے آپ پہنے تھے مجھے بتائیے کسے دیے ہیں۔ خیر، میں خود دریافت کر کے واپس لے لوں گا۔

میں: آپ کا مطلب خاکی جانگیہ اور بنیان سے ہے؟ وہ اسی مکان میں ہوں گے۔ میں نے تو کسی کو دیے نہیں۔ میں کیوں دیتا؟

فیضی: جس ملازم نے کپڑے تبدیل کروائے ہوں گے تو آپ نے اسی کو دیے ہوں گے۔

میں: تعجب ہے! جی نہیں، ہمارے زمانے میں یہ قاعدہ نہیں کہ جب کپڑے بدلے تو پرانے نوکروں کو بانٹ دیے۔

فیضی: بے حد تعجب خیز! دیکھیے، ایک طرح وہ کپڑے ہی ایک ثبوت ہیں۔ آپ کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔

میں: اب تو کچھ نہیں ہے۔ کاش میں سب کپڑے پہنے ہی پہنے پانی میں ڈوبتا تو پھر اس دنیا والوں کی عقلیں حیران کر دیتا۔ سنیے، سنسان اجاڑ قلعے میں، گرد اڑتی لو چلتی تھی۔ میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ گرمی سے پریشان ہو کر اس باؤلی میں گیا۔ وہاں ایک میں تھا، ایک جنگلی کبوتر اور دیوار پر ایک چھپکلی تھی۔ باقی ہو کا عالم تھا۔ گرمی سے پریشان ہاتھ منہ دھونے کو کوٹ، قمیص، رسٹ واچ، موزے، جوتے سب اتار دیے۔ پیر دھوئے۔ منہ اور سر دھو رہا تھا کہ پانی میں گر پڑا۔ کاش یہ سب سامان ہی ہوتا۔

فیضی: ان میں کیا کیا تھا؟

میں: رسٹ واچ اور تھرماس۔

فیضی: یہ کیا ہیں؟

میں: رسٹ واچ یہاں کلائی پر باندھنے کی ایک ڈبیا سی ہوتی ہے، آگے شیشہ ہوتا ہے، اندر بہت چھوٹے پرزے۔ دو چھوٹی چھوٹی سوئیاں ہوتی ہیں۔ ایک دائرے میں ہندسے ہوتے ہیں۔ اسے دیکھو صحیح وقت بتا دے گی۔ ایک پل کا فرق نہ ہوگا۔

فیضی: (کچھ سوچ کر) ہاں، ہو سکتا ہے، خیال اچھا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی بڑی دھوپ گھڑیاں بنائی جائیں۔

میں: اجی دھوپ گھڑی نہیں۔ دھوپ کا کیا کام۔ رات میں دیکھو تو تمام ہندسے اور دونوں سوئیاں بقعۂ نور بنی خود چمکتی ہیں اور وقت معلوم ہو جاتا ہے۔

فیضی: خیر صاحب، ہوگا۔ دوسری کیا چیز تھی؟

میں: دوسرا تھرماس تھا۔ یہ ایک گول دہانے کا لمبا برتن ہوتا ہے۔ اس میں یخ رکھ دیں، کھولتا پانی بھر دیں، جو دل چاہے رکھ دیں، بارہ بلکہ اٹھارہ گھنٹے تک ویسا ہی رہے گا۔

فیضی: گھنٹہ کیا؟

میں: لاحول! (جلدی سے اسے چھوڑ کر) گھنٹہ...دن کے بارہ اور رات کے بارہ گھنٹے۔

فیضی: ہوں، خیر ہوں گے۔ یہ برتن...

میں: معاف کیجیے، آپ کی بات کٹتی ہے۔ آج کل دن اور رات میں کیا سولہ گھنٹے ہوتے ہیں؟

فیضی: نہیں۔ ہاں، آدھے ملا کر سولہ ہی دفعہ گھنٹہ بجتا ہے، مگر ویسے آٹھ پہر کا دن اور آٹھ پہر کی رات ہے۔ شاید آئندہ دن کو بارہ گھنٹوں میں تقسیم کر دیں گے۔ خیر، مجھے ان باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں۔ بہرحال تو ایک برتن بھی عجیب تھا۔ اور بھی کچھ تھا؟

میں: جی ہاں۔ کوٹ میں منی بیگ تھا۔ اس میں نوٹ، ریل کا ٹکٹ، عثمان لڑکے کا ایک چھوٹا سا فوٹو، دوسری جیب میں سگریٹ کا ڈبا، اوپر کی جیب میں فاؤنٹین پین۔ ہاں ہاں، دیا سلائی کی ڈبیا، اور ہیٹ، اور دیکھیے یاد کر لوں، ہاں میری جیب میں دو خط بھی تھے، ان پر کے ٹکٹ۔

فیضی: (قلم ہاتھ میں لے کر اور ایک کاغذ اٹھا کر) آپ مجھے ایسی چیزوں کی فہرست بنوا دیں جو آج کل نایاب ہیں۔ اور اگر مل جائیں تو قابلِ حیرت ہیں۔

میں: بہت اچھا، لکھیے۔ اول نقدی رکھنے کا کیس۔ چمڑا عجیب۔ ساخت عجیب۔ کھولنے بند کرنے کا معاملہ عجیب۔ اس کی دھات عجیب۔ ایک طرف سے پکڑ کر کھینچو، چٹکیاں سی کھلتی چلی جاتی ہیں۔ پھر الٹا چلاؤ، بند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دوم، اس میں نوٹ یعنی کاغذ کے سکے اور چاندی کے بھی تھے۔

فیضی: کاغذ کے سکے کیا؟ یعنی ہنڈی؟

میں: ہنڈی تو کسی ایک شخص واحد کے نام ہوتی ہے، یہ کاغذی سکے ملک بھر میں ہیں۔ سب ایک سے، کوئی نقل ہی نہیں کر سکتا۔ ہر جگہ چلتے ہیں۔

فیضی: خیر، ایسا ہی ہوگا۔ اور؟

میں: سوم، میرے لڑکے کی تصویر۔ دستی نہیں اصلی، عکسی۔ اصل سے ایک بال کا بھی فرق نہیں۔

فیضی: ہمارے یہاں بھی ماہر مصور ہیں۔ خیر، اور؟

میں: سگریٹ اور ماچس۔ ماچس آگ سے پُر ایک لکڑی کی ڈبیا ہے۔ اس میں تیلیاں ہیں۔

ویسے بالکل سرد، بالکل بے ضرر اور معصوم، لیکن اگر اس میں سے کسی کو اس بکس پر رگڑ دو تو مشتعل ہو جائے اور اسی سے آگ جلالو۔

فیضی: ہاں، یہاں بھی دہقان لوگ دو لکڑیوں کو آپس میں رگڑ کر آگ جلاتے ہیں۔

میرا دل جل گیا کہ فیضی صاحب کو کسی چیز میں بھی کوئی تعجب کی بات نظر نہ آئی، مگر کیا کرتا دل پر جبر کیا۔ صرف اتنا ہی کہا، ''آپ ان چیزوں کو دیکھتے تو پھر معلوم ہوتا۔''

فیضی: اچھا صاحب، اب کچھ دیر بعد میں عالی جاہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوں گا۔ یہی کہوں گا کہ اجنبی کا کہنا ہے کہ اس کی حسب ذیل چیزیں تلاش کر دی جائیں تو پھر وہ ثبوت بہم پہنچا دے گا۔

یہ کہتے ہوئے فیضی کھڑے ہوے۔ ہم ایک دوسرے سے مصافحہ کر کے جدا ہو گئے۔ میں پھر اسی گھر میں آ گیا۔

۶

فیضی کے پاس سے آ کر میں نے دیکھا تو کھانا تیار تھا۔ دستر خوان اسی شان سے چنا ہوا تھا۔ چپاتیاں، روغنی روٹیاں، شیر مالیں، پراٹھے، پوریاں، کچوریاں۔ طرح طرح کا گوشت اور کباب۔ ایک طرح کے کبابوں میں میوہ اور بالائی بھری ہوئی تھی۔ یہ بہت مزے کے تھے۔ ایک سالن میٹھا اور نمکین بھی تھا۔ مربے قریب چھ طرح کے تھے۔ تیل کا اچار کوئی نہ تھا۔ ترکاریاں بھی بہت ہی کم تھیں۔ صرف قیمہ بھرے تلے کریلے اور اسی طرح کی ترکاریاں تھیں۔ آلو کہیں نظر نہ آیا۔

کھانے کے بعد الائچیاں، چکنی ڈلی اور کتھا لگے پان بھی سامنے آئے۔ نہ اس میں چونا تھا اور نہ تمباکو ان کے ساتھ۔ ایسا بکھٹا پان پھیکا کھا کر میں کچھ دیر قالین پر لیٹ رہا۔ پھر بغور مکان اور اس میں کے سامان کو دیکھتا رہا۔

بظاہر کوئی چیز عجیب یائی نہ لگی۔ پھر بھی مجموعی حالت، طور، سب کچھ عجیب تھا۔ اب میں نے غور کیا کہ کیا بات ہے، تو رفتہ رفتہ میری نگاہ ان باتوں کی طرف گئی۔ مکان میں روشن دان اور کھڑکیاں نہ

تھیں۔ ہر جگہ دیوار میں طاق ہی تھے۔ گھر میں میز اور کرسیاں نہ تھیں، جا بجا چھوٹی چھوٹی چوکیاں تھیں۔ گھر بھر میں لوہا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ سارا مکان پتھر کا بنا ہوا تھا، اور اس لیے اسے بھٹی کی طرح تپنا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آگرے میں اس زمانے میں اتنی گرمی نہ پڑتی تھی جتنی کہ ہمارے زمانے میں۔ گرمی سے بچنے کے واسطے جہاں تک میں نے اس وقت دیکھا تھا، ملازم اور پنکھا ہی نظر آتا تھا۔ دن میں پھر دو اور لڑکے مجھے پنکھا جھلنے کے واسطے آ گئے۔ یہ دونوں باری باری مجھے پنکھا جھلتے رہے اور میں نے اسی بیکاری میں سوتے اونگھتے ہوئے دن کاٹ دیا۔ قریب چار بجے کے، میرے واسطے شربت کا خوان آیا۔ اب میں نے خود اس میں سے شربت پیا۔ آٹھ دس طرح کے شربت، دو ایک طرح کے فالودے تھے، مگر افسوس شیشے کے گلاس یا پیالے نہ ہونے سے اس کا لطف آدھا ہی رہا۔

چاندی کے پتلی لمبی گردن والے گلاب پاش تھے۔ ایک میں گلاب اور ایک میں بید مشک۔ یہ میں نے پہچانا۔ ایک نہ معلوم کیا تھا، اس کی بو مجھے ناگوار معلوم ہوئی۔ کھٹ مٹھی سکنجبین بھی مجھے مطلقاً پسند نہ آئی۔ اس سامان میں افسوس چمچے بھی عمدہ نہ تھے۔ چاندی کی ڈوئی سی تھیں۔ ان کو ملازم ''کا شوبے'' کہتے تھے۔ شربت پینے کے بعد بیکاری سے گھبرا کر وقت کاٹنے کو میں صحن میں ٹہل رہا تھا کہ وہ ہی حضرت جو کل شام کو کنجیوں کا گچھا لیے ہوئے آئے تھے، جھپٹا مارتے زینے میں سے نمودار ہوئے۔

آدھے صحن میں پہنچ کر عادت کے موافق جھٹ سے رکے، پھرتی سے آدھے گھومے، پھر میری طرف رخ کیا اور لپک کر آئے۔ مجھ سے سلام علیک کی، مزاج پرسی کی۔ پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ ذرا دیر خاموش سامنے کھڑے ہوئے اور پھر تیزی سے دالان میں گھس گئے۔ پھر میرے پاس آئے، دوبارہ مزاج پرسی کی۔ ''کسی سامان کی ضرورت تو نہیں ہے؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟'' میں نے کہا کہ نہیں۔ کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ ڈاڑھی کھجائی۔ میری طرف دیکھا، مسکرائے۔ چار قدم زینے کے دروازے کی طرف لپکے، رک گئے، اور پھر لوٹ پڑے۔ یہ شخص تیزی، تذبذب، گھبراہٹ او دپھرتی کا ایک عجیب مجموعہ تھا۔ آج کی ان کی حرکتوں سے مجھے صاف معلوم ہو گیا کہ ان حضرت کے دل میں ضرور کچھ نہ کچھ ہے اور یہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ شخص کس طرح اپنے مدعا تک پہنچتا ہے۔ میں نے بھی اپنا روکھا پن قائم رکھا اور ہاں نہیں ہی کرتا رہا۔ اور جب ان

کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پوچھا، ''دل گھبراتا ہوگا۔ ستار لادوں؟ ستار بجائیں گے؟ میں بھی بجاتا ہوں۔ میرا ستار ہے۔ بہت اچھا ہے۔ ذرا چھوٹا ہے۔''

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا، ''مہربانی۔ مجھے ان چیزوں سے شوق نہیں۔'' آخر سر جھکائے، خاموش، حضرت چل دیے۔ لیکن جب یہ زینے کے دروازے میں پہنچے تو پھر میں نے ان کو بلا لیا۔ باہر کے دالان میں بیٹھ گیا اور انھیں بھی بٹھا لیا۔ کل شام تک انھیں اور شاید اور ملازموں کو بھی میرے اس طرح قلعے میں نمودار ہونے کا قصہ معلوم نہیں تھا۔ اب انھیں سب حال معلوم ہو گیا تھا کہ آنے والے چار سو برس بعد کا انسان ہوں۔ قدرتِ خدا سے ابھی اس طرح بھیج دیا گیا ہوں۔ اس لیے ان کو یقین تھا کہ اب سے لے کر چار سو برس تک جو کچھ ہونے والا ہے سب کچھ مجھے معلوم ہے۔ اور ہر آدمی کی اپنی آئندہ زندگی اور اس کے بچوں پوتوں اور پڑپوتوں کے مکمل مستقبل میں سے آگاہ ہوں۔ پہلے تو انھوں نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میں اپنی اصلی زندگی کے ختم پر مرنے کے بعد کہاں کہاں گیا اور پھر کس طرح اس کنویں میں سے ہو کر نکلا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں مجھ سے پوچھا۔ حالانکہ میں اس ہنر سے قطعی دلچسپی نہیں رکھتا، لیکن پھر بھی کئی ایک پنجابی نجومیوں کو ریلوں میں لوگوں کے ہاتھ دیکھتے اور حالات بتاتے سن چکا ہوں، اس لیے میں نے بھی الٹا سیدھا وہی طرز اختیار کیا۔ اور پھر ایسے باتونی اور جلد مزاج آدمی کا کہنا ہی کیا، ذرا سی دیر میں انھوں نے سب اگل دیا۔ مقیم بیگ نام تھا۔ فیضی کے ساڑھے تین سو ادنیٰ ملازموں میں سے ایک یہ بھی تھے۔ متصدی یا منشی گودام کے عہدے پر ساڑھے سات روپے مہینہ پر ملازم تھے۔ چھٹے مہینے تنخواہ ملتی تھی۔ گھر میں تین بیویاں اور گیارہ بچے نہ معلوم کن ترکیبوں سے پالتے تھے۔ فوجی مہموں میں بڑی کوششوں اور سفارشوں سے شرکت حاصل کرتے تھے اور سر ہتھیلی پر لے کر وہاں سے کچھ اور کما لاتے تھے۔ ان کو اس بات کی بڑی تمنا تھی کہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کی نگاہ میں آجاؤں تو پھر وہ کارنمایاں دکھاؤں اور وہ جانبازیاں کروں کہ پانچ سو کے منصب تک ہی پہنچوں۔

میں نے بھی انھیں بڑے اونچے اونچے ستارے دکھا دیے۔ میں نے کہا کہ ''ایک دن بادشاہ کی ناک کا بال بن کر رہو گے۔ مقیم بیگ کے نام کا ڈنکا بجے گا۔ بارہ پرگنوں کے حاکم ہو گے۔'' بہت خوش

ہوے۔ اب اپنی اولاد کے بارے میں پوچھنے چلے۔ میں نے انھیں وہیں سے جھڑک دیا اور کہہ دیا کہ میں نے تمھارے بارے میں کیا بتا دیا کہ لگے ہاتھ پاؤں پھیلانے۔ میں نے آج تک ایسا گدھا دیکھا ہی نہ تھا۔ اپنی زڑ اور بک میں سب کچھ کہہ گیا اور اس کو گمان بھی نہ ہوا کہ میں اس سے کیا مطلب حل کر رہا ہوں۔ دراصل دوپہر سے میں اس فکر میں تھا کہ کس طرح اس قلعے سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ مقیم بیگ سے میں نے قلعے کا پورا نقشہ، وہاں کی پہرہ چوکی، پھاٹکوں میں سے گذرنے کے قاعدے اور قلعے کے باہر تک کے حالات پوچھ لیے تھے۔ لیکن پھر بھی میری معلومات کافی نہ تھی۔ دو ایک باتیں عجیب معلوم ہوئی تھیں۔ ایک یہ کہ قلعے کے چاروں طرف کی خندق میں بہت گہرا پانی بھرا ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس خندق پر قلعے کے پھاٹک کے سامنے لکڑی کا ایک ایسا پل تھا کہ جو چرخیوں اور رسوں سے ضرورت کے وقت نیچا کر دیا جاتا تھا اور بعد میں پھر اوپر کھینچ لیا جاتا تھا۔ قلعے کے پھاٹک پر باہر جانے والوں کے واسطے کچھ زیادہ روک ٹوک نہ تھی، اور بہت ممکن تھا کہ کسی بڑے آدمی کے باہر جاتے وقت اس کے ساتھ کے آدمیوں میں شامل ہو کر نکل جاؤں، کیوں کہ یہ بڑا آدمی چاہے کہیں اور کسی وقت جائے، پچاس ساٹھ آدمی (ہر وقت) اس کے پیچھے پیچھے رہتے تھے۔ قلعے کے باہر دریا کا رخ چھوڑ کر چاروں طرف گھنا شہر آباد تھا جس میں ہزاروں پتلی پتلی بے ترتیب گلیوں اور سڑکوں کی بھول بھلیاں بنی ہوئی تھی۔ سب سے بڑی مشکل میرے لیے میرے اپنے مکان کے نیچے چاروں طرف کا پہرہ تھا۔ ابھی میرے واسطے دو دن کی مہلت اور تھی۔ مجھے بھی کچھ جلدی نہ تھی۔ احتیاطاً کچھ معلومات حاصل کی تھیں اور یہ انتظار تھا کہ دیکھیے مقدر سے کیا کیا درپیش آتا ہے۔ اس روز اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

دوسرے روز پھر اسی وقت فیضی نے مجھے بلایا۔

پہلے انھوں نے مجھے یہ اطلاع دی کہ میرے سامان کی جستجو کی جا رہی ہے۔ حالانکہ اس کے وجود میں ہونے کی کوئی وجہ تسلیم نہیں کی جاتی، پھر بھی ان کی سفارش پر بادشاہ نے میرے کنویں پر رکھے ہوے سامان کی تلاش کے واسطے بہت سخت حکم صادر کر دیے۔ پھر بھی فیضی نے مجھ سے کہا کہ میں سوچ ساچ کے کوئی بھی الٹا سیدھا ٹوٹا پھوٹا ثبوت پیش کروں۔ ہم دونوں کچھ دیر تک اسی فکر میں رہے اور فیضی طرح طرح کی تجویزیں پیش کرتے رہے۔ ان کی ایک تجویز یہ تھی کہ کیوں نہ میں یہ دعویٰ کروں

کہ آئندہ جو کچھ بھی ہونے والا ہے مجھے سب معلوم ہے، اور یہی میرا ثبوت ہے۔ میں نے اس کی مخالفت کی کہ دراصل مجھے آئندہ کا کچھ بھی نہیں معلوم۔ چند بہت موٹی موٹی باتیں معلوم ہیں تو ان کے لیے بھی یہ کہہ دیا جائے گا کہ دل سے گھڑ کر اڑا دیں۔ آخر ہم دونوں نے اس تجویز کو پسند کیا کہ میں کیوں نہ اپنی انجینئری (علم جرثقیل) اور ریاضی دانی کا دعویٰ کر کے اسی کو اپنے حادثۂ نزول کا ثبوت ٹھہراؤں۔ اس نتیجے پر پہنچ کر مجھے بھی اطمینان ہوا اور فیضی بھی بہت خوش ہوئے۔ مارے خوشی کے انھوں نے فوراً ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا جس کی چاہتا ہے غیب سے مدد کرتا ہے۔

شعر بہت اچھا تھا۔ یاد نہیں۔ میں نے پوچھا، ''یہ شعر آپ کا ہی ہے؟'' کہا، ''ہاں ابھی موزوں کیا ہے۔'' میں حیرت میں رہ گیا۔ ان کی جو کچھ بھی مجھ پر مہربانیاں تھیں میں ان کا بدلہ تو اتار ہی نہ سکتا تھا۔ مشکل تو یہ تھی کہ اس زمانے کی مروجہ لسانی زبان میں شکریہ بھی ادا نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے ایک شاعر کا دل خوش کرنے کا اس سے زیادہ کیا طریقہ ہو سکتا تھا، اور اب موقع بھی آ گیا تھا، میں نے فوراً گڑگڑا کر التجا کی کہ کچھ کلام سنائیے، اور زیادہ بہتر ہوگا کہ کوئی غزل سنائیں۔ یہ سنتے ہی فیضی باغ باغ ہو گئے۔ فوراً دوزانو بیٹھ کر ایک غزل شروع کر دی۔ افسوس، ایک مصرع بھی یاد نہ رہا۔ کلام شیریں اور سادہ تھا۔ مبالغہ بہت کم، مضامین سلجھے ہوئے، بندشیں سیدھی سادی۔ انھوں نے ایک شعر پڑھا تو بے ساختہ میرے منھ سے نکل گیا کہ اسی مضمون کا ہمارے سامنے کا بھی ایک شعر سن لیجیے۔ بولے، ''ہاں ہاں، ضرور سناؤ۔'' میں نے کہا، ''مغلیہ سلطنت یا سلاطین تیموری کا آخری چراغ جب دلی میں ٹمٹماتے ٹمٹماتے بجھ جاتا ہے تو اس وقت یادگار محفل، پرسوختہ ایک پروانہ رہ جاتا ہے اور وہ شکستہ دل شاعر غالب ہے۔ کہتا ہے:

داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

فیضی صاحب کچھ متعجب اور سراسیمہ سے نظر آنے لگے۔ میں سمجھ گیا۔ میں نے کہا، ''یہ شعر فارسی زبان کا نہیں۔ چار سو برس کے زمانے کی مدت میں یہاں ایک نئی زبان پیدا ہو جائے گی جسے اردو کہیں گے۔ دراصل یہ زبان فارسی ہی کی اولاد ہوگی۔ خیر، ایک اور شعر سنیے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشان ہونا

زندگی کیا ہے: زندگی چیست۔ عناصر کے ظہور ترتیب کی اضافت ہے ظہور ترتیب عناصر۔ زندگی چیست ظہور ترتیب عناصر۔ موت کیا ہے موت چیست۔ پریشان شدن ہمیں اجزا است۔"

اس شعر کو سن کر فیضی بڑی دیر تک جھومتے رہے اور بولے کہ "اگر تمھارے زمانے کے تمام شعرا کے ایسے ہی بلند خیال ہیں تو پھر آج کل کا کلام تو اس زمانے میں بالائے طاق رکھ دیا جائے گا۔" میں نے کہا، "نہیں، ہر گز ایسا نہیں۔ ہزاروں ہزاروں شاعر جب پیدا ہوں گے تو اس میں دو ایک چوٹی کے بھی نکل آئیں گے، اور ان کے بھی ہزاروں شعروں میں سے چند چنے جائیں گے تو وہ ایسے نہ ہوں گے تو کیسے ہوں گے۔

"پھر یہ بھی بات ہے کہ بعض وقت معمولی سے معمولی شاعر اتفاق سے ایسا شعر کہہ جاتا ہے کہ جس کی ٹکر کا دوسرا شعر نہیں ملتا۔ میں آپ کو مثال کے طور پر ایک شعر ایک لڑکے کا سناتا ہوں اور دوسرا ایک قطعی پاگل کا۔ لڑکے کا شعر ہے:

کوئی گریاں قریب تربت ہے
زندگی، پھر تری ضرورت ہے

کسے گریاں قریب تربت است۔ زندگی بار دگر ضرورت ترا است۔

دوسرا شعر دیوانے کا سنیے:

اصلاح ہوئی صنعت صناع ازل پر
مشاطہ نے خال رخ جانانہ بنایا

ترجمہ: اصلاح شد بر صنعت صناع ازل۔ خال رخ جاناں مشاطہ بزد۔"

فیضی کو یہ شعر بھی بہت پسند آیا۔ شعروں کا فارسی ترجمہ انھوں نے لکھ لیا۔ بڑی دیر تک شعر وشاعری پر میری ان کی باتیں ہوا کیں۔

گیارہ بارہ بجے کے قریب میں پھر چلا آیا۔ سارا دن پھر بیکاری میں کاٹا۔ تیسرے دن میں

انتظار ہی کرتا رہا لیکن فیضی نے نہیں بلایا۔ سارا دن گذر گیا، اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔
شام کو چھ بجے ایک چوبدار نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ رات کو مجھے بادشاہ کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔

(ناتمام)

۳

باقیات

مضامین

امید

امید، امید۔ خدا کی مار اس امید پر۔ میرے ہتھے چڑھ جائے تو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگادوں۔ مصیبت، وبال جان۔ چین ہی نہیں لینے دیتی۔ کچھ ناامیدی ہوتی ہے، چین سے بیٹھتا ہوں کہ پھر آ کر چپکے سے سوئی سی بھک جاتی ہے۔ قرار ہی نہیں لینے دیتی۔ بس بس، اب مجھ پر اس کے داؤں نہیں چل سکتے۔ میں خوب جان گیا۔ متھرا تیلی کے بیل کو یہ جھانسے دے۔ لڑکپن اور بچپنے کو جانے دیجیے، جب سے دنیا میں قدم رکھا ہے، پینتالیس برس ہوگئے ہیں، یہ مجھ کو جھانسے دے رہی ہے اور میں کمبخت، احمق، بے چاری، بھولی بھالی چھمی کی اماں کو ہوائی لقمے دیتا چلا آرہا ہوں۔ امید مجھ سے کہتی ہے، اب دولت ملتی ہے، اور میں اس سے (چھمی کی ماں سے) کہتا ہوں، گھبراؤ نہیں، جڑاؤ کنگن اور جڑاؤ کڑے بنوادوں گا، ذرا صبر سے کام لو۔ صبر کرتے کرتے دونوں بڈھے ہوگئے۔ وہ صبر سے بیٹھی پن کٹی سے کھیل رہی ہیں اور میں صبر سے بیٹھا یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ بس آج آپ لوگوں کے سامنے عہد کرتا ہوں، گواہ رہیں کہ اب اس حرام زادی کو پاس نہ پھٹکنے دوں گا (چھمی کی ماں کو نہیں، امید کو)۔

نہ صاحب، ہم کو تو اب ناامیدی ہی اچھی ہے۔ صبر سے بیٹھیں، اطمینان سے باقی زندگی بسر کریں۔ بس ہو چکا یہ، بہت بے بھاؤ کی ناچ، اب آپ ہی لوگوں کو یہ ناچ مبارک۔ اللہ رکھے، آپ لوگ جوان ہیں، آپ کو سب کچھ زیب دیتا ہے۔ ہم دونوں بڈھے ہوگئے، تھک گئے۔ چار دن کی اور باقی ہے، سکون سے بسر کرلیں گے۔ کچھ نہ ہوگا اطمینان سے ٹھنڈے پانی کے گھونٹ پییں گے۔ لیکن

کیسے کچھ نہ ہوگا؟ آپ لوگ قدر دان ہیں مجھ ایسے گھٹنا پرداز کو بھول تھوڑی جائیں گے (گھٹنا پرداز: یہ انشا پردازی کی ایک قسم خاص ہے۔ خیر اس سے آپ کو کیا، یہ ٹیکنیکل معاملات ہیں)۔ دو چار دس پانچ نذرانے کے منی آرڈر جو آجایا کریں گے اسی پر ہم دنوں بڑھیا بڈھے گذر کرلیں گے۔ چھوڑی انجینئری، ماری اس پر لات۔ اب تو مضمون نگاری ہی ہوا کرے گی۔ اور صاحب، اگر آپ میری مانیں تو آپ بھی کریں (گھٹنا پردازی سے مطلب نہیں ہے، نہ نہ!)۔ امید کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔ سراسر مصیبت ہے، وبال جان ہے۔ امید لگی ہے اب کی ویکلی کا معمہ ٹھیک نکلا۔ اچھا اب کی، اچھا اب کی، اب کی... امید جب پیچھا پکڑتی ہے، جونک ہوکر چمٹ جاتی ہے، گھڑ دوڑ کے شوقین کو بھیک منگوادیتی ہے۔ امید کی بنا پر آپ اپنے افسر کی خوشامد پر خوشامد کرتے ہیں اور ان کا منہ ہی ٹیڑھا ہوا چلا جاتا ہے۔ امید کی بنا پر آپ صاحب بہادر کی کوٹھی پر جاتے ہیں اور وہ موجود نہیں ہوتے۔ امید ہی کی بنا پر بچھونا کندھے پر، سوٹ کیس بغل میں دبا کر دوڑتے ہیں اور ہانپتے ہوئے خالی پلیٹ فارم پر پہنچتے ہیں، ورنہ آپ کی گھڑی نے صاف بتادیا تھا کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف ایک منٹ ہے۔ بس کچھ نہیں۔ معلوم ہوا کہ ہر کام ناامید ہو کر کرنا چاہیے۔ آپ میرے کہنے پر چل کر دیکھیے تو سہی، سب سے اچھے رہیں گے۔ انشاء اللہ آپ کو کامیابی ہی کامیابی ہوگی۔ ناکامیابی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ بھائی جان، بات دراصل یہ ہے کہ امید ہم لوگوں کے واسطے بنائی ہی نہیں گئی ہے۔ امید بنی ہے شاعروں کے واسطے اور مچھلی کے شکاریوں کے واسطے۔ اپنی بنسی ہاتھ میں ہے، ڈور پانی میں پڑی ہے، امید کی چسکی لگائے بیٹھے ہیں۔ شام کو انگل بھر کی ایک مچھلی لٹکائے گھر آگئے۔ رات بھر مچھلیاں ہی مچھلیاں خواب میں دیکھیں۔ صبح دم اور زیادہ جوش وخروش سے بنسیاں کندھے پر رکھ کر چل دیے۔ آج ضرور ڈھائی سیر کا مہاشیر پھنسے گا۔ یہ حالت تو ان کی ہے، لیکن شاعروں کی تو بس بیان سے باہر ہے۔ اب میں کیا بتاؤں، آپ خود ملاحظہ کرلیں۔ ایک صاحب مٹھی کی دوربین لگائے اکڑوں بیٹھے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

خاطرِ مایوس میں نقشِ امیدِ وصلِ یار
نور صحرا میں ہے گویا ایک چراغ دور کا

گھریات

تخمینہ لگایا کرتے ہیں، اور گجردم اٹھ کر ایک قطار میں بیٹھ کر مظاہرات قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مزید حالات معلوم کرنا ہوں تو کسی قومی لیڈر سے دریافت کرلیا جائے۔ چھوٹا گھر بہت چھوٹا، بہت مختصر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس میں نہ روشن دان ہوتا ہے نہ دروازہ۔ اس گھر میں رہنے کو جو جاتا ہے کئی کئی ساریاں سر سے پیر تک لپیٹ کر اکڑ جاتا ہے اور پھر بات نہیں کرتا۔ اندرونی حالات اس گھر کے کوئی نہیں جانتا، اس لیے مجھے بھی نہیں معلوم۔ آپ کے محلے کے ملاجی جھوٹے ہیں، خیالی گدّے لگاتے ہیں۔ مشاہدہ اور تجربہ ان کو بھی نہیں اس گھر کا۔ لہٰذا چھوڑیے اس کو بھی۔

ا۔ گھر

اس کے آگے بیان کرنے والے یوں بیان کرتے ہیں کہ دو قسمیں اور ہیں۔ انگنائی والا گھر اور بے انگنائی کا گھر۔ انگنائی والے گھر میں گھر انگنائی کو گھیرے ہوتا ہے اور بے انگنائی والے گھر میں انگنائی گھر کو گھیرے ہوتی ہے۔ یہ کسی موڑ پر ہوتا ہے اور وہ کسی گلی میں۔ اس میں چند کوٹھریاں اور بے حساب طاق ہوتے ہیں۔ اس میں طاق طاق اور کمرے بے حساب ہوتے ہیں۔ بے آنگن کے گھر میں پاخانہ کوئی نہیں، غسل خانے بے شمار۔ آنگن والے گھر میں غسل خانہ کوئی نہیں، پاخانہ ایک، لیکن بالکل ہی پاخانہ۔

اِس میں رہنے والے کم اور ملازم زیادہ ہوتے ہیں۔ اُس میں رہنے والے زیادہ اور ملازم ندارد ہوتے ہیں۔ بے انگنائی کے گھر میں کھانے والے میاں اور بیوی دونوں ہوتے ہیں۔ میاں کی کمائی خالص حرام کی ہوتی ہے اور بیوی کی کمائی حرام اور حلال دونوں صورتوں میں ہوتی ہے۔ انگنائی والے گھر میں بڈھا کھٹو تو ہوتا ہی ہے، اگر بڑھیا سے کمانے کو کہو تو وہ بھی بگڑتی ہے۔ بہر حال گھر دونوں ہی چلتے ہیں، یا چلائے جاتے ہیں۔ اس لیے اکثر مسز فضل قدیر یا چھمی کی اماں سختی سے ہنکائی کرنے لگ جاتی ہیں۔ گھر چلے یا نہ چلے، اس سختی سے گھر والے ضرور چل پڑتے ہیں۔ وہاں صاحب بہادر غسل خانے میں گھس جاتے ہیں، بچے باغ کی سیر کو نکل جاتے ہیں اور خانساماں کو دست آنے لگتے ہیں۔ یاں جب چھمی کی اماں ڈنڈا پکڑتی ہے تو بندہ اچکن ٹوپی پہن کر، عینک آنکھوں پر اور پنسل کان پر لگا کر، بغل میں مسودے، ایک ہاتھ میں حقہ دوسرے ہاتھ میں ڈاڑھی، سر نیچا کیے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ پھر میری بلا جانے اوروں پر کیا بیتی ہوگی۔ سنا ہے بڑے صاحب زادے نے بھی میرا ایسا رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بھی گھر سے نکل جاتے ہیں۔ پچھواڑے املی کے درخت پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلوں کی تلاش میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ بس چین ہی چین ہے۔

۲۔ بچے

بچے خدا کی دین ہیں۔ مفلسی اور بچوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو وقت دنیا کی فکروں میں لاحق ہو وہ ان کے گوموت میں بہلتا ہے۔ جتنا کھاتے ہیں اس سے زیادہ ہگتے ہیں۔ جتنا ہگتے ہیں اتنا ہی روتے ہیں۔ کیا کہنا! گھر کی رونق ان ہی سے ہے۔ جس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں وہ بھی رو رہا ہے، جس نے ہگ دیا ہے وہ بھی رو رہا ہے۔ جسے میں بہلا رہا ہوں وہ بھی رو رہا ہے۔ باورچی خانہ میں سویرا ہے اس لیے باقی چاروں بھی بسور رہے ہیں۔

گوشۂ دل، لختِ جگر، راحتِ جاں، آنکھوں کے تارے۔ یہ میرے بچے ہیں، ان کا گوموت سر آنکھوں پر، لیکن جناب دوسرے کے بچوں کو کیا حق ہے۔ ناک بہتی، رال ٹپکتی، بدصورت، بدتمیز، پھر بھی صاحب ان کی اٹھانی پڑتی ہے۔ دنیا میں رہ کر دوستوں رشتہ داروں کو کیسے چھوڑ دیا جائے۔ آپ ہی آپ

آپڑے تو آپ کیا کریں گے؟ کسی رشتہ دار کے یہاں آپ گئے، اور سلسلۂ کلام اس طرح سے بگڑتا ہے: ''اے ہاں بھائی، تم نے بتول کے بچے کو تو دیکھا ہی نہیں۔ بٹی انا کو بلاؤ، یہاں لائے۔'' اب آپ اٹھ کر بھاگیں گے تھوڑی۔ لیجیے گبّے پر بچہ آپ کے آگے پیش ہے۔ آپ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گبّہ پکڑتے ہیں تو بتایا جاتا ہے، ''اے الٹا ہے الٹا، ادھر سے پکڑو۔'' جوں توں گبّہ آپ ہاتھ میں لیتے ہیں۔ دو چار اور گھر والے تماشا دیکھنے کو جمع ہو جاتے ہیں۔ دُلائی الٹی جاتی ہے۔ بچہ گوشت کا لوتھڑا آپ کو نظر آتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں بچہ ہے۔ اب آپ سوچتے ہیں کچھ کہنا چاہیے۔ کیا کہیں، سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر زور لگاتے ہیں۔ نہر پر چل رہی ہے پن چکی سے لے کر مادھوری کی آخری فلم تک یاد کر ڈالتے ہیں، کچھ یاد نہیں آتا۔ آخر بچے کی نانی جان ہی آپ کی مدد کرتی ہیں۔ ''بھائی بتاؤ، کس پر پڑا ہے؟'' آپ گھبرا کر کہتے ہیں، ''گدّے پر۔'' سب ہنس پڑتے ہیں آپ کی پریشانی اور بڑھ جاتی ہے۔ نانی جان فرماتی ہیں، ''اوئی ایسے بتاؤ۔ صورت کس سے ملتی ہے۔'' ''ارے یہ ہی تو میں بھی سوچ رہا تھا، بالکل باپ کا نقشہ ہے۔'' سب مل کر کہتے ہیں، ''واہ واہ! صاف تو ماں کا نقشہ ہے۔'' آپ کہتے ہیں، ''ہاں ہے تو'' اور ساتھ ہی جھک کر اپنے جوتوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ گیلا گیلا کیا ہے؟ ارے پتلون کے اندر بھی۔ ارے ارے! اب آپ سمجھے۔ دُلائی سے ڈھکی ڈھکائی مڑے ہوئے گبّے کی نالی آپ کے پیٹ کی طرف تھی۔ اس طرح پتلون کے نیفے میں دھار گئی۔ وہاں سے پائنچے میں ہوتا ہوا جوتے میں بھر گیا۔ اب آپ ہنسنا چاہتے ہیں اور رونا آتا ہے۔ غرض یہ کہ دونوں کے سمونے سے جو حرکتیں پیدا ہو سکتی ہیں ان کو ادا کر کے رخصت ہوتے ہیں۔

۳۔ امائیں

امائیں، اچھا امائیں! گھر والیاں جنتی ہوتی ہیں، سب امائیں ہوتی ہیں۔ کوئی آپ کی اماں ہے، کوئی اماں کی اماں ہے، کوئی آپ کے بچوں کی اماں ہے۔ غرضیکہ عورتیں سب امائیں ہوتی ہیں، لہٰذا مائیں نہیں، عورتیں۔

۴۔عورتیں

عورتیں۔عورتیں۔(مشکل سوال ہے، تجربہ صرف ایک ہی گھر کا ہے۔) میرے گھر میں سات عورتیں ہیں جن میں بڑھیا آگے آگے رہتی ہے اور باقی چھ اس کے پیچھے۔ناصاحب، آپ میرے مضمون پڑھیں یا نہ پڑھیں، میں حاشاوکلا اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔آپ لوگوں کے گھر میں تھوڑی، مجھے اپنے گھر میں گذر کرنا ہے۔اچھا یہ مضمون ختم۔آپ لوگ گواہ رہیں، میں نے ایک لفظ ان لوگوں کے بارے میں اچھا یا برا کچھ نہیں کہا ہے۔

۵۔پڑوسی

پڑوسیوں ہی سے محلّہ آباد ہے۔یہ نہ ہو تو محلّہ ہی نہ ہو، صرف آپ ہی آپ کا اکیلا مکان ہو۔یہ آپ کی دل بستگی کے واسطے ہیں، آپ ان کی دل بستگی کے واسطے۔آپ ان کے گھر میں جھانکتے ہیں، یہ آپ کے گھر میں جھانکتے ہیں۔آپ ان کی برائیاں کرتے ہیں، یہ آپ کی عیب جوئی کرتے ہیں۔یہ ہی زندگی کے لطف ہیں۔آپس میں میل جول ہے۔حصہ بقرہ بھی چلتا ہے۔فقرے بھی کسے جاتے ہیں۔ آپ ان کو دیکھ کر جلتے ہیں، وہ آپ کو دیکھ کر جلتے ہیں۔آپ میلاد میں کھٹیاں بانٹتے ہیں تو وہ جلیبیاں۔اب آپ پھر میلاد کرتے ہیں اور بالوشاہیاں بانٹتے ہیں۔پڑوسی صاحب پھر آپ کو نیچا دکھاتے ہیں، اب کی وہ پلاؤ قورمے کی دعوت کرتے ہیں۔اب آپ کو طیش آتا ہے، دھڑاکے کی قوالی کرواتے ہیں۔ان کو جوش آتا ہے، گراموفون خرید لاتے ہیں۔آپ ریڈیو لے آتے ہیں، اور وہ موٹر خرید لاتے ہیں۔بھوکے سے بھوکا بھڑا، دونوں کو غش آیا۔ڈیڑھ سو کا موٹر، اسّی کا ریڈیو، پینتیس کا گراموفون۔مہینے بھر کے بعد، سب کچھ کڑاہی کی نذر ہو جاتا ہے۔

ادھر آپ کی بیگم صاحبہ نے اور ہی گل کھلایا۔پہل ہلدی کی ایک گانٹھ سے ہوئی تھی جس کے جواب میں پڑوسن نے لہسن کے دو جوے منگائے۔پھر نمک، آٹے اور گھی سے بڑھتے بڑھتے بُندے۔ ادھر آپ کی بیگم صاحبہ نے ان کی چوڑیاں بدلیں اور انھوں نے جڑاؤ ہار بدل لیا۔غرض کہ دو مہینے کے اندر اندر سارا زیور بدل گیا۔اب وہ اُدھر روتی ہیں کہ ان کا زیور قیمتی تھا اور اِدھر آپ کی بیگم صاحبہ چپ

بیٹھی ہیں کہ ان کا زیور ہزاروں کا تھا۔

۶۔ ماما

کھانا پکاتی ہے، خود پکتے میں کھاتی ہے، آپ کو پکا کر کھلاتی ہے۔ اور بھئی کیا خوب پکاتی ہے۔ آٹے میں ناک ملاتی ہے، سالن میں جوئیں ٹپکاتی ہے اور گھر بھر کی آنکھوں میں راکھ جھونکتی ہے۔ ہلدی، مرچ، دھنیا، گھی، سب چرا کر لے جاتی ہے۔

۷۔ بھنگن

تیسرے دن آتی ہے، اکٹھا لے جاتی ہے۔ جو ذرا ٹوکو تو پھر چھٹے دن کی باری باندھ دیتی ہے۔ جو کچھ بھی کرتی ہے آپ کے سر پر احسان کا ٹوکرا لا دتی ہے۔ ذرا دیکھیے تو سہی کیا کام کرتی ہے۔ اس ہی کا جگر ہے ورنہ انسان کا کام نہیں ہے۔ ہنسنے کا مقام نہیں، عبرت حاصل کیجیے۔ ایک دفعہ ہمارے محلے کی بڑھیا بھنگن آٹھویں دن بھرا ہوا ٹوکرا لیے جارہی تھی۔ برسات کے دن تھے، بیچاری پھسل پڑی۔ جب سے یہ ہو گیا ہے کہ جب وہ نکلتی ہے محلّہ بھر کھڑا ہو کر خیر مناتا ہے اور اس کے ہر قدم پر خیر مناتا ہے۔

۸۔ دھوبن

صاف ہے، ستھری ہے، چکنی ہے، چپڑی ہے۔ آٹھویں دن کا وعدہ کرتی ہے، مہینے بھر بعد صورت دکھاتی ہے۔ گٹھر بھر کے لے جاتی ہے۔ کچھ کھوتی ہے، کچھ جلاتی ہے، باقی دھو کر لے آتی ہے۔ کپڑوں کو پہلے بھٹی چڑھاتی ہے، جب نہیں گلتے تو دریا پر لے جا کر پتھر پر دے دے مارتی ہے۔ جب نہیں پھٹتے تو خود پہنتی ہے، کرائے پر دیتی ہے۔ نئے کپڑے اسی کے دم سے بنتے ہیں۔ سفید پوش اسی کے بھروسے پر اکڑتے ہیں۔ دھلائی کم مگر بخشش زیادہ مانگتی ہے۔

۹۔ مولوی صاحب

مولوی صاحب تو علم کا پوٹلا بنے ہوے ہیں۔ ان کی تو کوئی بات قیل و قال سے خالی نہیں، حتیٰ کہ بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے جب سو بھی جاتے ہیں تب بھی حاؤ، زاؤ، طاؤ، ظاؤ، عین، قاف کے خراٹے لگاتے ہیں۔ سوتے سے اگر چونک جاتے ہیں تو استغفر اللہ کہتے ہوے اٹھتے ہیں۔ بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں۔ دیکھیے سوتے سے چونکے تب بھی اللہ کو یاد کرتے ہوے۔ ان کو دیکھیے تو ڈر معلوم ہوتا ہے، اللہ میاں یاد آجاتے ہیں۔ بھاری جسم، آسمانی لباس، عبا قبا، صافہ اور عصا، سفید نورانی ڈاڑھی (ہول سے کیا ہوتا ہے، ہر جنگل میں جانور ہوتے ہیں) برکت نما گول توند۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم کی تجوری لیے پھرتے ہیں۔ (بھنگن جھوٹ کہتی ہے، ایسے ہی بکتی ہے۔ علم ہی علم بھرا ہے۔)

۱۰۔ سالار جنگ بہادر

ایک مکمل گھر کے واسطے آپ کا وجود لازمی ہے۔ وہ گھر جس میں سالا نہ ہوا ایسا ہی ہے جیسے بے کھونٹے کی چکی۔ بلکہ آپ کی ہستی کھونٹے سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ان کا شان نزول خود اس بات کی دلیل ہے۔

یاد کریے وہ دن جب بوے گل ہر گوشے سے آتی تھی، جب باد سحر دامن سے اٹھلاتی تھی، جب دنیا میں شور مچا تھا، جب نغموں میں جوش بھرا تھا۔ ارے جب، جب بادشاہت لٹتی تھی، جب آپ بھی ہنستے تھے، دنیا بھی ہنستی تھی۔ اس وقت یہ حضرت نمونتاً آپ کو پیش کیے گئے تھے۔ (ہاں آپ کو ہوش کہاں تھا، آپ نشے میں تھے۔) بعد میں بطور تحفہ آپ کو جہیز کے ساتھ ملے۔ جب نئے نئے آئے تھے تو میاؤں بھی کرنا نہ آتی تھی۔ اب کھاتے ہیں اور غراتے ہیں اور پھر بھی آپ ناز اٹھاتے ہیں۔

آپ خوب جانتے ہیں اور اچھی طرح آپ کے دل میں یقین ہے کہ یہ حضرت روز کوئی نہ کوئی حرکت کرتے ہیں لیکن پھر بھی سب سے لڑتے ہیں۔ پڑوسی کہہ رہا ہے، مسجد کا ملا کہہ رہا ہے، آیا گیا کہہ رہا ہے، سارا محلہ کہہ رہا ہے، لیکن آپ اڑے ہوے ہیں کہ وہ نہیں ہے، ہرگز نہیں ہے۔ وہ بیچارہ تو کبھی مسجد میں جاتا ہی نہیں۔ میں کیسے مانوں کہ اس نے مسجد کے بدھنے توڑے ہیں۔

آپ ایک ایک سے بحث کررہے ہیں۔ دنیا آپ کو قائل کررہی ہے اور آپ اکیلے سب کو جھٹلا رہے ہیں۔ کیا شان ہے سالے کی!

ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف

نمبر ۱۱

اب کون رہ گیا؟

میں اور آپ۔ واللہ ہاتھ ملایئے۔

من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو۔

ہندوستان کی تباہی کا راز

ہندوستان کیوں تباہ اور برباد ہے؟ اور کیوں اس پستی کی حالت میں پڑا ہوا ہے؟ اس پر ہر ہر پہلو سے انتہائی غور کیا جاچکا ہے اور بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن کم از کم میرے خیال میں تو ابھی تک کوئی بھی اصلیت کی تہہ کو نہیں پہنچا۔

کوئی کہتا ہے ہندوستانی کاہل اور سست ہوتے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ ہندوستانیوں کی فطرت میں اولوالعزمی نہیں ہوتی۔ کوئی بتاتا ہے کہ آپس کی پھوٹ ان کو تباہ اور برباد کیے ہوئے ہے۔ اور عقلائے مغرب نے تو فتویٰ دے دیا ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا ہی ہندوستان کے زوال کا باعث ہے۔

آب و ہوا تو ایسی شے نہیں جو بوروں میں بھر بھر کر افریقہ کے صحرا میں پھینک دی جائے اور یورپ یا امریکہ کی آب و ہوا کے سربہ مہر کنستر لا لا کر ہندوستان کی زرخیزی بلکہ زرد ماغی کی جائے۔ اس لیے ہم پر لازم ہے کہ ہم ہی کوئی ممکن علاج ڈھونڈیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہم دیسیوں کی خصلت ہی قدرتاً خرابیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ہم میں ایثار کے بجائے خود غرضی، ہمت کی بجائے پست ہمتی، اولوالعزمی کے بجائے مردہ دلی کے بہت گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ارادے غیر مستقل، ہمارے ارادے ناپائیدار اور ہمارے منصوبے بے بنیاد ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟ کس لیے؟ کیا بات ہے اور وہ کون سی چیز ہے جو ہم کو ایسا

بنا دیتی ہے؟ ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے خدا اس کو بے عیب بھیجتا ہے، اور بعد میں اس کے ماحول کے زیر اثر اس کی طبیعت کا ہیولیٰ بنتا ہے۔ ماں باپ اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اس کے دماغ پر اثر ڈال کر اس کی فطرت کا ڈھانچا بناتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر کون سی شے ہے جو ہر ہندوستانی بچے کو گھٹی کے وقت سے لے کر جوانی بلکہ ادھیڑ پن بلکہ بڑھاپے اور مرتے دم تک، ارے نہیں، ارے نہیں، بلکہ مرنے کے بعد بھی اس کی پستی، بے بسی اور ذلت کا احساس پیدا کرتی رہتی ہے؟

ہم آپ کو بتا ہی دیں کہ یہ ہے کیا۔ یہ ظالم شے مکھی ہے۔ پیدا ہوتے ہی یہ ہمارے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا اور مرنے کے بعد تک عاجز کر کر کے ہم میں بے بسی کا احساس تازہ رکھتی ہے۔ یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک میں جہاں مکھی کا وجود نہیں، وہاں ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن پیدا ہوتے ہیں۔ اس بھنکار میں گاندھی کے سوا اور کیا پیدا ہو سکتے ہیں؟

قوم کی امید کا گہوارہ، آنے والی نسلوں کا علم بردار، باپ کا دلارا، ماں کا لاڈلا منا ہپا کھاتے کھاتے سو گیا ہے۔ ماں گھر کے کاموں میں لگی ہوئی ہے۔ مکھیاں اس ہونے والے ہندوستانی ہٹلر کی تربیت میں مشغول ہیں۔ کانوں میں گھسی ہوئی ہیں، باچھوں پر چمٹی ہوئی ہیں، ناک کے نتھنوں میں دھکا پیلی مچی ہوئی ہے۔ آخر کہاں تک؟ پسینہ اور بھنکار۔ بچہ کچی نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ ماں آٹا گوندھنے سے کچکچاتی، کوستی، لپکتی ہے۔ ”تجھ کو سوا پہر کی موت بھی نہیں آتی۔ کھلا دیا، پلا دیا، پھر بھی مردہ روتا ہی ہوا اٹھا۔ لے! لے! لے!“ سنے ہوئے ہاتھوں سے دو ہتڑ لگا، تنتناتی ہوئی اماں جان پھر آٹے کے کونڈے پر مشغول ہو گئیں۔ ہندوستانی ہٹلر نے اپنا لاؤڈ اسپیکر بھی آنکھیں بند کر کے پورا کھول دیا۔ پورے کھلے منھ پر اور مکھیاں دوڑ پڑیں۔

اب آپ مکھیوں کا ڈنگارا بنے براڈ کاسٹ کر رہے ہیں۔ کیا مسولینی کا بچپنا بھی اسی طرح گذرا ہوگا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ خدا رحم کرے ہم پر اور ہمارے ملک پر۔

اصلیت تو یہ ہے کہ ساری تباہی اور بربادی مکھیوں کی ہی مچائی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرم ملکوں میں بڑے بڑے دماغ اس لیے پیدا نہیں ہوتے کہ گرمی سے دماغ چکرائے رہتے ہیں۔ غلط، بالکل غلط! اگر ہمارے دماغ گرمی سے چکرائے رہتے ہیں تو یورپ والوں کے دماغ سردی سے ٹھٹھرے

رہتے ہیں۔ نہیں، یہ کچھ نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس ملک میں ان مکھیوں کی وجہ سے کوئی بھی دماغی کام کرنا ممکن نہیں۔ وہاں ادنیٰ اور غریب طبقے میں بڑے بڑے فلاسفر اور مدبر اسی لیے پیدا ہوتے ہیں کہ اہم مسائل پر سوچنے اور غور کرنے کے وقت ان کے دماغوں کو یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں مکھیاں ایک منٹ بھی مہلت نہیں دیتیں، بس کبھی ناک میں کبھی کان میں یکساں گھسنے میں کوشاں، دماغ کو پراگندہ کیے رہتی ہیں۔ ہندوستان کا ہر شخص اپنی عمر کے ہر دن کم از کم دس دفعہ ضرور ان مکھیوں سے عاجز ہوکر شکست مان لیتا ہے، اور پھر بھی پناہ نہیں ملتی۔ ایسی حالت میں یقینی بات ہے کہ جسارت، اولوالعزمی اور استقلال کا شائبہ تک ہم بدنصیبوں میں سے غائب ہوجانا چاہیے۔ کامیابی کے واسطے استقلال بہت ضروری چیز ہے۔ یہاں مکھی کا استقلال دن میں دس دفعہ ہمارے استقلال کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ آپ کسی کام کے کرنے کو بیٹھے اور اس نے اگر ناک پر بیٹھنے کی ٹھان لی تو نچا مارا۔ کھکائے جاؤ، اترائی، کترائی اور پھر آ بیٹھی۔ عاجز ہوکر کام وام چھوڑ، جی چاہتا ہے کہ ناک کاٹ کر پھینک دو۔ اب بھی دیکھیے کہ ان چار سطروں کا لکھنا ایک مہم ہوگیا ہے۔ چاروں طرف کبڈی مچی ہوئی ہے۔ کوئی منھ پر، کوئی ناک پر، کوئی ہاتھ پر چلی آرہی ہے۔ ایک ہاتھ سے جھل رہا ہوں، دوسرے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں۔ آدھا دماغ مکھیوں سے جنگ کرنے میں لگا ہوا ہے، آدھا اس مضمون میں۔ ایک مکھی کہنی کے ایسا پیچھے پڑی ہے کہ شاید ہڈی پر کا گوشت چاٹ کے ہی پیچھا چھوڑے گی۔ بیس دفعہ کہنی کو جھٹکا دے چکا ہوں۔ ایک دفعہ کھٹ سے دیوار میں لگ چکی ہے۔ مگر وہ ظالم میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دوات کے منھ پر بھی سیاہی چاٹنے کے واسطے جان دیے دیتی ہیں۔ کم جگہ، اس پر دھینگا مشتی چل رہی ہے۔ یقیناً کئی ایک اندر ڈوب کر جان دے چکی ہیں کیوں کہ ابھی ڈوبا دے کر قلم جو نکالا تو نب کی نوک میں ایک عدد مکھی ساتھ آئی۔ اب ایسی حالت میں کیا خاک دماغ کام کرے! نہ دماغ رجوع، نہ طبیعت موزوں، نہ کام میں دلچسپی۔ لکھنے کو بیٹھے تھے بڑے عزم کے ساتھ، مکھیوں نے اتنا ستایا کہ وبالِ جان ہوگیا۔ مجھ پر کیا موقوف ہے، یہاں ہر کام میں ہر ایک کی یہی حالت ہوتی ہے۔ پھر الزام یہ دیا جاتا ہے کہ دیسی اپنے کاموں میں پوری دلچسپی نہیں لیتا۔ ہم بیچارے کریں تو کیا کریں؟ ہر کام شروع تو بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں مگر تھوڑی ہی دیر میں مکھیوں کو کوسنے اور گالیاں دینے میں یہ دلچسپی تبدیل ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہی کیا، ہماری جس اخلاقی

کمزوری پر غور کیا جائے اس کی بنا مکھیاں ہی نظر آئیں گی۔ بدطینتی اور لالچ ہماری طینت میں مکھیوں ہی نے ڈال دی ہے۔ اعتبار سے بے خبر، ذلت سے بے بہرہ، ہم کو مکھیوں نے ہی کر دیا ہے۔ غرضیکہ ہر طرح کی اخلاقی گندگی اور آلودگی انھی کی پھیلائی ہوئی ہے۔ اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ ہر چیز کسی نہ کسی مصرف وضرورت کے واسطے پیدا کی گئی ہے تو پھر مکھی کی پیدائش میں مصلحت اس ہی قسم کی ہے جو شیطان کے وجود میں ہے۔ شیطان عذاب بعد الموت کا سامان مہیا کرتا ہے اور مکھیاں زندگی بھر عذاب دینے میں لگی رہتی ہیں۔

باوجود ان تمام باتوں کے، ہم لوگوں کی اوندھی کھوپڑیوں میں یہ کبھی نہیں آتا کہ مکھیاں ماری جائیں۔ اگر کوئی بگڑے دل جھنجھلا کر اپنے گلے پر آپ طمانچہ لگا اتفاقاً مکھی مار لیتا ہے تو اس کے احباب بجائے شاباش دینے کے تھوتھو کرنے لگتے ہیں۔

بھائیو، اگر ہندوستان کی فلاح اور اپنی بہبود چاہتے ہو تو مکھیاں مارو! ہندو تو خیر یقیناً مجبور ہیں مگر مسلمانوں کو آخر کیا ہو گیا ہے جو مکھیاں نہیں مارتے اور جب کہ ان کا بہت بڑا حصہ بیکار ہی رہتا ہے؟ بیکار ہو تو مکھیاں ہی مارو اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچاؤ۔ یہ مانا کہ اس بیگار سے کہاں کام چلے گا۔ اس عالم گیر شیطانی فوج کو تباہ کر دینے کے واسطے ہم کو نہایت تنظیم کے ساتھ ایک عرصہ دراز تک جنگ کرنا ہوگی جب جا کر منحوس مکھی کی نسل فنا ہوگی۔

بدقسمت ہندوستان میں کتنی مکھیاں ہیں اس کا موٹا موٹا حساب اس طرح لگایا جاسکتا ہے۔ سارے ملک کا رقبہ ۱۸۸۶۸۰ مربع میل ہے یعنی اس میں ۵۸۵۹۰۰۰۰۰۰۰ مربع گز ہیں اور اگر ہر گز میں صرف تین مکھیاں مان لی جائیں تو ۳۴۲۵۲۰۵۸۳۶۸۰۰۰ مکھیاں کل ملک میں ہوں گی۔ یہ شمار لکھنے میں تو بڑا آ گیا مگر یہ مقدارِ شمار بہت ہی بڑی ہے، اس قدر زیادہ کہ انسانی دماغ کی گرفت سے باہر۔ لیکن پھر بھی ہمیں چاہیے کہ اس کا کچھ اندازہ ضرور لگالیں۔ اسے اس طرح سمجھیے کہ چار مکھیاں اگر آگے پیچھے ایک لائن میں کھڑی ہوں تو اس قطار کی لمبائی ایک انچ ہوتی ہے۔ اب اگر ہندوستان کی سب مکھیاں ایک قطار میں کھڑی ہوں تو تیرہ کروڑ میل سے زیادہ لمبی قطار ہوگی۔ مگر ناظرین اب بھی اندازہ کچھ نہیں لگا سکتے کیوں کہ تیرہ کروڑ کا عدد خود اس قدر بڑا ہے کہ اس کا اندازہ بھی نہیں لگ سکتا۔ پانچ

ماہ دن رات اگر کوئی آدمی گنتی گنے تو تیرہ کروڑ کی گنتی ختم ہوگی۔ اعداد کا لکھ دینا آسان ہے مگر اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بہر حال ان باتوں سے کیا حاصل، ہم آپ کو کام کی باتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہم کو اپنے ملک میں سے ۳۴۲۵۲۰۵۸۳۶۸۰۰۰ مکھیوں کی آبادی تباہ کرنی ہے اور ہماری انسانی آبادی ۴۰۰۰۰۰۰۰۰ ہے اس لیے ہر ہندوستانی کے حصہ میں ۸۵۶۳۰ مکھیاں آتی ہیں۔

اب اگر ہندوستان کے بوڑھے، بچے، مرد، عورت، سارے مل کر بیک وقت ہمت باندھ کر، کمر کس، جھاڑو ہاتھ میں لے، مکھیوں پر دھاوا بول دیں اور یہ بلائیں آٹھ گھنٹہ روزانہ ہر نفر کے ہاتھ سے فی منٹ ایک عدد کے حساب سے جہنم واصل ہونے لگیں تو کیا مشکل ہے، چھ مہینے میں ہندوستان جنت نشان ہو جائے۔

مندرجہ بالا اسکیم پر یہ اعتراض عائد ہو سکتا ہے کہ اس چھ مہینے کے مکمل جہاد کی وجہ سے ملک کی اگر دونوں نہیں تو ایک فصل تو بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔ غلے کا ایک دانہ نہ پیدا ہوگا۔ اس کا سیدھا حل یہ ہے کہ چھ مہینے غلہ نہ کھایا جائے بلکہ گوشت، میوے، پھل اور بلائی، بسکٹ وغیرہ پر گذر کی جائے۔ دراصل یہ اسکیم بذاتِ خود تو بالکل پکی ہے، مگر قباحت اس میں وہی ہے کہ ہم سست و کاہل ہندوستانی لوگ اپنی خوشی سے آپ منہ پر کی مکھی تک تو جھلتے نہیں، پھر آٹھ گھنٹے روزانہ جھاڑو کے ہاتھ کیسے چلائیں گے؟ ہر گز نہیں۔ مجبور ہو جائیں اور پھنس جائیں تو جا کر افریقہ کے صحرا فتح کر آئیں، ویسے کتا منہ چاٹا کرے اور خود پڑے ٹکر ٹکر دوسرے کا آسرا دیکھا کریں۔ ہم کو مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس ملک میں کوئی اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ گورنمنٹ کے ڈنڈے کا زور شامل حال نہ ہو۔

اس لیے زیادہ مناسب ہوگا کہ قوم کے بھاری بھرکم افراد میں سے منتخب کردہ ایک وفد حکومت کے پاس جائے اور پور از ور دے کر گورنمنٹ کو آمادہ کرے کہ وہ اس جہاد کو اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت شدومد سے جاری کر دے۔ کیوں کہ جب بھی ساری آبادی کا بیک وقت میدانِ کارزار میں لے آنا ممکن نہ ہوگا، اس لیے اس مہم کے واسطے ایک پورا نظام عمل تیار کرنا ہوگا۔ ذیل کی چند تجاویز جو میری نظر میں ہیں پیش کیے دیتا ہوں اور مضمون ختم کرتا ہوں۔

اول: پورے زور سے مکھیاں مارنے کا پروپیگنڈا فوراً شروع کر دینا چاہیے۔ اس میں ریڈیو اسٹیشنوں اور اخباروں کو پورا حصہ لینا چاہیے۔ شہروں میں بڑے بڑے پوسٹر جا بجا چسپاں ہونے چاہییں۔ ٹاؤن ہالوں میں جلسے اور تقریریں ہوں۔ غرضیکہ ہر ممکن طریقے پر مکھیاں مارنے کی ترغیب دلائی جائے اور تیز تر مکھی ماروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ریڈیو پکارے: ''مکھی مارو!'' ریل کے ڈبوں میں، شہر کی دیواروں پر لکھا ہو: ''مکھی مارو!'' اخباروں میں بڑی بڑی سرخیاں ہوں: ''مکھی مارو!'' نوٹوں کے حاشیوں میں، خطوں کی مہروں میں، سگریٹ کے کوپنوں میں لکھا ہو: ''مکھی مارو!'' مطلب یہ کہ جس جس طرح ہو سکے یہ ہی پروپیگنڈا کیا جائے۔

دوم: تمام اسکولوں اور کالجوں میں ایک گھنٹہ مکھیاں مارنے کے واسطے وقف کر دیا جائے۔ استاد خود بھی مکھیاں ماریں اور اپنے شاگردوں کو بھی اس ہنر کی تعلیم دیں۔

سوم: سرکاری دفاتر اور کچہریوں میں بھی ایک گھنٹہ یہی کام ہو۔ تمام عملہ، جج، پیشکار، وکیل، مختار، مدعی، مدعا علیہ مع گواہان، ہر دو جانب، مکھیاں ماریں۔

چہارم: ہر ٹکٹ اور ہر اسٹیمپ کے ساتھ حسب مقدار مکھیاں بھی چسپاں ہوں۔ ایک آنے کے ساتھ ایک مکھی اور ایک روپے کے ساتھ سولہ مکھیاں۔

پنجم: راجاؤں، نوابوں اور بڑے بڑے حکام کو چاہیے کہ بغیر مکھیوں کا نذرانہ لیے کسی سے نہ ملیں۔ حکام کا حسب مراتب نذرانہ ہو۔ کسی کا طشت بھر مکھیاں نذرانہ ہے تو کسی کا دو، اور اگر کوئی بہت بڑا حاکم ہے تو کم از کم سولہ طشتریاں مکھیاں اس کا نذرانہ ہو۔

ششم: اخبار اور رسالوں کے ایڈیٹروں کو بھی لازم ہے کہ کوئی مضمون نگار کتنا ہی کیوں نہ گڑگڑائے، اس کا مضمون ہرگز ہرگز نہ چھاپیں جب تک کہ مضمون کے ساتھ مکھیاں بھی نہ بھیجی گئی ہوں۔

لہٰذا اڈیٹر صاحب ''ساقی'' سے عرض ہے کہ ایک درجن مکھیاں خورد وکلاں ارسال خدمت ہیں۔ ان کو قبول فرما کر مضمون ہذا کو شرف باریابی بخشیں۔

۴

شخصیت اور فن

سید رفیق حسین

خودنوشت

۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ سات برس کی عمر میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بچپن عجیب طوفانی حالت میں گذرا۔ کبھی بہن کے پاس رہا، کبھی پھوپھی کے پاس، کبھی کسی اور عزیز کے پاس۔ والد کے دوسری شادی کرنے پر ذرا قرینے کی زندگی شروع ہوئی۔ اس عرصے میں تعلیم کا سلسلہ قطعی بگڑ چکا تھا، جو کبھی سدھر نہ سکا۔ اسکول میں کبھی اچھا طالب علم نہ سمجھا گیا۔

1915ء میں جب ہم سب والد کے ساتھ اٹاوے میں تھے اور میں نویں درجے میں پڑھتا تھا، گھر سے بغیر اطلاع بھاگ کر بمبئی چلا گیا۔ چھ مہینے تک ڈھلائی کے ایک کارخانے میں مزدوری کی۔ دن بھر محنت کرتا اور رات کو پڑھتا۔ پھر انجینئری کے ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخلے کے امتحان میں بیٹھا۔ کامیاب ہوا۔ گھر پر اطلاع کی۔ وہاں سے خرچ آنے لگا اور باقاعدہ پڑھنے لگا۔ ۱۹۲۰ء میں انجینئری کا امتحان پاس کیا۔ جب سے اب تک ملازمت کا سلسلہ وقفے دے دے کر جاری ہے۔ اٹھارویں ملازمت ہے۔ سترہ نوکریوں کو استعفیٰ دے چکا ہوں۔ کسی جگہ ایسا نہیں ہوا کہ لوگ میرے کام سے خوش نہ ہوئے ہوں اور مجھے خوشی سے علیحدہ ہونے دیا ہو، لیکن میری افتادِ طبع ہی کچھ ایسی ہے کہ مستقل ملازمت نہیں کر سکتا۔ اس وقت بھی یکے بعد دیگرے تین نوٹس گورنمنٹ کو دے چکا ہوں کہ میں اب یہاں کام نہیں کرنا چاہتا، انتظام کر لیا جائے۔ مگر کوئی آدمی نہیں ملتا، اس لیے افسران چھوڑنے پر راضی نہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں گیارہ بارہ برس ترائی کے جنگلوں میں رہنا پڑا۔ بحرِ ہند میں کبھی جہاز کی انجینئری کے سلسلے میں چکر لگائے ہیں اور اسی سلسلے میں حج کر چکا ہوں۔ لیکن مجھے دیکھ کر کوئی حشر تک حاجی نہیں کہہ سکتا۔ نکر اور آدھی آستین کی سفید قمیص شاید دس گیارہ برس کی عمر سے آج تک پہنتا ہوں۔

اردو بالکل نہیں لکھ سکتا۔ املا قطعی موزوں نہیں۔ میری لکھت میں خود نہیں پڑھ سکتا نہ کوئی اور، سوائے میری لڑکی کے۔ جس وقت طبیعت موزوں ہوتی ہے اور تصور کے نقشے قلم کے ذریعے سے کاغذ پر اترنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں تو معمولی معمولی لفظوں کے ہجوں میں دو دو اور تین تین منٹ صرف ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان کی گنتی کی چار پانچ کتابیں پڑھی ہوں گی۔ فارسی کبھی نہیں پڑھی، مگر بول سکتا ہوں اور چھوٹا موٹا مضمون تک لکھ لیتا ہوں۔ لکھی ہوئی فارسی کی ایک سطر نہیں پڑھ سکتا۔ انگریزی کتابیں بہت پڑھی ہیں، غالباً دو ہزار سے اوپر ناولیں اور قصے پڑھ چکا ہوں۔ حافظہ بہت خراب ہے۔ نہ صرف لوگوں کے نام ہی بھول جاتا ہوں بلکہ سب سے زیادہ دقت صورتیں پہچاننے میں ہوتی ہے۔ برسوں کے ساتھ رہے آدمی چھ مہینے کے واسطے الگ ہو جائیں اور پھر ان میں سے کوئی سامنے آ جائے تو پنجابی رمالوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں سے ملنے جلنے سے کتراتا ہوں۔ جانوروں سے انتہائی نفرت ہے۔ کبھی کوئی جانور خوشی سے گھر میں پالنے نہ دیا۔

آپ جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نے اردو میں کیوں اور کب سے لکھنا شروع کیا۔ میری لڑکی اور چھوٹی بہن کو اردو ادبیات سے بہت ذوق ہے۔ چند سال ادھر کی بات ہے، ان لوگوں نے کسی رسالے کی ایک کہانی کی بڑی تعریف کی اور بڑے شوق سے مجھے سنانا شروع کی۔ میں درمیان میں اٹھ کر چلا گیا، جس پر دونوں بہت خفا ہوئیں۔ میں نے کہا کہ بھئی چرخے اور کاٹن مل یا بیل گاڑی اور ریلوے ٹرین میں جو فرق ہے، وہی اردو اور انگریزی ادب میں ہے۔ میں کیا سنوں، مجھے تو کچھ انگریزی ہی میں مزہ آتا ہے۔ انھوں نے اسے میری غلامانہ ذہنیت سے تعبیر کیا اور مادری زبان سے اس بے رخی پر بڑی شرم دلائی۔ یہ بھی کہا کہ اگر اردو لٹریچر آپ کو اتنا ہی کم مایہ نظر آتا ہے تو کچھ آپ ہی لکھ کر اس لٹریچر میں اضافہ کیجیے۔ چنانچہ میں نے ان دونوں کے اصرار سے لکھنا شروع کیا اور جلد ہی

میرے افسانے اور مضامین پسند کیے جانے لگے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری چیزیں فن کے اعتبار سے مکمل ہوتی ہیں، لیکن چوں کہ فنون لطیفہ پر غائر نظر رکھتا ہوں، اس لیے آپ ان میں فن کی جھلکیاں ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ زبان نہ جانتے ہوئے بھی لکھ لیتا ہوں۔ شاید یہ لکھنوی ہونے کا فیض ہے۔

انگریزی ناولوں اور افسانوں میں اگر ۷۵ فیصد عشق ومحبت کا ذکر ہوتا ہے تو کم از کم ۲۵ فیصد اور مسائل پر بھی لکھا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں دو سو فیصدی عشق ومحبت ہوتا ہے، گو اس طرف کچھ مستثنیات نظر آنے لگے ہیں۔ اس لیے میں نے طے کیا ہے کہ کبھی عشق ومحبت پر کچھ نہ لکھوں گا۔ میں افسانہ لکھنے سے قبل اس کے پلاٹ اور تمام جزئیات کا اپنے تصور میں مکمل جائزہ لے لیتا ہوں۔ ''کلوا''، میرا پہلا افسانہ، اسی نام کے ایک کتے کی کہانی ہے۔ اسے لکھنے سے قبل میں لکھنؤ کی ان تمام سڑکوں اور گلیوں میں گھوما تھا جہاں جہاں کلوا گیا۔ عیش باغ کراسنگ پر جس جگہ کلوا استاد بوچا کی لاش سونگھتا ہے، وہ جگہ اب تک میری نظروں کے سامنے ہے۔

مصنفین میں ٹالسٹائی مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ زندگی سے الگ آرٹ کا کوئی تصور کم از کم میرے ذہن میں نہیں۔

(ماخوذ از ''میرا بہترین افسانہ''، مرتبہ بشیر ہندی، لاہور، سنہ ندارد)

الطاف فاطمہ

خزاں کے رنگ

جب روشن اور منور چراغ گل ہو جاتے ہیں تو اندھیارے اپنے دیے جلاتے ہیں۔ وقت کے طویل فاصلوں پر جھلملاتے دیپ کتنے گمراہ کن ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں کو اس کی راہیں بھلا دیتے ہیں۔ پھر وہ کہیں کا کہیں جا نکلتا ہے۔ اور جب ہم اپنے دریچے اور کواڑ بند کر لیتے ہیں تو تنہائی کتنی عجیب عجیب سرگوشیاں کرتی ہے۔ کبھی کہتی ہے کہ بیٹھ کر خوب سارا روؤ اور کبھی ساری دنیا سے بے تعلق ہونے کی صلاح دیتی ہے۔

اور بعض بعض تنہائیاں کتنی آباد اور معمور ہوتی ہیں۔ گذرے ہوئے کاروانوں اور وقت کی اجاڑی بستیوں سے معمور تنہائیاں، بہت آباد اور پُر رونق ہوتی ہیں۔

اس وقت اس سرد اور کالی رات میں میں نے ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے ان پر پردے سرکا دیے ہیں اور موٹے موٹے پردوں نے شیشوں میں سے جھانکتی ہوئی دنیا کو مجھ سے جدا کر دیا ہے، اور اب میرے پاس تنہائی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور ایسے میں کتنی ہی بار یہ ہوا کہ وقت کی گذرگاہوں پر بکھر جانے والے سارے طویل فاصلے بند دروازوں میں سے در آئے ہیں — ایک طویل اور ہموار راستہ بن کر اور کبھی بہکی بہکی بھٹکی پگڈنڈیوں کی صورت میں — اور میں نے بغیر کسی زادِ راہ کے ان پر بارہا سفر کیا ہے۔ اور اب اس کالی اور سرد رات میں میں یہاں نہیں ہوں۔ میرے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ گرجا کی برجیوں، مسجد کے میناروں اور داہنی کھڑکی

میں سے نظر آتی ہوئی گنگا رام ہسپتال کی سرخ عمارت کی اوپری منزل، یہ سب مجھ سے بہت دور رہ گئے ہیں، ماسوا ان سیاہ لبادوں میں لپٹے مبہوت درختوں کے۔ اور ان کا کیا ہے، یہ ہمیشہ اور ہر جگہ یوں ہی موجود رہیں گے۔ اب اندھیرے نے اپنے دیے جلائے ہیں اور ان کی روشنی میں وہ سب دیکھ سکتی ہوں کہ جس کے متعلق میرا گمان ہے کہ کب کا گذر چکا ہے اور وقت کے پانیوں میں تحلیل ہو چکا ہے۔

''ارے بھئی، ایک شرارت ہو تو کہی جائے۔ ایک مرتبہ کیا حرکت کی کہ مٹی کے تیل کے خالی کنستر میں ڈھیر سارے پٹاخے ڈال کر تین بھینس کی دُم سے باندھ دیا اور اس میں دو تین انگارے ڈال دیے۔ پھر جو دھماکے ہوئے تو بھینس نے زنجیر تڑالی اور سارے احاطے میں بدحواس ہو کر دوڑنا شروع کر دیا۔ ادھر اصطبل سے گھوڑی نے رسی تڑالی اور اس کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ اور ان کے پیچھے کتا بھونک بھونک کر دم دیے دیتا تھا۔ یا اللہ! کس مشکل سے سائیس ان کو قابو میں لایا اور وہ کنستر کھول کر پھینکا ہے۔ اتنی دھما چوکڑی ہوئی کہ ابا، جنھیں کام کرتے وقت سوائے اپنے نقشوں، پیمائشوں اور بندوں کی اونچائی اور چوڑائیوں کے کسی بات کا ہوش نہ رہتا تھا، باہر نکل آئے۔ مگر کبھی ایک حرف نہ کہتے تھے ان کی شرارتوں پر۔''

دھیمی دھیمی اور مسکراتی ہوئی یہ آواز اب میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ دیکھیے، میں نے کہا تھا نا کہ اب میں وہاں نہیں ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے، بلکہ وہاں ہوں جہاں میں اب کبھی نہ ہوں گی۔

ایسی ہی سرد اور کالی راتوں میں اماں کے اردگرد دبک کر لیٹے لیٹے ہم نے کتنی ہی کہانیاں سنیں، خرگوشوں، پریوں، بادشاہوں کی کہانیوں سے لے کر بابر، شواجی اور فلورنس نائیٹنگیل اور غازی انور پاشا سے لے کر مس ہیلن کیلر تک کی کہانیاں۔ مگر جو مزہ ان کی ان باتوں میں آتا تھا ان کہانیوں میں کبھی نہ آیا۔ اور اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس آن اور اس لمحے وہ ہمارے پاس اور ہمارے درمیان نہ ہوتی تھیں بلکہ اپنے ابا کے ساتھ دور افتادہ نہری علاقوں اور گھنے جنگلوں کے ریسٹ ہاؤسوں اور سروے کوٹھیوں میں جا پہنچا کرتی تھیں جن کے گرد تمام تمام رات بڑے بڑے الاؤ جلائے جاتے تھے، اُن شیروں کو پرے رکھنے کے لیے جو اندھیری راتوں میں نہر پر پانی پینے آتے تھے۔

اور سرد راتوں میں ایسے قصے جو بدن میں جھرجھری پیدا کر دیں، کتنے دلچسپ ہوا کرتے ہیں۔

اور پھر ایسے ماحول اور فضا میں ان کے بھائی جان کی شرارتوں کے لامتناہی قصے۔ وہ سچ مچ ہم سے بہت دور ہو جایا کرتی تھیں، اور اب میں سوچتی ہوں کہ اگر اس وقت ہم کو یہ احساس ہو جاتا کہ اس آن وہ ہمارے پاس نہیں ہیں بلکہ بڑے لمبے اور بعید فاصلوں پر سفر کر رہی ہیں تو کتنی تنہائی اور بے کسی کا احساس ہوتا۔ چنانچہ وہ آواز دور کہیں سے آتی رہتی اور ہم سنتے ہوتے۔

اور پھر جب انھوں نے ایک مرتبہ سرنگیں اڑانے اور بلاسٹنگ کے لیے آئے ہوئے ڈائنامائٹ کا ایک فلیتہ نہ جانے کس طرح حاصل کر لیا تھا، تب تو سچ مچ آفت ہی آ گئی تھی۔ پتھر کی ایک خالی بوتل میں بارود بھر کر ڈائنامائٹ کا فلیتہ اس میں لگا کر دور کہیں دبا آئے اور دور تک ایک رسی لا کر اس میں آگ لگا دی، اور پھر جو دھماکا ہوا تو سارا جنگل اور دور دور کا علاقہ دہل گیا۔ ابا سوتے سے اٹھ بیٹھے۔ ''غضب ہو گیا۔ یہ ڈائنامائٹ کس کے ہاتھ لگ گیا؟ ہو نہ ہو یہ رفیق کی کارستانی ہے۔'' اور پھر بھی انھوں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو کہا تو صرف اتنا کہا:

''تم دفتر کی اور سرکاری چیزوں کو کبھی ہاتھ نہ لگاؤ گے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمھارے باپ کا نام اُن لوگوں میں لیا جائے جو سرکاری چیزوں کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں؟''

البتہ دفتری کی اور اوورسیئروں کی شامت آئی تھی اور ان کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ منے میاں اس حصے کے قریب بھی قدم نہ رکھنے پائیں جس حصے میں دفتر تھے۔

ایک دفعہ یہی دھن لگ گئی کہ گھر میں جتنے جانور ہیں سب کا ٹمپریچر لیا جائے۔ اب تم جانو کہ بھینس سے لے کر مرغی اور چکور تک کا ٹمپریچر لے ڈالا۔ چکور کی حرارت سب سے زیادہ نکلی۔ تھرمامیٹر ٹوٹ گیا اور درجۂ حرارت آخر تک پہنچ چکا تھا۔

ایک دفعہ ہم سب عید کرنے نانا کے گھر لکھنؤ گئے۔ چاند رات کو یہ خیال آیا، کل سب لوگ تو کپڑے بدلیں گے اور مرغیاں یوں ہی سفید سفید پر لیے گھومیں گی۔ چپکے چپکے نانا کے سارے رنگ گھول ڈالے اور اندھیرے میں نہ جانے کب تک کیا کرتے رہے۔

صبح کو نانا نے سب کو آوازیں دے دے کر بلایا، ''ارے لڑکیو! آ کر تو دیکھو، یہ کیا جانور صبح صبح چلے آ رہے ہیں۔''

گلابی، سفید، ہری اور نیلی پیلی مرغیاں عید کے رنگین لباس میں دڑبے سے نکلی چلی آرہی تھیں۔

اور دل کے اتنے بڑے کہ جتنی عیدی اور جیب خرچ ملتا سب دوسرے دن ختم۔ ادھر سے ایک نوکر نے سلام کیا، ''منے میاں، سلام!'' ادھر انھوں نے روپیہ تھما دیا۔

ادھر سے دوسرے نے کہا، ''رفیق بھیا، سلام!'' اور انھوں نے ایک روپیہ حوالے کیا۔

اور اس دن کی تو نوکر تمنا کیا کرتے تھے کہ چھوٹے صاحب کسی کو ڈانٹ دیں یا جھڑک دیں۔ ذرا دیر میں معافی مع انعام اس تک پہنچ جاتی تھی۔

''مرزا جی، ہمیں معاف کر دیجیے۔''

''اللہ خنسا ماں، اب تو تم خفا نہیں؟'' وہ جیبیں اس کے آگے خالی کر دیتے۔

اپنے پیسے بانٹ بونٹ ہمارے پیسے جھڑوا لیتے، کبھی خوشامدوں سے اور کبھی چٹیا گھسیٹ کر اور ڈرا دھمکا کر۔

''بھئی واہ! آپ کیوں دے دیا کرتی تھیں اپنے پیسے ان کو؟'' ہمارا دل کڑھ جاتا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہماری اماں سے سارے پیسے ٹھگ لیا کرتے تھے۔

پھر وہ ایک گہری سانس لے کر کہتیں، ''تم کو نہیں معلوم بیٹے، جن بچوں کی مائیں نہیں ہوتیں وہ ایک دوسرے کا دکھ نہیں دیکھ سکتے، خصوصاً بہنیں تو بھائیوں کی مائیں بن جایا کرتی ہیں، چاہے چھوٹی ہوں یا بڑی۔ بس چھوٹی باجی اور میں دونوں اپنا سارا جیب خرچ باری باری ان کو دے دیا کرتے۔''

اماں کی ان ساری جیتی جاگتی کہانیوں کا مرکز ان کے بھائی جان تھے۔ وہ دو بھائیوں اور تین بہنوں کی سب سے چھوٹی بہن تھیں لیکن ان کی یادوں کے سارے چراغ ان کے بھائی جان کی ذات کے گرد فروزاں تھے۔ اور ان کہانیوں نے ان کے بھائی جان کو ہمارے ذہنوں میں ایک عجیب وغریب مقام دے دیا، جیسے وہ رابن ہڈ ہوں، جیسے وہ حاتم طائی ہوں، یا پھر ماسٹر صاحب کی سنائی کہانی کے تاج الملوک ہوں۔

کچھ ایسے ہی سے دنوں کی دوپہر تھی۔ امرود کے درختوں پر امرود پک رہے تھے اور ہزارہ

نارنگی کی باڑھ میں نارنجی نارنجی انگارے سے دہک رہے تھے۔ دسمبر کی مری مری دھوپ میں ماسٹر صاحب کے کمرے کے آگے والی کھپریل میں ہم سب ٹین کی کرسیوں اور چارپائی پر بیٹھے اپنی اپنی مشقت میں مبتلا تھے۔ میں ماسٹر صاحب کی دی ہوئی غلطی کو پچاس بار لکھنے کے بجائے ان کے نام محمد سلیم انصاری کے انتہائی پیچیدہ لیکن بے حد خوبصورت دستخطوں کے پیچ وخم میں گم تھی۔ کتنی حسرت تھی مجھے کہ ان دستخطوں کی نقل کرنا آجائے تا کہ اپنے غلط سلط سوالوں پر یہ دستخط ثبت کر کے ان کو دھندھلا سکوں کہ کام تو میں دکھا چکی۔ یہ لیجیے، اپنے دستخط دیکھ لیجیے۔

یکا یک ماسٹر صاحب نے چونک کر کہا:

''ارے یہ کون؟''

ہیں! ہم سب نے سر اٹھا کر اس بے حد گورے لمبے بالوں والے شخص کو دیکھا جس کی آنکھیں بڑی اور شاید شربتی تھیں۔

''کون صاحب ہیں یہ؟'' ماسٹر صاحب نے کہا، اور خود ہی بولے، ''کوئی فورینر ہے شاید۔''

''ماس صاحب، کیا کوئی انگریز ہے؟'' ہم میں سے اکثر نے سوال کیا۔

یکا یک وہ نیا آدمی مڑا اور ہمارے گھر میں گھس گیا۔

یہ تو بھئی عجیب بات ہوئی! ہم ماسٹر صاحب کی اجازت لیے بغیر، کتابیں چھوڑ چھاڑ، خود بھی اندر گھس گئے، یوں کہ ان دنوں ہماری اماں بیمار تھیں اور پتا نہیں یہ کون ہے جو اندر چلا گیا۔

ہم اندر گئے تو وہ شخص ہماری اماں کو گلے سے لگائے ہوئے تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ارے، یہ اتنا لمبا اور اجنبی انسان بھلا کیوں رو رہا ہے؟''

''یہ تمھارے ماموں جان ہیں،'' اماں نے ہمیں بتایا۔

ہاں، انھیں ایسا ہی ہونا چاہیے، اس لیے کہ ہم ان کے متعلق بہت کچھ سن چکے تھے، ہر روز ہی سنتے رہتے تھے، لیکن اتنے دلچسپ پیرائے میں کہ کبھی اکتاہٹ محسوس نہ ہوتی بلکہ دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

تو یہ تھی پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے ہوش میں ان کو دیکھا۔ وہ بھی اپنے ابا، خان بہادر سید جعفر حسین، اور بڑے بھائی کی طرح انجینئر تھے اور جگہ جگہ پھرتے رہتے تھے۔ اور اپنے باپ اور بھائی سے فقط ایک بات میں مختلف تھے کہ وہ گھڑی گھڑی نوکریاں چھوڑتے اور نوکری ان کو گھڑی گھڑی مل جاتی تھی۔ اور جہاں تک میری یاد کا تعلق ہے، ان کے باپ یا کسی بہن کو ان کی اس حرکت پر اعتراض بھی نہ تھا۔ میں نے بارہا غور کیا، جب کبھی ان کے ابا ماموں جان کا نام لیا کرتے تو فخر سے ان کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔

ایک مرتبہ جب انھوں نے کسی غیر ملکی انجینئر کو کئی طمانچے مارنے کے بعد نوکری چھوڑی تھی تو میری اماں نے اپنے بھائی کو حق بجانب ٹھیرایا تھا اور انھوں نے کہا تھا، ''اور کیا! ایسی بات پر غصہ تو آنا ہی تھا۔ میرا بھائی حق پرست ہے۔ اسے جھوٹ سے نفرت ہے۔ اور وہ حق پر ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو اپنے سامنے نہیں جھکا سکتی ہے۔'' اور پھر شروع ہو گئے ان کے قصے۔

ایک مرتبہ کھچڑی کھا رہے تھے۔ منجھلی اماں (سوتیلی والدہ) سے کہا، گھی کم ہے۔ تھوڑا گھی اور دلوا دیجیے۔

انھوں نے کہا، ''بس یہی کھا لو، گھی نہیں ہے۔ کون سے تمھارے باوا نے کپے رکھ دیے ہیں لا کر۔''

بس چپکے سے اٹھے، گودام میں گئے۔ چھینکے پر گھی کی مٹکی رکھی تھی۔ ایک چھری مار کر اس کے پیندے میں چھید کر لیا اور جب گھی بہہ نکلا تو پلیٹ اس کے نیچے لگا دی اور آرام سے باہر آ گئے۔

گھر میں ایک طوفان مچ گیا۔ جب منجھلی اماں نے ڈانٹا کہ سارا گھی بہا دیا تو نہایت سکون سے جواب دیا:

''گھی کہاں سے آ گیا؟ آپ تو کہہ رہی تھیں گھی نہیں ہے۔''

اور اسی طرح ایک مرتبہ ٹوٹی جوتی پہنے پھر رہے تھے۔ جب منجھلی اماں سے کہتے وہ کہہ دیتیں، ''میرے پاس نہیں ہیں پیسے۔'' چنانچہ ایک رات گھر بھر کی جوتیاں جمع کر کے نہر میں ڈال آئے۔ چنانچہ دوسرے دن گھر بھر کی جوتیوں کے ساتھ ان کی بھی نئی جوتی آ گئی۔ جب ابا سے شکایت

کی گئی تو انھوں نے کہا، ''ارے صاحب، تم کو جو کچھ بھی کرنا ہوا کرے رفیق سے صاف ہاں نہیں میں کہہ دیا کرو۔ غلط بیانی مت کیا کرو۔''

مگر منجھلی اماں تو پھر منجھلی اماں ٹھیریں۔ کچھ نہ کچھ حرکت کرتی رہتی تھیں۔ ایک بات میاں بھائی (بڑے بھائی) نے ہم کو گلے لگا لگا کر سمجھا دی تھی۔ ''دیکھو تم لوگوں کو جو تکلیف یا کمی ہو مجھ سے کہنا۔ ابا سے کبھی منجھلی اماں کی شکایت نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تم سے ہم سے کتنی محبت کرتے ہیں، پھر عمر بھر منجھلی اماں کی شکل نہ دیکھیں گے اور یوں ہمارے خاندان کی کتنی بے عزتی ہوگی۔'' چنانچہ جب وہ آتے تھے اپنی ملازمت پر سے، تو ہم سب اپنی ضرورت ان ہی سے بیان کرتے تھے۔

پھر یہ کہتے کہتے میری اماں کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ ''ارے، میاں بھائی تو ہماری ماں ہیں۔ اب جا کر ذرا لاپروا ہو گئے ہیں، ورنہ جب تک ہم اپنے اپنے گھر کے نہ ہوے ہمارے لیے سپر بن رہے۔ چنانچہ میاں بھائی کی یہی نصیحت تھی جو بھائی جان نے دل سے لگا کر رکھی۔ اور ایک مرتبہ جو منجھلی اماں کی زیادتیوں سے نہیں بلکہ فقط ایک طعنے سے اکتائے تو لاپتا ہو گئے۔ مگر گستاخی کی اور نہ کبھی ابا سے شکایت کی۔''

تو چنانچہ ان کے بھائی بمبئی بھاگ لیے تھے۔ اور یہ ایک اور روایت تھی ان کے خاندان کی کہ جہاں کسی نے نکھے پن یا بوجھ بننے کا طعنہ دیا اور صاحبزادے نو دو گیارہ۔ اور اس پر ہماری اماں کو فخر تھا۔ میر محسن علی شاہ کی اولاد بڑی غیرت دار تھی، چنانچہ ان کے باپ اور دونوں بھائیوں کے علاوہ خاندان کے متعدد افراد گھر سے بھاگ جاتے تھے اور انجینئر بن کر گھر میں قدم رکھتے تھے۔ چنانچہ بھائی جان بھی بمبئی بھاگے۔ جب تک ابا کو ان کا پتا نشان ملے ملے ہر دکھ جھیل لیا، اور ان دکھوں کی تفصیل سناتے سناتے میری اماں ہر بار رو پڑتی تھیں۔ اور مجھے آج تک اس بات کی حیرت ہے کہ بمبئی میں رہ کر جو دکھ ان کے بھائی نے جھیلے اس کی جزئیاتی تفصیل ان کو کس طرح اور کیوں یاد رہی۔ اور جب ابا کو ان کا پتا لگا اور باقاعدہ فیس اور خرچ بھیجنا شروع کر دیا جب بھی تو ان کی مشقت اور محنت کم نہ ہوئی، اس لیے کہ ان کا وہ جیب خرچ ان کے لیے تو کافی ہو سکتا تھا مگر ان کے دوست خان صاحب اور ان کے دو چھوٹے بھائیوں کی پوری تو نہ ڈال سکتا تھا جو پشاور سے اس لیے بھاگ آئے تھے کہ سوتیلی ماں کے

مظالم ان کی برداشت سے باہر ہو گئے تھے۔ چنانچہ چار آدمیوں کا خرچ یوں پورا ہوتا کہ شام کو وہ اور خان صاحب ایک سائیکل مرمت کرنے والے کی دکان پر کام کرتے اور ایک اور دکان کے حساب کتاب کی پڑتال کیا کرتے، اور یوں ان سب کی تعلیم پوری ہوئی۔ اور اگر کبھی کوئی اس بات کا ذکر کر دے تو بہت رنجیدہ ہوتے ہیں کہ یہ بھی کوئی ذکر کرنے کی بات ہے۔ بھلا میں نے کیا کر دیا؟ وہ تو میرا فرض تھا۔

اور اس قسم کے بہت سے فرائض وہ اپنے ذمے لے لیا کرتے تھے۔ انگریز صاحب علاقہ کی بیوی بہت بد دماغ تھی۔ جب اس کے سر میں درد ہوتا حکم دے دیتی کہ کوئی جوتا پہن کے ادھر سے نہ گذرے، کنویں سے پانی نہ بھرے۔ بچارے غریب قلی، ٹرالی مین اور مزدور پانی سے پریشان رہتے۔ ان ہی دنوں یہ نئے نئے انجینئر ہو کر وہاں گئے تھے۔ انھوں نے جو اس کا یہ نادر شاہی حکم سنا تو کھڑاویں پہن اس کے برآمدے میں پہنچ گئے اور ٹہلنا شروع کیا۔ وہ چیختی ہوئی نکلی، ''جعفری، تم کو کیا ہوا ہے؟ خدا کے واسطے! میں مر جاؤں گی۔''

اور رفیق حسین جعفری نے بڑے سکون سے جواب دیا، ''تم ہی نے تو جوتا پہن کر آنے کی ممانعت کی ہے۔ اب کیا میں ننگے پیر آتا۔ کھڑادیں پہن کر آگیا۔'' وہ ہنسی اور اندر چلی گئی۔ اس دن سے پھر کسی کو پانی کی تکلیف نہ ہوئی۔ اس کے سر میں درد ہوتا اور قلی اور مزدور مزے سے پانی بھر بھر کے لے جاتے۔

جن دنوں قمر باجی ہمارے یہاں آئی ہوئی ہوتیں تو پھر ہم لوگ اماں کے پاس نہیں لیٹ سکتے تھے۔ وہ ہمیں ایک ایک گھر کی دیتی تھیں، ''چلو ہٹو، اپنے پلنگ پر لیٹو۔ میں لیٹوں گی اپنی پھوپی جان کے پاس۔'' پھر ان کے بھائی کی سب سے لاڈلی اولاد ان کے پاس گھس کر اور چمٹ کر لیٹ جاتیں۔ قمر باجی کی سب سے پہلی فرمائش یہی ہوتی۔ ''اللہ پھوپی جان، اپنے بچپن کی باتیں سنائیے!'' پھر وہ جھانسی، کالپی، نرورا، بھوپال اور نہ جانے کہاں کہاں کے نہری علاقوں کی دلچسپ باتیں اور وارداتیں سناتے سناتے، آجاتیں ''بھائی جان'' کی باتوں پر۔ دسمبر کی ایک کالی، اور ٹھٹھرتی رات میں ایسے ہی قصے سناتے سناتے، ان کی باتیں کرتے کرتے انھوں نے ماموں جان کی پہلی شادی کا قصہ سنایا تھا،

اور اس کی ابتدا اس فقرے سے ہوئی تھی:

میرے بھائیوں نے کبھی ابا کے سر اٹھا کر اور نہ کبھی سامنے بیٹھ کر بات کی۔ ان کا ہر حکم پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ اب یہی دیکھو کہ بمبئی میں بھائی جان تھے اور میری شادی ہونے والی تھی۔ بڑی کوٹھی دن رات بن رہی تھی۔ میاں بھائی اور بھابی جان آ چکے تھے اور ابا منجھلے بھائی (اپنے بھتیجے) کے پاس بنارس گئے ہوئے تھے، کہ ایک صبح ہمیں تار ملا کہ دلہن کو لے کر پہنچ رہے ہیں۔ اب سارا گھر اس معمے کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ کیسی دلہن؟ کس کی دلہن؟ آخر میاں بھائی نے بڑے اطمینان سے کہا، ''کچھ نہیں، معلوم ہوتا ہے بنارس میں سائرہ عابدہ کو دیکھ کر ان کی شادیوں کا خیال آ گیا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے رفیق کا نکاح کر دیا ہے۔'' (اور یہی ہوا تھا کہ دوسرے مرحوم بھتیجے کی لڑکی کو دیکھ بھتیجے سے سوال کیا، ''ارے میاں صادق حسین، تم نے سائرہ کی شادی نہیں کی؟'' انھوں نے جواب دیا، ''چچا، کوئی مناسب رشتہ ملے تو کروں۔'' یہ سن کر چپ چاپ باہر چلے گئے۔ بیٹے کو بمبئی تار دیا: فوراً پہنچو۔ وہ وہاں سے حیران پریشان پہنچے کہ نہ جانے ابا بنارس جا کر بیمار تو نہیں ہو گئے۔ وہاں قاضی تیار بیٹھا تھا۔ چنانچہ نکاح ہو گیا۔) چنانچہ اسی قیاس پر میاں بھائی نے فوراً رشتہ داروں کی فہرست تیار کروا کر مارا مار بلاوے تقسیم کروا دیے۔ ولیمے کے لیے فوراً جا کر نتا کو لے آئے، اور اللہ بندے کو بلا کر ولیمے کا کھانا تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔ دولھا دلہن کے لیے سہرے اور ہار پھول لے کر اسٹیشن پہنچ لیے۔ گھر کے باقی لوگ ابھی تک شش و پنج میں مبتلا تھے کہ دیکھا ابا بیٹے بہو کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ غرض ولیمہ اسی کروفر سے ہوا جیسا باقاعدہ شادی ہونے پر ہوتا۔

اب یہ تو سنی سنائی باتیں تھیں۔ میں نے تو ماموں جان کو کم ہی کم دیکھا تھا۔ وہ آتے تو سب بچوں کو دیوانہ بنا دیتے۔ لوگ تو یہی کہتے تھے، مگر وہ تو فقط اتنا کرتے تھے کہ سگریٹ کی پنیوں کے کپ بناتے تھے اور ہم سے کہتے، ''جاؤ گیلی مٹی لے کر آؤ۔'' پھر ان کپوں کی پیندیوں پر لگا کر نہ جانے کیوں کر اچھالتے کہ سیدھی چھت میں جا چپکتی۔ ہم ان کی دیکھا دیکھی اچھالتے تو مٹی چھت میں جا لگتی، کپ نیچے گر جاتا۔

پھر اماں فریاد کرتیں، ''بھائی دیکھو تو، ساری چھت کا ناس ہوا جا رہا ہے۔'' اور جب ہم یہاں آ

رہے تھے تو ہمارے گھر کی چھت سے متعدد کپ چپکے ہوئے الٹے لٹک رہے تھے اور ماموں جان کے انتقال کو دو برس ہو چکے تھے۔ اماں سفیدی کرنے والوں کو منع کر دیتی تھیں کہ چھت کو نہ چھیڑیں۔

وہ چھت سے چپکے ان کپوں کو دیکھتیں اور پھر ان کے افسانوں کا مجموعہ ''آئینۂ حیرت'' پڑھنے لگتیں۔ پڑھتے پڑھتے کتنی ہی بار اپنے آنسو سفید دوپٹے کے آنچل میں جذب کر لیا کرتیں۔

میں دل میں کڑھ سا جاتی۔ وہی ماموں جان جو بچپن میں اپنے پیسے بانٹ کر ان کے پیسے لے لیا کرتے تھے، اب ان کے افسانے ان کو اتنا رُلا رہے ہیں۔

وہ افسانے بھی تو ہمارے لیے ایک مصیبت تھے۔ جس دن وہ اپنے ہاتھ میں ناپختہ سی لکھائی میں لکھے کاغذ اٹھائے داخل ہوتے، ہم سمجھ جاتے کہ آج چپ شاہ کا روزہ رکھنا ہے۔

دونوں بہن بھائی افسانہ سننے اور سنانے کے عمل کو عبادت کا سا درجہ دیتے۔ اماں فوراً پان سروتے اور سلائی بنائی سے فارغ ہو کر اشاروں میں ہم کو اِدھر اُدھر ہو جانے کا حکم دیتیں اور دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر بیٹھ جاتیں۔ پھر وہ ایک ایک لفظ سنتیں۔ کہیں کہیں رک کر تبادلۂ خیال ہوتا، کوئی لفظ کاٹا جاتا اور کوئی لکھا جاتا۔ اس دن گھر میں کوا بھی نہ بول پاتا، فوراً اڑ جاتا۔

اور مجھے یاد ہے کہ جس دن وہ اپنا افسانہ ''آئینۂ حیرت'' لکھ کر لائے تھے، اس دن ممانی جان بھی ان کے ساتھ تھیں۔ چائے کا دور چلنے کے بعد مخصوص خاموشی طاری کروائی گئی تھی۔ اُس دن ان پر عجب عالم طاری تھا۔

اور میرے کانوں میں آج بھی وہ بھرائی ہوئی گونجیلی اور گمبھیر آواز گونج رہی ہے۔

''سن شیلا! سن فردوس بانو! سن اے عبدالحکیم سن! ٹک ٹک ٹک!''

یہاں پر آ کر ان کی آواز ٹوٹ گئی تھی۔ وہ رو رہے تھے، اماں کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ممانی جان پر ایک سناٹے کا عالم طاری تھا۔

وہ جب کبھی کہیں باہر سے آتے تو گھر میں گھستے ہی بی (میری بڑی بہن) کو آواز دیتے، ''امینہ!'' ان کو تصویریں بناتے، پینٹنگ کرتے دیکھ کر خود بھی منہمک ہو جاتے۔ پھر وہ ان کو طرح طرح کے شعر سناتیں اور وہ فرمائش کرتے، ''امینہ، اس شعر کو مصور کرو تو جانیں۔'' پھر وہ اس شعر کو تصویر

کے قالب میں ڈھالنے میں جٹ جاتیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے بی کو شیشے پر اپنے ہاتھ سے کی ہوئی پینٹنگ بھی دی تھی۔ اور میرے ذہن میں آج بھی شیشے اور رنگوں میں مقید وہ گلاب کا گچھا اور اس پر بیٹھی ہوئی تتلی محفوظ ہے اس لیے کہ وہ بہت زندہ گلاب تھے اور تتلی کے پر ہلتے محسوس ہوتے تھے۔ اس دن مجھے ان کے متعلق اماں کے کہے ہوئے سارے فخریہ جملوں اور فقروں کا یقین ہو گیا تھا۔ میں نے ان کو خاندان کی دو ہی لڑکیوں سے اس قدر ٹوٹ کر محبت کرتے دیکھا تھا، ایک اپنی بہن سے اور دوسری ان کی اپنی بیٹی سے۔ دونوں بیٹوں سے زیادہ وہ انھیں پیاری تھیں۔ ان کی افسانہ نگاری میں قمر باجی ایک سکریٹری کی حیثیت سے شریک تھیں۔ وہ بڑی خوشخط اور بجل ہستی تھیں۔ وہ ان دونوں سے برابر والوں کی طرح ہنسی مذاق کرتے تھے۔ ان تینوں میں اور ہماری اماں میں ایک زبردست جوک ''سٹے'' کے نام سے چلتا تھا۔ یعنی کسی حد سے زیادہ غلط اور لایعنی بات کو حقیقت کے اس پیرائے میں بیان کرو کہ یقین کرتے ہی بنے۔ پھر دیکھا یہ جاتا تھا کہ اس ہفتے میں کس نے کامیاب ترین سٹے دیے۔ جب ایک سٹہ پکڑ لیا جاتا تھا تو سٹہ دینے والے پر دو واجب ہو جاتے تھے۔

بی کی شادی کے بعد وہ ہمارے گھر آئے۔ آنگن میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اماں کی طرف شکایتاً دیکھ کر بولے تھے، ''ایک کام کی لڑکی تھی، وہ بھی نکال دی۔'' پھر غصے سے پیر پٹخے اور باہر گئے۔ پھر وہ مہینوں ہمارے گھر نہ آئے۔ مگر پھر ان کا ایک افسانہ ان کو لے آیا۔ اس لیے کہ افسانہ لکھ کر وہ اپنی بہن کو سنانا ضروری خیال کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اپنا افسانہ سنا کر بولے تھے، ''بہن، میں چاہتا ہوں کہ مسعود صاحب کو اپنا افسانہ سناؤں۔ مگر میرا ان کا تعارف نہیں۔''

''تعارف یہ کروا دے گی،'' اماں نے میری طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا کروائے گی!'' انھوں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور ویسے ہی بیٹھے رہے۔

''کروا دے گی۔ اس کی اور اُن کی بہت بنتی ہے۔''

''ارے بھئی، کیا باتیں کرتے ہیں وہ تم سے؟'' انھوں نے پوچھا۔

میں چپ بیٹھی رہی۔ مجھے آج بھی خیال نہیں کہ ہم کیا باتیں کرتے تھے۔ اور ماموں جان کو

جواب دینا میں نے یوں ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ مجھے گدھی کہا کرتے تھے اور اماں سے کہتے تھے کہ یہ تمھاری لڑکی نہایت چبلی اور سڑن ہے۔

اس مختصر سے راستے میں انھوں نے کئی بار پوچھا تھا:

''بھئی مسعود صاحب سے تمھاری کیا باتیں ہوتی ہیں؟''

اب میں کیا جواب دیتی۔ میں تو یہ سوچتی چلی جارہی تھی کہ آخر میں ان سے لے جا کر انھیں کیوں ملواؤں۔ مجھے یہ تک نہ معلوم تھا کہ افسانہ ہوتی کیا چیز ہے۔ اور اچھا، اگر لے جاؤں تو جا کر کیا کہوں گی، ''خالو جان، میرے ماموں جان ہیں۔''

یا یوں کہوں، ''یہ سید رفیق حسین جعفری ہیں، اور یہ سید مسعود حسن رضوی۔'' مگر بڑوں کے نام ان ہی کے منھ پر لینا تو عجیب سی حرکت ہے۔

اب یہ یاد نہیں کہ میں نے ان دونوں کو کیوں کر ملوایا تھا۔ بہر حال اتنا یاد ہے کہ میں ان کو مسعود صاحب اور سید علی عباس حسینی کے پاس بٹھا کر سرپٹ بھاگ آئی تھی۔

ماموں جان بڑے نازک مزاج، نفاست پسند اور غصیلے بھی تھے اور سچ مچ رحم دل بھی تھے۔ مجھے ان کے غصے اور رحم دلی کے دو واقعے یاد ہیں۔

ایک دفعہ کوئی دس بجے رات کو روہانسے چلے آرہے ہیں، اور ساتھ ایک مریل سا آدمی ٹوکرا سر پر لیے۔ آتے ہی اماں کی خوشامد کرنے لگے، ''اے بہن، انکار نہ کرنا۔ دس بجے رات کو سردی میں یہ ترکاری بیچتا پھر رہا ہے۔ اے بہن، بچوں کو کیا منھ دکھائے گا۔ تم اس کی ترکاری خرید لو۔ گھر لے جاؤں گا تو بیگم ناراض ہوں گی۔'' (وہ ان دنوں حسب عادت ملازمت چھوڑے ہوئے تھے۔) چنانچہ یہ ہوا کہ اس کے ٹوکرے کی وہ ساری سوکھی سڑی سبزی اماں نے خریدی۔

اور غصے کا عجیب و غریب رنگ وہ تھا جب ڈاکٹر جیالال ہمارے لیے میرٹھ سے تلوں کی سفید سفید مٹھائیاں اور ایسی ہی ایک اور عجیب سی چیز لائے تھے۔ اب جناب وہ کچے تلوں کی مٹھائیاں بیٹھے کھا رہے ہیں اور بُرے بُرے منھ بنا رہے ہیں۔ اماں نے کہا، ''اے بھائی نہ کھاؤ''

''کیسے نہ کھاؤں؟'' جھلا کر بولے ''وہ لایا جو ہے۔''

''تو بھائی، فرض ہے کوئی یہ کھانا؟''

اور بھی زیادہ غصے سے بولے،''جب وہ اتنا بد مذاق ہے اور اس چاؤ سے بھیجی ہیں تو میں بھی انتقاماً کھا رہا ہوں۔''

کہکشاں کے ان دودھیا راستوں پر چل کر میں نے ابھی ابھی یادوں کے انبار اور خزینے پائے ہیں۔لیکن اب میرا خیال ہے کہ میں ان کو مزید نہ چھیڑوں۔ یہ انسان کو چوندھیا دیتے ہیں اور اس پر یورش کر دیتے ہیں۔کاش کوئی یادوں کے دفینوں پر پرانے وقتوں کی طرح آٹے کے سانپ بٹھا دیا کرے جو دوروں دور سے چل کر آنے والوں کو انھیں چھیڑنے ہی نہ دے، ورنہ یوں بھی تو ہوسکتا ہے کہ فاصلے اپنی سیڑھیاں کھینچ لیں اور وقت اپنی پگڈنڈیوں کو سمیٹ لے، اور یوں بھی ہوسکتا ہے کہ انسان لوٹ کر وہاں نہ پہنچے جہاں وہ ہے۔

اب مجھے جلدی ہے اور عجلت سی محسوس ہورہی ہے۔تنہائی میرا ساتھ چھوڑ رہی ہے اور مجھے اپنا سفر جلد جلد طے کرنا ہے، جستیں اور چھلانگیں لگا کر۔ ورنہ وقت ساتھ چھوڑتا جائے گا اور باتیں بڑھتی جائیں گی۔

دو ماہ ہو گئے اور ہم گھر میں ایک بوڑھی خاتون کے ساتھ (جن کو اماں چچی کہا کرتی تھیں) اکیلے رہتے رہے تھے۔آٹھویں دسویں دن اماں آجاتیں، نہا دھو کر، تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس چلی جاتیں۔

ایک دن ہم نے ان کو روکا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔''مجھے نہ روکو! مجھے وہ صورت پھر نظر نہ آئے گی۔آجاؤں گی کچھ دن بعد۔'' وہ پھر چلی گئیں۔

ماموں جان کو کینسر ہو گیا تھا۔ان کی بیوی، بیٹی اور بہن نے ان کے نازک اور عجیب وغریب مزاج کے مطابق ان کی تیمارداری کی تھی۔

مثلاً یہی کہ بیماری کا ذکر نہ ہو۔کوئی خیریت ان کے منہ پر نہ پوچھے۔گھر اسی طرح صاف ستھرا رہے، اس کے روزمرہ میں فرق نہ آئے۔''اور کچھ نہیں تو تم سب میرے سامنے تاش کھیلتے رہو، اِدھر اُدھر کی باتیں کرو۔ کچھ نہیں تو تیرے میرے قصے ہی کرو۔'' کبھی کبھی ہم بھی وہاں جاتے اور ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔انھوں نے شیو کرنا چھوڑ دیا تھا۔چھوٹی چھوٹی سی سنہری ڈاڑھی میں وہ اور

بھی خوبصورت نظر آنے لگے تھے۔ ان کی پیشانی اتنی روشن ہو گئی تھی اور ایسی جھمکتی تھی کہ دیکھ کر اچھا لگتا تھا۔

اب وہ بچوں سے یہ فرمائش نہیں کرتے تھے کہ بھئی ہماری ٹانگوں میں نہ آنا، نہیں تو پھر ہم گلا گھونٹ دیں گے۔ (جب وہ لمبے لمبے قدم ڈال کر چلتے تو بچے ان کی ٹانگوں میں آجاتے تھے اور وہ سخت جھنجھلاتے تھے۔) پر اب تو وہ چپ چاپ لیٹے سڑک سے آنے والی آوازوں کو سنا کرتے۔ سرفراز پریس کی مشین کے ساتھ ساتھ ان کا دماغ کام کرتا اور سوتا جاگتا۔ ذرا مشین میں خرابی آئی اور وہ چونکے۔

''مشین بگڑ گئی۔'' پھر کہتے، ''اس پریس کی آواز غنیمت ہے، ورنہ مشین کے بغیر اتنے دن کیسے گذارتا۔''

ڈاکٹر اور اوپر والے ان سے ان کی بیماری چھپاتے رہے اور اپنے خیال میں بڑے کامیاب رہے۔ لیکن مرنے سے ایک ہفتہ پہلے، جب ان کی آواز صرف سرگوشیوں میں نکل سکتی تھی، انھوں نے بڑے آہستہ آہستہ بتایا۔

''مجھے بڑے شدید قسم کا کینسر ہے۔ تقریباً ایک سال پہلے مجھے کان پور میں ڈاکٹر صمد نے بتادیا تھا۔ یہ لاعلاج مرض تھا، پھر تم سب کو اتنے پہلے سے کیوں پریشان کرتا۔ آخر مدت بھی ہوتی ہے پریشانی کی۔'' رازداری کا اہتمام کرنے والوں کی یہ کتنی زبردست شکست تھی۔

انھیں اپنے افسانوں کے مجموعے کا شدید انتظار تھا جو چھپ رہا تھا۔ جس دن ان کو موت آئی اس دن پریس کی مشین خرابی کی وجہ سے بند تھی۔ جس کمرے میں بیٹھ کر وہ گھنٹوں نہیں دنوں کے حساب سے شطرنج اور برج اور کیرم کھیلا کرتے تھے، وہ لوگوں سے بھر گیا اور وہ اس قسم کی غلغل سے بہت گھبرایا کرتے تھے۔

اماں گھر واپس آگئیں، اور دس پندرہ دن کے بعد ''آئینۂ حیرت'' کی ایک جلد ممانی جان نے ان کے پاس بھیجی جو چھپ کر آگئی تھی۔ ظاہر ہے کیا ہوا ہوگا۔ ہاتھ میں لیے لیے کتاب کی ساری جلد ان کے آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔ اس تمام رات وہ اٹھ اٹھ کر پانی پیتی اور بار بار اپنے آنسو خشک

کرتی رہی تھیں۔ اب ہم انھیں منع تو نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کتاب جسے دیکھ کر وہ اتنا رو رہی تھیں اسی شخص کی لکھی ہوئی تو تھی جس کی ذات سے متعلق ایک طویل داستان ان کی کتابِ دل کے چپے چپے پر لکھی تھی اور جس کو وہ ایسے پیارے انداز میں کہ سننے والا بھی نہ تھکے، سناتے کبھی نہ تھکتی تھیں۔ وہ کہانی اب ختم ہو چکی تھی۔ مگر نہیں، ایسا تو نہیں ہوا تھا۔ خود اپنے مرنے سے کچھ دن پہلے تک وہ اسی لطف سے بیان کرتی تھیں۔ ان کا نواسا عمر جب شرارتیں کرتا اور طرح طرح کی حجتیں، مثلاً یہ کہ اصحاب کہف کا قصہ سن کر سخت بے چین ہوا کہ ''بھئی وہ تو بڑے کام کی چیز ہیں، ارے بھئی، ان کو تو جگانا چاہیے، وہ تو ہسٹری ہیں،'' تو ہنس کر کہتیں:

''شریر، کہاں تک نہ آتا نانا کا اثر! آخر ان کی اسی بھانجی کا بیٹا ہے جس سے ان کو اتنی محبت تھی۔ جب ہی تو ایسی دلیلیں کرتا ہے۔''

''کون سے نانا؟''

''ارے بھئی، ہمارے بھائی جان تھے۔ عثمان ماموں کو دیکھا ہے؟ ان کے ابا تھے۔''

پھر یوں ہوتا کہ ان کے اہلو پہلو دونوں نواسا نواسی ہوتے اور وقت کے طویل فاصلوں پر چلتی ہوئی وہ وہیں پہنچ جاتیں کہ جس کو آغازِ داستان کہتے ہیں۔ کیسے بن بسے کے جنگلوں میں وہ شیروں سے آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ شیر اتنے قریب آ گیا کہ اس کی گرم گرم سانس منھ پر لگی اور چونک کر دیکھا تو شیر تھا۔

ہاں، میں تو ''آئینۂ حیرت'' کی بات کر رہی تھی۔ گھر کے جھنجھٹوں سے فرصت پاتیں تو بار بار کے سنے افسانوں کو پھر پڑھتیں۔ پھر مسعود صاحب بار بار ''آئینۂ حیرت'' منگوا بھیجتے۔ ایک دن بھیا[1] نے اماں سے کہا، ''خالہ جان، ابا کہتے ہیں، بہن سے کہنا یہ کتاب ہم واپس نہیں دیں گے۔'' پھر وہ کہنے لگا، ''وہ کہتے ہیں یہ تو صحیفۂ آسمانی ہے۔''

کچھ دن گذرے اور ہم پاکستان آ گئے۔

''پاکستان کو ان تھک کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اس کے وسائل تصرف میں لانے

---

[1] سید مسعود حسن رضوی ادیب کے صاحب زادے سید اختر مسعود رضوی۔

والے ہاتھوں کے منتظر ہیں۔" یہ صلائے عام سن کر میری ماں پھوٹ کر روئی تھیں۔ وہ ہاتھ تو کھوئے گئے۔ جناتوں کی طرح ان تھک کام کرنے والے کو کس قدر جلد موت آ گئی۔ افراتفری اور کام کا غلبہ میرے بھائیوں کی، خصوصاً بھائی جان کی زندگی تھی۔ تین تین دن بغیر کھائے پیے اور سوئے کام کرنے والا وہ شخص نالاں رہتا تھا، "اے بہن، کام نہیں ہے یہاں۔ اے بہن، غلامی میں کوئی اسکوپ نہیں ہوتا۔ میں تو یہاں جکڑا ہوا ہوں۔ مجھے تو محسوس ہوتا ہے میں جکڑا ہوا ہوں۔ رواں رواں بندھ رہا ہے۔ اے بہن، مجھے تو ایک انقلاب کا انتظار ہے۔" پھر وہ جھنجھلاتے۔ "مگر ہمارے یہ لیڈر رنکس رنکس کام کرنا چاہتے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں، مذاکرات ہو رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے کسی ایسی سرزمین کو بھاگ جاؤں جو آزاد ہو اور میری۔ جہاں... یہاں سے وہاں تک..." پھر وہ پیر پٹختے ہوئے باہر نکل جاتے۔ شکر کی کمی ہوئی تو پھر ایک بار تڑپ کر کہا:

"ان سے کہو رفیق حسین کو ڈھونڈ لائیں جسے ناممکنات کو ممکن بنا دینے کا سودا تھا۔ جس نے راجپوتانہ کی ریتیلی زمین پر شوگر فیکٹری کھڑی کروا دی تھی۔ خدا جانتا ہے، لاابالی انداز میں رنکس رنکس کام کرنے والوں کو وہ شخص جھنجھوڑیاں دیتا تھا۔ افسر ماتحت کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ بس کام! کام! اور چائے! چائے! بس اس کی دو ہی مانگیں تھیں۔ مشرف جب پکڑوا کر گھر بلواتیں تو ان ہی کپڑوں اور جوتوں سمیت پلنگ پر گر کر سو جاتا۔ مشین کی گت اور تال پر اس کا دماغ سوتا اور جاگتا تھا۔ ذرا مشین بگڑی اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ غضب ہو گیا۔ فلاں پرزہ خراب ہو گیا ہے۔ کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ ایک معمار پتھر میں شاعری کیوں کر کرتا ہے اور کام کو فن کیوں کر بنا دیتا ہے تو کوئی جا کر ساردا کینال دیکھے جو میرے بھائیوں کے کام کا ثبوت ہے۔ لیکن کام تو کسی کے بغیر رکے نہیں رہے۔"

چند سال ہوئے ممانی جان لاہور آئیں تو انھوں نے کہا، "اے بیٹا، ہمیں شالامار تو دکھا دو۔"

شالامار کو انھوں نے جس انداز سے دیکھا میں حیران رہ گئی۔ ایک ایک پتھر، ایک ایک جوڑ کو دیکھا، جالیوں کی تراش خراش، بارہ دری اور نہر کے ہر ہر زاویے کی فنکارانہ درستگی کو سمجھا، پہچانا، اور اس میں کھو کھو گئیں۔ کبھی وہ چلتے چلتے رک جاتیں، کھڑے ہو کر سوچتیں اور پھر بڑی گمبھیر آواز میں کہتیں:

"اللہ اللہ! وقت بھی کیا شے ہے! ارے آج یہاں یوں دڑانہ وار گھوم رہے ہیں۔ اے بیٹا،

اس وقت تو ہماری مکھیاں بھی نہ پہنچ پاتیں۔'' یہاں پھر وہ مودب اور متاثریوں آگے بڑھتیں جیسے عالم پناہ یہیں کہیں سامنے موجود ہوں، اور ان کے قدموں تلے ایک نئی راہ گذر آجاتی۔ وہ اس پر چل کر مغلیہ جشنوں، شاہزادیوں اور شاہزادوں کے ہجوم میں گم ہو جاتیں۔ اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر ان کو کھڑا دیکھ کر اور ان کی آواز کو سن کر بھی مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان روشوں پر یہاں تنہا کھڑی ہوں، اور وہ مجھ سے بہت دور وقت کی راہ گذار پر گرم سفر ہیں۔

''بھئی، آپ کو تو شالا مار دکھا کر دل خوش ہو گیا۔ بس ایسے ہی انسان کو ایسی جگہوں پر آنا چاہیے،'' میں نے کہا۔ ''یہ کیا کہ تو میں چلا آ رہا ہے، پلنکیں منانے، آموں کی بالٹیاں اٹھائے، ٹرانز سٹر لٹکائے۔''

تو پھر روش کے سبزے پر ان کے قدم ٹھٹکے۔ ''ارے ہم کیا بیٹا! یہ سب اُس شخص کا صدقہ ہے۔ بیٹا، تمھارے ماموں نے ہمیں باقاعدہ تربیت دی تھی۔ تاج محل، لال قلعہ، چتوڑ گڑھ کے قلعے، اجمیر اور راجپوتانہ کے کھنڈر اور مندر، جو بھی دکھایا اس کی اینٹ اینٹ سے واقف کروا دیا اور اسی زمانے کو لا کر سامنے کھڑا کر دیا۔ برجی برجی میں لے گیا۔ ہر ہر جگہ کے وہ وہ منظر بیان کیے کہ بیٹا، ہم تو بیان بھی نہیں کر سکتے۔ میں تمھیں بتاؤں، وہ شخص تو ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ ڈالتا تھا: اے بیگم، غور سے دیکھو! ہر چیز تمھارے سر پر گذر رہی ہے۔ ارے اپنے اندر لے جاؤ ان کو، اے بیگم ان میں ڈوب کر دیکھو۔ اے بیٹا ہم شل ہو جاتے تھے ان کے ساتھ ایسے مقامات دیکھ کر۔'' پھر انھوں نے میری بانہہ پکڑ لی۔

''سنا بیٹا تم نے، تمھارا ماموں عجیب وغریب تھا۔ وہ مشینوں سے کھیلتا تھا۔ تاریخ و ادب پڑھتا، فلسفہ گھونٹتا تھا۔ بچوں کی طرح ذرا سی بات پر خوش ہوتا اور رو دیتا۔ اس کا دل موم کا بنا ہوا تھا۔ ارے، ہم کہتے ہیں تم کبھی لکھونا اس پر۔''

پھر آہستہ آہستہ ہمارے قدم اس باؤلی کی طرف مڑے جو شالا مار کے ایک حصے میں رنجیت سنگھ نے بنوائی تھی۔ اس کو دیکھ کر وہ سخت برہم ہوئیں اور انھوں نے اپنے مخصوص لکھنوی لہجے میں اعتراض کیا۔

''اے بیٹا، پانی کا یہ سارا انتظام ناقص تھا جو وہ بڈھا یہ باؤلی بنا کر بیٹھا تھا؟''

پھر اچانک ہی وہ فکر مند ہو گئیں۔ ''تمھارے ماموں جب لاہور آئے تھے تو انھوں نے ضرور

شالامار دیکھا ہوگا۔ اور یہ باؤلی دیکھ کران پر کیا گذری ہوگی۔ موڈ آف ہوگیا ہوگا۔''

میں نے نظر اٹھا کر ایک بار پھر شالامار کی طرف دیکھا تھا۔ واقعی شالامار کیا ہے پانی کا دلکش اور حسین ترین انتظام یا پیچ وخم۔

اوراب کہکشاں نے اپنی دودھیا پگڈنڈیاں میرے تھکے ہوئے قدموں تلے سے سرکالی ہیں۔ اجالے مجھے آواز دے رہے ہیں۔ اندھیرے فاصلوں پر جھلملاتے دیپ روشنیوں میں گم ہو رہے ہیں۔ میری کھڑکی پر پھیلی ہوئی انگور کی بیل میں خزاں کے رنگ جھلملا رہے ہیں، اتنے بے شمار رنگ کہ جو بیان میں نہ آئیں۔

وقت کی گذران سے بے نیاز گرجا کے گھنٹے بج اٹھے ہیں، اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ پکار رہے ہوں: ''سن شیلا! سن فردوس بانو! اے عبدالحکیم۔ سن! اٹک ٹک ٹک!''

اوراب میں اپنے مقام پر موجود ہوں۔ میرے اندر پت جھڑ شروع ہوگئی ہے۔ اور خزاں کے البیلے رنگ دھیرے دھیرے فضا میں برس رہے ہیں۔

فضل قدیر

گلِ صحرا

سید رفیق حسین مرحوم کا نام قارئین کی اس نسل کے لیے جو اَب ادھیڑ ہو چکی ہے جانا پہچانا ہے، لیکن وہ جواں سال ادیب اور پڑھنے والے، جنھوں نے اِس سرزمین میں ہوش سنبھالا ہے، ان کے نام سے ناآشنا ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رفیق حسین مرحوم کی نگارشات کو شایانِ شان اشاعت کے سامان کبھی فراہم نہ ہو سکے۔

آزادیٔ وطن سے صرف چند سال قبل کی بات ہے کہ ستے ہوے چہرے، الجھے بالوں، گہری گہری تھکی ہوئی نگاہوں والا کھویا کھویا ایک افسردہ خاطر جوان بوڑھا راجپوتانہ کی بھوبھل میں لوٹتے لوٹتے ادب کے سبزہ زار میں آن گھسا۔ گرانڈیل ادیبوں نے اس نووارد کی طرف سے تمکنت سے آنکھیں پھیر لیں۔ خود نووارد کو بھی مدت تک یہی گمان رہا کہ یہ سبزہ زار نہیں سراب ہے۔ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ اور خواب زیادہ تر واہمہ ہی ہوتے ہیں، ان کا اعتبار کیا... لیکن پھر ریت کے وسیع سمندر میں دھیرے دھیرے تموج پیدا ہوا۔ جب بات دائرۂ خاص سے ہٹ کر عوام کے ہونٹوں پر آ جائے تو سمجھیے کوٹھوں چڑھ جاتی ہے اور اس کے آگے پھر کوئی ٹھہرتا نہیں۔

راجپوتانہ کے ریگزار سے بھوسلے کاغذوں کا وہ میلا سا پلندہ جو حسنِ تقدیر سے ردّی کی ٹوکری کی نذر ہوتے ہوتے جب رسالہ ''ساقی'' کے افق پر ''کفارہ'' کے عنوان سے طلوع ہوا تو گدڑی کے لعل کی طرح چمک اٹھا۔ ہر طرف سے مکرّر مکرّر کی صدائیں بلند ہونی شروع ہو گئیں اور ہر عمر اور ہر

خیال کے پڑھنے والوں کا تقاضا تھا کہ ان صاحب سے کہیے کہ اور لکھیں۔ واہ کیا بات ہے!

ادب کے گرانڈیل چودھریوں نے اپنی عینکوں کے شیشے صاف کیے اور واقعی نو وارد کو غور سے دیکھا۔ اور نو وارد نے شوگر مل کی کھٹ کھٹ دھڑ دھڑ کے شور میں پلاس اور پیچ کش کے ساتھ ساتھ قلم بھی پکڑنا شروع کر دیا۔ جو کچھ لکھا وہ ہاتھوں ہاتھ گیا اور ان کی جانب سے مزید کا نعرہ گونجتا رہا۔

سید رفیق حسین سوز و ساز کا ایک جیتا جاگتا مرقع تھے۔ وہ وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے اور کرمکِ شب تاب کی طرح جودتِ تخلیق کی آتشیں لو میں سلگ کر خاکستر ہو گئے۔ فنکار ہونے کا یہی کفارہ تھا۔

سید رفیق حسین نے لکھنؤ کے محلے شاہ گنج میں آج سے نصف صدی قبل آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد، خان بہادر سید جعفر حسین موسوی، محکمۂ انہار کے چیف انجینئر تھے۔ یہ صوبۂ متحدہ کے پہلے مسلمان تھے جس نے رُڑکی سے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ رفیق حسین کے دادا، سید محسن علی محسن، ایک پرگو شاعر، اہل دل صوفی، اور قلندر منش انسان تھے۔ مشہور تذکرہ ''سراپا سخن'' ان کی تصنیف ہے۔ سید صاحب کے پردادا سید حسین شاہ حقیقت بھی ایک مقتدر عالم اور ماہر علوم السنہ تھے۔ سادات کا یہ گھرانہ عہد فرخ سیر میں بلخ سے ہندوستان آیا تھا، اور ان کے مورث اعلیٰ سید امیر کلالؒ تھے جن کا شمار صوفیائے کبار میں ہوتا ہے۔ سید رفیق حسین مرحوم کو ان باتوں کو قطعی علم نہیں تھا، اور یہ ان کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ وہ ایک خودرو صحرائی پھول کی طرح رہے۔ جس پر تکلف تصنع کا کوئی ملمع تھا نہ خاندانی تفاخر کا کوئی خول۔

سید رفیق حسین مرحوم کا جو نقش میرے ذہن پر مرتسم ہے وہ انتہائی دھندلا ہو چکا ہے۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ لکھنؤ کے محلے بلوچ پورے میں ایک تہ خانے والا مکان تھا۔ یہ میری بڑی خالہ سیدہ آفاق بیگم کا گھر تھا اور اس سے ملے ملے بہت سے عزیزوں کے گھروندے تھے جو مختصر کھڑکیوں اور دروازوں سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ یہیں میں نے پہلی بار سید رفیق حسین مرحوم کو دیکھا۔

مجھے بتایا گیا کہ دیکھو یہ تمھارے ماموں جان ہیں... مگر وہ جو میرا ماموں جان تھا، کچھ عجیب سا آدمی نکلا۔ اسے مجھ پر توجہ دینے کا ہوش نہ تھا۔ چھڑ جیسا لمبا قد، ستا ہوا گورا بھبوک چہرہ اور پے کے

جھونجھ کی طرح الجھے ہوئے لمبے لمبے بھورے بال، بڑھے ہوئے ناخن اور میلی بنیان۔ مضطرب اور بے چین آنکھیں اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے وہ بیڑی کے لمبے لمبے کش لے کر انجن کی طرح دھواں اڑا رہے تھے۔ بیڑی کے تیز دھویں نے چراندسی فضا میں پیدا کر دی تھی۔

سید رفیق حسین کی دوسری جھلک کچھ عرصے بعد پھر اسی گھر میں دیکھی۔ بڑی بوڑھیوں کو کہتے سنا، ''لو وہ باؤلے آگئے ہیں۔ سارا دن ہو گیا ہے اور کمرے میں بند، تصویریں بن رہی ہیں۔''

شام ڈھلنے پر کسی لڑکی نے بند کمرے کے دروازے دھڑ دھڑانا شروع کیے، مگر دروازے نہیں کھلے۔ اگلے دن دوپہر کے قریب جب کمرے کے دروازے کھلے تو الجھے ہوئے بھورے بالوں والا ایک انسان کمرے سے نکلا اور برآمدے میں گر پڑا۔ سارے گھر میں ہلچل مچ گئی... کسی نے ٹانگیں دبانا شروع کیں، کسی نے سر جھنجھوڑا۔ تھوڑی دیر میں ہوش آیا تو انھوں نے کراہنا شروع کر دیا۔ اور کچھ بوڑھی عورتوں نے ان پر سخت ملامت شروع کر دی۔ ''خاک پڑے اس تصویر پر!''

ہم بچے جب دوڑ کر کمرے کے اندر گھسے تو سامنے ایک بہت بڑے تختے پر ایک تصویر نظر آئی۔ یہ ایک گھنے جنگل کی تصویر تھی جس میں بارہ سنگھے گھاس چر رہے تھے۔ سامنے مٹی کی پیالیوں میں کپڑے رنگنے کے رنگ اور بیسویں چیتھڑے پڑے ہوئے تھے۔ اب پتا چلا کہ آپ سارا دن ساری رات تصویر بنانے میں منہمک رہے تھے اور اس مشقت نے اب پلنگ نشین کر دیا تھا۔

تیسری بار انھیں اپنے گھر واقع دین دیال روڈ پر دیکھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی آپ نے میری چھوٹی بہن سے جو پہاڑے یاد کر رہی تھی، پوچھا، ''کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کہا، ''پہاڑا یاد کر رہی ہوں۔'' آپ نے کہا، ''تمھیں معلوم ہے پہاڑا کسے کہتے ہیں؟'' اس نے حیران ہو کر کہا، ''پہاڑا تو میں یاد کر رہی ہوں۔'' آپ نے جھٹ پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھالی اور کمر ٹیڑھی کر کے لکڑی کے سہارے چلنا شرع کر دیا اور پھر لکڑی ہوا میں لہرا کر بولے، ''یہ ہے پہاڑا۔ اس کی مدد سے کھٹ کھٹ پہاڑ پر چڑھا جاتا ہے۔''

پھر چوتھی بار انھیں علی گڑھ میں اپنی ایک خالہ کے یہاں دیکھا۔ یہاں ایک بندر پلا ہوا تھا۔ آپ اس کے سامنے بیٹھے اسے منہ چڑا رہے تھے، اور بچے ان کے گرد گھیرا ڈال کر ہنس رہے تھے۔

علی گڑھ والی ملاقات کے بعد انھیں دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کے مواقع ذرا جلد جلد آنے لگے۔ یہ ہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے جانوروں کی کہانیاں لکھنے کا شغل اپنا لیا تھا اور رسالہ ''ساقی'' میں ان کے افسانے باقاعدگی سے شائع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ وقت کے اس موڑ پر میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور ان کے متعلق والدہ سے بہت کچھ کریدنے لگا تھا۔

میرے کانوں میں ان کی شخصیت کے متعلق طرح طرح کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ ہر شخص اس بات پر متفق تھا کہ یہ نہایت نیک آدمی ہے، پر بس ایک مرض بہت برا ہے، اور وہ ہے استعفیٰ۔ ہر چوتھے مہینے اگر استعفیٰ نہ دے تو بہت بڑا آدمی ہو سکتا ہے۔

بڑی بوڑھیوں کو کہتے سنا کہ ''رفیق کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے۔ ذرا سی بات پر انگریز افسر کو تھپڑ مار دیا۔ اب بھلا ان کو نکوں سے نوکری رہ سکتی ہے بھلا!''

رفتہ رفتہ عمر کی منزلوں کے ساتھ میں ان سے زیادہ قریبی رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کے افسانوں کو کئی بار پڑھا۔ کچھ ان سے سمجھنے کی کوشش کی اور کچھ خود سمجھا۔

پہلی بات تو یہ سمجھ میں آئی کہ یہ شخص نوکریاں چھوڑنے کا شوقین نہیں ہے اور نہ اہلِ خاندان سے لاپرواہ ہے۔ بلکہ یہ شخص جنون کی حد تک ایمانداری کے مرض میں مبتلا ہے اور اس کی دیانت ہی اس کی ناکامی کی وجہ ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ شخص بنیادی طور پر متصوفانہ خیالات کا حامل ہے، کائنات پر غور کرنے کا عادی ہے، طبیعت میں بے چینی اور تجسس ہے، جودت تخلیق کا شعلہ سا اندر لپکتا رہتا ہے جو کل سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ شخص جو بندروں کو منھ چڑانے اور بچوں کو چرا کر امرود توڑنے کے گر بتانے کا ماہر تھا، سچا دیندار اور خدا پرست بھی تھا۔ میں نے ایک بار انھیں اپنے حج کا احوال بتاتے ہوئے رقت سے روتے بھی دیکھا ہے۔ سید صاحب نے ابتدائے جوانی میں ایک جہاز پر ملازمت کر لی تھی۔ یہ جہاز جب جدہ پر لنگر انداز ہوا تو پتا چلا کہ حج کا زمانہ ہے، چنانچہ آپ جہاز سے کود حاجیوں کی صف میں داخل ہو گئے۔ مدینہ کی زیارت کا احوال بڑے رقت انگیز الفاظ میں سنایا کرتے تھے۔

سید صاحب زندگی بھر حالتِ سفر میں رہے۔ کبھی روح کی نا آسودہ تمناؤں کی اذیت میں گرفتار، کبھی عرفان والہام کی برق کا شکار۔ شعلۂ تخلیق ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ روح اظہار کے لیے تڑپتی تھی۔ تصویر کشی کی کیفیتیں اس کی واضح مثال ہیں۔ اللہ بخشے، انسان گزیدہ تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے جانور انسانوں سے زیادہ انسان ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے، انسان بڑا خوفناک جانور ہے۔ یہ لیگ آف نیشنز، یہ امن و آشتی کے آدرش، سب ڈھکوسلے ہیں۔ وہ جانوروں کی معصومیت سے بہت زیادہ متاثر تھے اور انھیں مشیت کے ان گھڑ کھلونے تصور کرتے تھے جو انجانے انداز میں حیات کا کفارہ بڑی مسکینی سے ادا کرتے ہیں۔ اور پھر ایک دن خبر آئی کہ ماموں جان مر گئے ہیں، اور مجھے آج تک یقین نہیں آیا کہ ''کفارہ''، ''کلوا''، ''ہیرو''، ''گوری ہو گوری'' جیسے افسانے لکھنے والا کیسے مر سکتا ہے؟

سید مختار اکبر

سید صاحب

چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا قد۔ گورا رنگ جو دھوپ میں بہت زیادہ گھومنے کی وجہ سے تپے ہوئے تانبے جیسا ہو گیا تھا۔ اونچی پیشانی۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ کھڑی ناک۔ کھرے بال جس کی وجہ گھن نہ تھا بلکہ قینچی سے بے اعتنائی۔ بلا کے دبلے، بس یوں سمجھیے کہ ہڈیوں پر کھال منڈھی ہوئی تھی۔ مگر چوں کہ ہڈی چوڑی تھی اس لیے دبلا پا نمایاں نہ تھا، اور اچھے خاصے رعب دار انسان معلوم ہوتے تھے۔ تنہائی پسند تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر محفل و مجمع سے گھبراتے تھے۔ طبیعت میں جلد بازی اس قدر تھی کہ دل میں کسی خیال کے آتے ہی اس پر فوری عمل ضروری تھا۔ اسی طریق کار پر نہ صرف خود عامل تھے بلکہ دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ نتیجے میں جب اس کے خلاف ہوتا تو ناراض ہو جاتے۔ جلد بازی کی یہی عادت زندگی میں ان کی ناکامی کی وجہ تھی۔ ویسے بڑے خوش مزاج اور مرنجاں مرنج انسان تھے، مگر غصہ جب آتا تو خدا کی پناہ! چھوٹے اور برابر والے ہی نہیں، بڑے بھی تھرا جاتے تھے۔ مگر چوں کہ دل کے برے نہ تھے اس لیے جتنی جلدی غصہ آتا تھا اتنی ہی جلدی رخصت بھی ہو جاتا — بالکل سوڈے کی بوتل کے جھاگ کی طرح، کہ جب ابلنے پر آئے تو کارک کو اڑا دے اور جب جھاگ بیٹھ جائیں تو بے ضرر پانی۔ غرض یہ تھے سید رفیق حسین مرحوم، جو دوستوں اور ملنے والوں میں صرف سید صاحب کے نام سے مشہور تھے۔

اس مضمون کے مصنف سید مختار اکبر رفیق حسین مرحوم کے داماد ہیں۔

بچہ ہی تھے کہ ماں کی شفقت ومحبت سے محروم ہو گئے۔ ان کی والدہ کے انتقال کے چند سال بعد باپ نے دوسری شادی کر لی۔ ان حالات نے سید صاحب کے مزاج وکردار پر جو اثر چھوڑا وہ بہت گہرا تھا اور اس کی جھلکیاں ان کی تحریر میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار جیتے جاگتے انسان ہیں، یعنی وہ لوگ جن سے ان کا ذاتی تعلق تھا، اور جن میں انھوں نے اپنی ذات کو بھی شامل کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ کہیں کہیں اس کا اظہار غیر شعوری طور پر بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ان کے مشہور افسانے ''کلوا'' میں ننھے منّن کا جو کیریکٹر پیش کیا گیا ہے اس میں ان کی اپنی ذات شامل ہے۔

بچپن ہی میں وہ ماں کی شفقت ومحبت سے محروم ہو گئے تھے لیکن ان کا دل تمام عمر اس کا متلاشی رہا اور منّن کے کردار میں ماں کی جس ممتا اور بے جا چاہت کو انھوں نے اجاگر کیا ہے وہ ان کے ذہن میں ان کی ماں کی محبت کے مٹتے ہوئے نقوش تھے۔ ان کی والدہ میری نانی تھیں اور ان کا انتقال میری پیدائش سے قبل ہو چکا تھا۔ اپنی والدہ مرحومہ سے میں نے جو اُن کی صفات سنی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت محبت کرنے والی اور رقیق القلب خاتون تھیں۔ ان کی چھوٹی بہنوں کو البتہ میں نے دیکھا تھا۔ سب میں اولاد کے لیے بے پناہ جذبۂ محبت تھا جسے صحیح الفاظ میں بے جا لاڈ کہا جا سکتا ہے۔ یقیناً وہی جذبہ سید صاحب کی والدہ کی فطرت میں بھی کار فرما ہو گا۔ چنانچہ منّن کی ماں کی غیر معمولی محبت و بے جا لاڈ کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب کے ذہن میں لاشعوری طور پر اپنی ماں کا تصور سما گیا جو انھوں نے جوں کا توں رقم کر دیا۔ اسی مفروضے کی تصدیق ایک اور واقعے سے بھی ہوتی ہے جو میں نے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے ایک سے زائد بار سنا ہے۔ ہوا یوں کہ سید صاحب کی عمر شاید چار سال کی تھی، دوسرے بہن بھائی چوں کہ ان سے بڑے بلکہ کافی بڑے تھے اس لیے یہ اکیلے کھیلتے اور نت نئی شرارتیں کرتے پھرتے تھے۔ شرارتوں سے عاجز آ کر ان کی والدہ نے شاید سوچا ہو گا کہ ان کو پڑھنے بٹھا دیا جائے تو کچھ دیر تو گھر میں امن رہے گا۔ ابھی پڑھنے کی عمر تو تھی نہیں جو مولوی یا ماسٹر باقاعدہ مقرر کیے جاتے۔ پھر عورت کی فطری کفایت شعاری۔ دروازے پر سید صاحب کے والد کے اردلیوں میں سے ایک بڑے میاں تمام دن پہرے پر مامور تھے۔ پہرہ چوکی کا تو نام ہی تھا، بس یوں سمجھیے کہ بیٹھے رہتے تھے۔ بڑے میاں دین دار آدمی تھے اور قرآن شریف پڑھے ہوئے، اس لیے بیشتر وقت

ڈیوڑھی پر بیٹھے تلاوت کلام پاک کرتے رہتے۔ سید صاحب کی والدہ نے ان بیہ کو ہدایت کی کہ گھنٹہ دو گھنٹہ سید صاحب کو پڑھا دیا کریں۔ چنانچہ اس زمانے کے دستور کے مطابق بڑے میاں نے ان کو قاعدۂ بغدادی شروع کرادیا۔ الف سے دال تک تو یہ بڑے میاں کے ساتھ ٹھیک پڑھتے رہے مگر جب بڑے میاں نے کہا، ''کہو ذال،'' تو سید صاحب نے کہا، ''دال کے ساتھ چاول ہوتے ہیں، ذال نہیں۔'' بڑے میاں غریب کی حیثیت اتالیق یا استاد کی تو تھی نہیں جو ڈانٹتے یا تنبیہ کرتے، اس لیے بہت سمجھایا، مگر یہ حضرت اس پر مصر رہے کہ دال کے ساتھ چاول ہوتے ہیں۔ تھک کر بڑے میاں نے ان کی والدہ سے شکایت کی۔ مقصد چوں کہ تعلیم نہیں صرف شرارت سے باز رکھنا تھا، اس لیے ان کی والدہ نے فرمایا کہ ''بڑے میاں، رہنے ہی دو۔ ابھی بچہ ہے، جب بڑا ہوگا تو خود ٹھیک پڑھنے لگے گا۔'' سید صاحب کو بھی عمر کے لحاظ سے اس بحث میں دلچسپی پیدا ہوگئی، اس لیے روزانہ ناشتے سے فارغ ہوکر قاعدہ لے بڑے میاں کے پاس پہنچ جاتے۔ پڑھائی کم اور دال چاول کی بحث زیادہ ہوتی۔ چند ہی روز بعد ایک دن ان کے والد دفتر سے قبل از وقت گھر آئے تو صاحبزادے کو بنا پتی استاد سے دال چاول کی بحث میں مصروف پایا۔ بڑے میاں سے دریافت کرنے پر حال معلوم ہوا تو اندر جاکر بیوی کو تاکید کی کہ آئندہ لڑکے کو بڑے میاں سے تعلیم نہ دلائیں، بلکہ پڑھانا ہی ہے تو مولوی کا معقول انتظام کریں۔ اس واقعے سے سید صاحب کے ذہن کی جدت اور ان کی والدہ کی غیر معمولی محبت آشکارا ہیں۔

منن کے کردار میں ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے اور وہ اس کا اسکول سے بھاگنا ہے۔ یہاں بھی، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، سید صاحب لاشعوری طور پر آپ بیتی بیان کر گئے ہیں۔ یقین سے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اسکول سے بھاگا کرتے تھے مگر گمان غالب یہی ہے، کیوں کہ ہمہ آسائشوں، مواقع اور باپ کی انتہائی کوشش کے باوجود سید صاحب نے کوئی اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کی۔ ان کے والد نے مقامی مدارس کے علاوہ ان کو ہندوستان کی مشہور قومی درسگاہوں، یعنی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ اور سابق ایم اے او کالج حال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، میں بھی تعلیم کے مواقع فراہم کیے مگر انھوں نے ان مواقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ ان کے والد ماجد ہر دو ادارات تعلیمی کی مجالس منتظمہ کے رکن تھے،

اس لیے ان کو وہاں تعلیم میں کس قدر آسانیاں حاصل تھیں ظاہر ہے۔ علی گڑھ کے دوران قیام میں ریاضی کے مشہور عالم پروفیسر چکرورتی نہ صرف ان کے استاد بلکہ اتالیق خصوصی تھے۔ لیکن ان تمام سہولتوں کے باوجود انھوں نے میٹرک سے آگے تعلیم نہ حاصل کی بلکہ میٹرک بھی کئی سال کی جدوجہد میں پاس کیا تھا۔

ان معلومات کے پس منظر میں گمان یہی ہوتا ہے کہ سید صاحب کو اسکول اور تعلیم سے دلچسپی برائے نام ہی تھی، اور ہوسکتا ہے کہ وہ اکثر اسکول سے غائب بھی رہے ہوں۔ میٹرک کے بعد تو انھوں نے اسکول سے قطعی چھٹکارا حاصل کرلیا اور کئی سال یوں ہی اِدھر اُدھر گذار دیے، جس کی وجہ سے ان کے والد ان سے سخت ناراض ہوگئے، بلکہ ان کی لاابالی طبیعت اور ان کی زندگی کے ہر شعبے میں لاپروائی برتنے کی وجہ سے وہ ان سے ہمیشہ خفا رہے۔ غالباً اسی دورِ بے فکری میں سید صاحب کو شکار سے دلچسپی پیدا ہوگئی جس کے چند اور محرکات بھی تھے، جن کا ذکر آگے آئے گا۔ وہ ان ایام میں بیشتر وقت اپنی بڑی بہنوں کے ساتھ رہے تھے۔ جو ایک دن گھر سے غائب ہوئے تو عرصے تک لاپتا رہے۔ بہت دن بعد پتا چلا کہ بمبئی میں ہیں۔ بمبئی پہنچ کر سید صاحب نے کچھ تجارت کی کوشش کی، مگر نہ سرمایہ پاس، نہ اس لق ودق شہر میں کوئی یار و مددگار۔ پھر پتا چلا کہ وکٹوریہ جوبلی ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ اس وقت وہاں تین سال کا کورس تھا جو انھوں نے جوں توں کر کے پورا کیا اور مکینکل انجینئر کا ڈپلوما حاصل کرلیا، اور سند یافتہ انجینئر بن گئے۔ بمبئی میں انھوں نے جن لکھ پتی تاجروں کو دیکھا تھا اور دیکھنے سے زیادہ جن کے افسانے سنے تھے، اس نے ان کے دل پر تجارت کی ایک لگن ضرور پیدا کردی تھی جس پر وہ وقتاً فوقتاً عامل ہوجایا کرتے تھے اور جب پس اندوختہ ٹھکانے لگ جاتا تو پھر ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ میری یاد میں ایسے دورے کئی بار پڑے۔ سید صاحب کو مکینکس سے ضرور فطری لگاؤ ہوگا کیوں کہ انھوں نے انجینئرنگ کا صرف ڈپلوما نہیں حاصل کیا تھا بلکہ اپنے کام میں مہارت رکھتے تھے اور اسی کی بنا پر وہ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز کے ایسوسی ایٹ ممبر بھی بنا دیے گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ رزق کو لات مارو تو رزق اڑ جاتا ہے، مگر سید صاحب کے ساتھ کمال یہ تھا کہ لگی روزی پر دھڑ سے لات مارتے اور دوسری ملازمت جیسے ان کے

انتظار میں کھڑی ہوتی تھی۔ میں نے آج تک کسی کو اتنی بار نوکری چھوڑتے اور نئی ملازمت کرتے نہیں دیکھا ہے۔

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں سرکاری ملازمت سے دستبردار ہو کر اسی تجارت کی لگن میں انھوں نے کھنڈ ساری شکر کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا جس میں نہ صرف تمام اندوختہ لگا دیا بلکہ بیوی اور بیٹی کے پاس تار چھلا تک نہ چھوڑا تھا۔ جب وہ بھی ناکافی ہوا تو جس قدر قرض مل سکتا تھا لیا۔ پھر بھی سرمائے کی کمی رہی تو ایک بنیے کے ہاتھ کارخانہ مکفول کر دیا۔ لیکن اس رقم سے بھی جب کام نہ چل سکا تو مزاج میں جوڑ توڑ کی عادت تھی تو ایک روز جو نکل کر گئے تو پھر کارخانہ نیلام ہو گیا مگر یہ پلٹ کر نہ گئے۔ میرے ایک بزرگ اسی ضلعے کے صدر مقام پر جہاں کارخانہ قائم کیا تھا، ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ ان کو سید صاحب سے کافی ہمدردی تھی۔ کارخانے کی مالیت واثاثہ چوں کہ قرض کی رقم سے زیادہ تھا اس لیے بزرگ موصوف نے بہت اصرار کیا کہ اگر سید صاحب وہاں آجائیں تو اسی بنیے سے کارخانے کا سودا ایسی شرائط پر کرا دیا جائے کہ جس سے بنیے کا قرض ادا ہو کر سید صاحب کو بھی دو چار ہزار روپے بچ جائیں اور متفرق قرضوں کا بار ہلکا ہو جائے، مگر انھوں نے پھر کبھی اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا۔ سید صاحب کی لکھ پتی بننے کی دھن یقیناً مضحکہ خیز تھی، کیوں کہ لکھ پتی تو پیسے کو دانت سے پکڑتے ہیں، اور ان حضرت کی ہتھیلی میں تو گویا چھید تھا۔ نوکری کے خون پسینے کی کمائی اس طرح اڑاتے اور ضائع کرتے تھے کہ کوئی مفت اور حرام کی دولت بھی یوں نہ لٹائے گا۔ وہ تو کہیے کہ یہ جس قدر مصرف اور بے فکرے تھے بیوی اسی قدر منتظم و کفایت شعار۔ اچھے وقت میں جو وہ چھپا ڈھکا کر رکھ لیتی تھیں بیکاری کے زمانے میں اسی سے روٹی چلتی تھی، ورنہ سید صاحب تو فاقہ کشی کے پورے پورے انتظامات کر لیتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ روپیہ ہاتھ کا میل ہے، لیکن ان کے لیے مال و زر کی حیثیت اتنی بھی نہ تھی۔

سید صاحب کی ملازمت کا ابتدائی زمانہ تھا مگر تنخواہ معقول تھی۔ کنبہ بھی اس وقت مختصر تھا۔ ستا سما اور شہر سے دور دیہات میں قیام، اس لیے دونوں ہاتھوں سے خرچ کرنے کے بعد بھی چند سال میں کچھ رقم بچ ہی رہی۔ آج کل کے حساب سے تو دو چار ہزار کی کوئی حقیقت ہی نہیں مگر ۱۹۲۴ء میں اسے بڑی رقم کہا جا سکتا تھا۔ وہ ہمہ وقت متفکر تھے کہ کس طرح ان پیسوں کو ٹھکانے لگایا جائے، مگر نوکری کی

مصروفیت کی وجہ سے کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آخر سوچتے سوچتے ایک دوست کا خیال آ گیا اور فوراً ان کو خط لکھا کہ "میرے پاس اپنی ضروریات کے علاوہ کچھ روپیہ بچا پڑا ہے۔ اگر تم کو ضرورت ہو تو مطلع کرو۔" دوست نہ تو ضرورت مند تھے نہ محتاج بلکہ مالی اعتبار سے خود ان سے بہتر حیثیت رکھتے تھے، لیکن روپیہ آتا کسے برا لگتا ہے، اس لیے انھوں نے فوراً جواب دیا کہ اس باب میں وہ پہلے ہی خط لکھنے والے تھے۔ چنانچہ سید صاحب نے وہ رقم ان کو روانہ کر دی۔ کئی سال بعد جب انھوں نے شکر کا کارخانہ قائم کیا اور اس میں سرمائے کی کمی ہوئی تو ان دوست سے اپنی رقم کا مطالبہ نہیں کچھ روپیہ بطور قرض طلب کیا تو انھوں نے مجبوری کا اظہار کیا۔ لیکن سید صاحب نے ان سے تعلقات بدستور قائم رکھے۔ وہ دوست بھی خود غرضی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے انتقال پر تعزیت کی بھی زحمت نہ گوارا کی۔ کہتے ہیں کہ دیانت و ایمان داری کا ثبوت اس وقت صحیح ملتا ہے جب مال حرام سامنے ہو اور انسان اسے ایمان کی قوت سے ٹھکرا دے۔ ورنہ بقول حضرت اکبر الہ آبادی:

منبر پر آسان ہے بیان عذاب و ثواب کا

سید صاحب گو کسی طرح بھی مذہبی آدمی نہ کہے جا سکتے تھے مگر جب کبھی ایسی آزمائش سے گذرے تو مردانہ وار گذر گئے۔ شکر کے کارخانے کی تجہیز و تکفین کے بعد وہ عمر میں پہلی بار عرصۂ دراز تک بے کار رہے۔ کوڑی پاس نہیں، اوپر سے کثیر قرض کا بار۔ کافی عرصے کے بعد خدا خدا کر کے بہار کی ایک شوگر فیکٹری میں قلیل مشاہرے پر ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ کی جگہ ملی۔ وہ فیکٹری اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی شوگر فیکٹری تھی اور ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ فیکٹری والوں نے وہ سارا علاقہ خرید لیا تھا اور فیکٹری کی ضروریات کے لیے ایک بہت بڑا گنے کا فارم بھی قائم کیا تھا۔ فارم اور قرب و جوار کے علاقے سے فیکٹری تک گنا لانے کے لیے چند میل لمبی ریلوے لائن فیکٹری نے اپنی بچھائی تھی۔ اس ریلوے لائن کے لیے دو انجنوں کی ضرورت تھی۔ نئے انجن خاصے قیمتی ہوتے تھے اور یورپ سے منگانے کے لیے وقت درکار تھا، اس لیے طے کیا گیا کہ کسی ریلوے کمپنی سے دو پرانے مگر کارآمد انجن خرید لیے جائیں۔ ہندوستان کی سابق بی بی اینڈ سی آئی ریلوے کی چھوٹی لائن سیکڑوں میل لمبی تھی، اس لیے اس کے پاس انجن بھی بہ کثرت تھے۔ چنانچہ کمپنی سے اس بارے میں خط و کتابت ہوئی اور

ریلوے کمپنی نے انجن مہیا کرنے کی حامی بھرلی۔ چوں کہ ورکشاپ اور ریلوے لائن سب سید صاحب کے تحت میں آتے تھے، اس لیے فیکٹری والوں نے ان کو ہدایت کی کہ ریلوے کمپنی کے صدر مقام جاکر انجنوں کا معائنہ کرلیں۔ چنانچہ سید صاحب اجمیر گئے اور ریلوے کمپنی کے مہمان ہوے۔ ماشاءاللہ صورت شکل سے تو انگریز معلوم ہوتے تھے اور انگریزی بولتے بھی فروٹ تھے گو نامی شاہی۔ ریلوے کمپنی کے افسران بالا تو اس زمانے میں تھے ہی سب انگریز، خوب آؤ بھگت کی۔ مگر جب انجن دیکھے تو ناقص و ناکارہ۔ انھوں نے جب ان نقائص کی طرف اشارہ کیا تو ریلوے کے انگریز انجینئر نے کہا، ''فکر نہ کرو، تمھارا کمیشن پکا ہے۔'' سید صاحب کو اس پر بہت غصہ آیا مگر کچھ بولے نہیں بلکہ سیدھے بہار واپس آگئے۔ ریلوے والوں نے ان کی خاموشی کو نیم رضا سمجھا اور ان کی واپسی کے شاید ایک ہی ہفتے بعد ریلوے کا کوئی بڑا انجینئر دونوں انجنوں کی خوب لیپا پوتی کر کے بغیر اطلاع انجن لے کر پہنچ گیا۔ فیکٹری میں سید صاحب پہلے ہی مالکان کو انجنوں کی حالت و کیفیت سے آگاہ کر چکے تھے، اس لیے ان لوگوں نے ریلوے کمپنی کو جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ریلوے انجینئر پہنچا تو اس کو بھی انھوں نے صاف جواب دے دیا۔ وہ بہت جز بز ہوا اور فیکٹری کے چیف انجینئر کو، جو ان دنوں ایک جرمن تھا، ہموار کیا۔ ویسے تو انگریز اور جرمن میں باپ مارے کا دائمی بیر ہے لیکن کالے کے مقابلے میں سفید فام پھر بھی اپنا بھائی ہے۔ جرمن چیف انجینئر نے مالکان کو اس بات پر راضی کیا کہ خریداری کا معاملہ بعد کو دیکھا جائے گا، فی الحال انجنوں کا معائنہ و امتحان کرلیا جائے، اور یہ بات مالکان نے منظور کرلی۔ ریلوے اسٹیشن سے فیکٹری تک سائیڈنگ کے لیے لائن موجود ہی تھی، ریلوے انجینئر دونوں انجن چھک چھک کر کے لے آیا۔ مالکان نے انجن دیکھے تو نئے رنگ و روغن اور صفائی کی وجہ سے بڑے چم چم کر رہے ہیں۔ حیران ہوے کہ کیسے سید صاحب نے انجنوں کو ناقص بتایا تھا۔ بہر صورت، انجنوں کی طاقت اور کارکردگی کے امتحان کے لیے خالی ویگنوں میں اینٹ پتھر بھر کر مال گاڑی تیار کی گئی اور ایک انجن گاڑی میں جوڑ دیا گیا۔ ریلوے انجینئر نے خوشی خوشی گاڑی چالو کی۔ گاڑی مشکل سے ایک فرلانگ گئی ہوگی کہ انجن صاحب یکبارگی پھس پھسا کر کھڑے ہوگئے۔ ریلوے انجینئر کبھی یہ کل گھماتا ہے کبھی وہ، مگر انجن اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہونے کا نام نہیں لیتا۔ معا

اس کو خیال آیا کہ شاید لائن میں کچھ نقص ہو یا نچلے حصے میں کوئی پرزہ صحیح کام نہ کر رہا ہو۔ گھبرا کے بغیر بریک کھینچے نیچے اتر آیا، اور جھک کر نچلے حصے کا معائنہ کرنے لگا۔ مالکان میں سے بھی ایک صاحب نیچے کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ بوائلر سے انجن میں اسٹیم پوری قوت سے آ رہی تھی اور بریک کھلے ہوئے تھے۔ ابھی معائنہ جاری تھا کہ انجن نے ایک بار شوں کی۔ سید صاحب چلائے کہ بچو، انجن چل رہا ہے، اور مالک فیکٹری کو پکڑ کر انجن سے دور کھینچ لیا۔ مالک صاحب منحنی سے آدمی، سید صاحب کی کھینچ سے زمین پر آ پڑے۔ اسی دوران میں انجن، جیسے اپنے انجینئر کی خفت مٹانا چاہتا ہو، واقعی چل پڑا اور کئی گز چلا گیا، تب کسی فائر مین نے بریک کھینچ کر آگے جانے سے روکا۔ اب کیا تھا، مالکان کے دل میں سید صاحب کی قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ریلوے انجینئر نے بہت سر کھپایا اور سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسی وقتی خرابی تو کسی نئے انجن میں بھی پیدا ہو سکتی ہے، مگر مالکان کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے اور اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔ میرے ایک رشتہ دار، جن کو سید صاحب نے میری سفارش پر وہاں لوکو فور مین لگا دیا تھا، اس واقعے کے عینی شاہد ہیں بلکہ انھوں نے ہی مجھے یہ واقعہ سنایا تھا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ انجن بے شک پرانے تھے مگر ناکارہ نہ تھے اور وہ خرابی بھی اتفاقی تھی۔ صرف کمیشن کی پیش کش نے سید صاحب کو برافروختہ کر دیا تھا۔ خود ہی سوچیے کہ سید صاحب نے اس پیش کش کو اس وقت ٹھکرایا جب ان کی مالی حالت بے حد خراب تھی اور وہ بال بال قرض میں گرفتار تھے۔ دو انجنوں کے سودے پر کوئی سو پچاس روپے کمیشن تو نہ بنتا، کم سے کم بھی دس ہزار کی رقم ملنی تھی جو اس وقت ان کے حالات کے تحت دس نہیں تو ایک لاکھ کے برابر ضرور ہوتی۔ مگر وہ ایسے ہی روپیہ کمانا چاہتے تو خدا معلوم کتنی بار لکھ پتی بن گئے ہوتے۔ اس واقعے کے بعد مالکان نہ صرف ان کی قابلیت کے معترف ہو گئے بلکہ ان کی بہت عزت کرنے لگے۔ لیکن چند ہی روز بعد ایک دن اتفاق سے سید صاحب کی ناک پر مکھی بیٹھ گئی۔ پھر کیا تھا، نوکری پر لات ماری اور یہ جا اور وہ جا۔

اسی طرح سابق ریاست اُدے پور کے مقام کریرا پر مارواڑیوں نے ایک شوگر فیکٹری لگائی تھی۔ یہ فیکٹری پہلے ہندوستان کے صوبہ متحدہ کے ضلع بجنور میں کہیں لگی ہوئی تھی۔ مارواڑی سیٹھ نے خریدنے کے بعد اسے کریرا منتقل کیا تھا۔ فیکٹری کا سودا بھی شاید سید صاحب کے مشورے سے ہوا تھا،

اور انھوں نے پرانے ٹھکانے سے ہٹا کرنئی جگہ نصب کی تھی۔ اس فیکٹری میں وہ چیف انجینئر کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ نئی جگہ فیکٹری چالو کرنے میں کئی پرانی مشینیں بدلنا اور کئی میں نئے پرزے ڈالنا تھے۔ مارواڑی سیٹھ کا ایک دفتر کلکتہ میں بھی تھا اس لیے اس نے یہ خواہش کی کہ نئی مشینوں اور پرزوں کی ایک فہرست بنادیں تو اس کا کلکتہ کا دفتر سارا سامان خرید کے روانہ کردے گا۔ انھوں نے حسب ہدایت فہرست تو تیار کردی مگر یہ شرط لگائی کہ خریدنے سے قبل کلکتہ کا دفتر ان کو قیمت اور مقام ساخت سے مطلع کرکے منظوری لے لے۔ سیٹھ نے اپنے دفتر کو وہ ہدایات روانہ کردیں۔ وہاں سے جو پیشکش آئے وہ سید صاحب کو زائد معلوم ہوے۔ انھوں نے پہلے تو سیٹھ سے یہ دریافت کیا کہ کمپنی کی خریداری نقد ہوتی ہے یا قرض، اور جب سیٹھ نے یقین دلایا کہ قیمت کی ادائیگی نقد کی جائے گی تو انھوں نے تجویز کی کہ نقد خریداری کرنا ہے تو وہ خود بمبئی جا کر خریداری کریں گے۔ سیٹھ سے کوئی پرانے تعلقات نہ تھے مگر قیمتوں کا اندازہ تو اسے اپنے کلکتہ کے دفتر سے مل ہی چکا تھا، اس لیے سوچا ہوگا کہ اچھا ہے اگر روپیہ اور کم ہو جائے، اس لیے تیار ہوگیا، اور بمبئی میں اپنے کسی بھائی برادری والے کو جس قدر رقم درکار ہو ادا کردینے کی ہدایت کی۔ سید صاحب نے بمبئی پہنچ کر کسی انگریز کمپنی سے کلکتہ کی بتائی ہوئی قیمتوں سے کافی کم دام پر سب مال خرید لیا۔ مال روانہ ہو جانے کے بعد کمپنی کے انگریز منیجر نے ان کو ایک معقول رقم بطور کمیشن پیش کی، جس کو قبول کرنے سے انھوں نے انکار کیا تو منیجر نے وضاحت کی کہ کمپنی کے قواعد کی رو سے جس ایجنٹ کے ذریعے مال فروخت ہوتا ہے وہ دو یا تین فی صد کمیشن کا حقدار ہوتا ہے، اور وہ چوں کہ بغیر ایجنٹ کے توسل کے بلاواسطہ پہنچ گئے تھے اس لیے ایجنٹ کے کمیشن کے وہ خود مستحق تھے۔ سید صاحب نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ کمپنی تو یہ رقم ضرور نکالے گی، اور انھوں نے نہ لی تو کسی فرضی نام پر ادائیگی دکھائی جائے گی، اس لیے روپے جیب میں رکھ لیے، مگر فیکٹری پہنچ کر جوں کی توں تمام رقم سیٹھ کو دے دی۔

سید صاحب اپنے فرائض منصبی کی صرف انجام وہی نہیں کرتے تھے، بلکہ جب کام پر لگتے تھے تو تن من دونوں لگا دیتے تھے۔ کھانے پینے کا کیا ذکر، ان کو تن بدن کا ہوش نہ رہتا تھا۔ ویسے بھی ان کو کھانے پینے کا کوئی خاص ذوق نہ تھا، البتہ چاے اور سگریٹ کی طلب شدید اور تمام وقت رہتی تھی۔

اب تو چاے اس قدر عام ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں استعمال نہ ہوتی ہو۔ پھر بھی جو لوگ عادی ہیں ان کے یہاں صبح وشام چاے پی جاتی ہے مگر سید صاحب کا یہ دور کم ازکم چھ بار ہوتا اور ہر دور میں دو سے چار پیالی تک۔ اور یہی حال سگریٹ نوشی کا تھا۔ دن میں تین چار پیکٹ ضرور پھونکتے تھے، اور تعریف یہ کہ سگریٹ کے اچھے برے سے تعلق نہ تھا، بس دھواں نکلنا شرط تھا۔ غالباً چاے اور سگریٹ دونوں کی عادت ان کو بمبئی کے دورانِ قیام میں پڑی تھی۔ عادت جب اور جہاں بھی پڑی ہو مگر چھٹتی مرتے دم تک نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی موت کا باعث ان ہی دو چیزوں کی کثرت استعمال تھا۔

بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ ذکر کر رہا تھا سید صاحب کی فرض شناسی اور محنت شاقہ کا۔ ایسا جب کوئی وقت آتا تو وہ ماتحتوں کے لیے آفت بن جاتے۔ نہ خود کام سے ہٹتے ہیں نہ کسی کو ہٹنے کی اجازت۔ بارہ گھنٹے ہو جائیں یا چوبیس، کام ختم ہونا ضروری تھا۔ اُس دور میں مزدوروں اور کارکنوں کے حقوق اور اوقات کار کے لیے یا تو قوانین ہی نہ تھے اور جو کچھ تھے بھی تو وہ کتاب کے صفحات تک محدود، اس لیے عام مزدوروں اور کاریگروں سے دس سے بارہ گھنٹہ یومیہ کام لیا جانا معمولی بات تھی۔ سید صاحب ویسے تو بے فکرے اور مرنجاں مرنج آدمی تھے، فیکٹری سے نکل کر ماتحتوں سے برابری کا سلوک بلکہ ہنسی مذاق تک کرتے تھے، لیکن کام کے سخت محاسب بلکہ سخت گیر، اور کام چور ماتحت و کاریگر کے سخت دشمن۔ اور اس معاملے میں جس پر نظر عنایت ہوتی تھی اس کی اور بھی شامت آتی۔ نالائقوں پر تو غصہ گالی گفتار سے اتر جاتا مگر جو عنایات کے مستحق قرار پاتے تھے ان کی مرمت بھی کی جاتی۔ اور کوئی ہوتا تو اس طریق کار سے فیکٹری میں بلوہ ہو جاتا اور قتل وخون کی نوبت آجاتی، مگر ان کے ماتحتوں کو ان سے صرف محبت ہی نہیں ایک طرح کی عقیدت تھی۔ مزدوروں میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ جس کی پیٹھ پر ان کی لات پڑی، سال کے اندر ہی اندر اس کا مستری بن جانا لازمی ہے۔ چنانچہ کتنے ہی مزدوروں کو اس طرح مستری اور مستریوں کو سپروائزر بلکہ شفٹ انچارج تک بنا گئے جو آج تک ان کی لاتوں کو دعائیں دیتے ہوں گے۔ دراصل اس طرز عمل کی وجہ بھی ان کی فطری جلد بازی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ ایک ہی دن میں کاریگر کو سب کچھ سکھا کر انجینئر بنا دیں۔ میں نے ان کے

سکھائے ہوئے کئی ایسے سپروائز دیکھے ہیں جو بہ مشکل دستخط کر پاتے تھے، اور وہ بھی سید صاحب کی سکھائی ہوئی۔

زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ اور ان کے طریق کار کو دیکھتے ہوئے ایک بار میں نے عرض کی کہ بہتر ہوتا کہ جسمانی سزا کے بجائے جرمانہ یا ملازمت سے برطرفی کی سزا دی جائے۔ فرمانے لگے کہ یہ کہاں کا انصاف ہوگا کہ خطا کرے کام کرنے والا اور سزا بھگتیں اس کے بیوی بچے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد، جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں، مزید اضافہ کیا کہ پیٹ کی مار نہیں دینا چاہیے۔ شوگر فیکٹری ہمیشہ شہر سے دور کسی دیہات کے علاقے میں قائم کی جاتی ہیں، لہٰذا وہاں اس ترقی کے دور کی رعنائیاں ورنگینیاں عنقا ہوتی ہیں۔ اس بے کیف زندگی کو سید صاحب نے اپنے ایک مضمون ''میٹھی میٹھی باتیں'' میں بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون اغلباً دہلی سے شائع ہونے والے رسالہ ''ساقی'' میں ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں طبع ہوا تھا، اور ان کے افسانوں کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ اگر دستیاب ہوسکے تو بہت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس کا شمول ان کے افسانوں اور مضامین کے کسی نئے مجموعے میں کیا جاتا۔

سید صاحب کو شکار سے کب اور کیسے دلچسپی پیدا ہوئی، قطعی طور پر کوئی نہ بتا سکے گا، کیوں کہ لڑکپن اور جوانی میں انسان جن مشاغل وتفریحات میں محو ہو جاتا ہے ان کے لیے خارجی اسباب کچھ ضروری نہیں۔ بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے اور تفریح انسان کی سرشت میں داخل ہے، بس جدھر جی لگ گیا اسی کے ہو رہے۔ پھر بھی کسی خاص تفریح کے لیے کچھ نہ کچھ تو محرک ہوتا ہی ہے۔ جیسے اچھے کرکٹ یا ہاکی کھیلنے والوں کے باپ یا بڑے بھائیوں کو ان کھیلوں سے دلچسپی رہی ہے تو گھر میں بچپن سے اس کا چرچا سنا اور خود بھی اس میں دلچسپی لینے لگے۔ سید صاحب کے والد کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا مگر ان کے بڑے بھائی [1] اور بہنوئی [2] کو ضرور شکار کا بے حد شوق تھا۔ بلکہ بہنوئی تو، جو انڈین پولیس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، اپنی ایک ٹانگ اسی شوق کی نذر کر چکے تھے۔ ان کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ تھی۔ یعنی

---

[1] خان بہادر سید حامد حسین مرحوم، سابق ایگزیکٹو انجینئر محکمہ انہار یوپی، و پدر بزرگوار میجر جنرل سید شاہد حامد۔

[2] مولوی ظفر عمر صاحب مرحوم، سپرنٹنڈنٹ پولیس صوبہ متحدہ و مولف ''نیلی چھتری''، ''بہرام کی گرفتاری'' وغیرہ۔

ملازمت تو پولیس کی مگر ذوق ادبی اور شوق شکار کا۔ ہرن کے شکار میں ٹانگ چلی گئی تھی اور دوڑ بھاگ کے قابل نہ رہے تھے، اس لیے مچان پر بیٹھ کر شیر کا شکار کرنے لگے تھے۔ اسی ماحول میں اغلباً سید صاحب کو شکار کا شوق پیدا ہوا۔ ان کے لڑکپن میں ان کے والد [۳] کا تقرر بندیل کھنڈ کے علاقے میں کافی عرصے رہا۔ پنشن لینے کے بعد وہ اول ریاست گوالیار اور پھر بھوپال سے منسلک ہو گئے تھے۔ یہ تمام علاقہ ہندوستان کی بہترین شکار گاہوں میں شمار ہوتا ہے اور ہرن سے شیر تک ہر قسم کا شکار اس علاقے میں وافر ہے، چنانچہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سید صاحب کا اس علاقے میں قیام ہو اور شکار نہ کھیلیں۔ شکار سے ان کی دلچسپی کا ایک اور بھی بڑا سبب تھا، اور وہ یہ کہ شکار میں اکثر خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور صعوبتیں تو گویا شکاری کا مقدر ہیں۔ ہرن پر فائر کیا اور گرا نہیں مگر زخمی ہو گیا ہے۔ اب چلچلاتی دھوپ میں شکاری صاحب میلوں اس کے پیچھے ناہموار راستوں خاردار جھاڑیوں اور نالوں میں بھاگ رہے ہیں۔ مرغابی جیسی ننھی سی جان پر کنارے پر فائر کیا اور وہ جھیل میں گری تو کڑکڑاتے جاڑے میں برف جیسے ٹھنڈے پانی میں کود کر چڑیا نکالنا ضروری ہے۔ شیر، گلدار، ریچھ یا جنگی سؤر جیسے جانوروں کا شکار تو خطرے سے خالی ہی نہیں۔ سید صاحب کے لیے صعوبتیں جھیلنا اور خطرات سے دوچار ہونا زندگی کا اصل لطف تھا، بلکہ ایسی ہی تفریح تو ان کے لیے صحیح معنوں میں تفریح تھی۔ ورنہ ہاکی فٹ بال جیسے گھنٹے دو گھنٹے کے کھیل ان کی فطرت کے منافی تھے۔ موٹر تو اس زمانے میں تھی نہیں اور ہوتی بھی تو ان کے نصیب میں کہاں۔ مجھے خود بتایا تھا کہ اس دور میں سائیکل کے ٹائر ٹیوب اتار کر پہیوں پر موٹے رسے چڑھا دیتے تھے تاکہ پنکچر کا اندیشہ نہ رہے اور پہاڑی راستوں پر چل سکے۔ اسی لوہالاٹ سائیکل پر بیٹھ کر نکل جاتے اور خرگوش سے ہرن تک جو مل جاتا مار کر گھر لوٹتے۔ واپسی میں زیادہ دیر یا رات ہو جائے تو جنگل ہی میں کسی درخت پر چڑھ کر رات گذار لیتے۔ اغلباً جنگل میں اس طرح راتیں گذارنے ہی میں ان کو جانوروں کی عادات و خصائل پر غور کرنے کا موقع ملا ہوگا۔

سید صاحب کو قواعد و اصول سے ازلی بیر تھا۔ انھوں نے تو ساری زندگی صرف ایک اصول برتا اور وہ تھا بے اصولا پن، اس لیے شکار میں بھی وہ اسی پر کاربند تھے۔ شکار کا تو محض نام تھا، جنگل میں گھس

---

[۳] خان بہادر سید جعفر حسین۔

کر وہ قتل عام کیا کرتے تھے۔ بندوق چلاتے وقت وہ نر دیکھتے تھے نہ مادہ۔ بڑے بچے سب کو تہہ تیغ کرنا ان کے لیے روا تھا اس سب کی وجہ وہی فطری جلد بازی۔ کالج سے نکلنے کے بعد ایک سال تو ان کو جبری بحیثیت اپرنٹس ریلوے میں کام کرنا پڑا اور شاید ایک سال انھوں نے کسی انگریز فیکٹری میں ملازمت کی تھی۔ اس کے بعد ہی ہندوستان کے صوبہ متحدہ میں نہر ساردا کی کھدائی کا کام شروع ہوا اور وہ وہاں مکینکل ڈویژن میں بحیثیت سب ڈویژنل آفیسر مقرر ہو گئے۔ نہر ساردا کا ہیڈ ورکس پیلی بھیت کے ضلع میں بن بسا نامی ایک مقام پر بنایا گیا تھا۔ یہ تمام علاقہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ بن بسا تو نیپال کی سرحد پر واقع ہے۔ ساردا دریا، جسے وہاں کی مقامی زبان میں کالی ندی کہا جاتا تھا، برطانوی ہند اور ریاست نیپال کے درمیان حد فاصل تھا۔ یہاں شکار کی وہ کثرت تھی کہ لوگ کہتے ہیں کہ جب نہر بنانے کا منصوبہ تیار ہوا اور سروے کی گئی تو ابتدائی کئی سروے پارٹیز تو اس علاقے میں درندوں کا شکار ہو گئیں۔ اس لیے وہاں پہنچ کر سید صاحب نے محسوس کیا ہوگا کہ گویا جنت میں آگئے۔ کام سے فارغ ہوئے نہیں کہ رائفل کندھے پر رکھی اور چل کھڑے ہوے۔ چند روز بعد تو یہ حال ہوا کہ ادھر ان کو بندوق لیے جاتے دیکھا اور دس بیس قلی کیمپ سے نکل کر ان کے ساتھ ہو لیے۔ ان غریبوں کو اتنا گوشت مل جاتا کہ پوری عمر میں نہ کھایا تھا۔ اسی علاقے میں سید صاحب کی ملاقات ایک مقامی رئیس حاجی عبدالمجید خاں مرحوم سے ہوگئی۔ حاجی صاحب بھی شکار کے شوقین ہی نہیں بلکہ دھتیے تھے۔ بس پھر کیا تھا! بہ مصداق

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں دیوانے دو

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے شوقِ شکار پر جلا حاجی صاحب کی صحبت سے ہوئی۔ شیر کے شکار کا موقع بھی ان کو اغلباً پہلی بار حاجی صاحب کی معیت میں ملا۔ حاجی صاحب کا شوقِ شکار خود ایک افسانہ ہے۔ اس علاقے کے متعدد افراد سے میں نے خود سنا ہے کہ حاجی صاحب کا شکار مغلیہ شہزادوں کے جشن سے کم نہ ہوتا تھا۔ مجھ کو حاجی صاحب سے ملنے کا اتفاق تو ایک سے زائد بار ہوا مگر ان کے جشنِ شکار میں شرکت کبھی نہیں ہوئی۔ شاید جب مجھ سے ملاقات ہوئی تو دولت کے ساتھ یہ جشن بھی ختم ہو چکے تھے۔ معتبر روایات سے معلوم ہوا ہے کہ حاجی صاحب کی شکار پارٹی دس بیس مہمان شکاری، تیس

چالیس شکار کے ساتھیوں کا جلوس، ہاتھی، گھوڑوں، رتھوں اور بیل گاڑیوں کے ساتھ روانہ ہوتا جس میں باورچی، خدمت گار، حقہ بردار، مشعلچیوں کے علاوہ ناچ گانے کے طائفے بھی شامل ہوتے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ جنگل میں منگل منا کر واپسی ہوتی۔ یہ مختصر روداد ہے حاجی صاحب کے شکار کی، گو اپنے شوق کو پورا کرنے میں وہ لاکھوں روپے کی آبائی جائیداد کو ٹھکانے لگا اور اولاد کو بھیک مانگنے کے قابل چھوڑ گئے۔ افسانہ ''کفارہ'' میں جن دو بھائیوں احمد و محمود کی تڑاتڑ گولیوں سے آدم خور شیرنی کو مارتے دکھایا گیا ہے وہ کوئی فرضی کردار نہیں بلکہ انھیں حاجی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ اور دونوں شیر کے اچھے شکاری تھے۔ افسانے میں جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب بھی اصلی اور اسی علاقے میں واقع ہیں۔

غرض حاجی صاحب کی صحبت نے سید صاحب کو شیر کے شکار کا چسکا لگا دیا۔ سید صاحب اپنی مالی خستگی کی بنا پر مچان باندھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتے تھے اور اونچے درخت کے کسی مضبوط ٹہنے کو رات گذارنے کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ ان کو یہ طریقِ شکار شاید اس لیے بھی زیادہ پسند ہوگا کہ اس میں خطرات سے دوچار ہونے کے امکانات زیادہ تھے اور خطرات سے کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مسلمان کا ایمان ہے کہ موت کا وقت اور جگہ پہلے سے مقرر ہوتی ہے، چنانچہ سید صاحب کے لیے بھی کینسر میں مبتلا ہو کر چارپائی پر مرنا مقدر تھا، ورنہ جن خطرات کو وہ دعوت دیا کرتے تھے ان میں سے کوئی بھی ان کی ناگہانی موت کے لیے کافی تھا۔

یہ مضمون مکمل نہ ہوگا اگر میں اس سلسلے میں سید صاحب کی ادبی زندگی کا ذکر نہ کروں جو بہت مختصر بلکہ چندروزہ تھی۔ انھوں نے اغلباً ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں سب سے پہلا مضمون ''امید'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ ان کا دوسرا مضمون تھا ''کلوا'' مگر وہ شائع ہوا تھا ''کفارہ'' کے بعد۔ ''ہیرو''، ''شیریں فرہاد''، ''آئینۂ حیرت'' اور ''گوری ہو گوری'' ان کے بعد تابڑتوڑ قلمبند ہوئے اور، بقول ادیب جلیل شاہد احمد دہلوی صاحب، ان کی اشاعت نے تو جھنڈے گاڑ دیے۔ غرض ان کے تمام شاہکار پانچ سات سال کی قلیل مدت میں عالم وجود میں آئے۔ تعریف تو یہ ہے کہ وہ اپنی ادبی جدوجہد کو مشغلۂ بیکاری سمجھتے تھے، اور واقعہ یہی ہے کہ وہ صرف اُن دنوں میں لکھتے تھے جب وہ بے روزگار ہوتے تھے، گو انھوں نے کبھی

اپنے کسی مضمون یا افسانے کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ دراصل وہ بے کار بیٹھنے کے عادی نہ تھے اس لیے جب کچھ کرنے کو نہ ہوتا تو لکھنے بیٹھ جاتے، اور وہ بھی آخر زمانے میں۔ نوکر ہوتے ہی وہ ایسے کام میں مشغول و مصروف ہوتے کہ لکھنے کا نہ ان کو موقع ملتا نہ فکر ہوتی۔ ان کے تمام افسانے اور مضامین زمانہ بیکاری کی یادگار ہیں۔ اگر وہ چند روز اور زندہ رہے ہوتے، اور ساتھ ہی ساتھ بے روزگار، تو اردو ادب کے خزانوں کو اپنے جواہر پاروں سے مزید بھرپور کر جاتے۔

کہتے ہیں شاعر بنتے نہیں، پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ مقولہ صحیح ہے اور اس میں مضمون و افسانہ نگار بھی شامل ہو سکتے ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ سید صاحب پیدائشی ادیب تھے، گو آپ کی صلاحیتوں کا اظہار پہلی بار اس وقت ہوا جب ان کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ ساری عمر غم روزگار میں ایسے مبتلا رہے کہ غم عشق کا بھی وقت نہ ملا، ورنہ یہ کہا جاتا کہ قوت متخیلہ تیز ہوگئی۔ دراصل غور و فکر کو ان کے مزاج سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو ساری عمر جو دل میں آیا کہہ اور کر ڈالنے کے عادی رہے۔ کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ اسکول و کالج میں اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کی مگر مطالعہ وسیع تھا، تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بھی درست نہیں۔ افسانہ نویسی و مضمون نگاری کے دور سے قبل وہ خالی وقت میں پڑھا ضرور کرتے تھے، مگر سستا لٹریچر، یعنی گھٹیا انگریزی مار دھاڑ والی وائلڈ ویسٹ ناولیں۔ اردو نہ ان کو آتی تھی نہ میں نے اردو کی کوئی قابل ذکر کتاب پڑھتے کبھی دیکھا۔ اور لکھنے سے تو وہ اس قدر گھبراتے تھے جیسے اپچی نہانے سے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر میں شاید درجن بھر سے زائد خط نہ لکھے ہوں گے۔ رشتہ داروں سے خط و کتابت بیوی کے ذمے تھی اور دوستوں کو لکھ کر جواب کی زحمت دینا کبھی انھوں نے پسند نہیں کیا۔ اس سب کی ایک وجہ اغلباً ان کو خوشخطی بھی تھی۔ وہ شاید اپنا لکھا خود بھی نہ پڑھ پاتے ہوں گے۔ قلم کو اس قدر دباتے تھے کہ کاغذ میں جگہ جگہ چھید ہو جاتے اور املا اس قدر صحیح کہ ایک سطر میں پانچ غلطیاں معمولی بات تھی۔ مرتے دم تک ''کہ'' اور ''کے'' کا محل استعمال ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ایسا آدمی چالیس سال کے بعد یکا یک ادیب بن جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ خدا کی دین ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں جینیئس تھے اور ان کو اپنی خداداد صلاحیتوں کا خود بھی علم نہ تھا۔ مشاہدہ غضب کا تھا اور حافظہ بلا کا۔ بچپن میں گھر کے ماحول نے ان کو حساس بنا دیا تھا، اس لیے روزمرہ کی

زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کے دل پر نقش ہوتی رہتی تھیں۔ کم گو فطرتاً تھے اس لیے دل میں مواد جمع ہوتا رہتا۔ تقریر میں رکاوٹ تھی اس لیے جب قلم سنبھالا تو دریا بہہ نکلا۔

یہ ادبی جائزہ ادھورا رہ جائے گا اگر اس باب میں ان کی بیٹی قمر مرحومہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان کی ادبی سرگرمیوں میں وہ ان کی مشیر ہی نہیں بلکہ مرشد کا درجہ رکھتی تھیں۔ وہ افسانے کا خاکہ انگریزی اردو کے کھچڑی الفاظ میں تیار کرتے۔ بیٹی اسے شستہ زبان میں ترتیب دیتیں۔ خود جس قدر بدخط تھے بیٹی اسی قدر خوشخط۔ گو وہ پہلے ہی افسانے کے بعد ادبی دنیا میں روشناس ہو گئے تھے، مگر ان کی ناموری تمام تر بیٹی کا کارنامہ ہے۔ بیٹی کی رفاقت میسر نہ ہوتی تو ان کے بہت سے افسانے نامکمل ہی رہتے یا ان کی ترتیب وہ نہ ہوتی جو اَب ہے۔ سید صاحب کے ماشاء اللہ دو بیٹے ہیں۔ بیٹی صرف ایک ہی تھی مگر ان کا کہنا تھا کہ مجھے بیٹی دونوں بیٹوں سے زیادہ عزیز ہے۔

سید صاحب نے جس عنوان پر قلم اٹھایا وہ اردو ادب ہی میں ایک نئی چیز نہیں تھی بلکہ اسے ہم فخریہ دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ پالتو اور جنگلی جانوروں کی عادات و خصائل جس دلنشیں اور نکھرے ستھرے انداز میں انھوں نے پیش کیے ہیں اس کی کوئی مثال اپنے ادب میں پہلے نہیں ملتی۔ اگر سید صاحب کے افسانے کسی یورپین زبان میں شائع ہوئے ہوتے تو وہ یقیناً عالمگیر شہرت پاتے۔

جانوروں کے خصائل کا موازنہ انسانی سرشت کی کمزوریوں سے جس خوبی سے جا بجا کیا ہے اس پر غور کرنے سے نہ صرف ان کے مشاہدے کی گہرائی بلکہ زندگی پر ان کے نظریات عیاں ہوتے ہیں۔ افسانہ ''شیریں فرہاد'' میں انجینئر اقبال احمد کا کردار جن الفاظ میں بیان کیا ہے: ''جب ایک سیڑھی اوپر چڑھے تو نیچے کی سیڑھی کھود ڈالتے یا گز بھر اونچے ہوئے تو اترا گئے اور نیچے کی دنیا آنکھوں سے اوجھل ہو گئی''، اوچھوں اور کمینہ فطرتوں کی کیسی صحیح تصویر ہے۔ ذرا آپ بھی اپنے گرد و پیش نظر ڈالیے، کتنے اقبال احمد آپ کو نظر آئیں گے۔ سید صاحب نے اپنوں سے جو بے وفائی اور غیروں سے جو سرد مہری پائی تھی اس کا اظہار انھوں نے اقبال احمد اور اپنے دوسرے کرداروں میں بلا تکلف کیا ہے۔ ان کے سامنے ایک نہیں کئی اقبال تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر کڑھتے مگر زبان نہ ہلا سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے

جذبات کے اظہار کا یہ موثر ذریعہ پیدا کیا اور اردو ادب میں اپنے لیے ایک مستقل جگہ بنا گئے۔

سید صاحب اپنے مزاج و کردار کے لحاظ سے ایک مکمل مجموعۂ اضداد تھے۔ وہ بیک وقت منکسر مزاج، حلیم الطبع اور مغلوب الغضب تھے۔ ان میں خود پرستی مطلق نہ تھی۔ وہ کسی طرح بھی مذہبی آدمی نہ کہے جاسکتے تھے، مگر ان کی دیانت داری محراب و منبر کو شرما دینے والی تھی۔ سید صاحب نہ حاضر جواب تھے نہ پُر مذاق۔ بات سن کر اکثر ٹال جاتے تھے۔ لیکن بھولے بھٹکے کبھی جواب دے جاتے تو معترض بارہ بارہ چوبیس سال تو اعتراض کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ ایک روز ان کے کوئی بزرگ گھر پر ملنے آئے۔ شام کا وقت تھا۔ وہ حسب معمول چند ماتحتوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے اور ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ بزرگ موصوف یہ رنگ دیکھ کر زنان خانے میں چلے گئے اور ان کی بیوی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کبھی اس شخص کو بڑے آدمیوں کی صحبت نصیب نہ ہوئی، جب بھی دیکھا چھوٹے لوگوں کی صحبت میں۔ وہ حضرت تو تھوڑی دیر بعد رخصت ہو گئے۔ ان کی بیوی بھی روز کی ان لونڈھیار صحبتوں سے عاجز تھیں۔ موقع پا کر کسی وقت میاں صاحب کو بزرگ موصوف کے تاثرات سے آگاہ کیا۔ سید صاحب پہلے تو حسب عادت خاموش رہے لیکن بیوی نے وہی الفاظ دوبارہ دہرائے تو نہایت متانت سے کہا، ''وہ حضرت تمام عمر بڑوں کی صحبتوں میں بیٹھے مگر چھوٹے گنے گئے۔ ہم چھوٹوں کی صحبتوں میں بیٹھتے ہیں مگر بڑے بن کر۔''

سید صاحب کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے اور محلے کے چھوٹے بچوں کے ساتھ ان کے کھیلوں میں بلاتکلف شریک رہتے۔ بچوں کی دنیا میں وہ خود بھی بچہ بن جاتے۔ ''کلوا'' میں جو انھوں نے منّن کی ماں کے لیے نصیحت کے الفاظ کہے ہیں کہ ''افسوس اے جاہل ماں، تو نے سب کچھ کیا لیکن بچے کے دل کی تھاہ نہ لی۔ بچے کے دل میں بچہ بن کر گھسنا ہوتا ہے۔ وہاں ان کے چھوٹے چھوٹے رنج، منی منی خوشیاں، معصوم گِلے اور شکوے ہوتے ہیں۔ اور بے وقوف مائیں اس دنیا کو کس مپرسی میں چھوڑ دیتی ہیں،'' ان پر وہ تمام تر عامل تھے۔ جس زمانے میں وہ شوگر فیکٹری میں چیف انجینئر تھے، ایک مولوی صاحب کسی مسجد کے چندے کے سلسلے میں آئے۔ لوگوں نے حسب توفیق واستطاعت چندہ دیا۔ سید صاحب نے چندے کے علاوہ رات کو کھانے کی دعوت بھی دے دی۔ مولوی صاحب رات کو بعد

مغرب پہنچے تو سید صاحب کھانا کھا چکے تھے اور دعوت بالکل یاد نہ تھی۔ مولوی صاحب کی صورت دیکھتے ہی یاد آیا کہ ان کو تو کھانے پر بلایا تھا۔ کوئی بھی دوسرا ہوتا تو کچھ بات بناتا مگر سید صاحب کی فطرت میں تصنع کو تو دخل ہی نہ تھا۔ بلا تکلف مولوی صاحب سے کہہ دیا، ''میں تو بھول گیا تھا اور کھانا کھا چکا ہوں۔'' مولوی صاحب ''کوئی بات نہیں'' کہہ کر واپس چلے گئے۔ سید صاحب نے جب اندر جا کر بیوی کو واقعہ بتایا تو وہ بہت ناراض ہوئیں کہ بھول بھی گئے تو مولوی صاحب کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک صاحب کے کھانے میں کیا مشکل ہوتی ہے۔ کچھ تھا اور کچھ جھٹ پٹ تیار ہو جاتا۔ معصومیت سے فرمایا، ''بیوی، یہ ہمارے خیال میں ہی نہ آیا۔''

سید صاحب نے ۴۸ سال کی عمر پائی ہوگی مگر اس مختصر سی عمر میں انھوں نے زندگی کے نشیب و فراز، آرام و آسائش، تکلیف و مصائب سب ہی دیکھ ڈالے، اور نتیجہ وہی جس میں شاہ اور فقیر کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں کے دن بہر صورت گذر گئے اور اللہ وہاں ان کی بہت اچھی گذار رہا ہوگا۔

نیر مسعود

کچھ تحقیقی مباحث

سید رفیق حسین پر کوئی باقاعدہ تحقیقی کام میرے علم میں نہیں ہے۔ ان کے بارے میں لکھی جانے والی تحریروں سے جو متفرق باتیں معلوم ہوتی ہیں ان میں بعض ایسے اختلافات ہیں جن کا دور ہونا ضروری ہے۔ ذیل میں مجمل طور پر ان اختلافات کی نشان دہی کی جاتی ہے:

۱۔ سنہ ولادت، وفات، عمر:

"میرا وطن لکھنؤ ہے اور ۱۸۹۴ء کی میری پیدائش۔" (رفیق حسین: "فسانۂ اکبر")

"۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوا۔" (رفیق حسین: "میرا بہترین افسانہ")

"۱۹۴۶ء میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔" (اداریہ "نیا دور") یعنی عمر بہ وقت وفات اکیاون یا باون سال۔

"سید صاحب نے اڑتالیس سال کی عمر پائی ہوگی۔" (سید مختار اکبر: "سید صاحب") یعنی ولادت ۱۸۹۸ء یا وفات ۱۹۴۳ء کے قریب۔

۲۔ پہلا مضمون، پہلا افسانہ، پہلی اشاعت:

سید رفیق حسین نے ۳۸-۱۹۳۷ء میں لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا مضمون ''امید'' تھا۔ یہ بھی رسالہ ''ساقی'' میں شائع ہوا تھا، لیکن ''ساقی'' میں شائع ہونے والی ان کی سب سے پہلی تحریر [مضمون] ''میٹھی میٹھی باتیں'' تھا جو ۴۲-۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس تحریر کے ساتھ وہ منظرِ عام پر آئے۔ اس کے بعد انھوں نے جانوروں کے بارے میں افسانے لکھے۔

(مشرف احمد: ''شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان'')

انھوں نے اغلباً ۳۷ یا ۳۸ء میں سے پہلا مضمون ''امید'' کے نام سے لکھا تھا۔ ان کا دوسرا مضمون تھا ''کلوا'' مگر وہ شائع ہوا تھا ''کفارہ'' کے بعد۔

(سید مختار اکبر: ''سید صاحب'')

شاہد احمد دہلوی ''کفارہ'' کے بارے میں بتاتے ہیں: ''یہ لکھنے والے کا پہلا افسانہ تھا۔''
(''کہنے کی باتیں'' مشمولہ ''آئینۂ حیرت'')

۳۔ رفیق حسین اور شاہد احمد دہلوی:

مشرف احمد نے رفیق حسین کے بھتیجے میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد کا جو بیان نقل کیا ہے اس کے مطابق ''کفارہ'' لکھنے سے پہلے رفیق حسین کی ملاقاتیں شاہد احمد دہلوی سے رہ چکی تھیں اور شاہد احمد دہلوی سے دو چار ملاقاتوں میں سید رفیق حسین نے شکار کے بعض واقعات ان کو سنائے اور کچھ جانوروں کی نفسیات وغیرہ بھی زیرِ بحث آئی۔ شاہد احمد دہلوی نے انھیں مشورہ دیا کہ ان تجربات کو اگر وہ افسانے کی صورت میں لکھ دیں تو یہ اردو ادب میں ایک نئی چیز ہوگی، اور وہ انھیں اپنے رسالے ''ساقی'' میں شائع کر دیں گے۔ سید رفیق حسین نے اس پر عذر پیش کیا کہ وہ اردو نثر لکھنے پر قادر نہیں ہیں اور اردو انھیں واجبی سی آتی ہے۔ شاہد احمد صاحب نے ان سے کہا کہ وہ اس کی پروا نہ کریں۔ نثر وہ [شاہد] خود

ٹھیک کرلیں گے۔ (''شاہ حسین حقیقت اوران کا خاندان''۔)

شاہد احمد دہلوی کا بیان ہے کہ ''کفارہ'' وصول ہونے سے پہلے انھوں نے رفیق حسین کا نام ''کبھی نہیں سنا تھا۔'' (''کہنے کی باتیں''۔)

۴۔ ''آئینۂ حیرت'' کی ترتیب:

۱۹۴۴ء میں رفیق حسین کے افسانوں کا مجموعہ ''آئینۂ حیرت'' تیار تھا۔ ۵ مارچ کو شاہد احمد دہلوی نے اس کا تعارف لکھا اور اس میں بتایا کہ کوئی چار سال قبل یعنی ۱۹۴۰ء کے قریب ان کو رفیق حسین کا پہلا افسانہ ''کفارہ'' ملا تھا۔ (''کہنے کی باتیں'')

اختر حسین رائے پوری بتاتے ہیں کہ افسانوں کے اس مجموعے کو:

> پہلی مرتبہ... پڑھنے کا اتفاق مجھے ۴۱ء میں ہوا جب میں یورپ سے فارغ التحصیل ہوکر لوٹا اور دہلی میں دو تین دن کے لیے شاہد احمد صاحب کے دولت کدے پر ٹھہرا۔ ان کے اصرار پر جب میں کتاب کے مسودے کو پڑھنے بیٹھا...''

(''حیوان اور انسان'')

یعنی ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء کے دوران ''آئینۂ حیرت'' کے افسانے لکھے جا چکے تھے اور مجموعے کی صورت میں مرتب ہوکر شاہد احمد کے پاس موجود تھے۔

۵۔ ''آئینۂ حیرت'' کی اشاعت:

> ۴۴ء میں ساقی بک ڈپو سے ان کے افسانوں کا مجموعہ ''آئینۂ حیرت'' کے نام سے چھپا۔'' (اداریہ ''نیا دور''، شمارہ ۴۶-۴۵)

یعنی یہ مجموعہ رفیق حسین کی وفات سے (اگر اس کا سال ۱۹۴۶ء ہے) دو سال پہلے شائع ہوگیا تھا۔

الطاف فاطمہ رفیق حسین پر اپنے مضمون میں بتاتی ہیں کہ مرض الموت میں ''انھیں اپنے

افسانوں کے مجموعے کا شدید انتظار تھا جو چھپ رہا تھا۔''

اور یہ بھی کہ رفیق حسین کی وفات کے بعد:

اماں [سیدہ ممتاز جہاں بیگم] گھر واپس آ گئیں اور دس پندرہ دن کے بعد ''آئینۂ حیرت'' کی ایک جلد ممانی جان [بیگم رفیق حسین] نے ان کے پاس بھیجی جو چھپ کر آ گئی تھی۔ (''خزاں کے رنگ'')

یعنی ''آئینۂ حیرت'' کی اشاعت اور رفیق حسین کی وفات میں دو سال سے بہت کم کا فصل تھا اور کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

۶۔ ''فسانۂ اکبر'' وغیرہ کا زمانۂ تحریر:

''نیا دور'' کے اداریے میں لکھا گیا تھا:

''نیا دور'' کے اس شمارے میں ہم رفیق حسین کی بہت سی غیر مطبوعہ کہانیاں پیش کر رہے ہیں۔ یہ کہانیاں اُس دور سے تعلق رکھتی ہیں جب رفیق حسین نے لکھنا شروع کیا تھا۔

یعنی یہ کہانیاں ۳۸-۳۷ء میں لکھی گئیں۔

ان کہانیوں میں ''فسانۂ اکبر'' بھی شامل ہے جس کی تمہید میں رفیق حسین بتاتے ہیں:

۳ جون ۱۹۴۲ء سے یکم جولائی ۱۹۴۳ء تک میں لا پتہ رہا تھا۔ اس عرصے میں جہاں میں رہا اور جو مجھ پر گذرا ہے اس افسانے میں تحریر ہے۔

۷۔ دوسرے رسالوں میں رفیق حسین کی تحریریں:

رفیق حسین کے ایک افسانے کے بارے میں شاہد احمد دہلوی بتاتے ہیں:

افسانوی ادب کے محترم نقاد مولانا صلاح الدین احمد نے ''ادبی دنیا'' کے ادبی جائزے میں کئی صفحات میں اس افسانے کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔

عمدہ لکھنے والوں کی تلاش اور ان سے لکھوانے کے معاملے میں مولانا صلاح الدین احمد بھی شاہد احمد دہلوی سے کم نہ تھے۔ انھوں نے رفیق حسین سے بھی اپنے پرچے کے لیے کچھ لکھوایا تھا؟

مندرجۂ بالا باتوں کی تحقیق کچھ بہت دشوار نہیں ہے۔ سید رفیق حسین کے خاندان کے لوگ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ایسے لوگ مل جائیں گے جن کی رفیق حسین سے ملاقات رہی ہو۔ ''ساقی''، ''ادبی دنیا'' اور اس زمانے کے دوسرے رسالوں کی فائلیں مل جاتی ہیں؛ ان کی مدد سے خود رفیق حسین کی اور ان کے بارے میں دوسروں کی تحریروں کو اکٹھا اور ان کے زمانۂ اشاعت کو متعین کیا جاسکتا ہے۔

رفیق حسین کی وفات کو ابھی پچاس سال بھی نہیں ہوئے ہیں۔ ادبی تحقیق کے حساب سے یہ کوئی پرانی بات نہیں ہے اور ابھی رفیق حسین کے محقق کے لیے راست مآخذوں تک پہنچنا آسان ہے، البتہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ان پر تحقیقی کام دشوار ہوتا جائے گا۔

صلاح الدین محمود

ایک پیش لفظ

کرۂ ارض کے طبقات کی پرت در پرت چھان بین اور تلاش و تحقیق کرنے والوں کی کوئی نصف صدی کی محنت نے بغیر کسی شک و شبہ کے اور مکمل طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اصل میں آدمی ایک خاص طرح کا بندر ہے، ایک خاص ساخت کا بن مانس جو کہ بنوں سے باہر آکر کارآمد اور سربلند تو ضرور ہوا اور آخر کو آدمی کہلایا، مگر آج بھی بنوں کی ٹھنڈی، تاریک اور پیچیدہ کیفیت ہی میں اپنا غیب تلاش کرتا ہے۔

یہ نہ بھولیں کہ اس ہماری زمین کے طبقوں میں دبے ہوئے آثار کی داستان، کم از کم، اتنی ہی قدیم ہے کہ جتنا اس زمین پر جان اور جان دار کا نمو۔ ہم اور تمام پرند و چرند، کیڑے مکوڑے، آبی جانور، ہوا، پانی، آگ، خاک، شجر، پھل، پھول، ایک دوسرے میں بڑھتے گھٹتے، ایک دوسرے کی بُنت میں مشترک، اربوں کھربوں موسموں کے ساتھی، ایک دوسرے کی اٹھان میں شامل، یہاں تک آن پہنچے ہیں۔

کبھی آپ نے سوچا کہ آتی دنیا سے اپنے آپ کو تلاش کرنے والوں نے آخر جنگل، بیابان یا کسی پہاڑ کی چوٹی کا رخ کیوں کیا؟ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہماری بنت میں اوجھل، گھنے جنگل میں بارش سے دھلی ہوئی شاخوں کو، بیابانوں میں ہمیشہ سے ایک ہی سمت سے چلتی ہواؤں کے آبدار شور کو یا

صلاح الدین محمود سید رفیق حسین کی تمام تحریروں کو مرتب کر کے شائع کرانا چاہتے تھے لیکن زندگی نے انھیں یہ کام مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔ زیرِ نظر مضمون اسی اشاعت کے پیش لفظ کے طور پر لکھا گیا تھا۔

کسی پہاڑ کی چوٹی کے اوپر کسی مخفی محور کے گرد گھومنے والے آسمان کے لحن کو، ہم تو قرنوں پہلے اپنے لہو میں بھول چکے ہوں مگر وہ شاخیں، وہ ہوائیں، وہ آسمان، ہم کو ابھی تک نہ بھولے ہوں؟

میرا پختہ احساس ہے کہ ''آئینۂ حیرت'' کی بیش قیمت کہانیاں اس ہی حقیقت کا اعتراف ہیں۔ غالبًا یہ ادراک، یہ آگاہی ہی ہے کہ جو سید رفیق حسین کو جنگلوں، درختوں، ٹہنیوں، پرندوں، چوپایوں، درندوں اور ہواؤں کے قلب میں پہنچا کر، وہاں کے حواس سے، باہر کی دنیا کو پرکھنے کی بے حد عنقا اور مافوق الفطرت صلاحیت عطا کرتی ہے۔

ان کی کہانیوں میں انسان و جانور، درخت و میدان، جنگل و بیابان، دکھ اور سکھ، صبح و شام، ایک ہی خلائی کھڈی کے رنگ برنگے، اور کبھی بے رنگ، مگر مسلسل تانے بانے ہیں کہ جو اپنی تکمیل پر اس جہان کے مقدر میں ڈھل جاتے ہیں۔

جانور کے قلب میں پہنچنا اور وہاں پہنچ کر اپنے آپ کو بھول جانا اور اس کے حواس سے باہر کے جہان کا تجربہ کرنا، جنگل میں ایک درخت بن کر زندہ رہنا، پھلنا، پھولنا اور پھر اجڑ جانا، ہواؤں سے پرندوں کی بولیاں سیکھنا، آدمی کو انسان بن کر پرکھنا، اور پھر ان حوادث کو، ان محسوسات کو، ان فطری مشاہدات کو، ان دکھ بھرے واقعات کو، ایک سادی، بھولی بھالی، اصطلاحی نوک پلک سے درست، ادراک سے پر، زبان میں بلا کم و کاست بھرپور بیان کرنا — ہماری زبان کے لحن میں یہ صرف سید رفیق حسین ہی کا کمال تھا۔

سید رفیق حسین ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور خوش حال گھرانے سے تھا۔ آبا و اجداد میں شاعر، صوفی، عالم اور قلندر سب ہی گذرے تھے۔ سیدوں کا یہ گھرانہ فرخ سیر کے دور میں بلخ سے ہندوستان آیا تھا۔ مورث اعلیٰ سید امیر کلال تھے کہ جن کا شمار عظیم صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ کم عمری ہی میں والدہ وفات پا گئیں۔ والد خان بہادر سید جعفر حسین موسوی تھے کہ جو محکمۂ انہار میں چیف انجینئر کے عہدے تک ترقی کر کے پہنچے اور اس کے علاوہ بھی، ساری عمر، مختلف مقامات پر، اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے۔ یہ سرسید احمد خاں کے حامیوں اور نوجوان ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔

سید رفیق حسین کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز جھانسی سے ہوا، کہ اس وقت ان کے والد وہیں فائز تھے۔ یہاں مختلف اتالیق ان کو گھر پر ہی تعلیم دیتے رہے۔ اس کے علاوہ ان کی بڑی بہن، اشفاق جہاں بیگم، نے بھی ان کی تعلیم و تربیت و نشو ونما کا خاص خیال رکھا۔ اس کے بعد اٹاوہ، علی گڑھ (ظہور وارڈ: کہ یہاں ان کا دل پڑھنے میں خوب لگا)، بھوپال، پھر اٹاوہ (کہ جہاں عظیم بیگ چغتائی کوئی ایک برس تک ان کے ہم جماعت رہے) اور بمبئی میں تعلیم حاصل کی۔ بمبئی ہی سے، ۱۹۲۰ء میں، انجینئرنگ کی سند حاصل کی۔ دماغ بہت تیز تھا۔ یا تو پڑھتے ہی نہیں تھے اور اگر پڑھنے پر آتے تھے تو اس مضمون کو اچھی طرح کھنگال کر اس کی جڑوں تک پہنچ جاتے تھے۔ بلا کے ذہین اور فعال انجینئر ثابت ہوئے۔ بمبئی میں، جھانسی کے ریلوے ورکشاپ میں، شمالی محکمۂ انہار میں ساردا نہر کی تعمیر پر، سمندری جہازوں پر، کانپور میں، غرض یہ کہ کوئی بارہ چودہ اعلیٰ سطح کی ملازمتیں کیں، ہر جگہ اعلیٰ ترین کام کیا، مگر جمے کہیں بھی نہیں۔ محنت، دیانت داری، ایمان داری اور خودداری کے ساتھ ساتھ مزاج میں ایک سیلانی کیفیت ہمیشہ غالب رہی۔

لانبا قد، سرخ و سفید تیکھا چہرہ، بھورے لانبے بال، حرکات و سکنات میں بے چینی، کسی ازلی دکھ کو، نہ جانے کیوں، اپنی کوکھ میں سموئے ہوئے، یہ سرگرداں ہی رہے، حتیٰ کہ ۱۹۴۴ء میں، لکھنؤ ہی میں جان دے دی۔

''آئینۂ حیرت'' کے نام سے کہانیوں کا ایک مجموعہ، ۱۹۴۴ء میں، ساقی بک ڈپو، دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں ۸ کہانیاں ہیں۔ پھر بہت بعد میں کراچی کے ایک ادبی رسالے میں چند غیر مطبوعہ تخلیقات ''باقیات'' کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ ان ''باقیات'' میں ایک افسانہ ''نیم کی نمکولی'' ہر سطح پر ایک عظیم شاہکار ہے۔ ایک نامکمل ناولٹ ''فسانۂ اکبر'' کی اٹھان بھی حیرت زدہ کرتی ہے۔

سید رفیق حسین کو فوت ہوئے پچاس برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔ خاص و عام کے تخیل و حیرت میں جو اعلیٰ مقام تخلیق کے اس عظیم ہنرمند کو ملنا چاہیے تھا وہ ہرگز نہیں ملا ہے۔ غالباً اصیل چیزوں سے بے اعتنائی اور بے وفائی ہماری سرشت میں ہے۔ مگر ان کہانیوں کے طلسم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر انداز کی سفاکی کے باوجود یہ کہانیاں زندہ رہی ہیں، یہی نہیں بلکہ چند انوکھے اور چیدہ دلوں کو انھوں

نے ان برسوں میں زندہ بھی رکھا ہے۔

''آئینۂ حیرت'' کی کہانیوں کو صرف جانور شناسی کی وساطت پر کھنا ان کہانیوں کے ساتھ ایک اور زیادتی ہوگی۔ یہ تو یوں ہی ہوگا کہ جیسے ہم دیوانِ غالب کو محض صرف ونحو کی کتاب گردانیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باشعور فن کار کی حیرت انگیز حد تک خالص اور عظیم کہانیاں تو جاندار کے ارتقائی عمل کے اس ورثے اور اس ورثے کی ماہیت کے بارے میں ہیں کہ جو آدمی اور حیوان، جنگل اور آسمان میں ہمیشہ سے مشترک ہے۔

آپ ان کہانیوں کو بار بار پڑھیں۔ کائنات کا یہ راز آپ پر بھی منکشف ہوگا۔

(لاہور، ۱۹۹۸ء)

سید رفیق حسین

ا

سید رفیق حسین کو اردو کا تقریباً اُمّی افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے جس کا اردو ادب کا مطالعہ صفر کے آس پاس تھا اور جس کو اردو لکھنا بھی ٹھیک سے نہیں آتا تھا۔ مندرجہ ذیل شواہد اس تاثر کو تقویت دیتے ہیں:

(۱) خود رفیق حسین کا اپنے بارے میں بیان ہے:

> اردو بالکل نہیں لکھ سکتا۔ املا قطعی درست نہیں۔ میری لکھت میں خود نہیں پڑھ سکتا، نہ کوئی اور، سوائے میری لڑکی کے... [اور]... اردو زبان کی گنتی کی چار پانچ کتابیں پڑھی ہوں گی۔

("خودنوشت" مشمولہ "میرا بہترین افسانہ")

(۲) شاہد احمد دہلوی کو پہلی بار رفیق حسین کا جو افسانہ ملا اس کا مسودہ اس قدر غلط سلط تھا کہ شاہد احمد اسے پڑھے بغیر پھینکنے/ واپس کیے دے رہے تھے۔[1]

(۳) رفیق حسین کے داماد سید مختار اکبر بتاتے ہیں:

> افسانہ نویسی و مضمون نگاری کے دور سے قبل وہ خالی وقت میں پڑھا

---

[1] یہ افسانہ "کفارہ" تھا۔

ضرور کرتے تھے مگر سستا لٹریچر، یعنی گھٹیا مار دھاڑ والی وائلڈ ویسٹ ناولیں۔ اردو نہ ان کو آتی تھی نہ میں نے انھیں اردو کی کوئی قابل ذکر کتاب پڑھتے کبھی دیکھا... وہ شاید اپنا لکھا خود بھی نہ پڑھ پاتے ہوں گے۔ قلم کو اس قدر دباتے تھے کہ کاغذ میں جگہ جگہ چھید ہو جاتے، اور املا اس قدر صحیح کہ ایک سطر میں پانچ غلطیاں معمولی بات تھی۔ مرتے دم تک ''کہ'' اور ''کے'' کا محل استعمال ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا...

ان کی بیٹی قمر مرحومہ ان کی ادبی سرگرمیوں میں ... ان کی مشیر ہی نہیں بلکہ مرشد کا درجہ رکھتی تھیں۔ وہ افسانے کا خاکہ انگریزی اردو کے کھچڑی الفاظ میں تیار کرتے، بیٹی اسے شستہ زبان میں ترتیب دیتیں۔ خود جس قدر بدخط تھے، بیٹی اسی قدر خوش خط۔ گو پہلے ہی افسانے کے بعد ادبی دنیا میں روشناس ہو گئے تھے، مگر ان کی نام وری تمام تر بیٹی کا کارنامہ ہے۔ بیٹی کی رفاقت میسر نہ ہوتی تو ان کے بہت سے افسانے نامکمل ہی رہتے، یا ان کی ترتیب وہ نہ ہوتی جو اب ہے۔

(مضمون ''سید صاحب'')

(۴) رفیق حسین کی بھانجی الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

ان کی افسانہ نگاری میں قمر باجی ایک سکریٹری کی حیثیت سے شریک تھیں۔ وہ بڑی خوش خط اور سجل ہستی تھیں۔

(مضمون ''خزاں کے رنگ'')

لیکن ان شواہد کی روشنی میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل شواہد پر بھی نظر رکھنا چاہیے:

(۱) رفیق حسین لکھتے ہیں:

انگریزی ناولوں اور افسانوں میں اگر ۷۵ فی صدی عشق و محبت کا ذکر

ہوتا ہے تو کم از کم ۲۵ فی صدی اور مسائل پر بھی لکھا جاتا ہے، لیکن اردو میں دو سو فی صدی عشق و محبت ہوتا ہے، گو اس طرف کچھ مستثنیات نظر آنے لگے ہیں۔ اس لیے میں نے طے کیا ہے کہ کبھی عشق و محبت پر کچھ نہ لکھوں گا۔

("خود نوشت" مشمولہ "میرا بہترین افسانہ")

(۲) رفیق حسین کا یہ بھی بیان ہے:

مصنفین میں ٹالسٹائی مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔

(۳) اپنے نا تمام ناولٹ (یا ناول؟[۲]) "فسانۂ اکبر" کی ابتدا میں رفیق حسین نے اپنے دلچسپ حالات زندگی لکھے ہیں۔[۳] ان میں بتاتے ہیں:

بھوپال میں ایک خاص شخص سے واسطہ پڑا جس نے پھر میرے دماغ اور کیرکٹر پر گہرا اثر ڈالا۔

یہ خاص شخص ماسٹر حضور احمد تھے جو رفیق حسین کے بھتیجے کو پڑھانے آتے تھے۔ چھ مہینے تک رفیق حسین ان سے بیزار اور کھنچے کھنچے رہے، لیکن آخر جب بات چیت شروع ہوئی تو:

یہ معلوم ہوا کہ مقناطیس تھا جس نے مجھے کھینچ لیا۔ انگریزی ان کو خاک نہ آتی تھی۔ عربی بھی شاید کام نکالنے بھر کی یعنی کتابیں پڑھنے بھر کی آتی تھی۔ فارسی اور اردو کا کیا کہنا، ایک زندہ کتب خانہ تھے۔ تواریخ سے شوق بہت بڑھا ہوا تھا۔ لٹریچر کا ذوق سلیم تھا... حضور احمد نے میرے آگے ایک نئی دنیا روشن کردی۔ اب مجھے علم کا میدان ایک اصلی چیز نظر آنے لگا۔ خود اس وقت تک

---

۲ "فسانۂ اکبر" رسالہ "نیا دور" کے چون (۵۴) صفحوں میں آیا ہے۔ لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ رفیق حسین اسے بھی اور کتنا بڑھانا چاہتے تھے۔ موجودہ صورت میں اسے "فسانۂ اکبر" نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ ابھی مصنف صرف ایک بار اکبر کے دربار میں پیش ہوا ہے، وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ ممکن ہے آگے بڑھ کر اکبر اس داستان کا مرکزی کردار بنتا اور اس کا افسانہ ناول کی صورت اختیار کرتا۔

۳ "فسانۂ اکبر" کا یہ تمہیدی حصہ رفیق حسین کے حالات کا اہم ماخذ ہے۔ اسی حصے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اناوے میں عظیم بیگ چغتائی رفیق حسین کے ہم جماعت اور قریبی ساتھی تھے۔

قطعی جاہل تھا... اردو میں رسالہ ''مخزن'' بڑی آب وتاب سے اس زمانے
میں شائع ہوتا تھا۔ ہر چند پڑھتا، مگر گھنٹہ بھر الجھ الجھ کر ایک صفحہ پڑھا تو دماغ
پراگندہ ہو گیا، لطف کیا خاک آتا۔ آخر حضور احمد کا ہی دماغ چاٹتا تھا۔ نہ میری
سیری ہوتی تھی، نہ وہ تھکتے تھے۔ موتیا تالاب کے کنارے کسی چٹان پر بیٹھے
ہیں اور یک رخی باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ بول رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں:
''دیکھیے رفیق میاں، اب اسی خیال کو حافظ کس سادگی سے ادا کرتے ہیں''
... ایک سال نہ گذرا تھا کہ میں فارسی سمجھنے اور بولنے لگا (پڑھنا تو کجا، آج
تک اردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی)۔[۲۴]

اپنی فارسی دانی کا ذکر ایک اور جگہ اس طرح کرتے ہیں:

فارسی کبھی نہیں پڑھی، مگر بول سکتا ہوں اور چھوٹا موٹا مضمون تک لکھ لیتا
ہوں۔ لکھی ہوئی فارسی کی ایک سطر نہیں پڑھ سکتا۔

(''خودنوشت'')

(۴) اسی بیان میں اپنی اردو تحریروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

جس وقت طبیعت موزوں ہوتی ہے اور تصور کے نقشے کاغذ پر اترنے کے
لیے بے قرار ہوتے ہیں تو معمولی معمولی لفظوں کے ہجوں میں کئی کئی منٹ
صرف ہو جاتے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری چیزیں فن کے اعتبار سے مکمل ہوتی ہیں، لیکن
چوں کہ فنونِ لطیفہ پر غائر نظر رکھتا ہوں اس لیے آپ ان میں فن کی جھلکیاں
ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

---

[۲۴] اسی بیان میں رفیق حسین بتاتے ہیں کہ ۱۹۱۸ء میں ''حضور احمد دل کے ارمان دل ہی میں لے کر اس دنیا سے رخصت
ہو گئے۔''

اور:

میں افسانہ لکھنے سے قبل اس کے پلاٹ اور تمام جزئیات کا اپنے تصور میں
مکمل جائزہ لے لیتا ہوں۔

(۵) رفیق حسین اپنے نئے افسانے اپنی چھوٹی بہن، سیدہ ممتاز جہاں بیگم (والدہ الطاف فاطمہ)، کو سناتے تھے۔ الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

وہ افسانے بھی تو ہمارے لیے ایک مصیبت تھے۔ جس دن وہ اپنے ہاتھ میں نا پختہ سی لکھائی میں لکھے کاغذ اٹھائے داخل ہوتے ہم سمجھ جاتے کہ آج چپ شاہ کا روزہ رکھنا ہے۔ دونوں بہن بھائی افسانہ سننے اور سنانے کے عمل کو عبادت کا سا درجہ دیتے۔ اماں فوراً پان، سروتے اور سلائی بنائی سے فارغ ہو کر اشاروں میں ہم کو اِدھر اُدھر ہو جانے کا حکم دیتیں اور دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر بیٹھ جاتیں۔ پھر وہ ایک ایک لفظ سنتیں۔ کہیں کہیں رک کر تبادلۂ خیال ہوتا، کوئی لفظ کاٹا اور کوئی لکھا جاتا تھا۔

(''خزاں کے رنگ'')

ان بیانوں کو ملانے سے رفیق حسین کے بارے میں کچھ متضاد سی اطلاعات حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) وہ گھٹیا مار دھاڑ والے انگریزی ناول پڑھتے تھے لیکن مصنفین میں ٹالسٹائی کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ یعنی ٹالسٹائی کے سے سنجیدہ لکھنے والوں کا بھی مطالعہ کیے ہوئے تھے۔

(۲) انھوں نے اردو زبان کی بہ مشکل چار پانچ کتابیں پڑھی تھیں لیکن انگریزی اور اردو فکشن کا تقابل کر کے یہ رائے بھی دیتے ہیں کہ اردو فکشن میں عشق و محبت کی بھرمار ہے، اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اب (غالباً ترقی پسند تحریک کے زیر اثر) اردو میں غیر رومانی فکشن کی بھی تخلیق ہونے لگی ہے۔

(۳) وہ فارسی لکھ سکتے تھے مگر پڑھ نہیں سکتے تھے۔

(۴) اردو پڑھ سکتے تھے مگر لکھ نہیں سکتے تھے۔

(۵) انھوں نے اردو کا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن اردو لکھ لیتے تھے۔

(۶) وہ افسانہ انگریزی اردو کی کھچڑی زبان میں ایک خاکے کے طور پر تیار کرتے تھے، پھر ان کی بیٹی اس خاکے کو فصیح اردو میں افسانے کی شکل دیتی تھیں۔

یہ متضاد نما بیان شبہ پیدا کر سکتے ہیں کہ بیان دینے والوں سے کہیں کچھ غلط بیانیاں ہوگئی ہیں۔ لیکن حقیقت شاید یہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان بیانوں میں مطابقت پیدا کرنا ممکن ہے، جس کے بعد رفیق حسین کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آسکتی ہے۔ بیانات کی تطبیق کے بعد یہ تصویر کچھ یوں بنتی ہے:

(۱) رفیق حسین نے اردو کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ انھوں نے چند ہی اردو کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوگا۔ لیکن کتابی علم کی اس کمی کو ماسٹر حضور احمد کی صحبت نے بڑی حد تک پورا کر دیا۔ حضور احمد نے رفیق حسین میں فارسی کا ذوق بھی ایسا پیدا کیا کہ وہ فارسی زبان بولنے اور کسی حد تک لکھنے پر بھی قادر ہو گئے، لیکن کتابی فارسی کا پڑھنا اور سمجھنا ان سے ممکن نہ تھا۔

(۲) وہ اردو زبان کے عالم تو کیا طالب علم بھی نہیں تھے، لیکن یہ ان کی مادری زبان تھی۔ ان کے خاندان کی علمی اور ادبی روایت بہت مضبوط تھی۔ اس روایت اور اردو کے ایک اہم مرکز لکھنؤ سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہ ایک مستند اہل زبان کی طرح اردو میں اپنے خیالات ادا کر سکتے تھے۔ لیکن اردو رسم خط میں لکھنے کی مشق نہ ہونے کے باعث وہ املا کی غلطیاں بہت کرتے تھے اور بد خط بھی تھے۔ یعنی ان کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ فلاں خیال کو کن لفظوں میں ادا کیا جائے، بلکہ یہ تھا کہ فلاں لفظ کو کن حرفوں میں لکھا جائے۔ ان کے ہاتھ کا مسودہ پڑھنا بہت مشکل ہوتا تھا، اسی لیے شاہد احمد دہلوی ''کفارہ'' کے افسانے کو فضول سمجھ کو لوٹائے دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ رفیق حسین کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور ''کفارہ'' کی تصنیف اور اس کے مسودے کی تیاری میں بیٹی کا تعاون شامل نہیں تھا۔ بعد میں ان کی تحریروں کی خوش خط نقلیں تیار کرنے کا کام بیٹی نے اپنے ذمے لے لیا۔ اس کے علاوہ وہ مناسب اور برمحل الفاظ کی تلاش میں بیٹی سے بھی تبادلۂ خیال کرتے تھے اور اپنی چھوٹی بہن سیدہ ممتاز جہاں بیگم سے بھی۔

(۳) اپنی بعض تحریروں کے خاکے تیار کرنے میں رفیق حسین جلد باز طبیعت کی وجہ سے انگریزی الفاظ بھی استعمال کر جاتے تھے جن کی جگہ پر ان کی بیٹی اردو الفاظ رکھ دیتی تھیں۔

(۴) رفیق حسین انگریزی کے گھٹیا مار دھاڑ والے ناول شوق سے پڑھتے تھے جن کے لکھنے والے بیانیے کو دلچسپ اور تیز رفتار بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ٹالسٹائی کا سا سنجیدہ اور بوجھل اسلوب والا فلسفی مزاج ناول نویس ان کا محبوب مصنف تھا۔

(۵) رفیق حسین نے فکشن کا وسیع مطالعہ خواہ نہ کیا ہو لیکن کار آمد مطالعہ ضرور کیا تھا۔ کہانی بنانے میں وہ محنت کرتے تھے اور کہانی سنانے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ اور سب سے ماوراوہ ''چیزے دگر'' بھی ان کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھی جو تنقید اور تجزیے کی گرفت میں نہیں آتی۔

۲

رفیق حسین کا شمار اس لحاظ سے اردو کے بدقسمت افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے کہ ان کی طرف وہ توجہ نہیں کی گئی جس کے وہ مستحق تھے، لیکن رفیق حسین گم نام کبھی نہیں رہے، نہ ان کو یکسر فراموش کیا گیا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی ایک سے زیادہ بار (میرے علم میں کم سے کم چار بار) چار مختلف ناموں سے [۵] شائع ہوا۔ جانوروں کے افسانے لکھنے والے کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ یاد رکھا گیا، لیکن خود یہ افسانے قریب قریب فراموش کر دیے گئے۔ اس فراموش کاری کا ایک ثبوت اس زمانے میں سامنے آیا جب نوجوان افسانہ نگار سید محمد اشرف نے جانوروں کو کردار بنا کر بعض اچھے افسانے لکھے۔ اس وقت کچھ لوگوں نے کہا، اور کچھ نے باور بھی کر لیا، کہ عرصہ پہلے سید رفیق حسین نے جانوروں کے جو افسانے لکھے تھے اشرف کے افسانے انھیں کا چربہ ہیں، اور اس بے بنیاد قول فیصل نے اس حوصلہ منداور عمدہ افسانہ نگار کو خاصی تکلیف پہنچائی۔ ہم بہر حال یہی سمجھتے رہے کہ ہم کو رفیق حسین کی طرح ان کے افسانے بھی یاد ہیں جو جانوروں کے متعلق ہیں، یعنی جب ہم اردو افسانوں کو رومانی، سماجی، نفسیاتی، جنسی وغیرہ کے خانوں میں بانٹیں گے تو جانوروں کے افسانوں کا بھی ایک خانہ بنا کر اس میں رفیق

---

۵ ''آئینۂ حیرت''، ''گوری ہو گوری''، ''بے زبان''، ''شیر کیا سوچتا ہوگا''۔

حسین کا نام درج کر دیں گے (اور ابوالفضل صدیقی اور سید محمد اشرف کا بھی، اس فرق کے ساتھ کہ ابوالفضل اور اشرف نے "دوسری قسموں" کے افسانے بھی لکھے ہیں)۔ غرض رفیق حسین کو ہم نے اپنے یہاں کے بڑے افسانہ نگاروں میں شامل نہیں کیا۔ یہ ان کی اور اردو کی بھی، بدقسمتی تھی، اور اس بدقسمتی کی توثیق اس وقت ہوئی جب رسالہ "نیا دور" کراچی نے اپنے ایک شمارے (۴۶-۴۵) میں رفیق حسین کے لیے ڈھائی سو سے زیادہ صفحے وقف کیے۔ ان صفحات میں رفیق حسین کی افسانہ نگاری پر اختر حسین رائے پوری اور شمیم احمد کے تنقیدی مقالے، ان کی زندگی اور انوکھی شخصیت پر الطاف فاطمہ، سید فضل قدیر اور سید مختار اکبر کے بہت اچھے مضامین اور خود رفیق حسین کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کا انتخاب (تقریباً دو سو صفحات میں) شامل تھا، اور اس انتخاب میں "فنا"، "نیم کی نمکولی" اور "فسانۂ اکبر" کے سے غیر معمولی افسانے بھی تھے (اور یہ جانوروں کے افسانے نہیں تھے)۔ "نیا دور" نے یقیناً رفیق حسین کی قدر شناسی کا حق ادا کیا اور ان کی طرف وہ توجہ کی جو ابھی تک نہیں کی گئی تھی، لیکن "نیا دور" کے سے معتبر اور باوقار رسالے کی اس اہم اور یادگار اشاعت کے باوجود اردو ادب میں رفیق حسین کی صورت حال تقریباً وہی رہی جو پہلے تھی، اور تنقید نے ان کو زیادہ اعتنا کی نگاہ سے نہیں دیکھا، البتہ آصف فرخی نے اپنے مضمون "رفیق حسین: زبان بے زبانی" میں ان کے افسانوں کا بہت اچھا جائزہ لیا اور اس میں بحث کے کئی دروازے کھولے، لیکن اس مضمون نے بھی دوسرے لکھنے والوں میں کوئی خاص تحریک پیدا نہیں کی، اور اب تو کچھ ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ رفیق حسین ہماری کم توجہی سے زیادہ اپنے مقدر کا شکار ہیں۔

۳

رفیق حسین کے افسانوں، خصوصاً "آئینۂ حیرت" میں شامل آٹھ افسانوں، کے بنیادی موضوع یا موضوعات کا تعین ابھی ہونا ہے، اور یہ کچھ آسان کام نہیں ہے۔ سہولت کی خاطر کہا جا سکتا ہے کہ ان افسانوں کا موضوع جانور ہیں۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ رفیق حسین جانوروں کے موضوع پر ہمیں کیا بتانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جانوروں کی ہیئتوں، اداؤں، عادتوں، جبلتوں اور

جذبوں تک کی عمدہ تصویریں کھینچی ہیں، تاہم جانوروں کے متعلق معلومات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ افسانے تشنہ معلوم ہوتے ہیں اور جانوروں سے واقفیت اور ان کی قلمی تصویریں بنانے میں رفیق حسین سے کہیں بڑا ماہر جیر الڈ ڈریل ٹھہرتا ہے (اور تھا بھی، اس لیے کہ وہ جانوروں کا عاشق بھی تھا اور تاجر بھی۔ یہ تجارت اس کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھی، اور شاید اتنا ہی بڑا ذریعہ جانوروں سے متعلق اس کی تحریریں بھی تھیں)۔ لیکن جانور شناسی کے نقطۂ نظر سے رفیق حسین کو پرکھنا ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ یہ خیال کرنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ ان کا بنیادی موضوع جانور اور انسان کا موازنہ ہے، اور یہ خیال کرنا اور بھی نامناسب ہوگا کہ وہ جانور کو انسان پر فوقیت دیتے ہیں۔ جانور اور انسان کا اس قسم کا تقابل ان کا مقصود نہیں معلوم ہوتا، البتہ ان کے یہاں یہ دونوں فطری (جبلی) اور ساختہ (عقلی) مظاہر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے افسانوں میں کہیں کہیں ان دونوں مظاہر کا تقابل بلکہ تصادم بھی ہوتا ہے۔ حیوان فطری وجود کا نمائندہ ہے، اور انسانی وجود اس کو کبھی مسخ کرتا ہے، کبھی خطرے میں ڈالتا ہے اور کبھی فنا کر دیتا ہے۔ اسے رفیق حسین کا بنیادی موضوع خواہ نہ کہا جائے لیکن یہ ان کے افسانوں کا ایک مشترک موضوع ضرور ہے، کیوں کہ یہ "آئینۂ حیرت" کے آٹھوں افسانوں میں موجود ہے۔ گوشوارہ اس طرح ہے:

(۱) "کفارہ": انسان (بہاری) جنگل میں جا بستا ہے۔ شیروں کا شکار چرا چرا کر کھاتا ہے۔ شیرنی اس کو مار ڈالتی ہے جس کے بعد اس کا نر اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ انسانی خون کے اثر سے شیرنی آدم خور ہو جاتی ہے اور نتیجے میں اپنے ایک بچے کے ساتھ انسان (احمد محمود) کے ہاتھوں ماری جاتی ہے۔ دوسرا بچہ قیدی بنا لیا جاتا ہے۔

(۲) "کلوا": کتا انسان (مَنن) کی محبت میں ڈوب کر مر جاتا ہے۔

(۳) "بیرو": نیل گائے انسان (جوگی) کے ڈالے ہوئے کنٹھے کی وجہ سے اس وقت تک اپنے ہم جنسوں کی برادری سے باہر حیران و پریشان رہتا ہے جب تک وہ کنٹھ ٹوٹ نہیں جاتا۔ شیر ایک ریچھ سے لڑتے ہوئے مارا جاتا ہے جو اپنی عادت کے خلاف شیر سے اس لیے لڑ پڑا تھا کہ ایک انسان (کسی شکاری) کی گولی سے زخمی ہو کر اس کی ریچھنی کی موت نے اسے پاگل سا کر دیا تھا۔ شیر

سے لڑنے میں ریچھ کی جان جاتی ہے۔

(۴) "گوری ہو گوری": گائے کا بچھڑا موت کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے اس لیے کہ انسان (مادھو یا بسنتی) نے اسے کھونٹے سے باندھ دیا ہے اور سیلاب کا پانی چڑھتا ہوا اس کی ناک تک آ پہنچا ہے۔

(۵) "آئینۂ حیرت": بندریا کی زندگی سراپا الم ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ انسان (قریشی خاندان) نے اس کے بچے کو اس سے چھین لیا ہے۔ (بندریا اور "گوری ہو گوری" کی گائے، دونوں اپنے بچے کو پا جانے کے بعد بھی اسے ساتھ نہیں لے جا سکتیں اسی لیے کہ انسان کی باندھی ہوئی رسی نے بچوں کو جکڑ رکھا ہے۔) بندریا لینڈ سلائڈ کے وقت انسان کے بچے کو اٹھا کر بھاگتی ہے، اس لیے تین ٹانگوں سے چلنے پر مجبور ہے، اور اسی لیے لینڈ سلائڈ کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ (اس کا اپنا بچہ اس کے پیٹ سے اس طرح چپک جاتا کہ وہ چاروں ہاتھ پیر استعمال کر سکتی اور شاید بچ نکلتی، خود بھی اور اس کا بچہ بھی، بلکہ اگر بچہ چھینا نہ گیا ہوتا تو وہ لینڈ سلائڈ کے علاقے سے کب کی اپنے محفوظ میدانی مسکن کو لوٹ گئی ہوتی۔)

(۶) "ہر فرعونے را موسیٰ": عظیم الجثہ ہاتھی انسان (کسی شکاری) کی گولی سے کانا ہو کر قہر و غضب اور مکاری کا پیکر بن جاتا ہے اور آخر انسان (کلوا پاسی) کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔

(۷) "شیریں فرہاد": بلی انسان (نسیمہ) کی محبت میں ایک گھر سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اسے اور اس کے بلے کو انسان (اقبال احمد) خالی مکان کے ایک کمرے میں مقفل کر کے چلا جاتا ہے، جہاں کئی دن کی بھوک سے بے تاب ہو کر بلا اپنی محبوبہ بلی کو کھا جاتا ہے، اور پھر اسے ڈھونڈتا بھی پھرتا ہے۔

(۸) "بے زبان": سرکس کی چلبلی گھوڑی انسان (گونگی لڑکی) کی صحبت سے محروم ہو کر انسان (سرکس والوں) کے ظلم سہتی ہے۔ مدتوں بعد اتفاقیہ اپنی محبوب انسانی ہستی (گونگی لڑکی) کو پا کر پاگل سی ہو جاتی ہے، اور یہی پاگل پن اس کی جان لے لیتا ہے۔

یعنی (کم از کم اس گوشوارے کی حد تک) انسان کی جانور سے دوستی ہو یا دشمنی، جانور کو انسان

سے انس ہو یا وحشت، ہر صورت میں انسانی وجود حیوانی وجود کے لیے مہلک ہے۔ انسانی وجود حیوانی وجود سے بدتر ہے یا بہتر، اس بحث سے رفیق حسین سے زیادہ سروکار نہیں رکھا ہے، لیکن ان کے افسانے یہ ضرور بتاتے ہیں کہ جنگل کا ایک مقررہ قانون ہے جس سے اس کے باشندے انحراف نہیں کرتے، اور اگر شاذ و نادر انحراف کرتے ہیں تو ''کفارہ'' کی شیرنی اور ''ہر فرعونے راموسیٰ'' کے ہاتھی کی طرح اپنی سزا کو پہنچتے ہیں۔ جنگل کا قانون لازماً انسانی قانون سے بہتر نہیں ہے — یہاں بھی خون بہتا ہے اور یہاں بھی جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہے — لیکن یہ قدرت کا قانون ہے، اور رفیق حسین کے لفظوں میں قدرت کے قوانین بے رحم ہیں۔ اور ان قوانین سے بھی زیادہ بے رحم وقت ہے جو ''آئینہ حیرت'' کے لینڈ سلائڈ کی طرح ہر چیز پر سے گذرتا، ہر چیز کو فنا کرتا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو فنا کرنے کے لیے پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ چند اقتباس دیکھیے:

> اب موسم بھی اور ہے۔ ہولی جل چکی ہے۔ سبز لہلہاتے چاندر کو چار مہینے کی سخت سردی نے مار کر سکھا دیا ہے۔ یہاں نہ اب چڑیاں چہچہاتی ہیں نہ کالا تیتر بولتا ہے۔ کھڑ کھڑاتا ہوا بھورا چاندر ایک چنگاری کا منتظر تھا جو کسی نہ کسی طرح ہر چاندر میں پہنچ کر ان مردہ گھانسوں کو فنا کی آخری منزل میں پہنچا دیتی ہے اور جب چاندر جل کر بھوری اور سیہ راکھ سے ڈھکا ہوا نکل آتا ہے تو اس کی خاک سے آنے والی نسل کے بے خبر نونہال پودے ہنستے ہوئے سر نکالتے ہیں۔ ظالم، ظالم، قدرت کے قوانین ظالم ہیں۔ (''کفارہ'')

> ہم روز دیکھتے ہیں کہ صبح کو ہلکی روشنی میں ہر چیز خوش حال، تر و تازہ، شاداب ہوتی ہے؛ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلتے ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں؛ پھول مسکراتے ہیں؛ سبزہ لہلہاتا ہے۔ اور چند ہی گھنٹے بعد چوندھیاتی دھوپ میں ہر چیز دہکتی ہے؛ جھلستی ہے؛ ہوائیں گرم اور خاک آلود ہو جاتی ہیں؛ چڑیاں ادھر ادھر چھپ جاتی ہیں؛ پھول نڈھال ہو کر کمھلاتے اور گرتے

ہیں؛ ہریاول پر دھوپ پڑتی ہے، خاک چھاتی ہے۔ دن رات یہی قدرت
کے پلٹے ہیں۔ پھر کون سی حیرت کی بات ہے کہ سرکس کی وہ تندرست سیاہ
چمکتی شوخ گھوڑی کان پور میں نیلام ہونے کے چند دن بعد یکے میں جتنے
والی گھڑیا ہوگئی۔ (''بے زبان'')

ایک بوڑھی بندریا... بڑ کے درخت کے پاس اکڑوں بیٹھی ہے۔ لمبے ہاتھ
گھٹنوں پر ٹکے ہوئے آگے پھیلے ہیں۔ بدن پر چمکتی ہوئی پوستین کے بجائے
لمبے اور چھدرے بال بے ترتیبی سے منتشر ہیں۔ لٹکی ہوئی بھنوؤں کے نیچے
معمول سے کہیں زیادہ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ یہ گھنٹوں ایک جگہ
نگاہیں جمائے اسی حالت میں بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی سوکھا پتا ہوا میں
تلملاتا اس کے کان کے پاس سے گذرتا ہے تو سر ایک طرف جھکا کر پتے کو
گر جانے دیتی ہے اور پھر ویسے ہی بیٹھ جاتی ہے:

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

زندگی، پرعیش اور پر کیف زندگی، بچپن کی پر سحر بے فکر زندگی، جوانی کی مست
زندگی، کیا تو اسی واسطے عطا ہوئی تھی کہ وقت آخر تیری یاد کے تازیانے پشت
خمیدہ کی دھجیاں اڑائیں؟ (''آئینۂ حیرت'')

چاندرا گتا ہے۔ وہ ہستیاں جو کبھی حیات کی طالب نہیں ہوئی تھیں، عالم بے خبری
میں وجود میں لا کر اس دنیا میں گرم و سرد جھونکے برداشت کرنے کے لئے
چھوڑ دی جاتی ہیں۔ عرصۂ حیات کم ہے، مصائب عالم بھی ہیں، موسم کی سختیاں
بھی ہیں، وجود کی جدوجہد بھی جاری ہے، کہ بیڑا پار لگ جاتا ہے۔ اور پھر وہی

ہوتا ہے۔ ظلم، ظلم، قدرت کے قوانین کیسے ظالم ہیں۔ قد آور درخت، چھوٹے پودے، لاکھوں قسم کی گھانسیں، بڑے بڑے جانور اور درندے، چوپائے اور پرندے، چھوٹے چھوٹے جانور، کروڑ ہا قسم کے کیڑے، اور انسان، سبھی قانون کے تابع پیدا ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ چکی چل رہی ہے، آٹا نکل رہا ہے۔

("کفارہ")

اور یہ "آئینۂ حیرت" کا لینڈ سلائڈ ہے۔ لینڈ سلائڈ؟ یا گذرتے ہوئے وقت کی تجسیم؟ فنا کے اس کہرام میں ایک جان دار وجود ایک اور جان دار وجود کا بوجھ اٹھائے بقا کی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے:

پہاڑ گر رہا تھا۔ لینڈ سلپ ہو رہی تھی۔ پوری زمین، مکان، باغ، درخت اوپر نیچے کے جنگلوں سمیت، تیزی سے پھسل رہی تھی۔ سکنڈوں نہیں بلکہ پلکوں حالت بدل رہی تھی۔ زمین جگہ جگہ پھٹی۔ سیدھے درخت اپنی اپنی جگہ ٹیڑھے بکڑے ہوئے تھے۔ قریشی صاحب کی کوٹھی کانپی، لرزی، پھوٹ پھوٹ ہو کر بزدل کی طرح اڑ اڑا کر بیٹھ گئی۔ دھڑ دھڑ، ہاؤں ہاؤں کی بڑھتی ہوئی تا بہ فلک آوازوں میں گری ہوئی کوٹھی کا ملبہ نیچے دوڑا، پیچھے سے گرتے پڑتے سرنگوں درخت دوڑے۔ ہزاروں قد آور درخت، کروڑوں من ملبہ، لاکھوں من پتھر، ایک دوسرے پر گرتے، پلٹے کھاتے، ٹوٹتے، توڑتے، مسمار ہوتے اور سامنے کی ہر چیز کو تباہ کرتے گر رہے ہیں اور گرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان ہی میں، ان آوازوں میں، اس اندھیرے میں، لاکھوں لڑھکتے ہوئے پتھروں میں، تیز پھسلتی ہوئی سلوں میں، مشت خاک، تین ٹانگ کی بندریا ہے (کیوں کہ ایک ہاتھ سے بچے کو تھامے ہے)۔ چھوٹے پتھروں سے کتراتی ہے، بڑے پتھروں پر چڑھ جاتی ہے۔ سلیں اور چٹانیں اس کو پیس دینے کے لیے پھسلتی ہوئی لپکتی ہیں، یہ کود کر ان ہی پر سوار ہو جاتی ہے۔

> دیوہیکل درخت سیکڑوں ہاتھ پھیلائے اس پر لڑھکتا ہے، جھاڑو دیتا، سامنے کی ہر چیز سمیٹتا آتا ہے، بندریا اس کی ڈالی ڈالی اچکتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں من سلیں، پتھر، درخت مٹی برابر اوپر سے گر رہے ہیں۔ پہاڑ کے اس طرف کا پورا ڈھال، چوٹی سے لے کے نیچے بیر بھٹی تک، پھسل پڑا ہے۔ بیر بھٹی کی آبادی کئی سو فیٹ ملبے کے نیچے دفن ہوگئی ہے۔ کیا جھونپڑا، کیا مکان، کیا امیر، کیا غریب، کیا پیر، کیا فقیر، سب دفن ہو چکے ہیں۔ فردوس کالج کے منتشر ٹکڑوں پر گزوں بلکہ بلّیوں ملبہ گر چکا ہے اور گر رہا ہے۔ اور اب بھی، اس شورِ قیامت میں، اس اندھیرے میں، بندریا پتھر سے چٹان پر، اور چٹان سے درخت پر، درخت سے نگل جانے والے ملبے پر اچکتی ہے۔ تین ہی ہاتھ پیر ہیں، اور ایک ہاتھ سے بچہ سینے سے چمٹا رکھا ہے۔ بندریا ہر وقت اچھل رہی ہے؛ ہر کچل کر پیس لے جانے والی چیز پر اچک کر سوار ہو جاتی ہے؛ اور پھر جب اس چیز کے خود دفن ہونے کی نوبت آتی ہے تو اس سے اوپر آنے والی چیز پر اچک کر سوار ہو جاتی ہے۔

یہ ایک کامل علامتی بیانیہ ہے: کامل اس لیے کہ علامتی مفہوم کے بغیر بھی اس کی منظری حقیقت قائم رہتی ہے، یعنی یہ اپنی بیانیہ حیثیت میں علامتی تاویلوں کا محتاج نہیں ہے۔

''آئینۂ حیرت'' کے افسانوں کو ایک سے زیادہ بار پڑھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ رفیق حسین نے جنگل اور حیوان کو اپنا کینوس بنایا ہے، لیکن ان کی توجہ کا مرکز وجود اور اس کا عدم، حیات اور اس پر زمان کا گہرا سایہ ہے۔ لینڈ سلائڈ کے مندرجۂ بالا منظر کے فوراً بعد کا بیان دیکھیے:

> رات کی تباہ کاریوں کے بعد فلک پیر انتہائی معصومیت سے مسکرایا۔ خاموش پہاڑیوں میں صبح ہوئی۔ بادل بھی چھٹ چکے ہیں، کہرا بھی نہیں ہے، ہوا بھی بند ہے۔ دو چار چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ بیر بھٹی کی آبادی تین سو فیٹ ملبہ اوڑھے ٹھنڈی پڑی سو رہی ہے۔ سامنے مخمور کالا پہاڑ ڈیڑھ میل چوڑا، دو

ہزار فیٹ لمبا، کتھئی بھورا دہانہ پھاڑے جمائی سی لے رہا ہے۔ لمبی چوڑی
جمائی ہے، کچھ عرصہ لگے گا۔ پانچ سو برس میں پھر اس دہانے کو گھنے جنگل
اگ کر ڈھانک لیں گے۔

اور یہ وقت کی معتدل رفتار کے ساتھ ہوگا اور قانون کے عین مطابق ہوگا اور حسب معمول ہوگا۔ لینڈ سلائڈ کی رات جو کچھ ہوا وہ بھی کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ فردوس کاٹج کی کیا بساط، بیر بھٹی کی چھوٹی سی بستی کی بھی کیا بساط، بڑے بڑے شہروں کو مٹی ڈھانپ لیتی ہے، اور اس مٹی پر اور مٹی جمتی ہے۔ یہ وقت کے معمولی کام ہیں۔ غیر معمولی بات صرف یہ ہے کہ جو کام وقت صدیوں میں انجام دیتا ہے وہ اس نے لینڈ سلائڈ کی رات ساعتوں میں انجام دے دیا، اس لیے کہ اس رات برسوں کے بجائے ''سکنڈوں بلکہ پلکوں حالت بدل رہی تھی،'' گویا اس رات چکی تیز چل رہی تھی۔

کچھ پہلے رفیق حسین کے ساتھ جیرالڈ ڈریل کا نام لینے کی زیادتی کی گئی تھی۔ یہی زیادتی ان کے ساتھ کپلنگ اور جم کاربٹ کا نام لے کر بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی زیادتی ہوگی کہ ہم رفیق حسین کے یہاں جانوروں کو بالکل ضمنی اور ثانوی حیثیت دے دیں۔ یہ صحیح ہے کہ رفیق حسین جانوروں کے بارے میں زیادہ معلوماتی تفصیلات فراہم نہیں کرتے لیکن ان کا قلم چند خط کھینچ کر جانور کو زندہ کر دیتا ہے۔ خصوصاً کسی صورت حال میں تغیر کا مختلف جانوروں پر ردعمل دکھانے میں ان کی یہ مہارت کھل کر سامنے آتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

شیر: شیر دم کو اپنے پہلو میں سمیٹے، منھ کھولے، ہلکے ہلکے ہانپتا ہوا، تیزی سے
آنکھیں ادھر ادھر گھماتا ہوا، سامنے کی کھڑی چڑھائی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً
ریچھ، جس کی کہ بوا سے ندی کے کنارے ہی آ گئی تھی، سامنے پتھروں پر
آہستہ آہستہ بھدے پن سے چڑھتا نظر آرہا تھا۔ شیر کا کھلا ہوا منھ بند ہوگیا،
دم لٹھیا کی طرح پیچھے جا پڑی اور دم کی پتلی نوک ناگن کی طرح دائیں بائیں
لہرانے لگی۔ شیر بار بار دبکا ہوا پنجوں کے بل سدھر سدھر کر بیٹھنے لگا۔

(''بیرو'')

بنڈیلا (جنگلی سؤر): بنڈیلے کو مالا کی گھاس کی طرف سے کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ زمین میں گھسی ہوئی بھاری تھوتھنی وہیں مٹی میں دھنسی کی دھنسی رہ گئی۔ کانوں نے آہستہ آہستہ جنبش جاری رکھی۔ آواز پھر بند ہو گئی تھی۔ کچھ دیر اسی حالت میں انتظار کرنے کے بعد ناک کو دوبارہ مٹی میں جھٹکے سے دھنسایا ہی تھا کہ کھس کھس کھساک آواز آئی۔ بنڈیلا جڑ کھودتے میں رکا، اور پھر بغیر سر گھمائے بدن کے ایک ہی جھٹکے میں پوری جان سے گھوم، مالا کی طرف رخ کر، پتلی دم کی جلیبی بنا، ساکت کھڑا ہو گیا۔

(''ہر فرعونے را موسیٰ'')

ریچھ: اس تڑاخے کی آواز سے ریچھ، جو کہ ان پتھروں کے پاس سے گذر رہا تھا، ٹھٹھک گیا۔ بھاری جھبرا سر ہلا ہلا کر ادھر ادھر سونگھا ''دو بوئیں مشترکہ!'' جھلا کر نیچے سے ناک کے بانسے کو دو دفعہ پونچھا اور دونوں پتھروں کے بیچ میں گھس گیا۔ بجلی کی طرح شیر، شکار کو چھوڑ، گھوم کے کھڑا ہو گیا۔ آندھی کی طرح ریچھ نے جھٹکا لیا اور راستہ روک کر سات فیٹ اونچا، تین فیٹ چوڑا جھبرا دیو پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا...

(''بیرو'')

گوند: نر گوند، جنگل کا سب سے بڑا چوپایہ، اپنے جثّے اور اپنی طاقت پر مغرور گوند، نتھنے پھلائے، کانوں کی کٹوریاں آگے گھمائے، دم کی تھاپی تیزی سے ہلا رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون گستاخ بدتمیز راستے میں ہے۔

(''ہر فرعونے را موسیٰ'')

ھاتھی: شیرنی کی جنگل دہلا دینے والی دہاڑ اس نے سکون اور اطمینان کے ساتھ سونڈ کی نوک منھ میں دبائے ہوئے اور اٹھے ہوئے پچھلے ایک پیر سے

دوسرا پیر کھجاتے ہوئے سنی۔ اس کی بائیں طرف کی پھوٹی ہوئی آنکھ، جس میں سے دائمی سیاہ بہنے والے آنسوؤں سے مستک پر ایک کالی لکیر بنی ہوئی تھی، اپنے دید سے خالی گڑھے پر مچچائی اور سالم آنکھ کے چھوٹے سے گول ڈھیلے نے چاروں طرف اوپر اور نیچے کئی چکر کھائے۔

مکار ہاتھی آواز کے سنتے ہی سم ہو کر رہ گیا۔ کئی منٹ آدھا پولا منھ میں اور آدھا سونڈ کی نوک میں پکڑے کھڑا رہا۔ پھر پولا منھ سے نکال وہیں پھینک، سونڈ کی نوک بو لینے کو آگے بڑھائی۔ کان کھڑے کیے اور آہستہ آہستہ مچان کی طرف بڑھا۔

(''ہر فرعونے راموسیٰ'')

گھوڑی: یکا یک یہ آواز جو آئی، گھوڑی چونک، دونوں کان پیچھے دبا، خاموش کھڑی ہوگئی... گونگی نے پھر وہی آواز نکالی۔ گھوڑی نے آگے پیچھے کان ہلاتے ہوئے پھر اس آواز کو سنا... دوسرا کے جو گھوڑی نے اس آواز کو سنا تو پھر یہ معلوم ہوا کہ اس مریل گھوڑی میں کسی نے بجلی بھر دی۔ ایک دفعہ ہنہنانے کی تڑپ ماری... دیکھتے دیکھتے ساز کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ گھوڑی آزاد بھون سے نکل، یکے کے چاروں طرف پھرنے لگی۔ وہ رکتی، بھاگتی، کبھی الف ہوتی، کبھی دولتیاں چلانے لگتی، کان سکیڑے، دانت نکالے یکے کے گرد گھومنے لگی۔

(''بے زبان'')

رفیق حسین کے افسانوں کے دروبست کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ جس طرح کوئی انجینئر اپنی تعمیر کا نقشہ پہلے سے تیار کر کے ایک ایک اینٹ کی جگہ مقرر کر لیتا ہے، اسی طرح انھوں نے بھی اپنے افسانے کی منصوبہ بندی اور تنظیم کی ہے، اور ان کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے کہ ''میں افسانہ لکھنے سے

پہلے اس کے پلاٹ اور تمام جزئیات کا اپنے تصور میں مکمل جائزہ لے لیتا ہوں۔'' مثلاً بہاری کو افسانے میں پہلی بار کس وقت دکھایا جائے (''کفارہ'')؛ چاندنی کی پہاڑیوں میں ہیرو کو کب نمودار کیا جائے (''ہیرو'')؛ کلوا اور منن کی دوبارہ ملاقات کب اور کہاں ہو (''کلوا'')؛ بندریا کو آخری بار فردوس کاٹج میں کیوں کر پہنچانا ہے، اور لینڈ سلائڈ کی ابتدائی گڑگڑاہٹ کس وقت سنانا ہے (''آئینۂ حیرت'') وغیرہ، یہ سب طے کرنے میں رفیق حسین نے خاصی دماغ سوزی کی ہوگی، لیکن ان کے یہاں موڑ اس طرح آتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ اپنے آپ اُدھر مڑ گیا اور اسے یہ رخ دینے میں افسانہ نگار کو کچھ محنت نہیں پڑی ہوگی، لیکن افسانوی بیانیے میں سب سے زیادہ ساختہ چیز یہی پُرفریب بے ساختگی ہوتی ہے۔ ''آئینۂ حیرت'' کے افسانوں کے نقشوں پر ایک نظر ڈالیے:

(۱) "کفارہ": مصطفیٰ آباد رینج اور گیہوں کا کھیت۔ چیتلیں اور جھانک کھیت چر رہے ہیں، ان کی واپسی کے انتظار میں شیر اور شیرنی گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ شیرنی اور شیر کو ہوا میں ایک نئی بو محسوس ہوتی ہے اور دونوں وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ چیتلوں کو بھی وہ بو محسوس ہو جاتی ہے اور دور پر ایک جنبش نظر آتی ہے۔ پورا گلہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ گیہوں کھیت میں مفرور قاتل بہاری آ گیا ہے۔ وہ قانون سے بچنے کے لیے جنگل میں رہنے لگا ہے اور شیر کے شکار کا گوشت چرا چرا کر کھاتا ہے۔ ایک دن گوشت چرا کر بھاگتے ہوئے اس کا سامنا شیرنی سے ہو جاتا ہے۔ شیرنی اسے مار ڈالتی ہے اور اس کے بعد آدم خور ہو جاتی ہے۔ آخر خود بھی ماری جاتی ہے۔

(۲) "کلوا": اسکولی لڑکا منن کتے کے پلّے کو گھر لاتا ہے۔ پلا کچھ دن وہاں رہتا ہے۔ لڑکے کا باپ اسے نکلوا دیتا ہے۔ ایک کہار کی لڑکی اس کو پال لیتی ہے اور اس کا نام کلوا رکھتی ہے۔ محلے کا ایک لڑکا انتقاماً کلوا کو اٹھا لے جاتا ہے۔ کلوا کچھ دن قبرستان میں ایک گھرانے کے ساتھ رہتا ہے، پھر رسی کاٹ کر بھاگ نکلتا ہے اور ایک بڑے کتے کی ماتحتی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کتے کے مرنے کے بعد اس کے علاقے پر قابض ہو جاتا ہے۔ ایک دن اسے کہار کی لڑکی کی بو ملتی ہے، اور وہ اس کے سہارے لڑکی کے گھر پہنچ جاتا ہے، لیکن لڑکی سسرال جا چکی ہے۔ کلوا وہیں رہ پڑتا ہے۔ سال بھر بعد لڑکی واپس آتی ہے۔ کلوا اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن وہ کلوا کو بھول چکی ہے، اور اس سے ڈر جاتی ہے۔ آٹھویں

دن وہ سسرال واپس چلی جاتی ہے۔اب کلوا ایک غضب ناک کتا ہو جاتا ہے۔ادھر منن غلط تربیت کی وجہ سے آوارہ گردی کرنے لگتا ہے۔ایک دن کلوا اور منن کی ملاقات ہو جاتی ہے۔کلوا کو منن کی بو مانوس معلوم ہوتی ہے، دونوں میں پھر سے دوستی ہو جاتی ہے اور دونوں ساتھ ساتھ آوارہ گردی کرنے لگتے ہیں۔ایک دن منن واٹر ورکس کے گہرے تالاب میں گر کر ڈوبنے لگتا ہے۔کلوا تالاب میں پھاند کر اسے سہارا دیے رہتا ہے، یہاں تک کہ لوگ آخر منن کو بچا لیتے ہیں، لیکن کلوا پیٹ میں زیادہ پانی پہنچ جانے کی وجہ سے مر جاتا ہے۔منن کو اسپتال پہنچایا جاتا ہے اور کلوا کی لاش کرگسوں کی خوراک بننے کے لیے وہیں پڑی رہ جاتی ہے۔

(۳) "بیرو": ایک جوگی کا پالا ہوا نیل گائے بیرو جوگی کی گرفتاری کے بعد لاوارث ہو جاتا ہے اور بستی والوں کی چھیڑ چھاڑ سے عاجز آ کر جنگل میں چلا جاتا ہے۔لیکن اس کے گلے میں جوگی کا ڈالا ہوا کنٹھا پڑا ہے جس کی وجہ سے اس کے جنگلی ہم جنس اس سے وحشت کھاتے ہیں۔وہ نیل گایوں کے ایک گلے کے سردار سے بار بار لڑتا ہے اور ہر بار اس کا حریف شکست کھا کر بھاگتا ہے، جس کے بعد جنگل کے قانون کی رو سے بیرو کو گلے کا سردار ہو جانا چاہیے، لیکن جیسے ہی وہ گلے کے قریب پہنچتا ہے، مادائیں اس کے کنٹھے سے بھڑک کر بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔بیرو گلے کا پیچھا کرتا پھرتا ہے اور کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ادھر ایک بدمزاج ریچھ بھی وہاں آ جاتا ہے اور بلا امتیاز سب جانوروں پر حملہ کرنے لگتا ہے۔جنگل میں ابتری پھیل جاتی ہے جس کی وجہ سے شیر کو شکار کی تلاش میں کئی کئی دن بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ایک دن وہ ایک پہاڑی کگارے پر بیرو کے حریف کو مار لیتا ہے اور اسے کھانا شروع ہی کرتا ہے کہ ریچھ وہاں آ پہنچتا ہے۔دونوں میں ہولناک جنگ ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو مہلک طور پر زخمی کر دیتے ہیں۔بیرو بھی اپنے حریف کا پیچھا کرتا ہوا کگارے پر پہنچ جاتا ہے۔ریچھ اور شیر کو آپس میں گتھے دیکھ کر اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے اور پنجہ لگنے سے بیرو کے گلے کا کنٹھا ٹوٹ جاتا ہے۔اب مادہ نیل گائیں اسے قبول کر لیتی ہیں۔

(۴) "گوری ہو گوری": گاؤں میں سیلاب آ جاتا ہے۔گاؤں والے گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ایک لڑکی گھر ہی میں رہ جاتی ہے اور گھر کی گائے کا بچہ کھونٹے سے بندھا رہ جاتا ہے۔

محفوظ جگہ پر پہنچ کر ماں باپ کو لڑکی کے غائب ہونے کا پتا چلتا ہے۔ دونوں رونے لگتے ہیں۔ گائے بھی اپنے بچے کو پکار رہی ہے۔ آخر وہ پیرتی ہوئی واپس پہنچتی ہے۔ اپنے بچے کو ساتھ لے جانا چاہتی ہے، لیکن بندھا ہونے کی وجہ سے بچھڑا وہیں چکر کھاتا رہتا ہے۔ گائے لڑکی کو پیٹھ پر سوار کر کے بچھڑے کے پاس لاتی ہے۔ لڑکی بچھڑے کی رسی کھول دیتی ہے اور تینوں خیریت کے ساتھ اپنے لوگوں میں پہنچ جاتے ہیں۔

(۵) "آئینۂ حیرت": جون کی دھوپ میں جلتی ہوئی سڑک پر پہاڑ کا باشندہ ڈھٹیال گرمی سے ہلکان چلا جا رہا ہے۔ ایک رئیس ترس کھا کر اس کو اپنی موٹر میں بٹھالیتا ہے۔ اسی گرم سڑک پر ایک بندریا بھی اپنے بچے کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ سرد پہاڑی علاقہ آجاتا ہے جہاں بندریا اپنی ٹولی میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایک دن رئیس کا ڈرائیور بندریا کے بچے کو اٹھا لے جاتا ہے تاکہ رئیس کا منتوں مرادوں والا کمزور بچہ بندر کی ہوا پاس رہنے سے تندرست رہے۔ بندریا اپنے بچے کو ڈھونڈھتی ہوئی رئیس کی کوٹھی میں پہنچ جاتی ہے۔ بچہ رسی سے بندھا ہوا ہے اس لیے ماں اسے پالینے کے باوجود ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ آخر وہیں رہ پڑتی ہے۔ گھر والے شروع میں اس سے کچھ نہیں بولتے لیکن وہ کچھ ایسی توڑ پھوڑ مچاتی ہے کہ اسے بندوق سے ڈرا کر بھگا دیا جاتا ہے، لیکن اب اس کا بچہ ہر وقت ماں کی یاد میں چیخا کرتا ہے اور اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں وہ بیمار پڑ کر رئیس کے بچے کی صحت کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔ رئیس کے یہاں سے ایک لڑکی پوجا کی غرض سے بندر کے بچے کو اپنے یہاں لے جاتی ہے۔ پہاڑ پر بارش اور ٹھنڈ شروع ہو جاتی ہے۔ بندروں کی ٹولی واپس جا چکی ہے لیکن بندریا بچے کی تلاش میں وہیں رہتی ہے۔ بے قرار ہو کر ایک رات وہ رئیس کی کوٹھی پر پہنچ جاتی ہے۔ اسی وقت لینڈ سلائڈ میں اوپر والا پہاڑ نیچے پھسلنا شروع ہوتا ہے۔ مامتا کی ماری بندریا کو اپنا بچہ نہیں ملتا تو وہ رئیس کے بچے کو لے بھاگتی ہے۔ لینڈ سلائڈ میں کوٹھی بکھر کر نیچے پھسل پڑتی ہے اور اپنے مکینوں سمیت ملبے کی تہوں میں دفن ہو جاتی ہے۔ بندریا بچے کو لیے لینڈ سلائڈ کے خاتمے تک بھاگتی رہتی ہے، آخر زخموں اور تھکن سے چور ہو کر مر جاتی ہے۔ ایک ڈھٹیال اس کی گود سے بچے کو اٹھا لے جاتا ہے۔ لاکھوں کی جائداد کا مالک یہ بچہ اب سے نیم وحشی ڈھٹیال بن کر جانوروں کی سی زندگی گذارے گا۔

(۶) "ھر فرعونے را موسیٰ": مالا کے جنگل میں ایک بنڈیلا گوند سے ڈر کر بھاگتا ہے۔ گوندوں کی ڈار سامنے کھڑے ہوئے ہاتھی کو دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ ہاتھیوں کے دل میں شیرنی کی دہاڑ سن کر بھگدڑ پڑ جاتی ہے۔ لیکن ایک پرانا ڈیڑھ دانت کا کانا خونی ہاتھی شیرنی کو مار ڈالتا ہے، وہاں سے گیہوں کے کھیت میں جا پہنچتا ہے اور مچان پر سوئے ہوئے نوجوان بدّل کو بستر سمیت نیچے کھینچ لیتا ہے۔ بدل بچ نکلتا ہے لیکن ہاتھی کے ہاتھوں اس درگت نے اس کی جگ ہنسائی کرادی ہے۔ وہ ہاتھی کا دشمن ہو جاتا ہے۔ خونی ہاتھی کو مارنے والے کے لیے انعام کا اعلان ہوتا ہے تو ایک انگریز نام نہاد شکاری اس کا شکار کرنے کے لیے علاقے میں آتا ہے۔ بدل اس کی ملازمت کر لیتا ہے اور بڑی دوڑ دھوپ کر کے کانے ہاتھی کا پتا لگاتا اور شکاری کو گھنے جنگل میں لے جاتا ہے۔ لیکن ہاتھی کو دیکھ کر شکاری بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ بدل تنہا رہ جاتا ہے اور ہاتھی اسے کچل کچل کر مار ڈالتا ہے۔ انگریز شکاری بدل کے رائفل لے کر بھاگ جانے کی رپورٹ درج کرا کے واپس چلا جاتا ہے۔ بدل کا باپ، پرانا تجربہ کار شکاری کلوا پاسی بیٹے کی تلاش میں جنگل پہنچتا ہے۔ وہاں اس کے بدن کے چیتھڑے، انگریز کی چھوڑی ہوئی رائفل اور دوسرے سراغ دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ جاتا ہے۔ رائفل اٹھا کر ہاتھی کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوتا ہے اور بالآخر اسے مار کر بیٹے کا انتقام لے لیتا ہے۔ اسے اسلحہ قانون کے تحت گرفتار بھی کر لیا جاتا ہے اور ہاتھی کو مارنے کا انعام بھی ملتا ہے۔ عدالتی کارروائیوں کے دوران انگریز شکاری کو اپنی بزدلی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

(۷) "شیریں فرہاد": نئی روشنی اور اونچی سوسائٹی کے دلدادہ اقبال احمد کی سیدھی سادھی بیوی نسیمہ نے ایک بلی پال رکھی ہے۔ اقبال احمد بلی پالنے کا مخالف ہے اور جب ایک بلا گھر میں آنے لگتا ہے تو اقبال احمد اس بلے کو طرح طرح کی سزائیں دیتا ہے۔ ترقی پا کر اقبال احمد کو نسیمہ اپنے شایان شان بیوی نہیں معلوم ہوتی۔ وہ دوسری شادی کر لیتا ہے اور دوسرے گھر میں رہنے لگتا ہے۔ نسیمہ بھی بلی کو ساتھ لے کر میکے روانہ ہوتی ہے لیکن اسٹیشن پر بلی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور کتوں سے ڈر کر سیدھی اپنے ٹھکانے پر واپس آتی ہے جو نسیمہ کے جانے کے بعد ویران پڑا ہے۔ دوسرے دن اقبال احمد گھر میں آتا ہے اور اس کا سامان اٹھانے رکھنے لگتا ہے۔ بلی اور بلا ایک سے دوسرے کمرے میں

بھاگتے پھرتے ہیں۔ اقبال احمد گھر کے سارے کمروں کو مقفل کر کے چلا جاتا ہے۔ بلی اور بلا انھیں میں سے ایک کمرے میں بند رہ جاتے ہیں۔ دس دن میں دونوں بھوک سے مرنے لگتے ہیں۔ آخر بے تاب ہو کر بلا بلی کو کھا جاتا ہے۔ اسی دن گھر کے دروازے ایک بار پھر کھولے جاتے ہیں۔ بلا باہر نکل جاتا ہے، تندرست ہو جاتا ہے اور عرصے تک اپنی محبوب بلی کو آواز دیتا پھرتا ہے۔

(۸) "بے زبان": ایک شوقین مزاج بوڑھا رئیس سرکس کی منھ زور گھوڑی پر ایک خوبصورت لڑکی کی شہسواری کے کرتب دیکھتا ہے اور لڑکی پر لہلوٹ ہو جاتا ہے۔ سرکس کے منیجر کو بھاری رقم دے کر وہ لڑکی کو اپنی نئی بیگم بنانے کے لیے اپنے محل میں لے جاتا ہے۔ وہاں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ میک اپ کی بھاری تہوں کے نیچے ایک بھیانک سے چہرے والی گونگی لڑکی ہے۔ بدنامی کے خوف سے رئیس چپ رہ جاتا ہے اور لڑکی کو اپنے باورچی کی سپردگی میں دے دیتا ہے جہاں وہ نوکرانی کی طرح کام کرتے کرتے وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہے۔ گھوڑی کو سرکس والوں نے ایسا بنا دیا تھا کہ وہ لڑکی کے سوا کسی کو اپنی پیٹھ پر بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ لڑکی کے جانے کے بعد وہ دانہ گھاس چھوڑ دیتی ہے۔ اس پر طرح طرح کے ظلم کیے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ مریل گھوڑی ہو کر رہ جاتی ہے۔ عاجز آ کر سرکس والے اسے نیلام کر دیتے ہیں اور وہ یکے میں جوت دی جاتی ہے۔ یہ دونوں بے زبان اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ مدتوں بعد ایک دن اس گھوڑی والے یکے پر وہی گونگی بیٹھتی ہے۔ اس کی آواز سن کر گھوڑی پر ایک جوش طاری ہو جاتا ہے اور وہ خود کو چھڑا کر یکے کے گرد پاگلوں کی طرح چکر کاٹنے لگتی ہے۔ گونگی بھی اسے پہچان جاتی ہے۔ اس پر بھی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ یکے سے کود کر سرکس کے دنوں کی طرح گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو جاتی ہے۔ گھوڑی اسے لے کر سرپٹ بھاگتی ہے اور میلوں بھاگتی چلی جاتی ہے۔ آخر دونوں زمین پر گرتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔

ان میں سے کسی بھی نقشے میں جزئیات کے رنگ بھر کر کوئی معمولی افسانہ نگار بھی اچھا خاصا افسانہ، اچھا افسانہ نگار بہت اچھا افسانہ لکھ سکتا ہے۔ لیکن رفیق حسین سے بہتر افسانہ نگار بھی ان نقشوں پر رفیق حسین سے بہتر افسانہ نہیں لکھ سکتا، کیوں کہ جزئیات کے انتخاب میں وہ رفیق حسین سے مات

کھا جائے گا۔ یہ اس لیے کہ ان افسانوں کے نقشے اور ان نقشوں کے جزئیات دونوں ایک ہی دماغ کے ساختہ ہیں اور اسی لیے دونوں ایک ہی سانس لیتے معلوم ہوتے ہیں اور اسی طرح باہم پیوست ہیں کہ اعتماد کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ رفیق حسین نے ان افسانوں کے نقشے پہلے تیار کیے تھے یا ان کے جزئیات۔ اسی لیے ان افسانوں کو پڑھ کر ذہن اس سوال میں الجھتا ہے کہ یہ جزئیات ان نقشوں کے لیے بنائے گئے ہیں یا یہ نقشے ان جزئیات کے مطابق تیار کیے گئے ہیں۔

۴

رفیق حسین کے ذکر کے ساتھ مجھ کو اپنے پڑوس کا وہ مکان یاد آتا ہے جہاں میرے بچپن کا بہت سا وقت گذرا، اس لیے کہ وہاں بچوں کی کتابوں اور رسالوں کا ذخیرہ اور مکینوں کا محبت بھرا برتاؤ مجھے بار بار کھینچ بلاتا تھا۔ ہم لوگوں اور اس مکان والوں کے مراسم عزیزوں سے بڑھ کر تھے۔ خالہ جان، شمو باجی (جو والد صاحب کی چہیتی بیٹی کی طرح تھیں اور کبھی کبھی ان سے اردو پڑھتی تھیں)، نشو باجی، قدیر بھائی ہمارے اپنے گھر والوں کی طرح تھے۔ کبھی عثمان بھائی بھی آنکلتے تھے جو انگریزوں کے انداز میں اردو بول کر بہت ہنساتے تھے۔ تقسیم کے بعد یہ لوگ پاکستان چلے گئے اور وہ مکان کچھ دن خالی پڑا رہا۔ ایک دن میں اس خالی مکان کو دیکھنے گیا۔ وہاں اب کوئی سامان نہیں تھا۔ دالان، جہاں خالہ جان ہر وقت موجود ملتی تھیں (اس لیے کہ ان کی ایک ٹانگ زہر باد کی وجہ سے کاٹ دی گئی تھی)، تختوں کے چوکے کے بغیر زیادہ بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ چھت سے لٹکنے والا مشرقی پنکھا، جسے ڈوری کھینچ کھینچ کر جھولے کی طرح پینگ دیے جاتے تھے، اگر وہاں کبھی تھا تو اب نہیں تھا۔ البتہ چھت میں سگریٹ کی پنی کے کپ الٹے چپکے ہوئے تھے اور جانے والے مکینوں کی یاد دلا رہے تھے۔ ان مکینوں میں خالہ جان سید رفیق حسین کی چھوٹی بہن سیدہ ممتاز جہاں بیگم تھیں، شمو باجی پاکستان جا کر ''دستک نہ دو'' والی الطاف فاطمہ ہوئیں، نشو باجی افسانہ نگار نشاط فاطمہ اور قدیر بھائی ''ماہ نو'' کے ایڈیٹر اور ماہر مترجم سید فضل قدیر۔ اور چھت سے چپکے ہوئے یہ کپ، مجھے مدتوں بعد مضمون ''خزاں کے رنگ'' سے معلوم ہوا، سید رفیق حسین نے اپنے بھانجے بھانجیوں کو خوش کرنے کے لیے بنائے اور اچھال کر چھت سے

چپکائے تھے۔(عثمان بھائی انھیں کے بیٹے سید عثمان رفیق تھے۔)

اس گھر میں سید رفیق حسین کو میں نے کئی بار دیکھا، لیکن ان کی ادبی حیثیت کا مجھ کو علم نہیں تھا، اور مجھے ان کی شکل صورت بھی ٹھیک سے یاد نہیں، صرف اتنا خیال آتا ہے کہ ان کے چہرے پر چیچک کے ہلکے (یا گہرے؟) داغ تھے۔ ممکن ہے یہ میرے حافظے کا دھوکا ہو، اس لیے کہ ان داغوں کا ذکر ان کی شخصیت پر مضامین میں مجھے نہیں ملا۔ ان کے اہم شخصیت ہونے کا اندازہ مجھ کو اس وقت ہوا جب میں نے اپنے والد مرحوم کو بار بار ان کے افسانوں کی تعریفیں کرتے سنا۔ وہ کبھی کبھی ہمارے یہاں آ نکلتے اور انھوں نے والد صاحب کو اپنے بعض افسانے سنائے بھی تھے۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات کا ذکر الطاف فاطمہ نے اس طرح کیا ہے:

> ایک مرتبہ اپنا افسانہ سنا کر بولے تھے، ''بہن، میں چاہتا ہوں کہ مسعود صاحب کو اپنا افسانہ سناؤں۔ مگر میرا ان کا تعارف نہیں۔''
>
> ''تعارف یہ کروادے گی،'' اماں نے میری طرف اشارہ کیا۔
>
> ''یہ کیا کروائے گی!'' انھوں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور ویسے ہی بیٹھے رہے۔
>
> ''کروادے گی۔ اس کی اور اُن کی بہت بنتی ہے۔''
>
> ''ارے بھئی، کیا باتیں کرتے ہیں وہ تم سے؟'' انھوں نے پوچھا۔
>
> میں چپ بیٹھی رہی۔ مجھے آج بھی خیال نہیں کہ ہم کیا باتیں کرتے تھے۔ اور ماموں جان کو جواب دینا میں نے یوں ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ مجھے گدھی کہا کرتے تھے اور اماں سے کہتے تھے کہ یہ تمھاری لڑکی نہایت چبلی اور سڑن ہے۔
>
> اس مختصر سے راستے میں انھوں نے کئی بار پوچھا تھا:
>
> ''بھئی مسعود صاحب سے تمھاری کیا باتیں ہوتی ہیں؟''
>
> اب میں کیا جواب دیتی۔ میں تو یہ سوچتی چلی جارہی تھی کہ آخر میں ان سے

لے جا کر انھیں کیوں ملواؤں۔ مجھے یہ تک نہ معلوم تھا کہ افسانہ ہوتی کیا چیز ہے۔ اور اچھا، اگر لے جاؤں تو جا کر کیا کہوں گی، ''خالو جان، میرے ماموں جان ہیں۔''

یا یوں کہوں، ''یہ سید رفیق حسین جعفری ہیں، اور یہ سید مسعود حسن رضوی۔'' مگر بڑوں کے نام ان ہی کے منھ پر لینا تو عجیب سی حرکت ہے۔

اب یہ یاد نہیں کہ میں نے ان دونوں کو کیوں کر ملوایا تھا۔ بہر حال اتنا یاد ہے کہ میں ان کو مسعود صاحب اور سید علی عباس حسینی کے پاس بٹھا کر سرپٹ بھاگ آئی تھی۔

(''خزاں کے بعد'')

افسانہ ''کلوا'' ادیب نے غالباً خود رفیق حسین کی زبان سے سنا تھا اس لیے کہ اس افسانے کا وہ بہت ذکر کرتے تھے۔ (ہمارے گھر کے کتے کا نام بھی کلو رکھا گیا تھا۔) انسان اور کتے کی دوستی پر علی عباس حسینی نے بھی ایک افسانہ ''رفیقِ تنہائی'' لکھا تھا۔ معلوم نہیں یہ افسانہ ''کلوا'' کے بعد لکھا گیا تھا یا پہلے۔

الطاف فاطمہ مزید بتاتی ہیں کہ رفیق حسین کی وفات کے بعد:

مسعود صاحب بار بار ''آئینۂ حیرت'' منگوا بھیجتے۔ ایک دن بھیا[۱] نے اماں سے کہا، ''خالہ جان، ابا کہتے ہیں، بہن سے کہنا یہ کتاب ہم واپس نہیں دیں گے۔'' پھر وہ کہنے لگا، ''وہ کہتے ہیں یہ تو صحیفۂ آسمانی ہے۔''

(''خزاں کے بعد'')

غالباً یہی ''آئینۂ حیرت'' کا نسخہ تھا جو مدتوں میرے پاس رہا اور ادیب مرحوم نے بار بار مجھ سے لے کر پڑھا۔

رفیق حسین کے افسانوں کے ساتھ کبھی کبھی ادیب ان کی شخصیت کے بارے میں بھی باتیں

---

[۱] ادیب کے بڑے بیٹے ڈاکٹر سید اختر مسعود رضوی، سابق استاد شعبۂ فارسی، پشاور یونیورسٹی۔

کرتے تھے جن میں سے ایک دو مجھے یاد رہ گئی ہیں، مثلاً ان کے بڑے بھائی خان بہادر سید حامد حسین یا والد خان بہادر سید جعفر حسین محبت بھرے لہجے میں ان کی شکایت کرتے تھے کہ یہ اچھی اچھی ملازمتیں پاتا ہے، بڑی محنت سے کارخانے بناتا ہے، لیکن جب کام کی تکمیل اور اس کی ترقی کا وقت قریب ہوتا ہے تو اپنے افسر کو تھپڑ مار کر چلا آتا ہے۔ سید حامد حسین یہ بھی کہتے تھے کہ یہ مجھ سے بہتر انجینئر ہے لیکن مزاج کی وجہ سے ترقی نہیں کر پاتا۔

ایک زمانے میں رفیق حسین نے (غالباً لکھنؤ کے تاریخی شیعہ سنی فساد سے متاثر ہو کر) اتحاد المسلمین قسم کی ایک کمیٹی بنائی تھی اور اس کا ایک جلسہ نادان محل روڈ (لکھنؤ) کے آغا میر پارک میں کیا تھا۔ اس جلسے میں رفیق حسین کی فرمائش پر ادیب نے بھی تقریر کی تھی۔

حلق کے کینسر میں رفیق حسین کی وفات ہوئی۔ ادیب بار بار ان کی خیریت منگواتے تھے۔ بیماری کے آخری دنوں میں ان کا حلق اس طرح بند ہو گیا تھا کہ کھانا پانی نہیں اتر پاتا تھا۔ میری والدہ مرحومہ بتاتی تھیں کہ مرض کی اذیت کے ساتھ بھوک پیاس کی اس تکلیف پر اپنے لواحقین کو روتے دیکھ کر رفیق حسین انھیں امام حسینؑ کی یاد دلاتے اور صبر کی تلقین کرتے تھے۔

رفیق حسین کی وفات کے بعد بہت دن تک ادیب ان کے گھر والوں سے دریافت کراتے رہے کہ ان کے غیر مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ کہاں ہے۔ وہ اس مجموعے کی ظاہری ہیئت اور جلد کا رنگ بھی (غالباً سرخ) بتاتے تھے۔ یہ مجموعہ ایک بار رفیق حسین نے انھیں یہ کہہ کر پڑھنے کو دیا تھا کہ ابھی تک کے چھپے ہوئے افسانے تو میں نے مشق کے طور پر اور قلم کو رواں کرنے کے لیے لکھے تھے۔ اب یہ افسانے باضابطہ محنت اور ریاض سے لکھے ہیں۔ ادیب نے یہ افسانے پڑھے تھے اور وہ بتاتے تھے کہ ان کے آگے ''آئینۂ حیرت'' کے افسانے ماند پڑ جاتے تھے۔ میرے پوچھنے پر ادیب بتاتے کہ یہ افسانے بھی زیادہ تر (یا سب؟) جانوروں ہی کے بارے میں تھے۔ اس مجموعے کو ادیب کے اصرار پر رفیق حسین کے سامان میں کئی بار تلاش کیا گیا مگر اس کا سراغ نہیں ملا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ مجموعہ رفیق حسین نے اپنے ناشر شاہد احمد دہلوی کو بھیج دیا ہو۔ لیکن شاہد احمد کا سامان تقسیم ہند کے ہنگاموں میں بہت کچھ لٹ گیا اور بہت کچھ جل گیا۔ ظاہراً یہ مجموعہ بھی اس اتلاف کا شکار ہوا۔

لیکن ادب کی دنیا میں معجزاتی طور پر مردے زندہ ہو جاتے ہیں اور معدوم اچانک موجود ملتا ہے، اس لیے کبھی کبھی میں خواب سا دیکھتا ہوں کہ ہندوستانی پنجاب کے کسی دور افتادہ گاؤں میں، یا کہیں بھی، کسی غیر اردو داں گھرانے کے کباڑ میں ہاتھ کی لکھی ہوئی سرخ جلد کی ایک بوسیدہ کاپی نکلتی ہے جس کے پہلے ورق پر عنوان کے نیچے "از سید رفیق حسین، مصنف آئینۂ حیرت" لکھا ہے۔

آج کی کتابیں

قرۃ العین حیدر کے خطوط

ایک دوست کے نام

ترتیب: خالد حسن

ISBN 969-8379-54-1
Rs.180

خطِ مرموز

(کہانیاں)

فہمیدہ ریاض

ISBN 969-8379-42-8
Rs.100

ایرانی کہانیاں

انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود

ISBN 969-8379-39-8

Rs.90

عربی کہانیاں

انتخاب اور ترتیب: اجمل کمال

ISBN 969-8379-53-3
Rs.180

کتب خانہ پیپر بیک سیریز

عطر کافور

(کہانیاں)

نیر مسعود

ISBN 969-8379-09-6
Rs.80

بیس سو گیارہ

(ناول)

محمد خالد اختر

ISBN 969-8379-08-8
Rs.70

آدمی کی زندگی

(نظمیں)

فہمیدہ ریاض

ISBN 969-8379-10-X
Rs.70

عاقبت کا توشہ

(کہانیاں)

نکہت حسن

ISBN 969-8379-16-9
Rs.85

روکو کو اور دوسری دنیائیں

(نظمیں)

افضال احمد سید

ISBN 969-8379-18-5
Rs.50

ایک اور آدمی

(کہانیاں)

حسن منظر

ISBN 969-8379-13-4
Rs.85

دیمک

(بنگالی ناول کا ترجمہ)

شرشیندو مکھوپادھیائے

ISBN 969-8379-12-6
Rs.70

نمبردار کا نیلا

(ناولا)

سید محمد اشرف

ISBN 969-8379-14-2
Rs.60

اردو کا ابتدائی زمانہ

ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو

شمس الرحمن فاروقی

کیا اردو واقعی ''لشکری'' اور ''فوجی'' زبان ہے؟

لفظ ''اردو'' کے اصل معنی کیا ہیں؟

ہماری زبان کا نام ''اردو'' کب پڑا اور کیوں؟

کیا ہندی/ ہندوی/ گجری/ دکنی/ ریختہ/ اردو سب اصلاً ایک نہیں ہیں؟

جدید ''ہندی'' کو اردو کے خلاف قائم کرنے میں انگریزوں کی کیا مصلحت تھی؟

اردو کا وطن شمالی ہند ہے، لیکن اس کے ادب کا باقاعدہ آغاز گجرات اور دکن میں کیوں ہوا؟

شاگردی استادی کا ادارہ اردو ہی میں، اور وہ بھی دہلی ہی میں کیوں وجود میں آیا؟

ولی دکنی نے دہلی آ کر اردو شاعری سیکھی یا خود دہلی والوں کو سکھائی؟

دہلی میں ''اصلاح زبان کی تحریک'' اور ''ایہام گوئی کی تحریک'' کی کیا حقیقت ہے؟

کیا یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ''ہندی'' ترک کر کے ایک بوجھل، فارسی/عربی زدہ زبان اختیار کی، اور اس طرح خود کو ''ہندی'' سے الگ کر کے بالآخر تقسیم ملک کے لیے راہ ہموار کی؟

اس کتاب میں ان سوالوں اور ان کی طرح کے مزید سوالوں پر فکر انگیز بحث کی گئی ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

قیمت: ۱۲۰ روپے

کلیات اختر الایمان

مرتبین: سلطانہ ایمان، بیدار بخت

(مستند پاکستانی ایڈیشن)

ارض سبز و سیہ، ابیض و سرخ سے
میں گزرتا ہوا جاؤں گا، کوئی ہے؟
کوئی ہے ہم سفر میرا، کوئی نہیں
اس مسافت میں رہ رہ کے لپٹی تھی جو
میں نے وہ خاک بھی پاؤں سے جھاڑ دی
جو تمھارا تھا میں نے تمھیں دے دیا
اور جو جس کا ہو مجھ سے لے لے ابھی
کل نہ کہنا مری بات میں کھوٹ تھا
کل نہ کہنا مری ذات آلودہ تھی

ISBN 969-8379-20-7
Rs.350

مشرق و مغرب کے نغمے

میرا جی

میرا جی کے مضامین:

جہاں گرد طلبا کے گیت
امریکہ کا ملک الشعرا: والٹ وٹمین
روس کا ملک الشعرا: پشکن
فرانس کا آوارہ شاعر: فرانسا ولاں
مغرب کا ایک مشرقی شاعر: طامس مور
انگلستان کا ملک الشعرا: جان مینسفیلڈ
فرانس کا ایک آوارہ شاعر: چارلس بادلیئر
بنگال کا پہلا شاعر: چنڈی داس
امریکہ کا تخیل پرست شاعر: ایڈگر ایلن پو
چین کا ملک الشعرا: لی پو
مغرب کی سب سے بڑی شاعرہ: سیفو
فرانس کا تخیل پرست شاعر: سٹیفانے میلارمے
پرانے ہندوستان کا ایک شاعر: اَمارو
روما کا رومانی شاعر: کیٹولس
انگلستان کا پیامی شاعر: ڈی ایچ لارنس
کوریا کی قدیم شاعری
گیشاؤں کے گیت
وِدیاپتی اور اس کے گیت
رس کے نظریے
جرمنی کا یہودی شاعر: ہائنے
انگلستان کی تین شاعر بہنیں

ISBN 969-8379-17-7
Rs.180

گابرئیل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

ترتیب: اجمل کمال

لاطینی امریکہ کے ملک کولومبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
گابرئیل گارسیا مارکیز
(Gabriel Garcia Marquez)
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول:
کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا
ایک پیش گفتہ موت کی روداد
تیرہ منتخب کہانیاں
دو ناولوں
تنہائی کے سو سال اور وبا کے دنوں میں محبت
کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون
مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین
اپنی زندگی و فن اور خیالات کے بارے میں مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: ۳۰۰ روپے

آئینۂ حیرت

اور دوسری تحریریں

سید رفیق حسین کے افسانوں کا واحد مجموعہ ''آئینۂ حیرت'' ۱۹۴۴ء میں ساقی بک ڈپو، دہلی، سے شائع ہوا تھا، اور اس کے بعد کئی ناموں سے بار بار چھپتا رہا۔ ان کی شہرت کی زیادہ تر بنیاد اسی مجموعے میں شامل آٹھ افسانوں پر تھی اور انھی افسانوں کی بدولت ان کو اردو کا ایک منفرد اور بے مثل افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں سہ ماہی ''نیا دور'' کراچی، نے ایک خصوصی گوشے میں سید رفیق حسین کی متعدد غیر مطبوعہ تحریریں شائع کیں اور ان کی شخصیت اور فن سے متعلق کئی مضامین بھی۔ ۱۹۹۳ء میں بنگلور سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ''سوغات'' میں سید رفیق حسین کی بازخوانی کی ایک اور کوشش کی گئی اور ایک خصوصی مطالعے میں ان کی منتخب تحریروں کے علاوہ ان کے فن کے بارے میں کئی مضامین شائع کیے گئے۔ زیرِ نظر کتاب میں سید رفیق حسین کے پہلے مجموعے میں شامل آٹھوں افسانوں کے علاوہ ان کی تمام دستیاب تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں اور ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں منتخب مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

کسی زبان کی کلاسیکی تحریروں کو دوبارہ نئے پڑھنے والے میسر آتے ہیں جو ان تحریروں کے ذریعے سے اپنی ادبی روایت سے شناسائی حاصل کرتے اور اسے اپنے شعور کا حصہ بناتے ہیں۔ امید ہے کہ اس مجموعے کی بدولت سید رفیق حسین کے ان قدر شناسوں میں اضافہ ہوگا جو جانتے ہیں کہ ان کے افسانوں کو روایت میں اپنا مقام حاصل ہے۔

Cover painting R. N. Pasricha

ISBN 969-8379-55-X
Rs.375